تلاش ہند

جواہر لال نہرو

(جلد دوم)

مکتبہ جامعہ دہلی

بار اوّل ۱۰۰۰

دسمبر ۱۹۶۴ء
دیال پریس دہلی

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
ساتواں باب	
دور آخر	
۱ ۔ برطانوی حکومت کا استحکام اور قومی تحریک کا ابھرنا	۹
۲ ۔ بنگال کی لوٹ، انگلستان میں صنعتی انقلاب پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے	۲۳
۳ ۔ ہندوستان کی صنعت و حرفت کی تباہی اور اس کی زراعت کا انحطاط	۲۸
۴ ۔ ہندوستان پہلی مرتبہ کسی دوسرے ملک کا سیاسی اور معاشی ضمیمہ بنتا ہے	۳۶
۵ ۔ ہندوستانی ریاستی نظام کی نشو ونما	۵۴
۶ ۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی متضاد کارروائیاں	۵۵
۷ ۔ ۱۸۵۷ء کی زبردست بغاوت — نسلی تعصب	۷۳
۸ ۔ برطانوی حکومت کا طریق کار، مختلف قوتوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارنا اور توازن قائم رکھنا	۸۳
۹ ۔ صنعت کا ارتقاء — صوبوں کے باہمی اختلافات	۹۰
۱۰ ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی اصلاح اور دوسری تحریکیں	۹۹
۱۱ ۔ کمال پاشا — ایشیا میں قومیت کی نشو ونما، اقبال	۱۲۷
۱۲ ۔ بھاری صنعتوں کا آغاز — تلک اور گوکھلے، جداگانہ انتخاب	۱۳۲

صفحہ	عنوان

آٹھواں باب

آخری دور (۲) قومیت اور سامراج

نواں باب

صفحہ	عنوان
۳۱۸	۵ - انفرادی سول نافرمانی
۳۲۵	۶ - پرل ہاربر کے حملے کے بعد، مہاتما گاندھی اور عدم تشدد
۳۳۷	۷ - سیاسی کشمکش
۳۴۶	۸ - اسٹیفرڈ کرپس کا ہندوستان آنا
۳۶۷	۹ - ناکامی
۳۷۵	۱۰ - قوم کی للکار ــــ "ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز

دسواں باب

قلعہ احمد نگر

ساتواں باب

دَورِ آخر

برطانوی حکومت کا استحکام اور قومی تحریک کا اُبھرنا

ایک انگریز جو ہندوستان کو خوب جانتا ہے اور اُس کی تاریخ سے باخبر ہے لکھتا ہے :-

"ہم نے جو کچھ کیا ہے اُس میں غالباً سب سے زیادہ اشتعال انگیز ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم تاریخ ہند لکھیں۔"

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ برطانوی حکومت کا وہ کون سا فعل ہے جس نے ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ برہم اور آزردہ کیا ہے فہرست طویل ہے اور مختلف عنوانات پر مشتمل۔ مگر اس میں شک نہیں کہ انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ ہند خصوصاً اُس زمانے کے متعلق جس کو برطانوی دور سے تعبیر کیا جاتا ہے ہندوستانیوں کے لئے نہایت تکلیف دہ ہے۔ تاریخ تقریباً ہمیشہ غالب اور فاتح اقوام مرتب کرتی ہیں اور اس میں انھیں کا نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے یا کم سے کم انھیں کے نقطہ نظر کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے غالباً وہ سب چیزیں جو ہندوستان میں آریوں کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں، اُن کی رزمیہ نظمیں اُن کی روایات خود اُن کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر

دکھاتی ہیں اور مغلوب قوموں کے ذکر میں بے انصافی سے کام لیتی ہیں کوئی فرد اپنے ذہن کو نسلی اور تہذیبی قیود سے آزاد نہیں کر سکتا اور جب قوموں اور ملکوں میں باہم مخالفت ہو تو غیر جانبدار رہنے کی کوشش بھی اپنی قوم کے ساتھ غداری سمجھی جاتی ہے۔ اور جنگ کی صورت میں جو اس مخالفت کی انتہائی مثال ہے، حریف قوم کے بارے میں بے تعصبی اور انصاف سے کام لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اُس وقت ذہن کی لطیف صلاحیتیں غائب ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ایک ہی نقطہ نظر کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت تو نہایت شدت سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اپنے عمل کو جائز ثابت کیا جائے اور دشمن کی حرکتوں کو بُرا کہا جائے۔ اُس وقت سچائی ذہن کے کسی نامعلوم گوشے میں چھپ جاتی ہے۔ اور جھوٹ سفید جھوٹ کا ڈنکا بجنے لگتا ہے۔

بعض اوقات واقعی جنگ تو نہیں ہوتی مگر ان ملکوں میں جن کے اغراض میں تصادم ہو برابر نزاع اور کشمکش رہتی ہے جسے بالقوہ جنگ سمجھنا چاہیئے۔ ایک ایسے ملک میں جو کسی بیرونی طاقت کا غلام ہو۔ یہ کشمکش لازمی طور پر مسلسل قائم رہتی ہے اور لوگوں کے خیال اور عمل کو مسخ کر دیتی ہے۔ وہاں ہر وقت ایک قسم کی جنگی ذہنیت موجود رہتی ہے۔ پُرانے زمانے میں جب کہ جنگ اور اس کے نتائج یعنی وحشیانہ مظالم، اور کسی قوم کو مغلوب کر کے غلام بنا لینا۔ قدرتی چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ تو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کہ ان حرکتوں پر پردہ ڈالا جائے یا انھیں کسی دوسرے نقطہ نظر سے جائز ثابت کیا جائے اخلاقی معیار کے بلند ہو جانے کی وجہ سے جو اس کی ضرورت پیدا ہوئی اور واقعات مسخ کئے جانے لگے۔ کبھی کبھی یہ فعل ارادی ہوتا ہے

مگر اکثر غیر شعوری۔ اس طرح ریاکاری نیکی کو خراج ادا کرتی ہے اور بداعمالیوں کے ساتھ ایک جھوٹا تقدس شامل ہو جاتا ہے جسے دیکھ کر گھن آتی ہے۔

کسی ملک میں اور خصوصاً ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جس کی تاریخ پیچیدہ اور جس کی تہذیب مخلوط ہے۔ یہ ہر وقت ممکن ہے کہ ایسے رجحانات اور واقعات تلاش کر لئے جائیں جو کسی خاص نظریے کی تائید کرتے ہوں پھر اس نظریے کو مسلم سمجھ کر اس سے من مانے نتائج نکال لئے جاتے ہیں۔

امریکا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگرچہ وہاں بڑی یکسانی ہے اور سب چیزیں مقررہ سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ پھر بھی وہ ایک مجموعۂ اضداد ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس سے کہیں زیادہ اختلافات اور تناقضات ہیں۔ یہاں ہم ایک خیال پہلے سے قائم کرکے اس کی تائید میں جو واقعات ڈھونڈھنا چاہیں جا ملیں گے اور اس طرح خیالات کی ایک پوری عمارت کھڑی ہو جائے گی۔ مگر یہ عمارت غلط بنیادوں پر قائم ہوگی اور حقیقت کی ایک جھوٹی تصویر پیش کرے گی۔

ہندوستان کی عہد جدید کی تاریخ یعنی برطانوی عہد کی کہانی کو آج کل کے واقعات سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ہم اس کی تعبیر میں موجودہ جذبات اور تعصبات سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے انگریز اور ہندوستانی دونوں سے غلطیاں ہونے کا امکان ہے اگرچہ ان کی غلطیاں ایک دوسرے کے برعکس رخ اختیار کرتی ہیں وہ کاغذات اور دستاویزیں جن کی بنا پر تاریخ لکھی جاتی ہے زیادہ تر برطانوی ذرائع سے حاصل ہوتی ہیں لہذا لازمی طور پر برطانوی نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ شکست اور انتشار نے ہندوستانیوں کو اس سے معذور رکھا کہ وہ اپنے نقطہ نظر سے تاریخ کی تدوین کرتے پھر یہ کہ

بیشتر دفاتر ۱۸۵۷ء کے انقلابی معرکے میں تباہ ہو گئے۔ اس غارت سے جو کاغذات بچے وہ لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں چھپا کر رکھے گئے۔ اور نتائج کے خوف سے شائع نہ ہو سکے ان منتشر کاغذات سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ جھینگر اور دوسرے تباہ کرنے والے کیڑے جو اس ملک میں کثرت سے ہیں اُن کو چاٹ گئے۔ آگے چل کر جب اُن میں سے کچھ کاغذات دستیاب ہوئے تو اُنھوں نے بہت سے تاریخی واقعات پر ایک نئی روشنی ڈالی۔ برطانوی مورخین کو بھی ہندوستان کی تاریخ میں کسی قدر ترمیم کرنی پڑی اور تاریخ کا ہندوستانی تصور جو برطانیہ سے بہت سی باتوں میں مختلف تھا قایم ہوا۔ اس تصور کی بنیاد روایات پر اور لوگوں کی ذاتی یادداشت پر تھی جو واقعات لوگوں کو یاد رہ گئے تھے وہ ماضی بعید سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ اس قریبی زمانے سے جس میں ہمارے دادا اور پردادا نہ صرف جیتے جاگتے تماشائی تھے بلکہ اکثر حادثات کے شکار بھی تھے۔ تاریخی سے یہ روایات غیر اہم اور بے قدر سہی مگر ان کی اس اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمیں آج کل کے ہندوستان کے ذہن کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہیں۔ جو شخص برطانوی حکومت کے نزدیک مردود قرار پاتا ہے وہ ہندوستانیوں کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے اور جن لوگوں کو وہ اعزاز و اکرام کا مستحق جانتا ہے انھیں اکثر ہندوستانی قوم فروش اور غدار سمجھتے ہیں۔ ان کے بعد یہ دھبہ ان کی اولاد کے دامن پر رہتا ہے۔

امریکہ کے انقلاب کی داستان انگریزوں اور امریکنوں نے مختلف عنوان سے لکھی ہے۔ اور یہ آج بھی جبکہ پرانے جذبات ٹھنڈے ہو چکے ہیں اور دونوں قوموں میں دوستی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی لکھی ہوئی

تاریخ پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں لینن کی حیثیت انگلستان کے اکثر نامور مدبروں اور سیاست دانوں کے نزدیک ایک لٹیرے اور ظالم کی تھی۔ حالانکہ لاکھوں انسان اُسے نوع انسانی کا نجات دہندہ اور اس زمانے کا سب سے بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ ان مقابلوں سے اُس انتہائی بیزاری کا کچھ خفیف سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو ہندوستانی اس بات پر محسوس کرتے ہیں کہ انھیں مدرسوں اور کالجوں میں انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ ہند پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ تاریخیں ہندوستان کے ماضی کو ہر طرح بدنما ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی محبوب شخصیتوں کو برا بھلا کہتی ہیں اور برطانوی حکومت کے شاندار کارناموں کے گن گاتی ہیں۔

گوپال کرشن گوکھلے نے ایک مرتبہ اپنے لطیف طنزیہ پیرائے میں قدرت کی اس ناقابلِ فہم حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے ہندوستان کا سابقہ برطانوی قوم سے ڈالا خواہ یہ قدرت کی ناقابلِ فہم حکمت ہو تاریخ کے ناگزیر عمل ارتقا کا نتیجہ یا محض اتفاق، بہر حال انگریزوں کے ہندوستان آنے سے دو ایسی قومیں اکٹھی ہوگئیں جو ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں۔ درحقیقت یہ یکجائی محض برائے نام تھی اس لئے کہ عام طور پر دونوں ایک دوسرے سے کھنچتی رہیں اور ان کا سابقہ محض بالواسطہ رہا۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی ادب اور انگریزی سیاسی تصورات نے اُن تھوڑے سے افراد پر جنھوں نے انگریزی پڑھی تھی کچھ نہ کچھ اثر ڈالا۔ لیکن یہ سیاسی تصورات باوجود اپنی اثر آفرینی کے اُس وقت ہندوستان کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ انگریز جو ہندوستان

آئے سیاسی یا سماجی انقلاب کے حامی نہ تھے بلکہ قدامت پرست تھے اور انگلستان کے سب سے زیادہ رجعت پسند طبقے کی نمایندگی کرتے تھے اور انگلستان اس زمانے میں بعض باتوں کے لحاظ سے یورپ کا سب سے زیادہ قدامت پرست ملک تھا۔ مغربی تہذیب کا ہندوستان میں گویا ایک ترقی پذیر سماج اور عصر جدید کی روح کا ایک جامد سماج سے ٹکرانا تھا جو عہد وسطیٰ کے طریق فکر کی پابند تھی یہ جامد سماج خواہ اپنے رنگ میں کتنی ہی ترقی یافتہ اور شایستہ کیوں نہ ہو اپنی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ مگر تعجب کی بات ہے جو لوگ اس تاریخی عمل کے ذمہ دار تھے۔ وہ نہ صرف اپنی ذمہ داری سے بے خبر تھے بلکہ مجموعی طور پر وہ اس کو پورا بھی نہیں کرتے تھے۔ انگلستان میں اُن کے طبقے نے اس تاریخی عمل کی مزاحمت کی لیکن جن قوتوں سے اُن کا مقابلہ تھا وہ اتنی زبردست تھیں کہ اُن کے روکے نہیں رک سکتی تھیں۔ ہندوستان میں اُن کا راستہ صاف تھا اور وہ اس تغیر اور ترقی کو روکنے میں کامیاب ہو گئے جس کے ایک لحاظ سے وہ خود ہی محرک تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں اُن جماعتوں کو شہ دی اور تقویت پہنچائی جو سماجی حیثیت سے رجعت پسند تھیں اور اُن سب لوگوں کی انتہائی مخالفت کی جو سیاسی یا سماجی ترقی کی کوشش کرتے تھے اگر کوئی تبدیلی اور ترقی ہوئی تو اُن کی مخالفت کے باوجود اُن کی دوسری سرگرمیوں کے اتفاقی اور ضمنی نتیجے کے طور پر ہوئی۔ دخانی انجن اور ریل کا استعمال عہد وسطیٰ کے نظام کو بدلنے کی طرف ایک بہت بڑا قدم تھا لیکن اس سے خود ان کا مقصد اپنی حکومت کو استحکام بخشنا اور ملک کے اندرونی حصوں کے استحصال میں سہولت پیدا

کرنا تھا۔ برطانوی حکام کی اس بالقصد پالیسی میں اور ان نتائج میں جو اس سے بلا قصد پیدا ہو گئے ۔ ایک عجیب تناقض ہے جس سے اُلجھن پیدا ہوتی ہے اور اس پالیسی کی حقیقت نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں تبدیلی مغربی تہذیب کے اثر سے ہوئی لیکن یہ بھی یاد رہے کہ ہندوستان کے انگریزوں نے اپنی طرف سے اس کی پوری مخالفت کی وہ اس انقلاب کی رفتار کو مدہم کرنے میں اس قدر کامیاب ہوئے کہ ہم اب تک ایک عبوری دَور سے گذر رہے ہیں۔

جاگیردار قسم کے لوگ جو انگلستان سے ہندوستان پر حکومت کرنے آئے دنیا کو زمینداروں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے ۔ اُن کے نزدیک ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک وسیع جاگیر تھی اور جاگیردار اپنی جاگیر اور رعیت کا بہترین اور قدرتی نمائندہ تھا۔ یہ ذہنیت اُس کے بعد بھی کارفرما رہی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک بہت بڑی رقم کے بدلے جو ہندوستان کو ادا کرنا پڑی اپنی یہ جاگیر برطانوی حکومت کے حوالے کر دی۔ اس طرح ہندوستان کا ملکی قرضہ شروع ہوا۔ یہ ہندوستان کی قیمت تھی جو برطانیہ کے عوض خود ہندوستان نے ادا کی اب ہندوستان کی برطانوی حکومت زمیندار یا زمیندار کی کارندہ بن گئی دراصل وہ اپنے آپ کو ہندوستان تصور کرنے لگی بالکل اسی طرح جیسے ڈیون شائر کے ڈیوک کو اس کے ہم رتبہ ڈیون شائر سمجھتے ہیں۔ وہ کروڑوں آدمی جو ہندوستان میں بستے تھے گویا زمیندار کے اسامی بن گئے جو زمینوں کا لگان دیتے تھے اور جاگیری نظام کو قدرت کا بنایا ہوا نظام سمجھ کر اپنی حیثیت پر قانع تھے۔ اُن کے لئے اس نظام کی مخالفت کرنا گویا کائنات کے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی

اور مشیت الٰہی سے سرتابی تھی۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کا یہ مابعدالطبیعی تصور ابھی تک بنیادی طور پر نہیں بدلا ہے البتہ اس کا اظہار دوسرے طریقے سے ہوتا ہے۔ وہ پرانا طریقہ کہ کاشتکاروں سے کھلم کھلا گلا دبا کر زیادہ سے زیادہ لگان وصول کیا جاتا تھا بدل گیا ہے۔ اب دوسری اور زیادہ پیچ دار ترکیبوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ زمیندار کو اپنے کاشتکار سے شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اس کے مفاد کو پیش نظر رکھنا چاہیئے یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ کاشتکاروں میں جو لوگ سب سے زیادہ وفادار ہوں اُن کو جاگیر کے نظم و نسق میں ادنیٰ عہدہ داروں کی حیثیت سے شریک کرنا چاہیئے۔ لیکن زمینداری کے نظام کی مخالفت کسی طرح برداشت نہیں کی جا سکتی اگر کوئی زمینداری یا ریاست ایک شخص کے ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے تب بھی اس انتظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے۔ جب ایسی صورت پیش آتی ہے تو یہ شرط کر لی جاتی ہے کہ ریاست کے سب وفادار ملازم اپنے عہدوں پر رہیں زمیندار کے پرانے اور نئے دوستوں اور اس کے حوالی موالی کو گذارے دیئے جائیں۔ پنشن خواروں کو پنشن ملتی رہے اور خود سابق زمیندار ریاست کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتا رہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان کو برطانوی مفاد کے تابع سمجھنے کا احساس اعلیٰ عہدیداروں میں جو تقریباً سب کے سب انگریز تھے بہت زیادہ تھا۔ یہ آگے چل کر ان لوگوں کی ایک مربوط اور متحد جماعت بن گئی جس کو انڈین سول سروس

کہتے ہیں۔ ایک انگریز مصنف کا قول ہے کہ یہ "دنیا کا سب سے زیادہ
مضبوط اور منظم ٹریڈ یونین ہے" سول سروس کے ارکان اپنے زعم
میں ہندوستانی کشتی کے ناخدا تھے بلکہ وہ خود ہندوستان تھے اور
ہر بات جو اُن کے مفاد کے خلاف ہو لازمی طور پر ہندوستان کے حق
میں مضر تھی۔ انڈین سول سروس کے ذریعے سے اور تاریخ اور حالات
حاضرہ کی اُس تعبیر کے ذریعے سے جو برطانوی قوم کے سامنے پیش کی
جاتی تھی یہ خیال اس کے مختلف طبقوں میں مختلف حد تک پھیل گیا۔
ظاہر ہے کہ حکمراں طبقہ تو اس سے پورے طور پر متفق تھا مگر مزدوروں
اور کسانوں پر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر پڑا، اور خود اپنے ملک میں محکومی
کی زندگی بسر کرنے کے باوجود وہ برطانوی مقبوضات اور برطانوی سلطنت
پر فخر کرنے لگے۔ یہی مزدور یا کسان جب ہندوستان آتا تو لازمی طور
پر حکمراں طبقے کا ایک فرد بن جاتا۔ اسے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب
سے متعلق واقفیت نہ تھی اور وہ ہندوستان کے انگریزوں کی عام
ذہنیت کو اختیار کر لیتا تھا اس لئے کہ اس کے پاس کوئی اور معیار
نہ تھا جس سے وہ کام لیتا۔ زیادہ سے زیادہ اُس کے دل میں ہندوستان
کی بہی خواہی کا ایک مبہم سا جذبہ پیدا ہوتا مگر ماحول کے اثر سے وہ ایک
مقررہ دائرے کے اندر محدود رہتا۔ ایک صدی تک یہ ذہنیت برطانیہ
کے ہر طبقے میں سرایت کرتی رہی اور اس نے قریب قریب ایک قومی
ورثے کی حیثیت اختیار کر لی یہ تصور اس قدر راسخ ہو گیا تھا کہ وہ
ہندوستان کو اس کی روشنی میں دیکھتے تھے اور غیر محسوس طور پر خود اپنے
ملک کے مسائل کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنے لگے ہمارے زمانے میں

وہ عجیب و غریب جماعت جو نہ کوئی مقررہ معیار اور اصول رکھتی ہے اور نہ
بیرونی دنیا کے مسائل سے واقف ہے ، یعنی برطانوی لیبر پارٹی کے لیڈر
عام طور پر ہندوستان کے موجودہ نظام کے زبردست حامی رہے ہیں
بعض اوقات اس صریح تضاد کی وجہ سے جو انھیں اپنی خانگی پالیسی اور استعماری
پالیسی میں اپنے قول اور عمل میں نظر آتا ہے اُن کے دل میں ایک خلش سی پیدا
ہوتی ہے ۔ مگر چونکہ وہ اپنی اس حیثیت کو مقدم سمجھتے ہیں کہ وہ مصلحت شناس
عملی آدمی ہیں ۔ اس لئے اپنے ضمیر کی آواز کو سختی سے دبا دیتے ہیں عملی آدمیوں
کو لازمی طور پر اپنے عمل کی بنیاد جانی بوجھی مروجہ پالیسی اور موجودہ حالات پر
رکھنی پڑتی ہے وہ یہ نہیں کر سکتے کہ محض اصول کی خاطر یا نا آزمودہ نظریے
کی بنا پر آنکھ بند کر کے ایک نامعلوم راستے پر چل کھڑے ہوں ۔ وائسرائے جو
سیدھے انگلستان سے آتے ہیں اس پر مجبور ہیں کہ انڈین سول سروس پر اعتماد
کریں اور اس کے سانچے میں ڈھل جائیں ۔ چونکہ اُن کا تعلق انگلستان میں حکومت
کرنے والے جاگیردار طبقے سے ہوتا ہے اس لئے انھیں انڈین سول سروس
کے عام نقطہ نظر کو اختیار کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اور چونکہ ان کو
وہ مطلق العنانی حاصل ہوتی ہے جس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نظر نہیں
آتی اس لئے ان کا سارا طور طریقہ غیر محسوس طور پر بدل جاتا ہے ۔ اقتدار
انسان کے اخلاق کو بگاڑتا ہے اور اقتدار مطلق تو اسے بالکل ہی چوپٹ
کر دیتا ہے ۔ جو اقتدار مطلق اتنے زیادہ لوگوں پر ہندوستان کے وائسرائے
کو ملا ہے وہ اس وسیع دنیا میں نہ کسی کو میسر ہوا اور نہ ہے ۔ جس شان سے
وائسرائے گفتگو کرتا ہے نہ انگلستان کا وزیر اعظم کر سکتا ہے اور نہ امریکہ کا
پریسیڈنٹ اس کا مدِ مقابل اگر کوئی تھا تو ہٹلر تھا ۔ اور ایک وائسرائے پر

کیا موقوف ہے اُس کی کونسل کے برطانوی ممبر، گورنر، مختلف محکموں کے سکریٹری، ضلعوں کے مجسٹریٹ سب کا یہی حال ہے۔ وہ اس بلند مقام سے بولتے ہیں جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اُن کو نہ صرف یہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ صحیح ہے بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لوگ اسے صحیح ماننے پر مجبور ہیں۔ ان سے کمتر درجہ کی مخلوق اپنے دل میں جو چاہے سمجھے انھیں اس کی پروا نہیں۔ اس لئے کہ وہ قوت اور اقتدار، عظمت اور جلال کے مالک ہیں۔

والسرائے کی کونسل کے کچھ ممبر انگلستان سے براہ راست نامزد ہوتے ہیں اور اُن کا تعلق انڈین سول سروس سے نہیں ہوتا۔ عام طور پر ان لوگوں کا طرز عمل اور طرز گفتگو سول سروس والوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ان کو مقررہ نظام کے ماتحت کام کرنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن برتری اور تحکم کا وہ بے تکلف انداز جو سول سروس والوں کا حصہ ہے اختیار نہیں کر سکتے۔ اب رہے کونسل کے ہندوستانی ممبر (جو ابھی چند سال سے مقرر ہونے لگے ہیں) تو اُن کے لئے یہ اور بھی مشکل ہے۔ یہ غریب چاہے قابلیت اور تعداد میں انگریز ممبروں سے کم نہ ہوں۔ دراصل بد فضول ہیں داخل ہیں۔ سول سروس کے ہندوستانی عہدہ دار بھی خواہ کسی درجے کے کیوں نہ ہوں اس طلسمی حصار سے باہر ہیں۔ ان میں سے بعض انگریزوں کی نقل کی ناکام کوشش کرتے ہیں مگر کچھ مضحک سے بن کر رہ جاتے ہیں۔

آئی۔ سی۔ ایس کے انگریز عہدہ داروں کی نئی نسل میرے خیال میں طبیعت اور سیرت کے لحاظ سے اپنے پیشروؤں سے کسی قدر مختلف ہے وہ پُرانے نظام میں اچھی طرح نہیں کھپتے۔ لیکن اقتدار اور پالیسی پُرانے لوگوں کے

ہاتھ میں ہے اور نئے لوگ اس پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ۔ یا تو انہیں بزرگوں کا دین قبول کرنا پڑتا ہے یا (جیساکہ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے) استعفادے کر اپنے وطن کو لوٹ جاتے ہیں ۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن کے زمانے میں وہ اخبارات جو انگریزوں کی ملکیت میں تھے سرکاری بیانات اور خبروں سے بھرے ہوتے تھے ۔ ان میں سرکاری عہدیداروں کے تقرر، تبادلے اور ترقی کی خبریں اور انگریزی سوسائٹی کی مصروفیات پولو، گھوڑدوڑ، ناچ اور ناٹک تھیٹروں کا ذکر ہوتا تھا ۔ ہندوستان کے لوگوں اور ان کی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی، اقتصادی زندگی کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا جاتا تھا ۔ ان اخباروں کے پڑھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ ہندوستان میں ہندوستانی بھی رہتے ہیں ۔

بمبئی میں کواڈر، بنگولر، کرکٹ میچ، چار ٹیموں میں ہوا کرتے تھے، ہندو مسلمان، پارسی اور یوروپین ۔ یوروپین ٹیم بمبئی "پریسیڈنسی" کہلاتی تھی باقی لوگ محض ہندو مسلم اور پارسی یعنی بمبئی کی نمائندگی دراصل یوروپین کرتے تھے اور سب لوگ گویا باہر کے تھے اور صرف کرکٹ کھیلنے کے لئے بمبئی والوں میں شمار کرلئے گئے تھے یہ میچ اب بھی ہوتے ہیں اگرچہ آج کل ان کے بارے میں بڑی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں اور یہ کہا جارہا ہے ۔ کہ ٹیموں کا انتخاب مذہب کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہیئے ۔ میرا خیال ہے کہ غالباً "بمبئی پریسیڈنسی" کا نام اب یوروپین ٹیم سے ہے ۔

ہندوستان میں انگریزی کلب عام طور پر علاقوں کے نام سے موسوم ہیں، جیسے بنگال کلب ۔ الہ آباد کلب وغیرہ ۔ ان میں صرف برطانوی ہی قوم کے لوگ یا یوں کہنا چاہیئے کہ یوروپین لوگ داخل ہوسکتے ہیں ۔ اس

قسم کے نام رکھنا یا اپنے خاص کلب بنانا جس میں دوسرے لوگ داخل نہ ہو سکیں کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ لیکن اس قسم کے ناموں سے انگریزوں کی اس پرانی عادت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو حقیقی ہندوستان، حقیقی بنگال یا حقیقی الہ آباد سمجھتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان کے نزدیک محض طفیلی ہیں۔ اور اگر اپنی حد کے اندر رہیں تو خاصے مفید ہیں ورنہ سخت تکلیف دہ۔ اسی طرح کلب میں ہندوستانیوں کو داخل کرنا دراصل نسلی تعصب پر مبنی ہے۔ ورنہ اگر صرف اتنا ہوتا کہ کچھ ہم مذاق لوگ اپنی فرصت کے وقت میں کھیل تفریح اور بات چیت کے لئے مل کر بیٹھتے ہیں اور نا جنسوں کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے تو بالکل جائز تھا۔

میں ذاتی طور پر اس کے خلاف نہیں کہ انگریزوں اور یوروپینوں کے مخصوص کلب ہوں جن میں دوسرے لوگ نہ لئے جائیں اور میرے خیال میں کوئی ہندوستانی ان میں داخلہ پسند نہ کرے گا۔ لیکن جب اس بیگانگی کی بنیاد نسلی تعصب پر ہو اور حکمراں نو ہر موقع پر اپنی برتری اور دوری کا اظہار کرے تو معاملے کی صورت بدل جاتی ہے۔ بمبئی میں ایک مشہور کلب ہے جس میں اس کی اجازت نہیں تھی اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اب بھی نہیں ہے کہ کوئی ہندوستانی (بجز نوکر کی حیثیت کے اور کسی حیثیت سے) مہمانوں کے کمرے میں بھی قدم رکھ سکے چاہے وہ کسی ریاست کا حکمراں ہو یا کارخانوں کا مالک۔

ہندوستان میں یہ نسلی تقابل دراصل انگریز اور ہندوستانی کا نہیں ہے۔ یوروپین اور ایشیائی کا ہے۔ ہندوستان میں ہر یوروپین خواہ وہ جرمن ہو، پول ہو یا رومانوی ہو خود بخود حاکم نسل کا ایک فرد بن جاتا ہے۔

ریل کے ڈبوں پر، اسٹیشن پر آرام کرنے کے کمروں پر باغوں میں بیٹھنے کی بنچوں پر ہر جگہ "صرف یورپینوں کے لئے" موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوتا ہے۔ جنوبی افریقہ یا اورکہیں بھی یہ تفریق کچھ خوشگوار نہیں ہے مگر اپنے ہی ملک میں اس کو برداشت کرنا بڑی ذلت اور افسوس کی بات ہے اور ہماری غلامانہ حیثیت کو یاد دلاتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ نسلی تفوق شہنشاہی تکبر کے ان مظاہر میں رفتہ رفتہ کچھ تبدیلی ہو رہی ہے۔ لیکن یہ عمل بہت سست رفتار ہے۔ اور اکثر مثالیں اس کے سطحی ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ سیاسی دباؤ، اور قومی تحریک کی شدت اس طرز عمل کو بدلنے پر مجبور کرتی ہے اور ایک نسلی امتیاز اور تکبر کو کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر پھر بھی جب یہ قومی تحریک کسی بحرانی منزل میں پہنچتی ہے اور اس کو کچلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت تمام سامراجی اور نسلی تکبر اپنی انتہائی ہیبت ناک صورت میں عود کر آتی ہے۔

انگریز ایک ذکی الحس قوم ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب وہ دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو ان پر ایک عجیب بے حسی کا عالم چھا جاتا ہے۔ اور ہندوستان میں جہاں حاکم اور محکوم کے تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں دقتیں پیش آتی ہیں یہ بے حسی خاص طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ انداز خاص کرکے اختیار کیا گیا ہے۔ وہ جس چیز کو دیکھنا چاہیں اس کو دیکھیں اور جس چیز کو نظر انداز کرنا چاہیں اس کو نظر انداز کردیں لیکن واقعات سے تغافل برتنے سے وہ معدوم نہیں ہو جاتے۔ جب وہ جھنجھوڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں تو انگریز اس غیر متوقع صورت حال پر بہت برہم ہوتے ہیں اور انھیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھیں دھوکا دیا گیا۔

ذات پات کے اس ملک میں انگریزوں اور انڈین سول سروس والوں نے ایک نئی ذات پیدا کی ہے جس کے بندھن سخت ہیں اور جس میں کوئی باہر والا شریک نہیں ہوسکتا سچ پوچھئے تو سول سروس کے ہندوستانی ممبر بھی اس برادری کے باہر ہوتے ہیں باوجود اس کے کہ اُن کے سینوں پر اس کا تمغۂ امتیاز آویزاں ہے۔ اور وہ اُس قواعد کے پابند ہیں۔ اس ذات کے لوگوں کے دلوں میں اپنی عظمت اور برتری کا احساس تک مذہبی عقیدہ بن گیا ہے اور اس عقیدے کے گرد روایات کا ایک حصار بن گیا ہے۔ جو اس کی حفاظت کرتا ہے۔ عقیدہ ذاتی مفاد کے ساتھ مل کر بہت طاقت ور بن جاتا ہے اور اگر جہاں کسی نے اُسے ٹوکا قہر و غضب کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔

۲۔ بنگال کی لوٹ

انگلستان میں صنعتی انقلاب پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے

سترھویں صدی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغل شہنشاہ کی طرف سے سورت میں تجارتی کوٹھی بنانے کی اجازت مل گئی تھی چند سال کے بعد اُنھوں نے جنوب میں ایک قطعۂ زمین خریدا اور مدراس کی بنیاد ڈالی گئی ۱۶۶۲ء میں جزیرہ بمبئی چارلس دوم کو پرتگالیوں کی طرف سے بطور جہیز کے ملا تھا اور اس نے اس کو کمپنی کے نام منتقل کر دیا ۱۶۹۰ء میں شہر کلکتہ کی بنیاد رکھی گئی اس طرح سترھویں صدی کے آخر تک برطانیہ نے ہندوستان میں کئی جگہ ساحل بحر پر قدم جما لیا اور وہ آہستہ آہستہ اندر کی طرف بڑھے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی میں ایک وسیع رقبہ پہلی مرتبہ اُن کے ہاتھ آیا۔ اور چند ہی سال میں بنگال،

بہار اور اُڑیسہ اور مشرقی ساحل پر اُن کا قبضہ ہو گیا۔ پھر ایک بہت بڑا قدم تقریباً چالیس برس بعد انیسویں صدی کے آغاز میں اُٹھایا گیا اور وہ دہلی تک جا پہنچے۔ تیسرا اہم اقدام ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی آخری شکست کے بعد ہوا اور چوتھا ۱۸۴۹ء میں جب سکھوں سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوا اور برطانوی ہند کا نقشہ مکمل ہو گیا۔

اس طرح انگریز مدراس پر تین صدی سے کچھ زیادہ سے اور بہار، بنگال وغیرہ پر ۱۸۰ سال سے قابض ہیں۔ انھوں نے اپنی سلطنت کو جنوب کی طرف اب سے تقریباً ۱۴۵ برس پہلے وسعت دی صوبجات متحدہ، صوبجات متوسط اور مغربی ہند میں تقریباً ۱۲۵ سال پہلے قدم جمائے۔ وہ پنجاب کی طرف ۹۵ سال پہلے بڑھے (یہ بات جون ۱۹۴۴ء میں لکھی جا رہی ہے) مدراس کے شہر کو جو ایک مختصر سا رقبہ ہے نظر انداز کر کے دیکھئے تو بنگال اور پنجاب پر اُن کا قبضہ ہونے کے زمانوں میں کم و بیش ایک صدی کا فرق ہے۔ اس عرصے میں برطانوی حکمت عملی اور انتظامی طریقے تیزی سے بدلتے رہے۔ یہ تبدیلیاں کچھ تو انگلستان میں نئی تحریکوں کے پیدا ہونے اور کچھ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مستحکم ہو جانے کی وجہ سے واقع ہوئیں۔ ہر نئے حاصل کئے ہوئے رقبہ کے ساتھ انگریزوں کا سلوک ان کی بدلتی ہوئی پالیسی کے مطابق مختلف تھا۔ اور اس میں اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا وہ حکمراں قوت جس نے انگریزوں سے شکست کھائی کون ہے۔ چنانچہ بنگال میں جہاں فتح آسانی سے میسر آئی تھی مسلمان زمیندار طبقہ حاکم اور با اقتدار طبقہ تصور کیا گیا۔ اور ایسی حکمتِ عملی اختیار کی گئی جس سے اُن کی طاقت توڑی جا سکے ادھر پنجاب میں حکومت سکھوں سے چھینی گئی تھی اور ابتدا میں مسلمانوں اور انگریزوں میں

کوئی مخالفت نہ تھی ہندوستان کے بیشتر حصے میں مرہٹے انگریزوں کے حریف اور مد مقابل رہے تھے ایک اہم حقیقت جو صریحی طور پر نظر آتی ہے یہ ہے کہ ہندوستان کے جو حصے برطانوی حکومت کے زیر سایہ سب سے زیادہ عرصے تک رہے ہیں وہی آج سب سے زیادہ غریب ہیں۔ در حقیقت ایک ایسا نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے جس میں برطانوی حکومت کی مدت اور افلاس کی زیادتی کا تناسب دکھایا جا سکے۔ چند بڑے شہر یا نئے وجود میں آنے والے صنعتی مرکز کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے جو بات قابل غور ہے وہ عوام کی حالت ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ اور مدراس پریسیڈنسی کے کچھ حصے ہندوستان کے غریب ترین خطے ہیں۔ پنجاب میں عوام کا معیار زندگی مقابلتہً بہت بہتر ہے۔ بنگال یقینی طور پر انگریزوں کے آنے سے پہلے بہت دولتمند اور خوشحال خطہ تھا ہو سکتا ہے کہ اس تضاد اور اختلاف کی اور بھی بہت سی وجوہ ہوں۔ لیکن یہ بات آسانی سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ وہی بنگال جو کبھی اس درجہ زرخیز اور خوشحال خطہ تھا ۱۸۷ سال کی برطانوی حکومت کے دوران میں، جس میں کہا جاتا ہے کہ حکومت نے اس کی حالت کو بہتر بنانے اور اس کے باشندوں کو حکومت خود اختیاری کی تربیت دینے کی کوشش کی آج فلاکت زدہ بھوک سے نڈھال سسک سسک کر مرنے والوں سے پٹا پڑا ہے۔

بنگال ہی سب سے پہلے برطانوی حکومت سے پوری طرح فیضیاب ہوا۔ یہ حکومت صریحی غارتگری سے شروع ہوئی اور زرعی لگان کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا گیا جس میں نہ صرف زندہ بلکہ مردہ کسانوں سے بھی ایک ایک کوڑی جھاڑ لی جاتی تھی۔ ہندوستان کے انگریز مورخین

ایڈورڈ ٹامسن اور جی ٹی گیرٹ ہمیں بتاتے ہیں کہ استحصال کا ایک بے پناہ جذبہ جیسا کہ کورٹیز اور پزارو کے زمانے کے ہسپانیہ والوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ انگریزوں کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ خصوصاً بنگال کو اس وقت تک چین نہیں ملا جب تک اس کے خون کا آخری قطرہ نہ چوس لیا گیا۔

اس کے بعد برسوں تک ہندوستان میں انگریزوں کی معاشی بدعنوانیوں کا ذمہ دار کلائیو کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ کلائیو وہ زبردست بانیٔ سلطنت تھا جس کا مجسمہ آج لندن میں انڈیا آفس کے سامنے نصب ہے۔ یہ بدعنوانیاں انتہائی غارتگری کی حد تک پہنچ گئی تھیں۔ بنگال خوب لٹتا رہا، یہاں تک کہ ایک خوفناک تباہ کن قحط اس پر مسلط ہو گیا۔ اس عمل کو تجارت کے نام سے تعبیر کیا گیا مگر اس سے اس کی نوعیت میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ حکومت نام نہاد تجارت تھی اور تجارت، غارتگری۔ اس قسم کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں نایاب ہیں۔ اور یہ بات یاد رہے کہ یہی عمل، مختلف ناموں سے اور مختلف صورتوں میں نہ صرف چند سال جاری رہا بلکہ یہ سلسلہ پشتوں تک چلتا رہا۔ کھلی ہوئی غارتگری بتدریج قانون کے سانچے میں ڈھلتی گئی۔ اب وہ اتنی محسوس نہیں ہوتی تھی مگر حقیقت میں پہلے سے بھی بدتر تھی اس دور میں برطانوی حکام کی رشوت ستانی، اعزاز نوازی، سخت گیری اور روپے کی ہوس اس حد تک پہنچ گئی تھی جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ معنی خیز بات ہے کہ ہندوستانی الفاظ میں سے لوٹ کا لفظ انگریزی زبان میں داخل ہو گیا ایڈورڈ ٹامسن کہتا ہے اور اس کا اشارہ صرف بنگال ہی کی طرف نہیں ہے ہمیں برطانوی ہندوستان کی ابتدائی زمانے کی تاریخ یاد آجاتی ہے جو غالباً دنیا میں حکام کی بددیانتی کی بدترین مثال ہے۔

ان سب چیزوں کا نتیجہ تھوڑے ہی دن میں ۱۷۷۰ء کے قحط کی صورت میں نکلا جس نے بنگال اور بہار کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی کو ختم کر دیا۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا سب ترقی کی خاطر ہوا اور بنگال آج اس بات پہ فخر کرے تو بے جا نہ ہوگا کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب پیدا کرنے کا باعث بڑی حد تک وہی ہے۔ امریکن مصنف بروک ایڈمس ہمیں اس کی صحیح روداد سناتا ہے۔

"ہندوستان کے خزانے نے" نہ صرف قوم کے نقد سرمایہ میں معتدبہ اضافہ کیا اور اس کی قوت کے ذخیرے کو بڑھایا۔ بلکہ اس میں لوچ اور لچک پیدا کر دی اور اس کی حرکت کو بہت تیز کر دیا۔ جنگ پلاسی کے تھوڑے ہی دن بعد، بنگال کی لوٹ لندن پہنچنے لگی اور اس نے فوراً اپنا اثر دکھایا۔ سب مورخ اس پر متفق ہیں کہ صنعتی انقلاب ۱۷۶۰ء میں شروع ہوا .... پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں لڑی گئی اور اس کے بعد تغیرات کا سلسلہ نہایت تیزی سے شروع ہوگیا۔ ۱۷۶۰ء میں Flying shuttle ایجاد ہوا۔ دھات کو پگھلانے کے لئے لکڑی کی جگہ کوئلہ نے لے لی ۱۷۶۴ء میں ہارگریوز نے کاتنے والی کل "جینی" ایجاد کی ۱۷۷۶ء میں کرامپٹن نے ایک اور کاتنے والی کل "میول" کو رواج دیا اور ۱۷۸۵ء میں کارٹ رائٹ نے میکانکی طاقت سے چلنے والے کرگھے کا حق محفوظ کرایا۔ اور ۱۷۶۸ء میں واٹ نے دخانی انجن کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا .... لیکن گو یہ مشینیں زمانہ کی تیز رفتاری کا مظہر تھیں لیکن اس تیز رفتاری کے پیدا کرنے میں انھیں کوئی دخل نہ تھا ایجادات بجائے خود غیر متحرک اور جامد ہوتی ہیں .... وہ اس کی منتظر رہتی ہیں کہ طاقت کا ایک معقول ذخیرہ اُن سے کام لینے کے لئے اکٹھا ہو جائے۔ یہ ذخیرہ ہمیشہ اس روپیے کی صورت میں ہوتا ہے جو ایک جگہ جمع نہ ہو بلکہ حرکت میں رہے۔

ہندوستانی خزانوں کے آنے اور ان کی وجہ سے ساکھ کے بڑھ جانے سے پہلے طاقت کا کافی ذخیرہ موجود نہ تھا۔ غالباً ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی لگے ہوئے سرمایے سے اتنا منافع نہیں ہوا ہوگا جتنا ہندوستان کی لوٹ سے ہوا اس لئے کہ پچاس سال تک اس میدان میں برطانیہ عظمیٰ کا کوئی حریف ہی نہ تھا۔

۴۔ ہندوستان کی صنعت وحرفت کی تباہی

اور اُس کی زراعت کا انحطاط

ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے بڑا مقصد جس کے لئے وہ قایم ہوئی تھی یہ تھا کہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں خصوصاً یہاں کا کپڑا وغیرہ اور مختلف قسم کے مسالے مشرق سے یورپ لے جائے جہاں ان کی بے حد مانگ اور کھپت تھی۔ صنعت کے طریق کار میں انقلاب رونما ہونے کے ساتھ ساتھ سرمایہ داروں کا وہ طبقہ بڑھا جو صنعت میں روپیہ لگا سکتا تھا اور اُس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس پالیسی میں تبدیلی کا مطالبہ کیا وہ چاہتا تھا کہ برطانوی بازار ہندوستان کی مصنوعات کے لئے بند کردیا جائے اور ہندوستان کا بازار برطانوی مال کے لئے کھول دیا جائے برطانوی پارلیمنٹ نے اس نئے طبقے کے اثر سے ہندوستان کے معاملات میں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرز عمل میں زیادہ گہری دلچسپی لینا شروع کردی۔ آغاز اس سے ہوا کہ ہندوستانی مال کا داخلہ برطانیہ میں قانون کے ذریعے بند کردیا گیا۔ اور چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی ہندوستان کے مال کو غیر ممالک میں بھیجنے کی واحد اجارہ دار تھی اس لئے اس قانون نے دوسرے بیرونی دساوروں

کو بھی متاثر کیا۔ اس کے بعد ایک زبردست کوشش ہندوستانی صنعت کو کچل ڈالنے کی مختلف طریقوں سے کی گئی۔ کچھ ایسے محصول اور چنگیاں عائد کر دی گئیں کہ ہندوستانی مال کا ملک کے اندرونی حصے میں بھی آنا جانا رک گیا۔

برطانوی مال کی درآمد پر اس تمام عرصہ میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارچہ بافی کی ہندوستانی صنعت مٹ گئی۔ اس بُننے والوں اور دستکاروں کی ایک بڑی تعداد بیکار ہو گئی۔ اس عمل کی رفتار بنگال اور بہار میں بہت تیز تھی۔ دوسرے مقامات پر بھی رفتہ رفتہ برطانوی حکومت کی توسیع اور ریل کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہی صورت پیش آئی۔ انیسویں صدی کے دوران میں یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس کی زد میں تمام پرانی صنعتیں آتی گئیں۔ مثلاً جہاز سازی، دھات کے کام، شیشہ کا کام، کاغذ سازی اور اسی قسم کی دوسری دستکاریاں۔

پرانی صنعت اور نئے صنعتی طریقِ کار کی ٹکر کا یہ نتیجہ ایک حد تک لازمی تھا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی دباؤ نے اس عمل کو اور تیز کر دیا۔ ہندوستان میں نئے صنعتی طریقوں کو رواج دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ اس میں ہر طرح سے رکاوٹ ڈالی گئی۔ ملک کا معاشی اور اقتصادی ارتقاء روک دیا گیا اور نئی صنعت کی نشو و نما کو ختم کر دیا گیا۔ ہندوستان میں باہر کی مشینیں نہیں آ سکتی تھیں۔ اس طرح ایک خلا پیدا کر دیا گیا جس کو برطانوی مال ہی سے پُر کیا جا سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیکاری اور افلاس روز بروز بڑھتا گیا۔ نوآبادیات کے اقتصادی نظام کے ماتحت ہندوستان صنعتی انگلستان کی ایک زراعتی نوآبادی بن گیا جس کا کام کچا مال مہیا کرنا اور انگلستان کی مصنوعات کے لئے بازار پیدا کرنا تھا۔

دستکاروں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے سے بے روزگاری انتہا کو پہنچ گئی۔ سوال یہ تھا کہ وہ لاکھوں کاریگر اب کیا کریں جو اب تک صنعتی مشاغل میں مصروف تھے۔ اُن کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ اُن کے پرانے پیشوں میں کچھ رہا نہیں تھا نئے پیشوں کا دروازہ ان پر سختی سے بند تھا۔ البتہ وہ موت کے آغوش میں پناہ لے سکتے تھے۔ ناقابل برداشت حالات سے نجات پانے کی ایک ہی راہ ہے جو ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔ چنانچہ وہ لاکھوں کی تعداد میں مرکھپ گئے۔ لارڈ بنٹنگ گورنر جنرل ہندوستان نے ۱۸۳۴ء میں کہا تھا تجارت کی تاریخ میں اس مصیبت کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ہندوستان کے میدان جلاہوں کی ہڈیوں سے سفید نظر آتے ہیں۔"

پھر بھی ان میں بہت سے فاقہ کشی کی تکلیف اُٹھانے کے لئے بچ رہے اور جوں جوں برطانوی ملک کے دور دراز گوشوں کو متاثر کرتی رہی اور بے روزگاری بڑھتی گئی۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ دستکاروں اور صناعوں کے گروہ کے گروہ بے کار ہو کر رہ گئے قدیم ہنر اُن کے کسی کام کے نہ تھے۔ آخر اُنھوں نے زمین کی طرف توجہ کی زمین ابھی تک موجود تھی۔ لیکن زراعتی اراضی کا چپہ چپہ گھرا ہوا تھا اور اُس میں اتنی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہ سب لوگ اچھی طرح کھپ جائیں۔ چنانچہ زمین پر بار ہو گئے یہ بار بڑھتا گیا اور اُس کے ساتھ ساتھ ملک کا افلاس بڑھا اور زندگی کا معیار انتہائی پستی کو پہنچ گیا۔ دستکاروں کے مجبوراً کھیتی کی طرف ڈھل جانے سے زراعت اور صنعت کے تناسب میں خلل پڑ گیا۔ اور یہ برابر بڑھتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ زراعت لوگوں کا واحد پیشہ بن گئی۔ اس لئے کہ مزدوری کمانے کی اور راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔

ہندوستان کی آبادی روز بروز دیہات کی طرف ڈھلتی چلی گئی۔ ہر ترقی

کرنے والے ملک کی آبادی پچھلی صدی کے دوران میں زراعت سے صنعت کی طرف اور دیہات سے قصبے اور شہر کی طرف منتقل ہوتی رہی مگر ہندوستان میں برطانوی حکومت کی برکت سے معاملہ برعکس تھا۔ اعداد و شمار اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ کہا جاتا ہے انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی آبادی کا تقریباً ۵۴ فیصدی حصہ زراعت سے روزی کماتا تھا۔ حال ہی میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ تناسب ۷۴ فیصدی تک پہنچ گیا ہے یہ اعداد و شمار جنگ سے پہلے کے ہیں۔ ہرچند کہ دوران جنگ میں صنعتی پیشے اور ملازمتیں بڑھیں لیکن ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں مجموعی آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے زراعت پر گزر کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی چند بڑے شہروں کو دیکھ کر جو چھوٹے چھوٹے شہروں کے سٹنے سے بنے ہیں ایک سطحی مشاہدہ کرنے والا دھوکا کھا جاتا ہے اور اس کے ذہن میں ہندوستانی حالات کا ایک غلط تصور قائم ہو جاتا ہے۔

یہ ہے حقیقی اور بنیادی سبب ہندوستان کے باشندوں کے ہیبت ناک مفلسی کا جو اس کی مقابلتہً حال ہی کی پیداوار ہے۔ دوسرے حالات جو اس میں مدد دیتے ہیں درحقیقت اسی افلاس اور فاقہ کشی کا لازمی نتیجہ ہیں یعنی بیماری اور جہالت۔ آبادی کا حد سے زیادہ ہو جانا ایک بدنصیبی ہے اور جہاں ضروری ہو وہاں اس کی روک تھام لازمی ہے۔ لیکن ہندوستان کی آبادی اب بھی بہت سے صنعتی ملکوں سے کم گنجان ہے۔ یہ آبادی حد سے زیادہ صرف اس لحاظ سے سمجھی جاتی ہے کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے ایک مناسب اقتصادی نظام کے ماتحت اس تمام آبادی کو کارآمد بنایا جا سکتا ہے اور یہ ملک کی دولت میں معتدبہ اضافے کا باعث ہو سکتی ہے۔

سچ پوچھیئے تو گھنی آبادی صرف چند حصّوں میں ہے جیسے بنگال یا گنگا کی وادی سے ہے ورنہ اب بھی بڑے بڑے رقبوں میں بہت چھدری آبادی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ برطانیہ کی آبادی ہندوستان کے مقابلے میں دگنی گنجان ہے۔

صنعت و حرفت کا بحران تیزی سے بڑھتا رہا اور زراعت میں بھی ایک مستقل بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ آراضی روز بروز چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔ زرعی قرضہ کا بار بڑھتا گیا اور زمین کی ملکیت ساہوکاروں کی طرف منتقل ہوتی گئی۔ زمین سے محروم مزدوروں کی تعداد میں لاکھوں کروروں کا اضافہ ہوگیا۔ ہندوستان ایک صنعتی سرمایہ دارانہ حکومت کے ماتحت تھا۔ لیکن اس کی معیشت تک جاگیری عہد کے طرز کی تھی اس پر طرّہ یہ ہے کہ وہ بہت سے دولت آفریں عناصر سے جو جاگیری نظام میں موجود ہونے میں محروم تھا۔ غرض وہ جدید صنعتی نظام کا تختہ مشق بن کر رہ گیا۔ آسے اس نظام کے نقصانات تو اٹھانے پڑے مگر اس کے فائدوں سے محروم رہا۔ جو راہ قبل صنعتی معیشت سے سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کی طرف جاتی ہے وہ بہت دشوار گزار ہے اور اس میں قوموں کو بڑی سخت تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ خصوصاً ابتدائی دور میں جب کہ اس تغیر کے لئے پہلے سے کوئی تیاری نہیں ہوتی تھی۔ اور اس کے خراب نتائج کو کم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی ہر چیز انفرادی جد وجہد پر چھوڑ دی گئی تھی۔ تبدیلی کے اس دور میں انگلستان میں یہ مصیبت تھی تو ضرور مگر بحیثیت مجموعی اتنی زیادہ نہ تھی اس لئے کہ تبدیلی بہت جلد ہوئی اور جو لوگ بے کار ہوگئے تھے وہ تھوڑے ہی دنوں میں نئی صنعتوں میں کھپ گئے لیکن اس کے یہ

معنی نہیں کہ اس تبدیلی کی قیمت انسانی مصائب کی شکل میں ادا نہیں کی گئی قیمت تو پوری پوری دینی پڑی مگر دوسری قوموں خصوصاً ہندوستان کے لوگوں کو قحط اور موت اور بے روزگاری کی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی یورپ میں صنعتی تبدیلی کی قیمت کا بار ہندوستان، چین اور دوسری نوآبادیات جن کی معیشت یورپ کی طاقتوں کے اثر میں تھی اُٹھانا پڑا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ہمیشہ صنعتی ترقی کے لئے کافی مسالہ موجود رہا ہے یعنی فنی اور انتظامی قابلیت ہوشیار کاریگر اور وہ تھوڑا بہت سرمایہ جو اس دولت کے کچھ کر باہر چلے جانے کے باوجود باقی تھا۔ ایک مورخ مانٹگمری مارٹن نے جو ۱۸۴۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک تحقیقاتی کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا "ہندوستان صرف زراعتی ملک نہیں بلکہ ایک صنعتی ملک بھی ہے۔ اور جو لوگ اسے محض زراعتی ملک بنانے کے درپے ہیں وہ اس کو گرا کر تہذیب کے ادنیٰ درجے پر پہنچانا چاہتے ہیں" ہندوستان میں انگریز بالکل یہی کرنا چاہتے تھے اور برابر اس کی کوشش کرتے رہے اور کامیابی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈیڑھ سو سال کی استبدادی حکومت میں اُنھوں نے ہندوستان کی کیا حالت کر دی ہے۔ جب سے ہندوستان میں جدید صنعت کو ترقی دینے کا مطالبہ شروع ہوا (میرے خیال میں اسے کوئی سو سال ہو گئے) ہم سے برابر یہی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان نمایاں طور پر ایک زراعتی ملک ہے اور اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ زراعتی رہے۔ صنعتی ترقی سے ممکن ہے کہ توازن خراب ہو جائے اُس کے خاص کام یعنی زراعت کو نقصان پہنچ جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ برطانوی کارخانوں کے مالکوں اور معاشیات کے ماہروں کو ہندوستانی کاشتکار کی اس قدر فکر رہتی ہے۔ ان کی اس بہی خواہی

اور برطانوی حکومت ہند کی شفقت اور محبت کو دیکھتے ہوئے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، کہ تقدیر کی گردش نے یا کسی فوق الفطرۃ قوت نے اس کے نیک ارادوں اور کوششوں کو پورا نہیں ہونے دیا۔ اور ہندوستان کا کاشتکار دنیا کا سب سے زیادہ مفلس اور مصیبت زدہ انسان بن کر رہ گیا۔

اب ہندوستان میں صنعتی ترقی کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے لیکن اب بھی اگر اس کا کوئی دور رس اور وسیع منصوبہ سوچا جاتا ہے تو ہمارے برطانوی بہی خواہ، جو ہم پر برابر نصیحتوں کی بوچھاڑ کرتے رہتے ہیں، ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ زراعت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ بلکہ سب سے مقدم سمجھا جائے۔ بھلا کوئی ہندوستانی، جس میں ذرا سی بھی سمجھ ہو زراعت کی طرف سے غافل ہو سکتا ہے یا کسان کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ ہندوستانی کسان ہی تو دراصل ہندوستان ہے اور اسی کی فلاح اور بہبود پر ہندوستان کی ترقی منحصر ہے۔ لیکن ہماری زراعت کی ابتری صنعت کی ابتری سے وابستہ ہے اور اسی کا نتیجہ ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے جدا سمجھیں اور ان پر الگ الگ غور کریں۔ ان میں جو عدم تناسب پیدا ہو گیا ہے اس کا دور کرنا نہایت ضروری ہے۔

جدید ترقی کی جو صلاحیت ہندوستان میں ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب کبھی اسے کسی صنعت کے قائم کرنے کا موقع ملا اس نے اس میں کامیابی حاصل کی۔ اور یہ کامیابی ہندوستان کی برطانوی حکومت اور انگلستان کے سرمایہ داروں کی شدید مخالفت کے باوجود ہوئی۔ پہلا حقیقی موقع اسے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کی جنگ میں میسر آیا جب برطانوی مال کی درآمد رک گئی۔ اس موقع سے پورا پورا فائدہ تو اس سے نہیں

اُٹھایا جا سکا کہ برطانوی پالیسی سد راہ تھی مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا۔ تب سے حکومت پر برابر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ان رکاوٹوں کو دور کرکے جو ارباب غرض نے پیدا کر رکھی ہیں ہندوستان کی صنعت کے بڑھنے میں مدد دے۔ بظاہر حکومت نے اسے اپنی پالیسی کے طور پر قبول کر لیا مگر دراصل وہ ہر صنعت خصوصاً بنیادی صنعتوں کے نشو و نما کو روکتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء کے آئین میں اس کی تصریح کر دی گئی کہ ہندوستان کی قانون ساز جماعت ان مستقل حقوق میں دست اندازی نہیں کر سکتی جو برطانوی صنعت کو ہندوستان میں حاصل ہیں۔ جنگ سے پہلے کے چند سال میں بار بار بڑی بنیادی صنعتیں قائم کرنے کی کوشش کی گئی مگر سرکاری پالیسی نے ایک نہ چلنے دی سرکاری مزاحمت کی حیرت انگیز مثالیں اس موجودہ جنگ میں نظر آئیں جب کہ پیداوار کے بڑھانے کی بہت سخت ضرورت تھی۔ یہ شدید ضرورت بھی انگریزوں کے دل سے ہندوستانی صنعت کی مخالفت دور نہ کر سکی۔ اس کے باوجود حالات کے تقاضے نے ہندوستانی صنعت کو ترقی دی لیکن جتنی ترقی ہو سکتی تھی یا دوسرے ملکوں میں ہوئی اُس کے مقابلے میں موجودہ ترقی کچھ بھی نہیں۔ پہلے ہندوستانی صنعت کی نشو و نما کی براہ راست مخالفت کی جاتی تھی۔ اب اس کے بجائے بالواسطہ مزاحمت کے طریقے برتے جاتے ہیں جو اتنے ہی موثر ہیں۔ اسی طرح کھلم کھلا خراج لینے کی جگہ اب چنگی اور آب کاری کے محصول، مالیات اور سکے کی پالیسی سے کام لیا جاتا ہے اور ہندوستان کا پیٹ کاٹ کر برطانیہ کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔

کسی قوم کا عرصہ تک محکومی کی زندگی بسر کرنا اور آزادی سے محروم رہنا بہت سی خرابیوں کا باعث ہوتا ہے لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ

اس کا اخلاق بگڑ جاتا ہے اور اس کی روح کچل جاتی ہے۔ اس روحانی پستی کا پورا پورا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے چاہے یہ بالکل صریحی کیوں نہ ہو اس کے مقابلے میں معاشی انحطاط کا جائزہ لینا اور اس کا اندازہ کرنا زیادہ آسان ہے۔ جب ہم ہندوستان میں برطانیہ کی اقتصادی پالیسی پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ غربت، اس پالیسی کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ یہ افلاس کوئی پُراسرار چیز نہیں ہم اس کے اسباب معلوم کرسکتے ہیں اور اس بات کا پتہ چلاسکتے ہیں کہ کون سے واقعات تھے جنھوں نے ہمیں رفتہ رفتہ اس حالت کو پہنچادیا۔

۴۔ ہندوستان پہلی مرتبہ کسی دوسرے ملک کا سیاسی اور معاشی ضمیمہ بنتا ہے

ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قیام ہندوستان کے لئے ایک انوکھا حادثہ تھا۔ آج تک جتنے بیرونی حملے ہوئے تھے یا اور سیاسی اور معاشی تبدیلیاں ہوئی تھیں، اُن کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں۔ ہندوستان اس سے پہلے بھی کئی بار فتح کیا گیا لیکن ہمیشہ فاتح اقوام یہیں رس بس گئیں اور یہیں کی ہورہیں (بالکل اُسی طرح جیسے نارمن لوگوں نے انگلستان میں یا مانچو قوم نے چین میں)۔ کبھی اس کی آزادی نہیں گئی تھی۔ کبھی وہ غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑا گیا تھا۔ یعنی کسی ایسے سیاسی اور معاشیاتی نظام سے منسلک نہیں کیا گیا تھا جس کا مرکز ثقل ملک سے باہر ہو۔ وہ کبھی ایسے حاکم طبقے کے ماتحت نہیں رہا تھا جو اول سے آخر تک نسل اور سیرت کے لحاظ سے اس سے بالکل اجنبی رہا ہو۔ سابق حکمرانوں نے خواہ وہ یہیں کے ہوں یا باہر سے آئے ہوں ہندوستان کی سماجی اور معاشی وحدت کو تسلیم کرکے اس میں کھپنے کی کوشش کی وہ ہندوستان

کے رنگ میں رنگ گئے اور انھوں نے اس کی زمین میں جڑ پکڑ لی یہ نئے حاکم
بالکل مختلف تھے۔ ان کا مرکز کہیں اور تھا۔ اُن کے اور عام ہندوستانیوں
کے درمیان ایک وسیع اور ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی۔ اُن کی روایات
مختلف تھیں، اُن کے نقطۂ نظر مختلف تھے۔ ان کی آمدنی میں اور طرزِ معاشرت
میں بہت فرق تھا۔ شروع میں جو انگریز آتے تھے اُن کا انگلستان سے قطع
تعلق سا ہو جاتا تھا اور وہ ہندوستانیوں کے رہن سہن کے طریقے اختیار
کر لیتے تھے۔ لیکن یہ میل جول کا محض ایک سطحی طریقہ تھا جب انگلستان اور
ہندوستان میں آمد و رفت زیادہ سہل ہو گئی تو یہ بھی بالقصد ترک کر دیا گیا۔ یہ
محسوس کیا گیا کہ برطانوی حکمراں طبقے کو ہندوستان میں اپنا رعب قائم رکھنے
کے لئے ہندوستان سے الگ تھلگ رہنا چاہیئے اور اپنی ایک علیحدہ برتر
اور بلند دنیا بنانا چاہیئے" الگ الگ دنیائیں تھیں ایک برطانوی حکام
کی، اور دوسری ہندوستان کے کروروں باشندوں کی اور ان میں اگر کوئی
چیز مشترک تھی تو وہ باہمی منافرت کا جذبہ تھا۔ پہلے زمانے میں مختلف نسلیں
ایک دوسرے میں گھل مل جاتی تھیں یا کم سے کم ایک ہیئت اجتماعی کے
اندر کھپ جاتی تھیں اب نسل پرستی کا کلمہ پڑھا جانے لگا۔ اور اس کو اس بات
سے اور تقویت پہنچی کہ غالب نسل کے پاس غیر محدود سیاسی اور معاشی
قوت تھی۔

نئی سرمایہ داری کی بدولت جو عالمی بازار وجود میں آ رہا تھا وہ بہرحال
ہندوستان کے معاشی نظام پر اثر انداز ہوتا۔ گاؤں کا چھوٹا خود کفیل حلقہ
جس میں تقسیم کار پرانے ڈھرے پر چلی آرہی تھی اپنی قدیم ہیئت کو قائم نہیں
رکھ سکتا تھا۔ لیکن جو تبدیلی ہوئی وہ طبعی نشوونما کا نتیجہ نہ تھی [illegible]

ہندوستان کے سماجی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دیا۔ ایک ایسا نظام جسے ہندوستانی سماج کی تائید حاصل تھی، جو اُسی کی نگرانی میں چلتا تھا۔ اور اُس کے تہذیبی ورثے کا ایک اہم جُز بن گیا تھا ایک دم سے ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا نظام مسلط کر دیا گیا جس کی باگ دوسروں کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوستان دنیا کی منڈی سے براہ راست تعلق نہ پیدا کر سکا بلکہ ایک محکوم زراعتی ملک کی حیثیت سے برطانیہ کے اقتصادی نظام کا ضمیمہ بن گیا۔

گاؤں کی جماعت جس پر اب تک ہندوستان کی معیشت کی بنیاد قائم تھی درہم برہم ہوگئی اور اسے معاشی اور انتظامی امور میں کوئی دخل نہ رہا۔ ۱۸۳۰ء میں سر چارلس مٹکاف نے جو ہندوستان کے بہترین برطانوی حکام میں سے تھا ان جماعتوں کا ذکر ذیل کے الفاظ میں کیا تھا جس کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے "دیہاتی جماعتیں چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستیں ہیں جو اپنی کُل ضروریات کی کفیل ہیں اور بیرونی تعلقات سے تقریباً بے نیاز ہیں۔ اور سب چیزیں بدلتی رہتی ہیں مگر یہ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ دیہاتی جماعتوں کا یہ وفاق، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے .... ایک ایسا نظام ہے جس سے یہ سب بہت خوش اور مطمئن ہیں اور سب کو بڑی حد تک آزادی حاصل ہے۔"

دیہاتی صنعتوں کی تباہی نے ان جماعتوں کی کمر توڑ دی صنعت اور زراعت کا توازن بگڑ گیا تقسیم کار کا پرانا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ بے شمار منتشر افراد کو اجتماعی کاموں میں کس طرح کھپایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا حل کرنا بہت دشوار تھا۔ ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ زمینداری کا

طریقہ جاری کر دیا گیا جس نے زمین کی ملکیت کا تصور ہی بدل دیا۔ اب تک جو تصور تھا وہ اجتماعی ملکیت کا تھا۔ زمین سے زیادہ اس کی پیداوار گاؤں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ برطانوی گورنر جو انگلستان کے زمیندار طبقے کے نمائندے تھے۔ اس نظام کو سمجھ نہیں سکے مگر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ دوسری وجوہ کی بنا پر جان بوجھ کر انھوں نے ہندوستان میں ایک ایسا نظام جاری کیا جو انگلستان کی زمینداری سے ملتا جلتا تھا۔ شروع شروع میں انھوں نے مختصر زمانے کے لئے مستاجر مقرر کئے جو لگان اکٹھا کر کے حکومت کو ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ آگے چل کر یہی مستاجر زمیندار بن گئے۔ گاؤں کی پنچایت کو زمین اور اس کی پیداوار پر کوئی اختیار نہ رہا اور یہ دونوں چیزیں زمیندار کی ذاتی ملکیت بن گئیں۔ اس تبدیلی نے گاؤں کی مشترکہ زندگی اور اجتماعی حیثیت کو برباد کر دیا اور امداد باہمی کے اصول پر کام کرنے کا طریقہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔

زمین کے اس طریق ملکیت کا رواج پانا صرف ایک معاشی انقلاب نہ تھا بلکہ اس نے ساری زندگی پر گہرا اثر ڈالا اور ہندوستان کے جماعتی نظام کو جو امداد باہمی پر مبنی تھا درہم برہم کر دیا۔ زمینداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا جو برطانوی حکومت کا بنایا ہوا تھا اور اسی کے ساتھ وابستہ تھا۔ پرانے نظام کے ٹوٹ جانے سے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ غالباً ہندو مسلم مسئلہ کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی۔ زمینداری کا نظام سب سے پہلے بنگال اور بہار میں جاری کیا گیا جہاں بندوبست استمراری کے ماتحت بڑے بڑے زمیندار بنائے گئے۔ بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ یہ طریقہ حکومت کے لئے فائدہ مند نہیں ہے۔ کیونکہ مالگذاری ہمیشہ کے لئے مقرر ہو گئی ہے اور اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں نئے بندوبست ایک معینہ مدت کے لئے کئے گئے۔ اور

مالگذاری میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا۔ بعض صوبوں میں ایک قسم کا رعیت واری نظام قائم کیا گیا۔ اُس انتہائی تشدد کا جو مالگذاری کے جمع کرنے میں برتا گیا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض صوبوں میں خصوصاً بنگال میں پُرانے زمیندار ختم ہو گئے اور نئے لوگوں نے جو تجارت پیشہ اور دولت مند طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ان کی جگہ لے لی۔ اس طرح بنگال ایک ایسا صوبہ بن گیا جس میں زمیندار اکثر ہندو تھے اور کاشتکار زیادہ تر مسلمان۔

برطانوی حکام نے انگلستان کے نمونے پر بڑے بڑے زمیندار زیادہ تر اس لئے کہ بے شمار کسانوں کے بجائے چند افراد سے معاملہ کرنا زیادہ سہل ہے۔ اصل مقصد یہ تھا کہ لگان کا زیادہ سے زیادہ روپیہ کم سے کم وقت میں جمع ہو جائے۔ اگر ایک زمیندار مال گذاری وقت پر داخل نہ کرتا تو وہ ملکیت سے خارج کر دیا جاتا اور فوراً دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ ایسی جماعت پیدا کی جائے جس کا مفاد برطانوی حکومت سے وابستہ ہو۔ برطانوی حکام کے دماغوں پر ہندوستان میں بغاوت ہو جانے کا خوف چھایا ہوا تھا اور اپنے مراسلات میں اس کی طرف بار بار اشارہ کرتے تھے۔ لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل نے ۱۸۲۹ء میں کہا "اگر عام ہیجان اور بغاوت سے محفوظ رہنے کی تدبیر کرنا ضروری تھا تو میں یہ کہوں گا گو استمراری بندوبست اور بہت سی باتوں کے لحاظ سے ناکام رہا مگر اس سے کم ازکم ایک بہت بڑا فائدہ ہے کہ دولت مند زمینداروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو برطانوی حکومت قایم رہنے میں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے اور جسے عوام پر پورا پورا قابو حاصل ہے۔"

اس طرح برطانوی حکومت نے اپنے استحکام کے لئے نئے طبقے

اور مستقل حقوق رکھنے والے گروہ پیدا ہوگئے جو اس حکومت سے وابستہ تھے اور جن کے حقوق و مراعات اُس کے قایم رہنے پر منحصر تھے ۔ زمیندار تھے ، راجہ مہاراجہ تھے ، اور مختلف محکموں کے ادنیٰ ملازمین تھے جن کا سلسلہ پٹواری اور گاؤں کے مکھیا سے شروع ہوتا تھا ۔ حکومت کی " اہم ترین شاخیں مال گذاری اور پولیس تھیں ۔ اور ان دونوں کا افسر ہر ضلعے میں کلکٹر یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا جو سارے نظم و نسق کا محور تھا ۔ وہ اپنے ضلع میں ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کرتا تھا ۔ کل انتظامی ، عدالتی ، مالی وظایف اور پولیس کے فرائض اس کے ہاتھ سے انجام پاتے تھے اور اگر کوئی چھوٹی سی ہندوستانی ریاست اس کے علاقے سے ملحق ہوتی تھی تو وہ اُس کا پولیٹیکل ایجنٹ بھی ہوتا تھا ۔

اس کے علاوہ ہندوستانی فوج تھی جو ہندوستانی اور برطانوی سپاہیوں پر مشتمل تھی اس کے افسر سب کے سب انگریز تھے ۔ مختلف موقوں پر خصوصاً ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس کی ازسرِ نو تنظیم کی گئی اور آخر میں انتظامی حیثیت سے برطانوی فوج کے ساتھ نتھی کر دی گئی ۔ اس کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ مختلف عناصر میں توازن قایم رہے اور ان جگہوں پر جو سب سے اہم تھیں برطانوی سپاہی رکھے گئے ۱۸۵۸ء میں فوج کی تنظیم نو کی سرکاری رپورٹ میں ایک فقرہ یہ تھا " سب سے بڑا توازن تو یہ ہے کہ برطانوی فوج کافی تعداد میں موجود ہو ۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کے باہمی توازن کا سوال ہے " ان فوجوں کا اصل کام یہ تھا ملک پر تسلط قایم رکھا جائے ۔ یہ اندرونی حفاظتی فوج کہلاتی تھی اور زیادہ تر برطانوی سپاہیوں پر مشتمل تھی ۔

صوبہ سرحد سے یہ کام لیا جاتا تھا کہ برطانوی فوج کو ہندوستان کے خرچ پر لڑائی کی مشق ہو فیلڈ آرمی (جس میں زیادہ تر ہندوستانی تھے)

دوسرے ملکوں میں جاکر لڑنے کے لئے مخصوص تھی۔ اُس نے برطانیہ کی متعدد سامراجی جنگوں میں حصہ لیا اور اس کا خرچ ہمیشہ ہندوستان کو برداشت کرنا پڑا۔ اس کا خاص اہتمام کیا گیا کہ ہندوستانی فوج کو باقی آبادی سے بالکل علیٰحدہ رکھا جاسکے۔

غرض ہندوستان فتح ہونے، ایسٹ انڈیا کمپنی برطانوی حکومت کی طرف منتقل کئے جانے، برطانوی سلطنت کو برما اور دوسرے ملکوں تک پھیلانے، افریقہ اور ایران کو فوجیں روانہ کرنے اور ملک کو خود ہندوستانیوں سے محفوظ رکھنے میں جو کچھ صرف ہوا وہ سب ہندوستان کو ادا کرنا پڑا صرف یہی نہیں کہ اُسے سامراجی مقاصد کے لئے فوجی اڈے کے طور پر استعمال کیا گیا اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا بلکہ اس سے انگلستان کی برطانوی فوج کے ایک حصے کی ٹریننگ کا خرچ بھی لیا گیا۔ جو مدد خرچ کہلاتا تھا۔

اس کے علاوہ اور بہت سے مصارف جو دراصل برطانیہ کے ذمہ عائد ہوتے تھے ہندوستان سے وصول کئے گئے مثلاً چین اور ایران کے برطانوی سفارت خانے اور قنصل خانے کے اخراجات، انگلستان سے ہندوستان تک تار کا سلسلہ قائم کرنے کی لاگت، بحیرۂ روم کے برطانوی جہازی بیڑے کے خرچ کا ایک حصہ یہاں تک کہ لندن میں سلطان ترکی کی تواضع کے مصارف بھی۔

ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر پر، جو یقیناً بہت اچھی اور ضروری چیز تھی، اندھا دھند روپیہ خرچ کیا گیا۔ حکومت ہند کل لگے ہوئے سرمایہ پر ۵ فیصدی منافع ادا کرنے کی ذمہ دار تھی پھر یہ دیکھنے بھالنے کی کیا ضرورت

تھی کہ کون سا سامان ضروری ہے اور کون سا غیر ضروری۔ مال سارا کا سارا انگلستان سے خریدا جاتا تھا۔

حکومت کے سول محکموں کے ملازمین پر بھی بے اندازہ خرچ ہوتا تھا۔ بڑی بڑی تنخواہوں کے عہدے یورپ والوں کے لئے مخصوص تھے حکومت کی ملازمت میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھانے کی رفتار بہت سست تھی کہیں بیسویں صدی میں جا کر کچھ ہندوستانی بڑے عہدوں پر نظر آنے شروع ہوئے مگر اس سے بجائے اس کے کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں سیاسی طاقت آئے برطانوی حکومت اور مضبوط ہو گئی۔ بنیادی عہدے انگریزوں ہی کے ہاتھ میں رہے اور ہندوستانی محض برطانوی حکومت کے کارندوں کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

اس پر طرّہ یہ کہ انگریزوں کے عہد حکومت میں اوّل سے آخر تک جان بوجھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالی جائے اور ایک گروہ کے مقابلے میں دوسرے کی حمایت کی جائے۔ ابتدا میں اس پالیسی کا کھلم کھلا اعتراف کیا جاتا تھا اور سچ پوچھئے تو ایک سامراجی طاقت کے لئے یہ پالیسی اختیار کرنا بالکل قدرتی چیز ہے قومی تحریک کے شروع ہونے کے بعد اس پالیسی نے زیادہ لطیف اور خطرناک صورتیں اختیار کر لیں۔ اگرچہ اب اس سے انکار کیا جاتا تھا لیکن حقیقت میں یہ پالیسی پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے برتی جا رہی تھی۔

آج کل ہمارے جتنے بڑے بڑے مسائل ہیں تقریباً سب کے سب برطانوی حکومت کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اس کی حکمت عملی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ریاستیں، اقلیت کا مسئلہ، مستقل حقوق خواہ ہندوستانیوں کے

ہوں یا غیر ملکیوں کے۔ صنعت کا فقدان، زراعت کی طرف سے بے توجہی، فلاح عامہ کے کاموں کی پس ماندگی اور سب سے بڑھ کر لوگوں کا انتہائی افلاس۔ تعلیم کی طرف جو رویہ رہا وہ بھی قابل غور ہے۔ میٹکاف کی سوانح عمری کا مصنف کے (Kaye) لکھتا ہے "علم کی عام اشاعت کا خوف ایک مزمن مرض بن گیا .... اعیان حکومت پر مالیخولیا کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ سوتے جاگتے ڈراؤنے خواب دیکھنے لگے جن میں چھاپے خانے اور انجیل کے خیالی پیلشر ان کو ہیبت زدہ کر دیتے تھے۔ خوف سے اُن کی بوٹی بوٹی کانپتی تھی اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان دنوں ہماری پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو انتہائی جہالت اور تاریکی کی حالت میں رکھیں رعایا میں، خواہ وہ برطانوی ہند کی ہو یا ریاستوں کی، علم کی روشنی پھیلانے کی جتنی کوششیں کی گئیں ان کو حکومت نے نہایت ناپسند کیا اور ان کی شدید مخالفت کی۔"

شہنشاہیت کو اسی انداز پر چلنا چاہیئے ورنہ وہ شہنشاہیت ہی نہیں رہتی موجودہ اقتصادی سامراج نے معاشی لوٹ کی نئی صورتیں نکالی ہیں جو پہلے زمانے میں کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھیں۔ انیسویں صدی میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں جو کچھ کیا اُس کو پڑھ کر ایک ہندوستانی کو یقیناً کوفت ہوتی ہے، اور غصہ آتا ہے مگر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ برطانوی قوم ہم سے بہت سی باتوں میں برتر ہے خصوصاً اس معاملے میں کہ وہ ہماری کمزوری اور نااتفاقی سے فائدہ اُٹھانا خوب جانتی ہے۔ وہ قوم جو کمزور ہو اور زمانے کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گویا اپنے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے اور سچ پوچھئے تو اپنے سوا کسی کو الزام نہیں دے سکتی۔ اگر ان حالات میں برطانوی

سامراج اور اس کے نتائج قدرتی سلسلہ حوادث کی کڑیاں تھیں تو اس کی مخالفت میں قومی تحریک نشو و نما کا ابھرنا اور پھر دونوں میں تصادم ہونا بھی ناگزیر تھا۔

۵۔ ہندوستانی ریاستی نظام کی نشو و نما

ہندوستان کے موجودہ مسائل میں ایک بڑا مسئلہ ریاستوں کا ہے ہندوستانی ریاست بھی دنیا میں ایک انوکھی چیز ہے۔ یہ ریاستیں اپنے رقبے کے اور سیاسی اور سماجی حالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں ان کی مجموعی تعداد چھ سو ایک ہے ان میں سے تقریباً پندرہ بڑی ریاستیں کہی جا سکتی ہیں جیسے حیدرآباد، کشمیر، میسور، ٹراونکور، بڑودہ، گوالیار، اندور، کوچین، جے پور، جودھ پور، بیکانیر، بھوپال اور پٹیالہ۔، پھر کچھ اوسط درجے کی ریاستیں ہیں اور ان کے علاوہ کئی سو چھوٹے چھوٹے علاقے ہیں جن میں اکثر نقشے پر سوئی کی نوک کے برابر معلوم ہوتے ہیں۔

ان ننھی ننھی ریاستوں میں سے اکثر کاٹھیا واڑ، مغربی ہندوستان اور پنجاب میں ہیں یہ ریاستیں صرف رقبے ہی کے لحاظ سے اس قدر مختلف نہیں کہ کوئی فرانس کے برابر ہے اور کوئی ایک اوسط درجے کے کسان کی آراضی کے برابر۔ بلکہ ہر بات میں مختلف ہیں۔ میسور صنعتی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ میسور، ٹراونکور اور کوچین تعلیم میں برطانوی ہند سے بہت آگے ہیں لیکن اکثر ریاستیں بہت پس ماندہ ہیں اور بعض میں جاگیری نظام کا دور دورہ ہے سب کی سب استبدادی حکومتیں ہیں۔ اگرچہ بعض نے منتخب ممبروں کی کونسلیں بنائی ہیں لیکن ان کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ ریاست حیدرآباد جو سب

سے بڑی ریاست ہے، ابھی تک جاگیری نظام کے ماتحت حکومت کر رہی ہے اور اس کی رعایا شہریت کے حقوق سے تقریباً محروم ہے۔ یہی حال راجپوتانے اور پنجاب کی ریاستوں کا ہے۔ شہری آزادی کا فقدان ریاستوں کی مشترک خصوصیت ہے یہ ریاستیں مسلسل رقبوں کی صورت میں واقع نہیں ہیں بلکہ سارے ہندوستان میں بکھری ہوئی ہیں۔ گویا چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جو برطانوی ہند کے سمندر سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی اکثریت ایسی ہے جو معاشی حیثیت سے کسی حد تک بھی خودکفیل نہیں ہے بڑی سے بڑی ریاست بھی اپنے محل وقوع کی بنا پر آس پاس کے علاقوں کے تعاون کے بغیر کام نہیں چلا سکتی۔ اگر کسی ریاست اور باقی ہندوستان میں معاشی معاملات میں تصادم ہو تو وہ ریاست محصول درآمد برآمد اور دوسرے معاشی ذریعوں کے ذریعے سے آسانی سے دبائی جا سکتی ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ چھوٹی ریاستیں تو ایک طرف بڑی سے بڑی ریاست بھی سیاسی اور معاشی حیثیت سے باقی ہندوستان سے الگ کر کے قائم بالذات نہیں سمجھی جا سکتی۔ ایسی صورت میں ریاستوں کی زندگی محال ہو جائے گی اور باقی ملک کو بھی بہت نقصان پہنچے گا۔ گویا ہندوستان کے بیچ میں جابجا دشمن علاقے ہوں گے۔ اور اگر انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے کسی بیرونی طاقت کا سہارا ڈھونڈا تو یہ بجائے خود آزاد ہندوستان کے لیے ایک شدید اور مسلسل خطرہ ہوگا۔ اگر سارا ہندوستان سیاسی اور معاشی اعتبار سے ایک ہی حکمراں قوت کے ماتحت نہ ہوتا اور وہ ریاستوں کی محافظ نہ ہوتی تو یہ اب تک باقی نہیں رہ سکتی تھیں۔ ریاستی اور غیر ریاستی ہندوستان کے اختلافات سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو ریاست کے مطلق العنان حکمراں اور اس کی رعایا

میں بھی ایک مستقل کشمکش موجود ہے اور رعایا کی طرف سے جمہوری حکومت کا مطالبہ جاری ہے آزادی حاصل کرنے کی یہ کوششیں برطانوی طاقت کی مدد سے دبائی اور روکی جاتی ہیں

سچ پوچھیئے تو انیسویں صدی میں ان ریاستوں کا وجود تاریخی حیثیت سے بے محل تھا۔ موجودہ حالات میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان بیسیوں خود مختار علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے صرف یہی نہیں کہ سیاسی اعتبار سے ان میں آپس میں مسلسل کشمکش رہے گی بلکہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق معاشی اور تہذیبی ترقی ناممکن ہو جائے گی یہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ انیسویں صدی کے شروع میں جب ان ریاستوں کی تشکیل ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے ان کے معاہدے ہوئے اس وقت یورپ بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ متعدد لڑائیوں اور انقلابوں کی بدولت یورپ کا نقشہ بدل گیا اور آج بھی بدل رہا ہے۔ مگر ہندوستان بیرونی حکومت کے دباؤ سے پتھر کی طرح جامد ہو کر رہ گیا اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے پائی۔ یہ ایک مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے کہ جو عہد نامے آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے عموماً دوران جنگ میں یا اس کے فوراً بعد حریف فوجوں کے سپہ سالاروں یا اُن کے سرداروں میں ہوئے تھے اُن کو پیش کر کے یہ کہا جائے کہ یہ عارضی سمجھوتہ ہمیشہ کے لئے جاری رہنا چاہیئے ظاہر ہے کہ اس سمجھوتے میں ریاست کے باشندوں کی رائے شامل نہ تھی اور فریق ثانی اس زمانے میں ایک تجارتی شرکت تھی جسے صرف اپنے منافع سے غرض تھی۔ یہ تجارتی شرکت یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی شاہ برطانیہ یا

پارلیمنٹ کی نمایندہ نہ تھی بلکہ نظری حیثیت سے شہنشاہ دہلی کی نائب تھی جو قوت اور اختیار کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا حالانکہ خود ایک عضو معطل تھا۔ برطانوی بادشاہ یا پارلیمنٹ کو عہدناموں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ پارلیمنٹ ہندوستان کے معاملات پر صرف اس وقت غور کرتی تھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا چارٹر اُس کے سامنے وقتاً فوقتاً بحث کے لئے پیش ہوا کرتا تھا۔ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں اُن اختیارات کو برت رہی تھی جو اسے مغل بادشاہ کے عطا کئے ہوئے منصب دیوانی کی رُو سے حاصل تھے اس لئے وہ برطانوی بادشاہ یا پارلیمنٹ کی بلا واسطہ مداخلت سے آزاد تھی۔ البتہ پارلیمنٹ اس طرح بالواسطہ دخل دے سکتی تھی کہ جب چارٹر تجدید کے لئے اس کے سامنے پیش ہو تو اسے منسوخ کردے یا کمپنی پر نئی قیود عاید کردے یہ خیال کہ بادشاہ یا پارلیمنٹ نظری حیثیت سے بھی دہلی کے برائے نام شہنشاہ کی نائب یا ماتحت سمجھی جائے انگلستان میں ناپسند کیا جاتا تھا اس لئے برطانوی پارلیمنٹ خاص کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں سے بے تعلق رہی۔ ہندوستان کی لڑائیوں میں جو روپیہ خرچ ہوا ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان سے وصول کیا اور جس طرح چاہا صرف کیا۔

آگے چل کر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات بڑھے اور اس کی حکومت کو استحکام ہوا تو برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ ۱۸۵۸ء میں غدر کے جھٹکے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ہندوستانی مقبوضات برطانیہ کے حوالے کردئیے اور اس کی قیمت ہندوستان سے وصول کی۔ اس انتقال حکومت میں ریاستیں بھی شامل تھیں۔ ان کے متعلق کوئی جداگانہ معاملہ نہیں ہوا۔ سارا ہندوستان

ایک اکائی تصور کیا گیا اور برطانوی پارلیمنٹ حکومت ہند کے توسط سے ، جیسے ریاستوں پر اقتدار اعلیٰ حاصل تھا ہندوستان پر حکومت کرنے لگی ۔ ریاستوں کے برطانوی بادشاہ یا پارلیمنٹ سے کوئی جداگانہ تعلقات نہ تھے ۔ وہ اس نظام کے اجزا کی حیثیت رکھتی تھیں جو بالواسطہ اور بلاواسطہ سلطنت ہند کے ماتحت تھا ۔ اس حکومت نے ، اپنی بدلتی ہوئی پالیسی کے لحاظ سے جب چاہا پرانے عہدناموں کو نظر انداز کر دیا اور اس اقتدار اعلیٰ کو جو اُسے ریاستوں پر حاصل تھا بہت موثر طریقے سے برتا ۔

اس طرح ہندوستانی ریاستوں کو تاج برطانیہ سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ ابھی تھوڑے ہی دن کی بات ہے کہ ریاستوں کی طرف سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ کسی حد تک آزاد ہیں اور حکومت ہند کے علاوہ تاج برطانیہ سے بھی کچھ تعلقات رکھتی ہیں ۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کے عہد نامے بہت کم ریاستوں سے ہیں ۔ صرف چالیس ریاستیں عہدنامے والی ریاستیں کہلاتی ہیں ۔ باقی کے پاس اسناد یا اقرار نامے ہیں ۔ ان چالیس ریاستوں میں ہندوستان کی ریاستی آبادی کا تین چوتھائی حصہ رہتا ہے اور اس میں سے چھ ایسی ہیں جن کی مردم شماری کل آبادی کے ½ سے زیادہ ہے [۱]

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں پہلی مرتبہ اُن تعلقات کا الگ

---

[۱] یہ چھ مندرجہ ذیل ہیں ۔ حیدر آباد ، آبادی تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ ۔ میسور چھہتر لاکھ ، ٹراونکور ۶۵ لاکھ ۔ بڑودہ چالیس لاکھ ۔ کشمیر تیس لاکھ ۔ گوالیار تیس لاکھ ۔ کل میزان تقریباً تین کروڑ ساٹھ لاکھ اور ہندوستانی ریاستوں کی مجموعی آبادی تقریباً ۹ کروڑ ہے ۔

الگ ذکر کیا گیا جو برطانوی پارلیمنٹ ہندوستانی ریاستوں اور بقیہ ہندوستان سے رکھتی ہے۔ ریاستوں کو حکومت ہند کی نگرانی سے علحدہ کر کے براہ راست وایسرائے سے وابستہ کر دیا گیا۔ جس کا لقب اس حیثیت سے تاج نمائندہ قرار دیا گیا اس کے ساتھ ساتھ وایسرائے بدستور حکومت ہند کا افسر اعلیٰ رہا۔ حکومت ہند کا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ جو ریاستوں کے معاملات کا ذمہ دار تھا۔ اب براہ راست وایسرائے کا ماتحت کر دیا گیا اور اُسے ایگزیکٹیو کونسل سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

یہ ریاستیں کیسے وجود میں آئیں؟ کچھ تو بالکل نئی ہیں جن کو انگریزوں نے قایم کیا ہے۔ کچھ سلطنت مغلیہ کے صوبے تھے جن کو انگریزوں نے باجگذار کی حیثیت سے باقی رہنے دیا۔ بعض ان سرداروں خصوصاً مرہٹوں کے علاقے تھے جن کو برطانوی فوجوں نے شکست دے کر باجگذار بنا لیا۔ تقریباً سب ریاستیں برطانوی عہد کے آغاز میں قائم ہوئیں۔ اس سے پہلے تاریخ میں ان کا وجود نہ تھا۔ اگر ان میں سے کچھ ایک زمانے میں خودمختار رہیں تو یہ خودمختاری کی مدت بہت مختصر تھی اور کسی جنگ سے یا بعض جنگ کے خوف سے ختم ہوگئیں معدودے چند ریاستیں جن میں سے اکثر راجپوتانہ میں ہیں مغلوں کے عہد سے پہلے کی ہیں۔ ریاست ٹراونکور ایک ہزار سال سے مسلسل چلی آرہی ہے کچھ راجپوت خاندان جنھیں اپنی شرافت پر ناز ہے اپنا شجرہ نسب قبل تاریخی دور کے سورماؤں سے ملاتے ہیں مہارانا اودے پور (سورج بنسی) کا سلسلۂ نسب اس قدر قدیم ہے کہ شہنشاہِ جاپان میکاڈو کے سوا اور کسی کا نسب نامہ اس کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ راجپوت سردار مغلوں کے باجگذار بن گئے پھر انھوں نے مرہٹوں کی اطاعت قبول کی اور آخرکار

برطانوی اقتدار کے آگے سر جھکا دیا۔ ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے "اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمایندوں نے والیان ریاست کو تقویت پہنچائی اور اس ابتری سے نکالا جس میں وہ پھنسے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں یہ بے چارے ایسے بے کسی اور بے بسی کی حالت میں تھے جو دنیا میں آج تک کسی حکمران کی نہ ہوئی ہوگی۔ اگر برطانوی حکومت دست گیری نہ کرتی تو راجپوت اور مرہٹہ ریاستیں نیست و نابود ہو جاتیں جہاں تک اودھ اور نظام کی ریاستوں کا تعلق ہے اُن کا تو وجود ہی محض مصنوعی تھا۔ کمپنی کی محافظ طاقت نے اُن میں سانس پھونک کر زندگی کا شائبہ پیدا کر رکھا تھا۔"

حیدر آباد، جو موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی ریاست ہے شروع میں بہت چھوٹی تھی۔ اس کی حدود میں دو بار توسیع کی گئی۔ ایک مرتبہ جب انگریزوں نے سلطان ٹیپو کو شکست دی اور دوسری مرتبہ مرہٹوں کی لڑائیوں کے بعد یہ اضافے انگریزوں نے اس شرط پر کرائے کہ نظام ان کے ماتحت رہیں گے۔ بلکہ ٹیپو کی شکست کے بعد پہلے انگریزوں نے اس کے مقبوضات کا ایک حصہ پیشوا کو دینا چاہا مگر اس نے ان شرائط پر لینے سے انکار کر دیا۔

کشمیر کو، جو وسعت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے ایسٹ انڈیا کمپنی نے سکھوں کی جنگ کے بعد موجودہ والی کشمیر کے پردادا کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ ایک زمانے میں انگریزوں نے بدنظمی کے الزام میں مہاراجہ کے اختیارات سلب کر لئے اور براہِ راست حکومت کرنے لگی۔ مگر کچھ دن بعد مہاراجہ کو اس کے اختیارات واپس کر دیئے گئے۔ موجودہ ریاست میسور برطانیہ نے ٹیپو کی لڑائیوں کے بعد قایم کی یہ بھی بہت عرصے تک برطانوی

حکومت میں شامل رہی۔

ہندوستان میں حقیقی خود مختار ریاست صرف نیپال ہے جو ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ اُس کی حیثیت افغانستان کی سی ہے مگر فرق یہ ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ہے سب ریاستیں نظام باجگذاری کے ماتحت تھیں جس میں حقیقی اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں تھے اور رزیڈنٹ یا پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے سے برتے جاتے تھے۔ اکثر والیان ریاست کے وزراء بھی انگریز افسر ہوتے تھے جو زبردستی اُن کے سر منڈھ دیئے جاتے تھے۔ حُسنِ انتظام اور اصلاح کی ساری ذمہ داری والی ریاست پر ہوتی جو انتہائی نیک نیتی کے باوجود (اگرچہ عموماً نہ اس میں نیک نیتی ہوتی تھی نہ قابلیت) ان حالات میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ہنری لارنس نے ۱۸۴۶ء میں ہندوستانی ریاستوں کے نظام کے بارے میں لکھا تھا۔ اگر بدنظمی پیدا کرنے کی کوئی حکمی تدبیر ہے تو یہ ہے کہ ہندوستانی والئ ریاست اور اُس کا وزیر بیرونی فوجی طاقت کے بھروسے پر برطانوی رزیڈنٹ کی نگرانی میں حکومت کرے۔ اگر یہ سب قابل، نیک اور سمجھدار ہوں تب بھی حکومت کا کام اچھی طرح نہیں چل سکتا سچ پوچھئے تو انگریزوں یا ہندوستانیوں میں ایک آدمی بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے جس میں اچھے منتظم کی سب صفات موجود ہوں پھر ایسے تین آدمی کہاں سے آئیں، جو مل جل کر کام کرسکیں۔ اُن میں سے ہر ایک اپنی جگہ جتنی خرابیاں پیدا کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی تعمیری کام کرنے کا ارادہ کرے اور دوسرا اس میں روڑا اٹکا دے تو وہ کچھ نہیں کرسکتا۔

اس سے بھی پہلے ۱۸۱۷ء میں سر ٹامس منرو نے گورنر جنرل کو لکھا

تھا" باجگذار ریاستوں کی مدد کے لئے برطانوی فوج سے کام لینے کے خلاف بہت سے وزنی اعتراضات وارد ہوئے ہیں اس کا قدرتی طور پر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جس ریاست میں ایسی فوج موجود ہو اس کی حکومت کمزور ہو جاتی ہے اور جبر و تشدد سے کام لیتی ہے۔ سماج کے اعلیٰ طبقوں میں شرافت اور دیانت باقی نہیں رہتی اور پوری قوم ذلت اور افلاس میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں بُری حکومت کا علاج عام طور پر یہ ہوا کرتا تھا کہ محل میں خاموشی سے انقلاب ہو جاتا تھا، یا کوئی بغاوت اُٹھ کھڑی ہوتی تھی، یا باہر سے کوئی طاقت آ کر ملک کو فتح کر لیتی تھی۔ لیکن برطانوی فوج کی موجودگی رئیس کو ہر بیرونی اور اندرونی دشمن سے محفوظ رکھتی ہے اور اصلاح کی سب راہیں مسدود کر دیتی ہے۔ وہ آرام طلب ہو جاتا ہے کیونکہ اپنی حفاظت کے لئے دوسروں پر بھروسا کرتا ہے۔ ظالم اور جابر بن جاتا ہے کیونکہ اس کی رعایا خواہ اس سے کتنی ہی نفرت کرے اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ جو ریاست بھی نظام باج گذاری کے تحت میں آتی ہے، اگر اس کا رئیس غیر معمولی طور پر قابل نہ ہو، تو تھوڑے ہی دن میں وہاں کی حالت تباہ ہو جاتی ہے، اور آبادی گھٹنے لگتی ہے .... اگر رئیس بذات خود برطانوی حکومت سے دوستی کا معاہدہ نبھانا بھی چاہتا ہے تو اس کے اعیان ریاست میں سے کوئی نہ کوئی اُسے اس کے توڑنے پر اُکساتا ہے۔ اور جب تک ملک میں حمیت کا جذبہ موجود ہے جس کا یہ تقاضہ ہے کہ بدیسی حکومت کا جوا اُتار کر پھینک دیا جائے۔

اس وقت تک اس قسم کے مشیر لازمی طور پر پائے جائیں گے۔ مجھے ہندوستانیوں کی طرف سے یہ حُسنِ ظن ہے کہ ان میں یہ جذبہ کبھی پوری طرح

سرد نہیں ہوگا۔ اس لئے مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظام باجگذاری ہر جگہ اپنا چکر پورا کرے گا اور جن ریاستوں کی حفاظت کرنا چاہتا ہے ان کو برباد کرکے رکھ دے گا" اس قسم کے احتجاج کے باوجود ہندوستانی ریاستوں میں یہ نظام عائد کیا گیا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ظلم و جبر اور رشوت کا بازار گرم ہو گیا۔ ان ریاستوں کی حکومتیں اکثر بُری بھی ہوتی تھیں لیکن اگر یہ بُری بھی ہو تو بہرحال بالکل کمزور تھیں ۔ اب رہے برطانوی ریزیڈنٹ تو ان میں سے کوئی نہ کوئی مٹکاف کی طرح دیانت دار اور فرض شناس بھی ہوتا تھا لیکن اکثر ایسے ہوتے تھے جن میں دونوں باتیں مفقود ہوتی تھیں۔ قحبہ عورتوں کی طرح ان کے ہاتھ میں قوت تو تھی مگر ان پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ مہم جو انگریز اپنے نسلی تفوق اور حکام کی حمایت کے زعم میں ریاست کا روپیہ دل کھول کر برباد کرتے تھے ۔ ان ریاستوں میں خصوصاً حیدرآباد اور اودھ میں انیسویں صدی کے نصف اول میں جو اندھیر مچا ہوا تھا اس کا ذکر پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اودھ غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے برطانوی ہند میں شامل کر لیا گیا۔

اس زمانے میں برطانوی پالیسی الحاق کے موافق تھی اور ہر بہانے سے ریاستیں سرکار برطانیہ کے حق میں ضبط کر لی جاتیں لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے برطانوی حکومت پر نظام باجگذاری کی قدر و قیمت ثابت کر دی دو ایک چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر ہندوستان کے والیانِ ریاست نہ صرف اس شورش سے علیحدہ رہے بلکہ انھوں نے انگریزوں کو اس کے فرو کرنے میں مدد دی۔ اس وفاداری کی وجہ سے برطانیہ کی پالیسی ان کے ساتھ بدل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اُن ریاستوں کو نہ صرف باقی رکھا

جائے بلکہ اُن کو مضبوط کیا جائے۔ برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے اصول کا اعلان کر دیا گیا اور عملاً حکومتِ ہند کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ نے برابر اُن کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھیں، رئیسوں کو معزول کیا گیا، اور ان کے اختیارات سلب کئے گئے، اور اُن کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وزارت کے عہدوں پر حکومتِ برطانیہ کے ملازموں کو رکھیں۔ اب بھی ریاستوں میں بہت سے وزیر ہیں جو اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے سامنے زیادہ جواب دہ سمجھتے ہیں، بہ نسبت اپنے نام نہاد آقاؤں یعنی رئیسوں کے۔

بعض والیانِ ریاست اچھے ہیں اور بعض بُرے ہیں۔ لیکن جو اچھے ہیں ان کی راہ میں بھی ہر ہر قدم پر رکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔ ایک طبقے کی حیثیت سے وہ لازمی طور پر پسماندہ ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر جاگیری ہے اور اُن کا طرزِ عمل استبدادی۔ البتہ معاملہ حکومتِ برطانیہ سے آپڑتا ہے تو وہ سعادت مندی اور اطاعت شعاری سے کام لیتے ہیں Shelvankar نے بجا طور پر ہندوستانی ریاستوں کا نام "ہندوستان میں برطانیہ کا پانچواں کالم" رکھا ہے۔

۶۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی متضاد کارروائیاں

جب ہم ہندوستان میں برطانوی حکومت کے کارناموں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ہر قدم پر تضاد اور تناقض نظر آتا ہے۔ برطانیہ کے ہندوستان پر قابض ہو جانے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جانے کا راز یہ تھا کہ وہ نئی مشینی صنعتی تہذیب کا ہراول تھا۔ وہ ایک نئی تاریخی قوت کا حامل تھا جو دنیا کو بدل رہی تھی۔ اس طرح وہ ایک زبردست تغیر اور انقلاب کا علم بردار تھا اگرچہ اسے خود اس کی خبر نہ تھی۔ مگر ہندوستان میں اس نے تغیرات کی رو کو جان بوجھ کر روکنے کی کوشش کی۔ وہ صرف اتنی تبدیلی چاہتا تھا کہ اس کی حکومت کی بنیاد مضبوط ہو جائے اور ملک کے معاشی استحصال سے فائدہ

اٹھا سکے۔ ہندوستان کے انگریز حکام کا نقطۂ نظر رجعت پسندانہ تھا کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ خود عموماً زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ اس لئے کہ وہ بالقصد ترقی کو روکنا چاہتے تھے کیوں کہ اس سے ہندوستانی قوم کے قوت پکڑنے اور برطانوی اقتدار کے کمزور ہونے کا امکان تھا عوام کا خوف ان کے فکر و عمل میں برابر کار فرما رہا کیوں کہ نہ وہ اُن سے ملنا چاہتے تھے اور نہ مل سکتے تھے۔ ان کی قسمت میں یہی تھا کہ ایسے لوگوں کے بیچ میں جو ان سے مختلف اور ان کے سخت مخالف ہیں ایک بدیسی حکمران طبقے کی حیثیت سے رہیں۔ یوں تو تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ترقیاں بھی مگر برطانوی پالیسی کی مدد سے نہیں بلکہ اس کی مخالفت کے باوجود حالانکہ ان تبدیلیوں کا محرک جدید مغربی تہذیب کا سابقہ تھا جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کی بدولت میسر آیا تھا۔ انفرادی طور پر انگریز ماہرین تعلیم، مستشرقین اخبار نویسوں، مشنریوں اور دوسرے لوگوں نے ہندوستان میں مغربی تہذیب کو رواج دینے میں بہت اہم حصہ لیا اور اس سلسلہ میں اُنھیں اکثر خود اپنی حکومت سے لڑنا پڑا حکومت کو خوف تھا کہ جدید تعلیم کے پھیلنے کا نتیجہ اس کے حق میں مضر ہوگا اور اس نے اس راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کیں پھر بھی ان قابل اور مخلص انگریزوں کی بدولت جنھوں نے اپنے گرد پُرجوش ہندوستانی طالب علموں کا حلقہ اکٹھا کر لیا تھا۔ انگریزی فکر، ادب اور سیاسی روایات ہندوستان پہنچیں جب میں انگریز کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے کل برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کے باشندے مراد لیتا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ یہ غلط ہے "برطانوی" کا لفظ مجھے پسند نہیں اور پھر یہ بھی پورے مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا اس لئے کہ غالباً اس میں آئرلینڈ والے شامل نہیں امید ہے کہ آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور ویلس کے باشندے میری اس کوتاہی سے درگذر کریں گے۔ ہندوستان میں ان سب کا طرز عمل یکساں رہا ہے اور ان میں کبھی فرق نہیں کیا گیا خود برطانوی حکومت کو بھی، چار و ناچار اپنے نظام حکومت کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے لئے کلرکوں کی تعلیم

کا انتظام کرنا پڑا ظاہر ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے عہدوں کے لئے جو بے شمار آدمی درکار تھے وہ انگلستان سے تو لائے نہیں جا سکتے تھے۔ چنانچہ تعلیم رفتہ رفتہ پھیلی اور اگرچہ یہ بہت محدود اور ناقص تعلیم تھی۔ پھر بھی اس نے ہندوستانی ذہن کے دروازے نئے تصورات اور جاندار خیالات کے لئے کھول دئے اس طرح چھاپے کی مشین بلکہ دراصل ہر قسم کی مشین کو ہندوستانی ذہن کے لئے آتش گیر مادّے کی طرح خطرناک سمجھا جاتا تھا اور اس کے رواج کو روکنے کی کوشش کی جاتی تھی اس خوف سے کہ کہیں بغاوت اور صنعت کو فروغ نہ ہو جائے۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ نظام حیدر آباد نے یورپ کی مشینیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور برطانوی رزیڈنٹ نے ان کے لئے ایک ہوا کش (ایرپمپ) اور ایک چھاپنے کی مشین منگائی۔ جب نظام کا اشتیاق پورا ہو گیا تو یہ چیزیں دوسرے تحائف اور نادر اشیاء کے ساتھ حفاظت سے رکھ دی گئیں۔ لیکن جب کلکتہ میں حکومت کو اس کا علم ہوا تو اس نے رزیڈنٹ کی اس حرکت پر ناخوشی کا اظہار کیا۔ خصوصاً اُسے اس غلطی پر تنبیہہ کی گئی کہ اس نے ایک ہندوستانی ریاست کو چھاپے کی مشین سے روشناس کر دیا۔ رزیڈنٹ نے کہا اگر حکومت کی خواہش ہو تو خفیہ طور پر اس مشین کو توڑ پھوڑ کر بیکار کرا دیا جائے۔ مگر باوجود اس کے کہ حکومت نجی مطبع کھولنے کے خلاف تھی، خود اس کا کام بغیر چھاپے کے نہیں چل سکتا تھا چنانچہ کلکتے، مدراس اور دوسرے مقامات پر چھاپے خانے کھولے گئے۔ پہلا غیر سرکاری چھاپہ خانہ سیرام پور میں عیسائی مبلغوں نے قائم کیا اور پہلا اخبار ۱۷۸۰ء میں ایک انگریز نے کلکتہ سے جاری کیا۔

یہ اسی قسم کی اور تبدیلیاں رفتہ رفتہ ہندوستانی ذہن کو متاثر کرتی رہیں اور اس میں جدیدیت کا شعور پیدا کرتی رہیں۔ یورپ کے خیالات کا بلاواسطہ اثر تو صرف ایک چھوٹے سے طبقے پر پڑا کیونکہ ہندوستان اپنی فلسفیانہ روایات کا دامن پکڑے رہا۔ اور ان کو مغرب کے

فلسفے سے برتر سمجھتا رہا۔ مغرب کا اصل اثر زندگی کے عملی پہلو پر پڑا جس میں یورپ کی فضیلت مسلم تھی۔ نئی صنعت کے نتائج مثلاً ریل گاڑی، چھاپے کی مشینیں دوسری مشینوں کو اور جنگ کے بہترین طریقوں کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ سب چیزیں بالواسطہ اور تقریباً غیر محسوس طور پر پرانے انداز فکر سے ٹکراتی رہیں اور انھوں نے ہندوستان کے ذہن میں ایک کشمکش پیدا کر دی، سب سے زیادہ صریحی اور دور رس تبدیلی پرانے زرعی نظام کا ٹوٹنا اور شخصی ملکیت اور زمینداری کے تصورات کا پیدا ہونا تھا۔ معاشی نظام کی بنا زر پر رکھی گئی۔ زمین قابل فروخت جنس بن گئی۔ رسم و رواج نے جو بندھن باندھ رکھے تھے انھیں زر نے کھول کر رکھ دیا۔"

بنگال میں یہ زرعی، صنعتی، تعلیمی اور ذہنی تبدیلیاں ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بہت پہلے ہوئیں کیونکہ وہ نصف صدی قبل برطانیہ کے قبضے میں آچکا تھا۔ چنانچہ بنگال نے اٹھارویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول میں برطانوی ہندوستان کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ وہ نہ صرف برطانوی حکومت کا مرکز تھا بلکہ اس نے انگریزی پڑھے ہوئے ہندوستانیوں کا پہلا گروہ پیدا کیا، جو برطانوی حکومت کے سائے میں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پھیل گیا۔ انیسویں صدی میں بنگال میں بعض بہت قابل آدمی پیدا ہوئے تہذیبی اور سیاسی معاملات میں بقیہ ہندوستان کی رہنمائی کی اور جن کی کوششوں کا نتیجہ آگے چل کر نئی قومی تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بنگال میں برطانوی حکومت بہت مدت سے تھی اور وہ اس ابتدائی دور کا تجربہ کر چکا تھا۔ جب یہ حکومت زیادہ سخت گیر، جاندار اور تغیر پذیر تھی اور اس نے ہنوز ایک بے لوچ نظام کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ بنگال اس حکومت کو شمالی اور وسطی ہند سے بہت پہلے قبول کر چکا تھا اور اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھال چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی عظیم الشان بغاوت بنگال پر بہت کم اثر انداز ہوئی حالانکہ اس کی پہلی چنگاری ڈم ڈم میں جو کلکتہ کے قریب ہے ظاہر ہوئی تھی۔

برطانوی حکومت سے پہلے بنگال سلطنت مغلیہ کا ایک سرحدی صوبہ تھا، اس کی اہمیت ضرور تھی مگر پھر بھی وہ مرکز سے بالکل علیحدہ اور الگ تھلگ تھا عہد وسطیٰ کے شروع میں عبادت کی بہت سی مسخ شدہ صورتیں، اور تانترک فلسفہ اور رسوم کو بنگال کے ہندوؤں میں بہت فروغ ہوا۔ اس کے بعد کئی ہندو اصلاحی تحریکیں رونما ہوئیں جنھوں نے مقامی رواج اور قانون کو متاثر کیا بلکہ دوسرے علاقوں میں بھی وراثت کے مسلمہ طریقوں میں ایک حد تک تبدیلی پیدا کی چیتن لے، جو ایک جید عالم تھے جذب و عقیدت کی راہ اختیار کی اور ایک نئے وشنو عقیدے کی جو بھگتی پر مبنی تھا، ابتدا کی جس نے بنگالیوں کو بہت متاثر کیا اور وہ ذہن و فکر کی بلندی اور جذبات کی شدت کا ایک عجیب و غریب مجموعہ بن گئے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں بنگال میں محبت اور خدمت کی ان روایات کے حامل ایک اور صوفی منش بزرگ رام کرشن پرم ہنس تھے۔ ان کے نام پر خلق خدا کی خدمت کرنے والوں کا ایک سلسلہ قایم کیا گیا جس نے خیراتی اور سماجی کاموں کی ایک روشن مثال قایم کردی۔ رام کرشن مشن کے لوگ جو قدیم فرانسسکن درویشوں کی طرح خدمت کے جذبے سے معمور گونگوں کی طرح خاموش، نمود و نمائش سے پاک، مستعد اور قابل ہیں اپنے اسپتال اور تعلیمی ادارے چلاتے ہیں اور مصیبت کے وقت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ملکوں میں بھی امدادی کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

رام کرشن قدیم ہندوستانی روایات کے علم بردار تھے۔ ان سے پہلے اٹھارویں صدی میں بنگال میں ایک بلند شخصیت پیدا ہو چکی تھی یعنی راجہ رام موہن رائے وہ قدیم اور جدید علوم کے جامع اور ایک نئے طائب کے آدمی تھے ہندوستانی فکر و خیال اور فلسفہ میں ایک دقیق نظر رکھنے کے علاوہ

راجہ رام موہن رائے سنسکرت، فارسی، عربی کے جید عالم تھے۔ اُس مخلوط ہندو مسلم تہذیب کی پیداوار جو اُس وقت ہندوستان میں تہذیب کے سب طبقوں میں رائج تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ انگریز جو باہر سے آئے ہیں، بہت سی باتوں میں ہم سے اچھے ہیں تو اُن کے ذہن کو جس میں تجسس اور تلاش کا مادّہ بہت تھا، یہ فکر پیدا ہوئی کہ اُن کی تہذیب کی بنیادوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ انھوں نے صرف انگریزی پڑھنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ یونانی، لاطینی اور عبرانی زبانیں بھی سیکھیں تاکہ وہ مغربی تہذیب اور مذہب کے ماخذوں کا پتہ چلا سکیں۔ اُن کو مغربی تہذیب کے صنعتی پہلو اور سائنس کی طرف بھی کافی توجہ تھی اگرچہ اس وقت تک صنعتی تبدیلیاں اس قدر نمایاں نہ تھیں جتنی کہ وہ بعد میں ہوگئیں۔ رام موہن رائے کا ذہنی رجحان فلسفیانہ اور عالمانہ نہ تھا۔ اس لئے لازمی طور پر اُنھیں قدیم ادب کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا فاضل مستشرق Monier Williams مونیر ولیمس اُن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے " غالباً وہ دنیا میں پہلے شخص تھے جنھوں نے سنجیدگی کے ساتھ تقابلی مذہب کا مطالعہ کیا" اس کے باوجود وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ تعلیم کو قدیم متکلمانہ روش سے ہٹا کر جدید راہ پر لگائیں۔ اُس ابتدائی زمانے میں بھی وہ علمی طریق فکر کے حامی تھے اور انھوں نے گورنر جنرل کو ایک خط لکھا تھا جس میں " ریاضی، فلسفۂ طبیعی، کیمیا، تشریح اور دوسرے علوم مفید، " کی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا تھا۔

وہ محض ایک عالم اور محقق ہی نہیں بلکہ دراصل ایک مصلح تھے۔ عمر کے ابتدائی حصے میں اسلام سے اس کے بعد عسائیت سے متاثر ہوئے تھے مگر اس کے باوجود بنیادی طور پر اپنے ہی قدیم عقیدے پر قائم رہے۔

تاہم اُنھوں نے اس عقیدے کی اصلاح کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ وہ تمام بے عنوانیاں جو اس عقیدے میں شامل ہوگئی ہیں دور ہوجائیں۔ ستی کے خلاف جو ایجیٹیشن اُنھوں نے کیا زیادہ تر اسی کی وجہ سے حکومت برطانیہ نے اس رسم کو ممنوع قرار دیدیا۔ ستی، کی رسم کسی زمانے میں بھی زیادہ عام نہ تھی۔ لیکن مرفہ الحال طبقے میں کبھی کبھی اس کی مثالیں دیکھنے میں آتی تھیں۔ شاید ہندوستان میں یہ رسم سیتھی تاتاروں کی لائی ہوئی تھی جن کے یہاں قدیم سے یہ دستور تھا کہ آقا کی موت پر اُس کے ملازم خودکشی کر لیتے تھے۔ سنسکرت کے ابتدائی زمانے کے ادب میں رسم ستی کی مذمت کی گئی ہے۔ اکبر اعظم نے اس رسم کو مٹانے کی انتہائی کوشش کی اور مرہٹے بھی اس کے مخالف تھے۔

رام موہن رائے ہندوستانی اخبارات کے بانیوں میں سے تھے ۱۸۱۸ء سے بہت سے انگریزی اخبار شائع ہو رہے تھے۔ یہ عموماً حکومت پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے اس لئے ان میں اور حکومت میں اختلاف پیدا ہوگیا اور ایک شدید احتساب قائم کر دیا گیا۔ اخبارات کی آزادی کے اولین علم بردار اور اس کا مطالبہ کرنے والے انگریز ہی تھے۔ ان میں جیمس سلک بکنگھم جسے لوگ اب بھی یاد کرتے ہیں۔ ملک سے نکال دیا گیا تھا۔ پہلا اخبار جس کے مالک اور ایڈیٹر ہندوستانی تھے ۱۸۱۸ء میں انگریزی زبان میں جاری ہوا۔ اسی سال سیرام پور کے مشنریوں نے ایک ماہنہ رسالہ اور ایک ہفتہ وار اخبار بنگلہ میں نکالا۔ یہ پہلے صحیفے ہیں جو ایک ہندوستانی زبان میں شائع ہوئے اس کے بعد کلکتہ، مدراس اور بمبئی سے متعدد اخبارات اور رسالے انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں نکلنے لگے۔

اس عرصے میں اخباروں کی آزادی کی جد و جہد شروع ہو گئی تھی۔ جو بہت سے نشیب و فراز دیکھ چکی ہے اور اب تک جاری ہے۔ اسی سال (۱۸۱۸ء) میں مشہور ضابطہ نمبر ۳ نافذ ہوا۔ جس کی رو سے ملزموں کو بغیر عدالت میں پیش کئے ہوئے حراست میں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ ضابطہ آج بھی رائج ہے اور بہت سے لوگ اس سوا سو سال پرانے حکم کی رو سے قید خانوں کی چار دیواری میں زندگی گزار رہے ہیں۔

رام موہن رائے کا تعلق بہت سے اخباروں سے تھا۔ انھوں نے بنگالی اور انگریزی کا ایک مشترک رسالہ نکالا۔ آگے چل کر انھوں ایک ہفتہ وار اخبار فارسی میں، جو اس وقت تک تمام ہندوستان کے مہذب طبقوں کی زبان سمجھی جاتی تھی، جاری کیا تاکہ وہ ملک کے ہر حصے میں اشاعت پا سکے۔ ۱۸۲۳ء میں نئے پریس ایکٹ نے اس اخبار کو ختم کر دیا۔ رام موہن رائے اور اُن کے رفقا نے ان قیود کے خلاف سخت احتجاج کیا اور شاہ انگلستان اور مجلس وزرا کے نام ایک عرضداشت بھیجی۔

رام موہن رائے کی صحافتی جد و جہد کا اُن کی اصلاحی تحریکوں سے گہرا تعلق تھا۔ قدامت پرست طبقوں کو اُن کے ترکیبی اور آفاقی نظریات سے اختلاف تھا۔ اور وہ اکثر اُن مجوزہ اصلاحات کی مخالفت کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ اُن کے بہت سے حامی اور مؤید بھی تھے۔ ان میں ٹیگور کا خاندان بھی تھا جس نے بعد میں بنگال کی نشاۃ ثانیہ میں اہم حصہ لیا۔ رام موہن رائے دہلی کے شہنشاہ کی طرف سے انگلستان بھیجے گئے اور وہاں برسٹل میں ۱۸۳۰ء کے چند سال بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔

رام موہن رائے اور ٹیگور خاندان کے افراد نے انگریزی کا علم نجی طور پر

حاصل کیا۔ اُس وقت تک انگریزی کالج اور اسکول نہ تھے اور حکومت ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دینے کے قطعی طور پر خلاف تھی۔ ۱۷۸۱ء میں حکومت نے کلکتے میں سنسکرت کی تعلیم کے لئے ہندو کالج اور عربی کی تعلیم کے لئے مدرسہ عالیہ قائم کیا۔ ۱۷۹۱ء میں بنارس میں سنسکرت کا ایک کالج قائم ہوا۔ شاید انیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں کچھ مشن اسکول انگریزی میں تعلیم دے رہے تھے۔ ۱۸۲۰ء کے بعد حکومت کے حلقے میں بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھائی جائے لیکن عام طور پر اس خیال کی مخالفت کی گئی۔ پھر بھی تجربہ کے طور پر دہلی کالج اسکول اور کلکتے کے کچھ اداروں کے ساتھ انگریزی جماعتیں شامل کر دی گئیں۔ انگریزی تعلیم کے حق میں قطعی فیصلہ فروری ۱۸۳۵ء میں میکالے کی "یادداشت دربارہ تعلیم" کی صورت میں ہوا۔ کلکتہ میں پریذیڈنسی کالج کا افتتاح کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔

اگر ایک طرف برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دینے میں تامل کر رہی تھی تو دوسری طرف برہمن انگریزوں کو سنسکرت کی تعلیم دینے کے اس سے بھی زیادہ شدت سے مخالف تھے۔ لیکن ان دونوں کی مخالفت کی وجوہات بالکل مختلف تھیں جب سر ولیم جونس جو بہت بڑے عالم اور ماہر لسانیات تھے سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو انھوں نے سنسکرت سیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور معقول معاوضہ پیش کیا لیکن کوئی برہمن بھی اس کے لئے آمادہ نہ ہوا کہ اجنبی غاصب قوم کے فرد کو اس مقدس زبان کی تعلیم دے۔ آخر جونس Jones کو ایک غیر برہمن ویدیا

جو بعض انوکھی اور کڑی شرطوں پر پڑھانے کو تیار ہوا۔ جونس ہندوستان کی قدیم زبان سیکھنے کے لئے اس قدر بے چین تھے کہ انھوں نے ہر شرط کو قبول کر لیا۔ سنسکرت سے انھیں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی خصوصاً قدیم ہندوستانی ڈراما کی دریافت سے انھیں بے حد خوشی ہوئی۔ یورپ نے سنسکرت ادب کے خزانے کی پہلی جھلک ان ہی کی تصانیف اور ترجموں کے ذریعے دیکھی۔ ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونس نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جو بعد میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نام سے موسوم ہوئی۔ ہندوستان پر جونس اور اس جیسے دوسرے یورپی عالموں کا بہت بڑا احسان ہے کہ ان کی کاوش سے اس کا قدیم ادب از سرِ نو دنیا کے سامنے آیا۔ یہ ضرور ہے کہ ہر زمانہ میں اس ادب کے جاننے والے موجود تھے مگر یہ علم چند منتخب لوگوں میں محدود ہوتا جا رہا تھا۔ فارسی کے تہذیبی زبان کی حیثیت سے فروغ پانے کی وجہ سے لوگوں کی توجہ سنسکرت سے ہٹ گئی تھی۔ قدیم نسخوں اور مسودوں کی تلاش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی نامعلوم قابلِ قدر تصانیف دریافت ہوئیں اور جب اس وسیع ادب کا مطالعہ علمی تحقیق کے جدید ناقدانہ طرز سے کیا گیا تو اس کی کچھ اور ہی شان ہو گئی۔

مروجہ ہندوستانی زبانوں کی نشو و نما میں طباعت کے رواج سے بہت بڑی مدد ملی۔ ان میں سے ہندی، بنگلہ، گجراتی، مرہٹی، اردو، تامل اور تلنگی وہ زبانیں تھیں جو نہ صرف عرصہ دراز سے استعمال ہوتی تھیں، بلکہ ان میں ادب کا معقول ذخیرہ تھا۔ ان کی بہت سی کتابیں عوام میں مقبول تھیں تقریباً یہ سب رزمیہ نظمیں یا گیتوں اور اشعار کے مجموعے تھے جن کو آسانی سے حفظ کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت ان زبانوں میں نثر کی کتابیں بہت ہی کم تھیں۔

سنجیدہ تصانیف تقریباً سب کی سب سنسکرت اور فارسی میں ہوتی تھیں اور ہر مہذب آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ ان میں سے کم از کم ایک زبان ضرور جانتا ہوگا۔ یہ "کلاسیکی زبانیں اس قدر حاوی تھیں کہ صوبوں کی مروجہ زبانوں کی ترقی رک گئی تھی۔ جب اخبار اور کتابیں چھپنے لگیں تو ان کلاسیکی زبانوں کا یہ زور ٹوٹ گیا اور صوبائی زبانوں میں بھی نثر کی ترقی شروع ہو گئی۔ عیسائی مبلغوں خصوصاً سیرام پور کے بیپسٹ مشن نے اس عمل میں بہت مدد کی پہلا غیر سرکاری مطبع ان ہی سے قائم کیا اور اُن کی یہ کوشش کہ انجیل کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں نثر میں کیا جائے بہت کامیاب ہوئی۔

اُن زبانوں کا معاملہ تو کچھ دشوار نہ تھا جو پہلے سے مشہور تھیں اور ایک حد تک ترقی کر چکی تھیں لیکن مشنریوں نے ان کے علاوہ بعض چھوٹی چھوٹی غیر ترقی یافتہ زبانوں کو بھی ایک شکل دی اور ان کی قواعد اور لغت مرتب کی۔ اُنھوں نے متمدن پہاڑی اور جنگلی قبائل کی بول چال کو تحریر کا جامہ پہنایا۔ عیسائی مبلغین کا یہ جذبہ کہ انجیل کا ترجمہ ہر ایک ہندوستانی زبان میں کیا جائے ہندوستان کی اکثر زبانوں کی نشو و نما کا باعث ہوا۔ عیسائی مشن کا کام ہندوستان میں عموماً پسندیدہ اور قابل تعریف نہیں رہا۔ لیکن اس سلسلہ میں اور دیہاتی گیتوں اور قصّوں کی تدوین میں یقیناً اس نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو تعلیم کے عام کرنے میں جو تامل تھا وہ ایک حد تک جائز بھی تھا کیونکہ ۱۸۳۰ء ہی میں ہندو کالج کلکتہ کے طلباء کے ایک گروہ نے کچھ سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا تھا یہ یاد رہے کہ اس کالج میں صرف سنسکرت پڑھائی جاتی تھی۔ انگریزی کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ ان کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ کمپنی کے سیاسی اختیارات کی کوئی مناسب حد قائم کی جائے

اور دوسرا یہ کہ تعلیم مفت اور لازمی ہونی چاہیئے۔ مفت تعلیم ہندوستان میں بہت قدیم زمانے سے رائج تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تعلیم روایتی تھی اور کچھ بہت عمدہ اور مفید نہ تھی۔ لیکن اس کے لئے غریب طالب علم کو اُستاد کی ذاتی خدمت کے سوا کچھ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی روایات یکساں تھیں۔

ادھر نئی تعلیم کا رواج قصداً روکا جا رہا تھا اور اُدھر قدیم تعلیم بنگال میں بڑی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ جب بنگال میں برطانوی اقتدار قایم ہوا اُس وقت وہاں بڑی بڑی معافیاں تھیں۔ ان میں سے کچھ ذاتی اور شخصی تھیں۔ لیکن بیشتر اوقاف کی صورت میں اداروں کے لئے مخصوص تھیں۔ پرانی وضع کے بے شمار ابتدائی مدارس اور مکتب اور کچھ اعلیٰ مدارس جن میں فارسی میں تعلیم ہوتی تھی چلتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تیزی سے روپیہ بٹورنا چاہتی تھی تاکہ وہ انگلستان میں اپنے حصہ داروں کو منافع تقسیم کر سکے اور اُس کے ڈائرکٹر برابر آمدنی میں اضافے کا تقاضا کرتے رہتے تھے۔ اس لئے یہ پالیسی قصداً اختیار کی گئی کہ یہ معافیاں ضبط کر لی جائیں۔ اصل فرامین اور اُسناد طلب کی جاتی تھیں اور ظاہر ہے کہ یہ کاغذات یا تو عرصہ ہوا گم ہو چکے تھے یا اُن کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ چنانچہ معافیاں ضبط کر لی گئیں، جو لوگ ان پر قابض تھے وہ نکال باہر کئے گئے اور پرانے مکتب اور مدرسے ان اوقاف سے محروم ہو گئے۔ بہت وسیع علاقہ اس ضبطی کی زد میں آ گیا، اور بہت سے پرانے خاندان تباہ ہو گئے۔ وہ تعلیمی ادارے جو ان معافیوں سے امداد پاتے تھے بند ہو گئے۔ اور بے شمار معلم اور دوسرے ملازمین بے روزگار ہو گئے۔ بنگال کے ہندو اور مسلم جاگیرداروں اور اُن کے متوسلین کی تباہی کا

ایک سبب یہ بھی تھا کہ متوسلین طبقوں کو ختم کر دیا۔ مسلمانوں پر اس کا خاص
طور پر اثر پڑا کیونکہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں جاگیری نظام سے زیادہ
وابستہ تھے اور ان کو ان معافیوں سے زیادہ فائدہ پہنچتا تھا۔ ہندوؤں
کی بڑی تعداد متوسط طبقے کی تھی جو تجارت اور دوسرے پیشوں سے روزی
کماتے تھے۔ ان لوگوں میں حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت
تھی اور انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف بہت جلد توجہ کی وہ برطانوی حکومت
کے لئے بھی مفید تھے اور ادنیٰ ملازموں میں کھپ سکتے تھے مسلمان انگریزی تعلیم سے
بھاگتے تھے اور بنگال میں برطانوی حکام ان سے بدظن تھے ان کو ڈر تھا کہیں حکمراں طبقے کے پڑھے
لکھے لوگ کچھ گڑبڑ نہ کریں۔ اس طرح شروع میں بنگالی ہندو ادنیٰ سرکاری
ملازمتوں کے تقریباً اجارہ دار بن بیٹھے اور سب شمالی صوبوں میں پہنچ گئے
آگے چل کر کچھ تھوڑے سے مسلمان بھی جو بڑے خاندانوں کی بچی کھچی یادگار تھے
ان ملازمتوں میں لئے جانے لگے۔

انگریزی تعلیم سے ہندوستان کے ذہنی افق کو وسعت حاصل ہوئی،
ہندوستانی انگریزی ادب اور انگریزوں کے آداب و رسوم کی قدر کرنے لگے۔
اور اپنی قدیم معاشرت کے بعض پہلوؤں سے باغی ہو گئے سیاسی اصلاحات
کا مطالبہ روز بروز بڑھنے لگا۔ سیاسی ایجیٹیشن میں نیا متوسط طبقہ جس میں وکیل
وغیرہ شامل تھے پیش پیش تھا۔ یہ ایجیٹیشن زیادہ تر حکومت کے پاس عرضداشتیں
بھیجنے پر مشتمل تھا۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں نے، جو سرکاری ملازمتوں اور آزاد
پیشوں میں تھے، ایک نیا طبقہ بنا لیا جو سارے ملک میں پھیل گیا۔ یہ طبقہ مغربی
فکر اور طریقوں سے متاثر تھا اور عوام سے قریب قریب بالکل علیحدہ اور بے تعلق
۱۸۵۲ء میں کلکتے میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم ہوا۔ یہ انڈین نیشنل

کانگریس کے پیشرؤوں میں سے تھا مگر خود کانگریس پورا ایک قرن گذرنے کے بعد قایم ہوئی یہ بیچ کا زمانہ ۵۸-۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بر پا ہونے، اُس کے فرو ہونے، اور اُس کا خمیازہ بھگتنے میں صرف ہوا۔ اس صدی کے وسط میں بنگال اور شمالی اور وسطی ہند کی حالت میں بین فرق یہ تھا کہ بنگال میں نیا تعلیم یافتہ طبقہ جس کے اکثر و بیشتر افراد ہندو تھے انگریزی ادب اور فکر سے متاثر ہو کر آئینی اصلاحات کے لئے انگلستان سے لو لگائے تھا دوسرے علاقے بغاوت اور انقلاب کے جذبے سے معمور تھے۔

غرض برطانوی حکومت اور مغربی تہذیب کا ابتدائی زمانے میں جو اثر پڑا وہ دوسرے مقامات کے مقابلے میں بنگال میں زیادہ نمایاں ہے۔ زرعی معیشت بدل گئی اور قدیم جاگیردار طبقے قریب قریب ختم ہو گئے۔ اُن پرانے جاگیرداروں کی جگہ نئے زمینداروں نے لی جن کو زمین سے کوئی گہرا روایتی تعلق نہیں تھا اُن میں پرانے جاگیرداروں کی خوبیاں مفقود تھیں مگر اُن کے نقائص موجود تھے۔ کاشتکار قحط اور لوٹ مار کا شکار ہو کر بالکل مفلس ہو گئے۔ دستکار طبقہ بالکل تباہ ہو گیا۔ ان بکھری ہوئی اور ٹوٹی ہوئی بنیادوں پر نئے طبقوں کی تعمیر ہوئی جو برطانوی حکومت کی پیداوار اور اس کے ساتھ وابستہ تھے ایک تو سوداگروں کا طبقہ تھا جو درحقیقت برطانوی تجارت اور صنعت کا دلال اور اس کے خوانِ نعمت کے بچے کھچے ٹکڑوں پر بسر کرتا تھا، دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ جو ادنیٰ سرکاری ملازموں، وکیلوں وغیرہ پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ اپنی ترقی کے لئے انگریزی حکومت کی نظرِ عنایت کے محتاج تھے اور کم و بیش مغربی فکر سے متاثر تھے۔ ان میں ہندو سماج کے سخت قیود، اور قدیم نظامِ معاشرت کے خلاف ایک باغیانہ جذبہ پیدا ہوا۔ لامحالہ اُن کی

نظر انگریزی لبرل تحریک اور انگریزی اداروں کی طرف اُٹھتی تھی۔

یہ وہ اثرات تھے جو بنگال کے اعلیٰ ہندو طبقوں پر پڑے۔ ہندو عوام اُن سے متاثر نہ تھے، ہندو لیڈر بھی شائد ہی کبھی ان عوام کا خیال کرتے ہوں۔ مسلمان گنتی کے چند آدمیوں کو چھوڑ کر مغربی فکر سے بالکل متاثر نہ تھے۔ اور وہ ارادتاً نئی تعلیم سے علیحدہ رہے۔ اقتصادی طور پر وہ پہلے ہی پس ماندہ تھے اب اور بھی ہو گئے۔ انیسویں صدی میں بنگال کے ہندوؤں میں بہت سے غیر معمولی قابلیت کے لوگ پیدا ہوئے مگر اس پورے دور میں ایک بھی قابل ذکر مسلمان لیڈر نظر نہیں آتا۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، ہندو مسلمانوں میں مشکل سے امتیاز کیا جا سکتا تھا۔ دونوں کی عادات میں، رہنے سہنے کے طریقوں میں اور زبان میں کوئی فرق نہ تھا اور دونوں یکساں افلاس اور مصیبت میں گرفتار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سب طبقوں میں مذہبی اور معاشرتی اختلافات اس قدر کم کہیں بھی نہ تھے جتنے بنگال میں۔ شاید ۹۰ فیصدی مسلمان نچلے طبقے کے وہ ہندو تھے جو ہندو مت کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ آبادی کے اعداد و شمار میں مسلمان، ہندوؤں سے کچھ زیادہ تھے آج کل بنگال میں آبادی کا تناسب یہ ہے، ۵۳ فیصدی مسلم، ۴۶ فیصدی ہندو اور ایک فیصدی دوسرے لوگ۔

برطانوی حکومت کے یہ ابتدائی نتائج اور وہ مختلف اقتصادی، سماجی، ذہنی اور سیاسی تحریکیں جو ان سے پیدا ہوئیں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی نظر آتی ہیں مگر نسبتاً کم لیکن دوسرے علاقوں میں یہ جاگیرداری معاشرتی اور معاشی نظام اس طرح قطعی طور پر اور ایک دم سے ختم نہیں ہوا بلکہ تدریجی طور پر۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس نظام نے مغربی اثرات

کے خلاف بغاوت کردی اور کچلے جانے پر بھی کسی نہ کسی حد تک باقی ضرور رہا
شمالی ہند کے مسلمان بنگالی مسلمانوں سے اقتصادی طور پر کہیں زیادہ بلند تھے
لیکن وہ بھی مغربی تعلیم سے دور رہے۔ بہ خلاف اس کے ہندوؤں نے انگریزی
تعلیم آسانی سے قبول کرلی اور وہ مغربی خیالات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے
حکومت کی ملازمت میں اور وکالت وغیرہ میں ہندو مسلمانوں سے کہیں زیادہ
تھے۔ صرف پنجاب میں یہ فرق زیادہ نمایاں نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اٹھا
اور کچل ڈالا گیا مگر بنگال نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ انیسویں صدی میں شروع سے
آخر تک یہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ جو زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل تھا انگلستان کو عقیدت
کی نظر سے دیکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کی مدد اور اس کے ساتھ تعاون کرنے
سے وہ ترقی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ ایک تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع
ہوا۔ بنگلہ زبان نے خاصی ترقی کی اور بنگال کے لیڈر ہندوستان کے سیاسی
لیڈر بن گئے۔ غرض بنگال کے ہندوؤں کے دل انگلستان کی عقیدت سے
اور قدیم سماجی بندھنوں کے خلاف بغاوت سے معمور تھے۔ اس کا ایک دھندلا
سا عکس رابندر ناتھ ٹیگور کے اس پیغام میں دیکھا جا سکتا ہے جو انھوں نے
مئی ۱۹۴۱ء میں اپنی اسیویں سالگرہ کے موقع پر دیا تھا۔ یہ ان کی موت سے
چند ہی مہینے پہلے کی بات ہے۔ وہ کہتے ہیں جب میں گزرے ہوئے زمانے
پر نظر ڈالتا ہوں اور اپنے ابتدائی ارتقا کی تاریخ کو واضح طور پر دیکھتا ہوں تو
اس تبدیلی پر جو میری اپنی نظر میں اور میرے ہم وطنوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی
ہے حیرت سے انگشت بہ دنداں رہ جاتا ہوں۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جس
میں ایک آنے والے شدید المیہ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

بیرونی دنیا سے ہمارا رابطہ انگریز قوم کی تاریخ جدید سے وابستہ ہے

جس سے ہمیں اُس ابتدائی دور میں سابقہ پڑا. نو واردوں کے متعلق ہمارے ذہن میں جو کچھ تصورات قائم ہوئے وہ ان کی قوم کے عظیم الشان ادب کی بنا پر ہوئے. وہ تعلیم جو اس زمانے ہم کو دی جاتی تھی نہ بہت گہری تھی نہ اُس میں کوئی تنوع تھا، اور نہ علمی تحقیق کی روح پائی جاتی تھی. اس زمانہ کے تعلیم یافتہ طبقہ کی پہنچ صرف انگریزی زبان اور ادب تک تھی چنانچہ اُن کی نظر بہت محدود تھی. اُن کی زبان پر شب و روز برک کی دھواں دھار تقریریں اور میکالے کے چھپے دار فقرے رہتے تھے شیکسپیر کے ڈراموں اور بائرن کی شاعری پر اور ان سب سے زیادہ انیسویں صدی کی لبرل انگریزی سیاست پر گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں.

اگرچہ اس زمانے میں قومی آزادی کے حاصل کرنے کی عارضی کوششیں کی گئیں مگر دراصل ہمیں انگریزوں کی فیاضی پر پورا عقیدہ تھا. یہ عقیدہ ہمارے تدبر رہنماؤں کے جذبات میں اس قدر راسخ تھا کہ اُن کو اُمید تھی کہ فاتح خود ہی از راہِ عنایت مفتوح کے لئے آزادی کی راہ ہموار کردے گا. اس یقین کی بنیاد یہ تھی کہ اُس زمانے میں جن لوگوں کو سیاسی تشدد کی وجہ سے اپنے ملک سے بھاگنا پڑتا تھا اُنھیں انگلستان ہی میں پناہ ملتی تھی.

انگریز قوم اُن سیاسی رہنماؤں کو جو اپنی قوم کے لئے قربانیاں دے چکے تھے ہاتھوں ہاتھ لیتی تھی. میں انگریزوں کی اس وسعت قلب اور انسانیت سے بہت متاثر ہوا اور میرے دل میں ان کی انتہائی عزت پیدا ہوگئی. یہ فراخ دلی قومی سیرت کی خصوصیت تھی. ابھی شہنشاہیت کے غرور سے آلودہ نہیں ہوئی تھی میں اس وقت نوجوان تھا اور مجھے انگلستان میں پارلیمنٹ کے اندر اور باہر جان برائٹ کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا. ان تقریروں کی

انتہائی حریت پسندی نے جو ہر قسم کے تنگ اور محدود قومی تصورات سے بالاتر تھی۔ میرے دل و دماغ پر اس قدر گہرا اثر ڈالا کہ آج بھی جب کہ ہر فریب نظر اور فریب خیال ٹوٹ چکا ہے ان کا ایک ہلکا سا نقش باقی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس بے حسی کے ساتھ اپنے حکمراں کی خیرات کا سہارا ڈھونڈھنا ہمارے لئے کوئی فخر کی بات نہ تھی البتہ یہ امر قابل توجہ ہے کہ ہم نے انسانی عظمت کا اُس وقت بھی کھلے دل سے اعتراف کیا جب وہ ایک غیر ملکی قوم میں نظر آئی انسانیت کی بہترین اور پاکیزہ ترین صفات کسی ایک ملک یا قوم کا اجارہ نہیں ہے، نہ تو ان کو ایک خاص دائرے میں محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ تخیل کی دولت کی طرح دفن کر کے رکھا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ انگریزی ادب جو پچھلے زمانے میں ہمارے دماغوں کو منور کرتا رہا آج بھی ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں گونج رہا ہے۔

اسی سلسلے میں ٹیگور ہندوستان کے اس اخلاقی نصب العین یا "دھرم" کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے قومی روایات نے متعین کیا ہے ایک تو یہ قدیم رسوم و روایات خود ہی تنگ نظری پر مبنی تھیں دوسرے انھوں نے ایک تنگ جغرافی علاقے میں نشو و نما پائی جو ایک طرف دریائے سرسوتی سے اور دوسری طرف دریائے سرَوتی سے محدود تھا اور برہم ورت کہلاتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ظاہر بینی اور رسم پرستی آزاد خیالی پر غالب آگئی اور دھرم کے تصور نے جو منو کے زمانے میں برہم ذات پر مسلط تھا بہ تدریج سماجی ظلم کی شکل اختیار کر لی۔

میرے لڑکپن میں مہذب اور تعلیم یافتہ بنگالیوں کا ذہن، جس نے انگریزی علم و ادب کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس سماجی قید و بند کے خلاف

انتہائی بغاوت کے جذبہ سے معمور تھا........ اس بنا پر ہم نے اپنے ضابطۂ اخلاق کے بجائے ہم نے تہذیب کے اس معیار کو قبول کر لیا جسے انگریزی لفظ ہیومینیٹیریشن ظاہر کرتا ہے۔

"ہمارے اپنے خاندان میں اس نئی تہذیبی روح کا خیر مقدم محض اس کی عقلی اور اخلاقی قوت کی بنا پر کیا گیا اور اس کا اثر ہماری زندگی کے ہر شعبے میں محسوس ہونے لگا۔ ایسے ماحول میں پیدا ہونے کی وجہ سے جس میں سب لوگوں کو ادب سے خلقی مناسبت تھی مجھے انگریزی سے ایک خاص شغف پیدا ہو گیا اس طرح میری زندگی کا پہلا دور گذرا اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب مجھے روز بروز محسوس ہونے لگا کہ جب ذاتی اغراض کا سوال پیدا ہوتا ہے تو تہذیب و تمدن کے اعلیٰ اصول کا کلمہ پڑھنے والے ان اصول کو بے تکلف نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسا میرے اور ان کے راستے الگ الگ ہو گئے اور مجھے اس طلسم کے ٹوٹنے سے شدید روحانی تکلیف ہوئی۔

۷۔ ۱۸۵۷ء کی زبردست بغاوت۔ نسلی تعصب

بنگال میں برطانوی حکومت کو قائم ہوئے سو سال کے قریب ہو چکے تھے اور وہ اس حکومت کا عادی ہو گیا تھا۔ کسانوں کو تعلقے نے تباہ کر دیا تھا اور نئے اقتصادی حالات نے کچل ڈالا تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تہذیب کی طرف ڈھل گیا تھا اور سمجھتا تھا کہ انگلستان کی ہر تحریک اُسے ترقی کی راہ دکھائے گی۔ کم و بیش یہی کیفیت جنوبی اور مغربی ہند، مدراس اور بمبئی میں بھی تھی۔ لیکن شمالی میں یہ اطاعت شعاری یا مصالحت انظر

نہیں آتی تھی بلکہ بغاوت کا جذبہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا خصوصاً جاگیرداروں اور اُن کے متوسلین میں۔ عوام میں بھی سخت بے چینی تھی اور وہ شدت سے برطانوی حکومت کے مخالف تھے۔ اعلیٰ طبقے اجنبیوں کے حقارت آمیز اور متکبرانہ انداز سے بیزار تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی جہالت اور غارت گری نے لوگوں کی زندگی دشوار کردی تھی۔ ان کو نہ تو ہندوستانیوں کی قدیم رسوم وروایات کی پروا تھی اور نہ ان کے جذبات وخیالات کی۔ کروڑوں آدمیوں پر غیر محدود اختیارات حاصل ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے دماغ چل گئے تھے اور وہ بے دھڑک لوٹ جو جی چاہتا تھا کرتے تھے وہ نیا عدالتی انتظام بھی جو اس حکومت نے قائم کیا تھا لوگوں کے لئے ایک عذاب بن گیا تھا اس لئے کہ وہ نہایت پیچیدہ تھا اور حکام عدالت ملک کی زبان اور رسم ورواج سے ناواقف تھے۔ ۱۸۱۸ء میں سر ٹامس منرو نے لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل کو ایک مراسلے میں برطانوی حکومت کی برکتوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا تھا " لیکن یہ برکتیں بہت گراں قیمت پر خریدی گئی ہیں، اُن کے بدلے ہندوستانیوں کو اپنی آزادی، قومی خصوصیات اور وہ سب چیزیں جن پر قوموں کی عزت کا دارومدار ہے دینی پڑی ہیں۔ لہٰذا برطانوی اسلحہ سے ہندوستان کو فتح کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک پوری قوم ذلت کے گڑھے میں گر جائے گی۔ غالباً دنیا میں کسی فاتح قوم نے مفتوحوں کو اپنے ملک کے نظم ونسق میں حصہ لینے سے اس طرح محروم نہ کیا ہوگا جس طرح برطانوی ہند میں کیا گیا"

منرو یہ چاہتا تھا کہ ہندوستانیوں کو انتظامی عہدوں پر رکھا جائے " بیرونی فاتحوں نے مفتوحوں پر سختیاں بھی کی ہیں اور بعض اوقات ظلم بھی

کیئے ہیں مگر کسی نے اُن کو اتنا ذلیل نہیں کیا جتنا ہم نے کیا ہے۔ کسی فاتح نے بھی ایک پوری قوم پر یہ الزام نہیں لگایا کہ یہ لوگ سراسر ناقابل اعتماد ہیں۔ ان میں دیانت داری کی صلاحیت ہی نہیں اور انھیں صرف وہی جگہیں دینی چاہیئں جہاں اُن کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

سکھوں سے " لڑائیاں لڑنے کے بعد ۱۸۴۸ء میں برطانوی سلطنت پنجاب تک پھیل گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جس نے سکھ ریاست کو قائم کیا تھا اور وسعت دی تھی ۱۸۳۹ء میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ۱۸۵۶ء میں اودھ بھی برطانوی ہند میں شامل کر دیا گیا۔ دراصل اودھ نصف صدی سے برطانوی حکومت کے ماتحت تھا۔ اس کی حیثیت ایک باجگذار ریاست کی تھی اور اس کا نام نہاد حاکم بے بس اور عیش پرست تھا اور ساری طاقت برطانوی ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی حالت نہایت ابتر تھی اور اس میں نظام باجگذاری کی ساری قباحتیں واضح طور پر نظر آتی تھیں۔

مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کر دی اس بغاوت کی تیاریاں چپکے چپکے ہو رہی تھیں مگر اس کے قبل از وقت ظاہر ہو جانے کی وجہ سے سب منصوبے خاک میں مل گئے۔ یہ محض فوجی غدر نہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم چیز تھی۔ اس نے بہت تیزی سے پھیل کر ایک عام بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور ہندوستان کی جنگ آزادی بن گئی۔ اس حیثیت سے یہ شورش دہلی، صوبجات متحدہ، اور وسطی ہندوستان اور بہار کے کچھ حصّوں تک محدود رہی۔ دراصل یہ جاگیرداروں کی بغاوت تھی اور اس کے سرگروہ جاگیردار اور اُن کے پیرو تھے۔ مگر بدیسیوں سے نفرت

کے جذبے نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایسی صورت میں لازمی طور پر باغیوں کی توقعات سلطنت مغلیہ کے وارث سے وابستہ تھیں جو کمزوری، ضعیفی اور بے بسی کے عالم میں دہلی کے قلعہ میں بیٹھا ہوا تھا ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں نے اس بغاوت میں پورا پورا حصہ لیا۔

اس بغاوت نے برطانوی حکومت کی جڑوں کو ہلا دیا مگر آخر میں خود ہندوستانیوں کی مدد سے کچل دی گئی۔ اس سلسلے میں قدیم حکومت کی اندرونی کمزوریاں ظاہر ہو گئیں جو جان پر کھیل کر بدیسی حکومت کو ختم کرنے کی آخری کوشش کر رہی تھی۔ جاگیرداروں کو ملک کے بہت بڑے حصے میں عوام کی ہمدردی حاصل تھی مگر وہ نااہل اور غیر منظم تھے نہ اُن کے پیش نظر کوئی تعمیری نصب العین تھا اور نہ کوئی مشترک مقصد وہ تاریخ میں اپنا کام کر چکے تھے اور مستقبل میں اُن کے لئے کوئی جگہ نہ تھی ان میں سے بہت سے باوجود اپنی ہمدردیوں کے بہادری سے زیادہ احتیاط کے قائل تھے اور دور سے کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ فتح کس کی ہوتی ہے اور بہت سے ہندوستانی والیان ریاست عام طور پر یا تو علیحدہ رہے یا برطانیہ کو مدد دیتے رہے اس لئے کہ جو کچھ اُنھوں نے حاصل کیا تھا یا اُن کے پاس بچ رہا تھا اُسے وہ خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ لیڈروں میں کوئی قومی اور متحد کرنے والا جذبہ موجود نہ تھا۔ بعض انگریزوں کی نفرت اور اپنے جاگیری حقوق کے تحفظ کی خواہش اس کا بدل نہیں ہو سکتی تھی۔

برطانیہ کو گورکھوں سے مدد ملی اور تعجب تو یہ ہے کہ سکھوں نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ سکھ اُن کے دشمن رہ چکے تھے اور چند ہی سال پہلے اُن سے شکست کھا چکے تھے۔ برطانیہ کی یہ حکمت عملی یقیناً قابل تعریف تھی کہ اس نے

اس طرح سکھوں کو اپنے میں ملا لیا۔ اب رہی یہ بات کہ اس زمانے کے سکھوں کا یہ طرزِ عمل قابلِ تعریف تھا یا قابلِ مذمت اپنے اپنے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں کوئی قومی جذبہ موجود نہ تھا جو لوگوں کو متحد کر سکتا۔ جدید طرز کی قومیت کے پیدا ہونے میں ابھی دیر تھی۔ ہندوستان کو بہت رنج اور مصیبت اٹھا کر وہ سبق سیکھنا تھا جس سے اس کو حقیقی آزادی میسر آ سکتی ہے۔ جاگیری نظام جیسی فرسودہ چیز کے لئے لڑنے سے آزادی نہیں مل سکتی تھی۔

اس تحریک نے بعض بہت اچھے گوریلا لیڈر پیدا کئے ان میں بہادر شاہ کا ایک عزیز فیروز شاہ بھی تھا مگر سب سے زیادہ ہوشیار تانتیا ٹوپی تھا جو برطانوی حکومت کو اس وقت بھی مہینوں تک پریشان کرتا رہا جب اس کو شکست کا یقین ہو گیا تھا۔ آخر کار جب وہ نربدا کو پار کر کے مرہٹوں کے علاقے میں پہنچا اس امید پر کہ اس کے ہم وطن اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے تو اس کا خیر مقدم کرنے کے بجائے اس کے ساتھ دغا کی گئی۔

ایک ہستی ان سب میں ممتاز نظر آتی ہے اور آج بھی عوام اس کا نام عزت اور احترام سے لیتے ہیں یعنی جھانسی کی رانی لکشمی بائی یہ ایک بیس سال کی لڑکی تھی جو میدانِ جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرتی ہوئی ماری گئی۔ اس انگریز جنرل نے جو اس کا حریف تھا یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ باغی لیڈروں میں "سب سے بہتر اور سب سے زیادہ بہادر تھی۔"

انگریزوں نے غدر کی یادگاریں کانپور اور دوسرے مقامات پر تعمیر کیں مگر ان ہندوستانیوں کی کوئی یادگار نہیں جو اس معرکے میں کام آئے۔ اس

میں شک نہیں کہ باغی ہندوستانیوں نے بعض اوقات ظالمانہ اور وحشیانہ حرکتیں کیں۔ ان میں ضبط اور تنظیم نہ تھی اور اکثر برطانوی جبر اور تشدد کی خبریں پاکر بھڑک اُٹھتے تھے۔ لیکن تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے جس نے ہندوستانی ذہن پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ خصوصاً میرے اپنے صوبے میں اس کی یاد شہروں اور دیہاتوں میں اب تک موجود ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ سارا قصہ بھلا دیا جائے کیونکہ یہ ایک مکروہ اور ہیبت ناک تصویر ہے جس میں انسان اپنے درجۂ انسانیت سے گرا ہوا نظر آتا ہے اور آج بھی جب کہ نازیت اور موجودہ جنگ نے بربریت اور وحشت کے نئے معیار قایم کردیئے ہیں اُس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان کا فراموش کر دینا یا محض ایک تاریخی واقعے کے طور پر یاد رکھنا صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ حقیقی ماضی بن جائے اور اس کا حال سے کوئی تعلق نہ رہے جب تک ایسے واقعات ہوتے رہیں گے جو غدر کے مظالم کو یاد دلاتے ہیں اور جب تک وہ جذبہ، وہ روح جو ان واقعات کی تہ میں کارفرما ہے ظاہر ہوتی رہے گی، یادگار بھی باقی رہے گی اور ہمارے قومی ذہن اور جذبات کو متاثر کرتی رہے گی یہ تصویر مٹانے سے نہیں مٹے گی بلکہ لوگوں کے دماغ پر اس کا نقش اور زیادہ گہرا ہو جائے گا اس کا اثر صرف اسی طرح کم ہو سکتا ہے کہ اس کو صحیح روشنی میں دیکھا جائے۔

بہت سی جھوٹی تاریخیں لکھی گئی ہیں جن میں غدر کے واقعات مسخ کرکے دکھائے گئے ہیں۔ ہندوستانیوں کے جو خیالات اس بارے میں ہیں اُن کو چھپنے اور شائع ہونے کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ ساورکر نے "ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ" آج سے تقریباً تیس سال

پیشتر لکھی تھی مگر یہ کتاب اسی وقت ممنوع کر دی گئی اور آج تک ممنوع ہے۔ البتہ کبھی کبھی بعض صاف گو، دیانت دار انگریز مورخین نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور اس طرح ہمیں اُس زمانے کی قاتلانہ ذہنیت اور نسل پرستی کے جنون کی ایک جھلک نظر آئی۔ "غدر کی تاریخ" میں کے اور میلیسن کے بیانات اور "ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی ابتدا اور تکمیل" میں ٹامسن اور گیرٹ کے بیانات ایسے ہولناک ہیں کہ اُن کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں" ہر ہندوستانی سپاہی جو برطانوی فوج کا ساتھ نہیں دے رہا تھا عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہا تھا۔ .... دہلی کے باشندوں کا جن میں اکثر ہماری فتح کے آرزو مند تھے قتل عام ہو رہا تھا لوگوں کو تیمور اور نادر شاہ کا زمانہ یاد آ رہا تھا بلکہ موجودہ خونریزی اور غارت گری شدت کے لحاظ سے ان دونوں کے کارناموں سے بڑھ گئی تھی۔ ایک ہفتہ کی لوٹ مار کی تو باقاعدہ اجازت دی گئی تھی مگر در اصل اس کا سلسلہ ایک مہینے تک جاری رہا۔

میرے اپنے وطن یعنی الہ آباد کے شہر اور ضلع اور اس کے قرب و جوار میں جنرل نیل کی خونریز عدالتوں (Bloody Assizes) کا زور تھا" فوجی اور سول حکام نے " خونریز عدالتیں قائم کر رکھی تھیں اور بغیر عدالتی تحقیقات کے بھی ہندوستانی مردوں، عورتوں اور بچوں کو اندھا دھند قتل کر رہے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں وہ مراسلات اب تک موجود ہیں جنھیں گورنر جنرل نے اس زمانے میں بھیجے تھے۔ ان میں ایک جگہ لکھا ہے "ان لوگوں کے علاوہ جو بغاوت کے مجرم ہیں بوڑھے عورتیں اور بچے بھی مارے جا رہے ہیں۔ ان کو بالقصد پھانسی نہیں دی جاتی بلکہ جب

پورے گاؤں میں آگ لگائی جاتی ہے تو وہ بھی جل جاتے ہیں یا اتفاقاً گولی سے ہلاک ہو جاتے ہیں"

جماعتیں شہروں اور ضلعوں میں دورہ کر رہی تھیں اور تائی جلادوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی ایک صاحب اس پر نازاں تھے کہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو "نہایت چابک دستی سے" ٹھکانے لگا دیا۔ آم کے درختوں سے سولی کا کام لیا جاتا تھا اور ہاتھیوں سے پھانسی کے تختے کا۔ اور جو غریب اس وحشیانہ انصاف کا شکار ہوتے تھے ان کے جسم کو توڑ مروڑ کے انگریزی کے آٹھ کے ہندسے کی شکل میں رسیوں سے باندھ دیتے تھے۔ گویا یہ بھی کوئی تفریحی مشغلہ تھا کانپور، لکھنؤ، اور دوسرے مقامات پر بھی یہی حال تھا۔

جنرل نیل ۱۸۵۷ء کا وہ مجسمہ جو اس کے شکر گذار ہموطنوں نے ہندوستان کے روپئے سے تیار کر کے نصب کیا آج بھی ہم کو حقارت سے دیکھتا ہے یہ برطانوی حکومت کے گذشتہ اور موجودہ دور کی سچی نشانی ہے۔ نکلسن کا مجسمہ ہاتھ میں ننگی تلوار لئے ہوئے آج بھی پرانی دہلی کو دھمکا رہا ہے ان گئے گذرے واقعات کا ذکر کرنا بہت تکلیف دہ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جذبہ جو ان کی تہ میں تھا ان کے ساتھ ختم نہیں ہوا بلکہ اب تک باقی ہے۔ اور جب کوئی بحرانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور اعصاب پر قابو نہیں رہتا تو بھر ابھر آتا ہے۔ دنیا امرتسر، اور جلیانوالہ باغ کے قصے سے واقف ہے مگر غدر کے زمانہ سے آج تک اور ابھی پچھلے دنوں میں جو کچھ ہوا اس میں سے بہت سی باتوں کو نہیں جانتی ہماری موجودہ نسل کے دل میں ناسور ڈال دیئے ہیں۔ شہنشاہیت اور ایک قوم کا دوسری

قوم پر مسلط ہو جانا بُری بات ہے اور نسلی برتری کا احساس بھی بُرا ہے۔ لیکن اگر شہنشاہیت اور نسلی برتری کا احساس دونوں مل جائیں تو اس کا نتیجہ نہایت ہولناک اور فریقین کے لئے ذلّت اور رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔ انگلستان کا بام عروج پر پہنچنے کے بعد زوال کی طرف مائل ہونا کس حد تک اس شہنشاہیت اور نسلی برتری کے احساس کا نتیجہ ہے، انھیں دو چیزوں کی وجہ سے اس کی قومی زندگی اخلاقی پستی میں مبتلا ہو گئی اور اس نے وہ سبق بھلا دیئے جو خود اس کی تاریخ اور اُس کے ادب نے اُسے سکھائے تھے۔

جب سے ہٹلر گوشہ گمنامی سے نکلا اور جرمنی کا قائد بنا تو نسل پرستی اور نازیوں کے "حاکم قوم" کے نظریے کے متعلق بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں۔ متحدہ اقوام کے رہنماؤں نے اس نظریے کو بہت بُرا کہا اور اب بھی کہہ رہے ہیں۔ حیاتیات کے ماہرین ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ نسلی امتیاز محض ایک افسانہ ہے اور "حاکم قوم" کی کوئی اصلیت نہیں لیکن ہم ہندوستانیوں نے حکومت برطانیہ کے آغاز سے آج تک نسلی تفوق اور امتیاز کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ اس حکومت کی ساری ذہنیت "حاکم قوم" اور "غالب نسل" کی تھی اور اس کا سارا نظام اسی نظریے پر مبنی تھا۔ سچ پوچھئے تو یہ نظریہ شہنشاہیت کا لازمی جز ہے۔ اور اس پر کوئی پردہ نہ تھا بلکہ حکام صاف الفاظ میں اس کا اعلان کرتے تھے۔ الفاظ سے زیادہ پُر زور اُن کا عمل تھا۔ ہندوستانی بہ حیثیت قوم اور بہ حیثیت افراد متواتر اور مسلسل، توہین، ذلّت، اور حقارت آمیز برتاؤ کا شکار ہوتے رہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا تھا کہ انگریز فرماں روا قوم

سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں خدا نے ہم پر حکومت کرنے کا حق عطا کیا ہے۔ اگر ہم اس میں چون و چرا کرتے تھے تو ہمیں متنبہ کر دیا جاتا تھا کہ "فرماں روا قوم شیرانہ مزاج رکھتی ہے۔ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے یہ باتیں لکھتے ہوئے شرم آتی ہے اور انھیں یاد کرکے تکلیف ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ یہ حقیقت ہے کہ ہم اس ذلت کو اتنے عرصے تک برداشت کرتے رہے ہیں تو ہر قسم کی مزاحمت کو چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ ہوتا، اس پر ترجیح دیتا کہ میری قوم اس طرح ذلیل ہو۔ پھر بھی بہتر یہی ہے کہ ہندوستانی اور انگریز دونوں اس حقیقت سے واقف ہو جائیں کیونکہ یہ انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات کا نفسیاتی منظر ہے نفسیات بڑی اہمیت رکھتی ہے اور قومی حافظہ بہت قوی ہوتا ہے۔"

ایک مثال سے ہم پر یہ بخوبی روشن ہو جائے گا کہ ہندوستان کے انگریزوں کی ذہنیت اور طرز عمل کیا تھا ۱۸۸۳ء میں البرٹ بل کے ایجیٹیشن کے سلسلے میں سٹین کیرنے جو حکومت ہند کے وزیر خارجہ رہ چکے تھے بیان کیا کہ اس بل نے "اس محبوب عقیدے" کو صدمہ پہنچایا ہے "جو چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر انگریز کے دل میں راسخ ہو چکا ہے چاہے وہ ایک ادنیٰ سے بنگلے میں رہنے والا نیل کا کاشتکار ہو یا ایک بڑے شہر کو رونق بخشنے والا اخبار کا اڈیٹر، یا ایک اہم صوبے کا چیف کمشنر یا مسند حکومت پر بیٹھنے والا وائسرائے ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جس کو خدا نے دوسروں پر حکومت کرنے اور انھیں مغلوب کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔"

۸ - برطانوی حکومت کا طریق کار

(مختلف قوتوں کو ایک دوسرے کے خلاف اُبھارنا اور توازن قائم رکھنا)

۵۸-۱۸۵۷ء کی بغاوت دراصل جاگیردار طبقے کی بغاوت تھی گو اس میں کچھ قومی عناصر بھی شامل تھے - مگر یہ بہت سے راجاؤں اور تعلقہ داروں کی عملی مدد یا کم سے کم اس ہنگامہ سے الگ تھلگ رہنے ہی کا نتیجہ تھا کہ برطانوی حکومت اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہوگئی - بغاوت میں وہی لوگ شریک تھے جن کو برطانوی حکومت نے ان کی آبائی ریاست یا مراعات اور اختیارات سے محروم کردیا تھا یا جن کے دل میں اس قسم کے اندیشے تھے - کچھ تامل کے بعد برطانوی حکمت عملی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ والیان ریاست کو رفتہ رفتہ ختم کر دیا جائے اور سارے ملک میں برطانیہ کی براہ راست حکومت ہو - بغاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حکمت عملی بدل گئی اور اس سے جو نہ صرف راجاؤں اور نوابوں کو بلکہ تعلقداروں اور بڑے زمینداروں کو بھی فائدہ پہنچا - حکومت نے یہ محسوس کیا کہ عوام کو ان نوابوں اور جاگیرداروں کے ذریعہ آسانی سے قابو میں رکھا جا سکتا ہے - اودھ کے یہ تعلقہ دار مغلوں کے لگان دار کاشتکار تھے مگر مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کی وجہ سے جاگیردار بن بیٹھے تھے - اُن میں سے تقریباً سبھی بغاوت میں شریک ہوئے اگرچہ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے بھاگنے کا راستہ کھلا رکھا - ان کی بغاوت کے باوجود برطانوی حکومت نے چند آدمیوں کے سوا سب کے منصب قائم رکھے - چنانچہ ان سے "وفاداری اور خدمت" کا عہد لے کر ان کے تعلقے ان کو سونپ دیئے گئے - اس طرح

یہ تعلقہ دار جو اپنے آپ کو بڑے فخر سے امرائے اودھ کہتے ہیں برطانوی حکومت کے ستون بن گئے۔

اگرچہ بغاوت کا براہ راست اثر ملک کے صرف چند مخصوص حصوں ہی پر ہوا مگر اس نے ہندوستان کو اس سرے سے اس سرے تک ہلا کر رکھ دیا۔ خصوصاً برطانوی نظم ونسق کے سارے کل پرزے ڈھیلے ہو گئے۔ حکومت کو اپنا سارا نظام بدلنا پڑا برطانوی تاج، یعنی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے ملک کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی ہندوستانی فوج جس نے اس بغاوت کا آغاز کیا تھا از سرنو ترتیب دی گئی۔ برطانوی حکومت کا طریق کار جو مدت سے چلا آتا تھا اب اور واضح اور مستحکم ہو گیا اور اس پر بالقصد عمل کیا گیا۔ اس کے خاص گر یہ تھے: مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کا پیدا کرنا جن کا مفاد برطانوی حکومت سے وابستہ ہو۔ ایک دوسرے کے خلاف ابھار کر توازن قایم رکھنا، اور تفریقی رجحانات کو تقویت دینا۔ وہ خاص طبقے جنھیں حکومت برطانیہ نے پیدا کیا یا بڑھایا والیان ریاست اور بڑے زمینداروں کے تھے لیکن اب تک نیا طبقہ جو برطانوی حکومت سے اور بھی زیادہ وابستہ تھا روز بروز اہمیت حاصل کرنے لگا۔ یہ ملازمت پیشہ ہندوستانیوں پر مشتمل تھا جنھیں عام طور پر چھوٹے چھوٹے عہدے دیئے جاتے تھے۔ شروع شروع میں ہندوستانیوں کو ملازم رکھنے سے پہلوتہی کی جاتی تھی اور صرف اسی صورت میں رکھے جاتے تھے جب ان کے بغیر کام نہ چل سکے۔ منرو کی یہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں کو زیادہ تعداد میں مقرر کرنا چاہیئے۔ تجربے نے اس بات کو قطعی طور پر ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستانی عہدہ داروں کا مفاد حکومت برطانیہ سے اس طرح وابستہ ہے کہ ان پر

اعتماد کیا جا سکتا ہے اور انھیں حکومت کا آلۂ کار سمجھا جا سکتا ہے۔ غدر سے پہلے ماتحت اسامیوں پر زیادہ تر بنگالی مامور تھے۔ شمالی صوبوں میں جہاں کہیں بھی فوجی یا ملکی محکموں میں محرر اور منشی کی ضرورت ہوتی تھی بنگالی وہاں پہنچتے تھے۔ اس طرح سے بنگالیوں کی آبادیاں صوبجات متحدہ، دہلی اور پنجاب کے انتظامی اور فوجی مرکزوں میں قائم ہوگئی تھیں۔ یہ بنگالی برطانوی افواج کے ساتھ رہتے تھے اور انھوں نے اپنے تئیں ان کا وفادار خادم ثابت کیا تھا۔ باغیوں کے ذہن میں ان کا تصور برطانوی اقتدار کے ساتھ وابستہ ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ ان سے نفرت کرتے تھے اور انھیں حقارت آمیز القاب سے یاد کرتے تھے۔

اس طرح نظم ونسق میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کا عمل شروع ہوا مگر یہ لوگ چھوٹے چھوٹے عہدوں پر رکھے جاتے تھے۔ اصل قوت اور اختیار انگریز عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھا۔ جب انگریزی تعلیم پھیلی تو سرکاری ملازمتوں پر بنگالیوں کا بلا شرکت غیرے قبضہ نہیں رہا بلکہ عدالتی اور انتظامی محکموں میں اور بہت ہندوستانی بھی رکھے جانے لگے۔ ہندوستانیوں کا تقرر برطانوی حکومت کی تقویت کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ثابت ہوا۔ اس طرح ہر جگہ ایک شہری لشکر تیار ہوگیا جو فوجی جمعیت سے زیادہ اہم تھا۔ اس سول لشکر کے کچھ افراد محب وطن اور قابل بھی تھے اور قومی رجحانات رکھتے تھے لیکن اس سپاہی کی طرح جو انفرادی حیثیت سے محب وطن ہونے کے باوجود مجبور ہے فوجی قواعد اور ضوابط میں جکڑے ہوئے تھے۔ نافرمانی ترک خدمت اور بغاوت کی سزا بہت سخت تھی۔ نہ صرف یہ سول لشکر تیار ہوگیا بلکہ اس میں بھرتی ہونے کے لالچ میں اور بہت سے لوگوں کی نیتیں بگڑ گئیں۔ سرکاری

ملازموں کی زندگی عزت اور اطمینان سے گذرتی تھی اور ملازمت کی مدت ختم ہونے پر پنشن ملتی تھی ۔ اگر اپنے افسروں کی پوری اطاعت کی جائے تو ہر قسم کی خامیاں اور کوتاہیاں نظر انداز کر دی جاتی تھیں ۔ یہ سول ملازمین برطانوی حکام اور عوام کے درمیان واسطے کا کام دیتے تھے ۔ اگر انھیں اپنے افسروں کے سامنے ذلیل ہونا پڑتا تھا تو اس کی کسر اپنے ماتحتوں سے نکال سکتے تھے وہ ان سے اور تمام لوگوں سے غرور اور نخوت سے پیش آتے تھے اور انھیں اپنی اطاعت پر مجبور کرتے تھے ۔

چونکہ کسب معاش کے دوسرے ذرائع مفقود تھے اس لئے حکومت کی ملازمت کی اہمیت اور بڑھ گئی کچھ تھوڑے سے لوگ جو وکیل اور ڈاکٹر بن سکتے تھے لیکن ان پیشوں میں بھی کامیابی یقینی نہ تھی ۔ صنعت و حرفت کا کہیں نام بھی نہ تھا تجارت زیادہ تر چند خاص طبقوں کے ہاتھ میں تھی جو پشتہا پشت سے کاروبار کرتے چلے آئے تھے اس سے خاص مناسبت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے ۔ جدید تعلیم نہ تو کسی تجارت کے لئے موزوں بناتی تھی اور نہ کسی اور پیشے کے لئے اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ حکومت کی ملازمت تھی ۔ تعلیم کا کام اس قدر محدود تھا کہ اس میں بہت کم لوگوں کی گنجائش تھی ۔ سماجی خدمت کی دوسری شاخیں تقریباً ناپید تھیں بس لے دے کے ایک حکومت کی ملازمت ہی باقی رہ گئی تھی اور جب کالجوں نے اپنے یہاں سے ہزاروں گریجویٹ نکالنے شروع کئے ۔ تو باوجود اس کے کہ سرکاری ملازمت کا دائرہ روز بروز بڑھ رہا تھا یہ سب کے سب اس کے اندر نہیں کھپ سکتے تھے ۔ چنانچہ آپس میں بہت سخت مقابلہ شروع ہوگیا ۔ اس طرح بے روزگار تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک ایسی جماعت بن گئی جس میں سے حکومت اپنی ضرورت

اہلیت کے مطابق افراد کو چن سکتی تھی۔ اس کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی جو برسرکار تھے اپنی ملازمت کا بھروسا نہیں رہا۔ غرض حکومت برطانیہ ہندوستان میں سب سے بڑی آجر بن گئی بلکہ اس کے سوا (ریلوے کو شامل کر کے) کوئی ادارہ نہ تھا جو لوگوں کو اتنی بڑی تعداد میں نوکر رکھتا ہو۔ اس طرح ایک وسیع دفتری نظام وجود میں آیا جس کی کل اعلیٰ حکام کے ہاتھ میں تھی۔ اس زبردست طاقت سے تمام ملک پر برطانیہ کا تسلط بٹھا یا گیا، مخالف عناصر کو کچلا گیا اور ان جماعتوں میں جو حکومت کی ملازمت کی آرزومند تھیں، باہمی مخالفت اور رقابت کا جذبہ ابھارا گیا۔ اس سے ہندوستانیوں میں اخلاقی پستی اور کشمکش پیدا ہو گئی اور حکومت کو موقع مل گیا کہ ان کو ایک دوسرے سے لڑا کر تماشا دیکھے۔ مختلف قوتوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھار کر توازن قائم رکھنے کی یہ پالیسی ہندوستانی فوج کے بارے میں بھی اختیار کی گئی۔ مختلف گروہوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ اس میں قومی وحدت کا جذبہ پیدا نہ ہوسکے قبائلی احساس اور فرقہ وارانہ عصبیت کو فروغ دیا گیا اور ہر فرقے کے مخصوص تعصبات کی ہمت افزائی کی گئی یہاں تک کہ ہندوستانی فوجوں کو معمولی اخبار بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اہم اور بنیادی عہدوں پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور کسی ہندوستانی کو شاہی کمیشن نہیں مل سکتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ناتجربہ کار انگریز افسر بھی پرانے تجربے کار ہندوستانی افسروں سے ۔ اُن لوگوں سے جنھیں "وائسرائے کا کمیشن مل چکا تھا" سینیر سمجھے جاتے تھے فوج کے صدر دفتر (آرمی ہیڈکوارٹرز) میں ہندوستانیوں کو شعبہ حسابات کی محرری کے سوا کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ مزید حفاظت کے خیال سے جنگ کے زیادہ موثر اسلحے ہندوستانی فوجوں کو نہیں دیئے جاتے تھے۔ بلکہ صرف ہندوستان کی برطانوی فوجوں کے لئے مخصوص

تھے یہ برطانوی دستے ہمیشہ ہندوستان کے خاص خاص مرکزوں میں ہندوستانی رجمنٹوں کے ساتھ رکھے جاتے تھے اور" اندرونی حفاظتی دستوں " کے طور پر چھاؤنیوں کو دبانے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ اس فوج سے جس میں بیشتر انگریز تھے ، ملک پر تسلط قائم رکھنے کا کام لیا جاتا تھا۔ اور ہندوستانی سپاہی زیادہ تر فیلڈ آرمی میں شامل تھے جو باہر بھیجنے کے لئے ترتیب دی گئی تھی شمالی ہندوستان کے مخصوص طبقوں سے ، جو جنگی طبقے کہلاتے تھے ، بھرتی کئے جاتے تھے۔

یہاں پھر ہمیں برطانوی حکومت کی پالیسی کا بنیادی تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف اس نے ملک میں سیاسی وحدت پیدا کی اور ان عناصر کو ابھارا ، جو قومی اتحاد کے تصور کے ماتحت ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے ، اور دوسری طرف اس وحدت کو جو ایک حد تک خود اس کی پیدا کی ہوئی تھی ختم کرنے کی کوشش کی۔ یہ تفریق جو حکومت پیدا کرنا چاہتی تھی اس وقت تک تقسیم ہند کے سیاسی تصور پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ قومی احساس کمزور کر دیا جائے تاکہ برطانیہ کا تسلط سارے ملک پر قائم رہے بہرحال یہ سب کوششیں تفریق اور انتشار ہی کی تھیں بلکہ ریاستوں کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی جو پہلے کبھی نہیں دی گئی تھی ، رجعت پسند عناصر کو ابھارا گیا اور ان سے مدد لی گئی لوگوں میں پھوٹ ڈال کر ایک کو دوسرے کے مقابلے میں شہ دی گئی ، مذہب اور صوبے کے اختلافات کو بھڑکایا گیا اور ایسے غدار طبقے پیدا کئے گئے جو ہر قسم کی تبدیلی کے مخالف تھے اس لئے کہ اس میں انھیں اپنی تباہی کا اندیشہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک بدیسی سامراجی طاقت کے لئے یہ پالیسی اختیار کرنا بالکل قدرتی بات تھی اور اگر ہم اس پر تعجب کریں تو یہ ہماری

سادہ لوحی ہے البتہ ہمیں یہ حقیقت یاد رہنی چاہیئے کہ اس قسم کی پالیسی اختیار
کی گئی تاکہ ہم بعد کے واقعات کو سمجھ سکیں۔ اسی پالیسی کی بدولت "ہندوستان
کی قومی زندگی کے اہم عناصر" وجود میں آئے جن کا آج کل بار بار نام لیا جاتا
ہے۔ ان کے پیدا کرنے کی غرض یہی تھی کہ ایک دوسرے سے لڑتے رہیں
اور ملک میں انتشار پیدا کریں اور اب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپس میں مل کر
فیصلہ کر لو۔

ہندوستان کی رجعت پسند عناصر کی دوستی کی وجہ سے برطانوی
حکومت کو بہت سی قبیح رسموں کی حمایت کرنی پڑی جن کو وہ خود برا کہتی تھی
جس زمانے میں انگریز ہندوستان آئے ہمارا ملک رسم و رواج کا غلام تھا اور
رسموں کی زنجیریں بعض اوقات بہت کڑی ہوتی ہیں۔ مگر رسمیں بدلتی رہتی
ہیں اور انھیں ایک حد تک بدلتے ہوئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنی
پڑتی ہے ہندوؤں کا مذہبی قانون زیادہ تر رسم و رواج پر مبنی تھا۔ اور جب رسم و رواج
بدلتا تھا تو قانون کی تعبیر بھی بدل جاتی تھی۔ سچ پوچھیئے تو ہندو دھرم شاستر
کا ایک ضابطہ بھی ایسا نہیں جو رواج سے بدلا نہ جا سکے۔ مگر انگریزوں نے
اس لچک دار رواجی قانون کے بجائے عدالتی فیصلوں کی بنیاد قدیم شاستروں
کے متن پر رکھی ہے اور یہ فیصلے آئندہ کے لئے نظیر بن گئے جن کی سختی سے
پیروی کی جاتی تھی۔ نظری حیثیت سے تو یہ اچھا تھا اس لئے کہ اس سے
قانون میں یکسانی پیدا ہو گئی اور اس نے ایک متعین شکل اختیار کر لی۔ لیکن
جو طریقہ اختیار کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم قانون نے ایک دائمی ضابطے
کی حیثیت اختیار کر لی جس میں رسم و رواج سے کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی
تھی۔ وہ دھرم شاستر جس میں ملک کے مختلف حصوں میں رسم و رواج

کے لحاظ سے بے شمار جزوی تبدیلیاں ہوئی تھیں اور اپنی اصلی شکل میں بالکل فرسودہ ہو چکا تھا اب پتھر کی لکیر بن گیا اور اگر مسلمہ دستور کے مطابق اس میں ترمیم کی کوشش کی جائے تو وہ دبا دی جاتی تھی۔ بظاہر ہر جماعت کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ یہ ثابت کرے کہ فلاں معاملے میں رسم و رواج قانون پر مقدم سمجھا جاتا ہے مگر عدالت میں اس کا ثبوت دینا بہت دشوار تھا تبدیلی صرف قانون سازی کے ذریعے سے ہو سکتی تھی مگر قانون بنانا برطانوی حکومت کے ہاتھ میں تھا جو قدامت پسند عناصر کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اس کے مددگار تھے۔ تھوڑے دن بعد قانون سازی کے بعض اختیارات ان اسمبلیوں کو دیئے گئے جن کے کچھ ممبر رائے عامہ سے منتخب کئے جاتے تھے تو سماجی اصلاح کے قانون بنانے کی کوششیں کی گئیں مگر حکومت نے ہمیشہ انھیں ناپسند کیا اور ان کی راہ میں دشواریاں پیدا کیں۔

صنعت کا ارتقاء

صوبوں کے باہمی اختلافات

رفتہ رفتہ ہندوستان سے وہ خوف اور سیاسی کیفیت جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے پیدا کر دی تھی دور ہو رہی تھی۔ برطانوی حکمت عملی کے باوجود زمانے کی زبردست قوتیں ہندوستان کو بدل رہی تھیں اور ایک نیا سماجی شعور پیدا ہو رہا تھا۔ ملک کی سیاسی وحدت، مغرب کے اثرات، علم و صنعت کی ترقیاں، یہاں تک کہ غلامی کی لعنت بھی جو سب میں مشترک تھی لوگوں کے ذہن میں نئے نئے رجحانات پیدا کر رہی تھی، صنعت آہستہ آہستہ نشو و نما پا رہی تھی

اور قومی آزادی کی ایک نئی تحریک اُبھر رہی تھی ۔ ہندوستان کی اس بیداری کے دو پہلو تھے ۔ ایک طرف وہ مغرب کا جائزہ لے رہا تھا اور دوسری طرف اپنی تہذیب کا اور اپنی تاریخ کا مطالعہ کر رہا تھا ۔ ہندوستان میں ریلوں کے جاری ہونے سے صنعتی دور کا مثبت پہلو سامنے آیا ۔ اب تک تو صرف اس کا منفی پہلو نظر آیا تھا یعنی برطانیہ کا تیار کیا ہوا مال ہمارے دساور میں آیا کرتا تھا ۔ مشینوں کی درآمد پر وہ محصول جو اس غرض سے عائد کیا گیا تھا کہ ملک میں صنعتی ترقی نہ ہونے پائے ۱۸۶۰ء میں معاف کر دیا گیا اور بڑے پیمانے کی صنعت زیادہ تر برطانوی سرمائے سے شروع ہوئی ۔ سب سے پہلے بنگال میں جوٹ کی صنعت شروع ہوئی جس کا مرکز اسکاٹ لینڈ کا شہر ڈنڈی تھا اس کے بہت دن بعد احمد آباد اور بمبئی میں روئی کے کارخانے قائم ہوئے جن کا بیشتر سرمایہ ہندوستانی تھا اس کے بعد کان کنی کا کام شروع ہوا ۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت برابر رکاوٹیں ڈالتی رہی چنانچہ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی مال پر محصول لگا دیا گیا تاکہ وہ ہندوستان میں بھی لنکا شائر کے سوتی مال کا مقابلہ نہ کر سکے حکومت ہند میں تجارت، صنعت اور زراعت کا کوئی محکمہ بیسویں صدی تک قائم نہیں ہوا ۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کی پالیسی ایک ریاست قائم کرنے کی تھی جو صرف پولیس کے فرائض انجام دے غالباً مرکزی حکومت نے زراعتی محکمہ زیادہ تر اس وجہ سے کھولا کہ ایک امریکن سیاح نے ہندوستان میں زراعتی ترقی کے لئے ایک رقم عطیے کے طور پر دی تھی ۔ (اب بھی یہ بہت چھوٹا سا محکمہ ہے) ۱۹۰۵ء میں تجارت اور صنعت کے محکمے بھی قائم ہوئے مگر یہ بہت معمولی پیمانے پر کام کرتے رہے ۔ صنعت کی ترقی کو مصنوعی طریقے سے محدود کر کے ہندوستان کی

قدرتی معاشی ترقی کو روک دیا گیا۔

اگرچہ ہندوستان کے عوام بہت غریب تھے اور اُن کا افلاس روز بروز بڑھتا جاتا تھا لیکن اونچے طبقے کے تھوڑے سے لوگوں کو نئے حالات بہت موافق آئے اور وہ خوب سرمایہ جمع کر رہے تھے یہی چھوٹی سی جماعت سیاسی اصلاح کا مطالبہ کر رہی تھی اور اپنا سرمایہ لگانے کے مواقع کی تلاش تھی۔ سیاسی مقصد کے لئے ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگریس قائم کی گئی۔ تجارت اور صنعت رفتہ رفتہ ترقی کرتی رہی اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اسے زیادہ تر انھیں طبقوں نے اختیار کیا جن کے ہاں سینکڑوں سال سے سوداگری کا پیشہ چلا آتا تھا۔ احمد آباد جو کپڑے کی صنعت کا نیا مرکز بنا مغل عہد میں بلکہ اس سے پہلے سے دستکاری اور تجارت کا ایک مشہور مرکز تھا اور اپنا مال باہر کے ملکوں میں بھیجا کرتا تھا احمد آباد کے بڑے سوداگروں کے پاس اپنے ذاتی جہاز تھے جن کے ذریعے سے وہ افریقہ اور خلیج فارس سے بحری تجارت کرتے تھے۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر بڑوچ کی بندرگاہ تھی جو یونانی رومی عہد میں بہت مشہور تھی۔

زمانہ قدیم سے گجرات، کاٹھیاواڑ اور کچھ کے لوگ تاجر، دستکار، سوداگر اور جہاز راں تھے۔ ہندوستان میں بہت سے انقلابات آئے مگر وہ اپنا قدیم کاروبار کرتے رہے اور اسے نئے حالات کے مطابق بناتے رہے آج وہ صنعت اور تجارت میں سب سے پیش پیش ہیں۔ مذہب یا تبدیل مذہب کا ان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ پارسی جو آج سے تیرہ سو سال پہلے گجرات میں قیام پذیر ہوئے اس لحاظ سے گجراتی خیال کئے جا سکتے ہیں۔ (خود سے ساز سے اُن کی زبان گجراتی ہے) مسلمانوں میں سب سے

زیادہ نمایاں حیثیت خوجہ، میمن اور بوہرہ فرقوں کی ہے۔ یہ سب وہ ہیں جو ہندو مت چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے اور ان سب کا وطن گجرات، کاٹھیاوار اور کچھ کا علاقہ ہے۔ یہ گجراتی تو نہ صرف ہندوستان کی صنعت اور تجارت پر حاوی ہیں بلکہ ان کا کاروبار برما، لنکا، مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ اور دوسرے اجنبی ممالک میں بھی پھیلا ہوا ہے۔

راجپوتانہ کے مارواڑی لوگ اندرونی تجارت اور مہاجنی کاروبار پر قابض تھے اور ہندوستان کے سب اہم ترین مرکزوں میں پائے جاتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے ساہوکار بھی تھے اور چھوٹے چھوٹے گاؤں کے مہاجن بھی۔ ایک مشہور مارواڑی کوٹھی کی ہنڈی ہندوستان میں ہر جگہ بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی بھنائی جا سکتی تھی۔ مارواڑی اب بھی بڑے پیمانے پر ساہوکارہ کرتے ہیں مگر اب انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ صنعتی کاروبار بھی شروع کر دیا ہے۔

شمال مغربی حصے میں سندھی لوگ بھی قدیم تجارتی روایات رکھتے ہیں۔ شکارپور یا حیدرآباد کے مرکز سے وہ وسطی ایشیا، مغربی ایشیا اور دوسرے ملکوں کا چکر لگایا کرتے تھے۔ آج کل (یعنی جنگ سے پہلے) دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی بندرگاہ ہو جہاں سندھی دکاندار نہ موجود ہو۔ پنجابیوں میں بھی کچھ لوگ پشتہا پشت سے کاروبار کر رہے ہیں۔

مدراس کے چیٹی لوگ بھی قدیم زمانے سے کاروبار میں ساہوکارے میں پیش پیش رہے ہیں۔ لفظ چیٹی سنسکرت کے لفظ "شریشتی" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں تاجروں کی برادری کا سردار۔ سیٹھ جو کاروباری لوگوں کا عام لقب ہے اسی سے ماخوذ ہے۔ مدراس کے چیٹی لوگوں نے

صرف جنوبی ہند ہی کی تجارتی زندگی میں اہمیت حاصل نہیں کی بلکہ وہ سارے برما میں پھیل گئے اور دور اُفتادہ گاؤں میں بھی پہنچ گئے۔

ہر صوبے کی اندرونی تجارت بھی زیادہ تر ویش طبقہ کے ہاتھ میں تھی جو سیکڑوں پشتوں سے یہی کام کرتا چلا آرہا تھا، یہ لوگ خوردہ فروش، تھوک فروش، اور مہاجن تھے۔ ہر گاؤں میں ایک بنئے کی دُکان ہوتی تھی جو دیہاتی زندگی کی ضروریات مہیا کرتی تھی اور گاؤں والوں کو بھاری سُود پر روپیہ قرض دیتی تھی۔ دیہاتی قرضے کا تقریباً سارا نظام ان بنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ شمال مغرب کے قبائلی اور آزاد علاقوں میں بھی پہنچ گئے اور وہاں انھوں نے بہت اہم کام انجام دیے۔ جوں جوں افلاس بڑھتا گیا تو زراعتی قرضے میں بھی تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ ساہوکاروں نے زمینیں رہن رکھیں اور آخر کار ان میں سے اکثر پر قابض ہو گئے۔ اس طرح مہاجن زمیندار بھی بن بیٹھا۔

وہ امتیاز جو تجارتی، کاروباری اور ساہوکاری طبقوں اور دوسرے لوگوں میں تھا رفتہ رفتہ کم ہو گیا اس لئے کہ بہت سے نئے لوگ کاروبار میں گھس آئے مگر پھر بھی یہ حد بندی ایک حد تک موجود ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ ذات پات کے بندھن کا نتیجہ تھا، یا قدیم روایات کا، یا موروثی صلاحیت کا یا ان سب چیزوں کا مجموعی اثر بہرحال برہمن اور چھتری لوگ تجارت اور کاروبار کو اپنے لئے ذلت سمجھتے تھے اور دولت کتنی ہی خوشگوار کیوں نہ ہو، اس کی تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ زمین کی ملکیت، جاگیری عہد کی طرح اب بھی عزت کی نشانی اور علم و فضل بجائے خود قابلِ احترام سمجھا جاتا۔ برطانوی دورِ حکومت میں سرکاری ملازمت کا بڑا رعب اور

بڑی شان تھی اور پھر اس میں مالی اطمینان بھی تھا۔ اور جب ہندوستانیوں کو انڈین سول سروس میں داخل کیا جانے لگا۔ تو یہ ملازمت جو "آسمانی ملازمت کہلاتی تھی (جس کا عرش اعلیٰ وہایٹ ہال تھا) انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے لئے جنت سے کم نہ تھی آزاد پیشے بھی، خصوصاً وکالت، جس میں بعض لوگوں کو بہت بڑی آمدنی تھی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ وکلا لازمی طور پہ سیاسی اور سماجی اصلاح کی تحریکوں کے لیڈر بن گئے۔ سب سے پہلے بنگالیوں نے قانونی پیشہ اختیار کیا اُن میں سے بعض کو بہت بڑی کامیابی ہوئی اور ان کی وجہ سے اس پیشے کی شان بڑھ گئی۔ یہی لوگ سیاسی لیڈر بھی تھے۔ مگر وہ صنعت کے کاروبار میں نہ کھپ سکے شاید اس لئے کہ اُن میں اس کی صلاحیت موجود نہ تھی یا دوسری وجوہ سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب صنعت نے ملک کی زندگی میں اہمیت حاصل کی اور سیاست پر اثر انداز ہوئی تو بنگال سیاسی میدان میں اپنی قیادت قائم نہ رکھ سکا۔

پہلے بنگالی اپنے صوبے سے نکل کر سرکاری ملازمت اور دوسرے کاموں کے سلسلے میں اور صوبوں میں پھیل گئے تھے اب دھارے کا رُخ بدل گیا اور دوسرے صوبوں کے لوگ بنگال میں خصوصاً کلکتہ پہنچے اور وہاں کی صنعتی اور تجارتی زندگی پر چھا گئے۔ کلکتہ انگریزی سرمایہ اور صنعت کا خاص مرکز تھا اور اب بھی ہے اور وہاں کے کاروبار پر انگریز اور اسکاچ حاوی ہیں۔ لیکن اب مارواڑی اور گجراتی ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ کلکتہ کا معمولی کاروبار بھی زیادہ تر غیر بنگالی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ہزاروں ٹیکسی ڈرائیور تقریباً سب کے سب پنجابی سکھ ہیں۔ بمبئی ہندوستانی سرمایہ داروں کی

صنعت، تجارت، ساہوکارے اور بیمہ وغیرہ کا مرکز بن گیا۔ پارسی، گجراتی، اور مارواڑی ان سب کاموں میں پیش پیش تھے اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ مہاراشٹر کے لوگوں یعنی مرہٹوں نے اس میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ یوں تو بمبئی ایک آفاقی شہر ہے مگر اس کی خاص آبادی مرہٹوں اور گجراتیوں پر مشتمل ہے۔ مرہٹوں نے آزاد پیشوں میں اور علم و فضل میں خاص امتیاز حاصل کیا ہے اور اپنی روایات کے مطابق سپاہی بھی اچھے ہیں ان کی بہت بڑی تعداد کپڑے کے کارخانوں میں مزدوری کرتی ہے۔ وہ جفاکش اور مضبوط ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر غریب ہیں۔ وہ شیواجی کی روایات پر اور اپنے آباء و اجداد کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ گجراتی نسبتاً زیادہ نازک اندام نرم خو، اور خوش حال ہیں تجارت اور بیوپار سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ شاید یہ اختلاف زیادہ تر جغرافی حالات پر مبنی ہے۔ کیونکہ مرہٹوں کا ملک بنجر اور سنگلاخ پہاڑی علاقہ ہے اور گجرات ایک زرخیز خطّہ ہے۔

ہندوستان کے مختلف حصّوں میں اس قسم کے اختلافات کا مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ یہ اختلافات اب بھی موجود ہیں اگرچہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ مدراس، ذہانت اور قابلیت میں امتیاز رکھتا ہے اس نے نامور فلسفی، ریاضی داں اور ماہرین سائنس پیدا کئے ہیں اور اب بھی پیدا کر رہا ہے۔ بمبئی نے کاروبار کو اس کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ اپنا لیا ہے۔ بنگال نے جو صنعت اور تجارت میں نسبتاً پسماندہ ہے بعض بہت اچھے ماہرین سائنس پیدا کئے ہیں اور فنون لطیفہ اور ادب میں خاص طور پر کمال حاصل کیا ہے۔ پنجاب سے بڑی بڑی شخصیتیں تو پیدا نہیں ہوئیں

مگر یہ ایک ترقی کرنے والا صوبہ ہے اور بہت سے میدانوں میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے باشندے علی قسم کے لوگ ہیں۔ یہ بہت اچھے مستری ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کاروبار، اور معمولی پیمانے کی صنعتوں میں بہت کامیاب ہیں۔ صوبہ متحدہ (اور دہلی) ایک معجون مرکب ہے اور ایک لحاظ سے ہندوستان کا خلاصہ ہے۔ یہ صوبہ قدیم ہندو تہذیب کا، اور اُس ایرانی تہذیب کا جو افغانوں اور مغلوں کے دور میں آئی تھی خاص مرکز ہے۔ اسی لئے یہاں ان دونوں تہذیبوں کا سنگم نظر آتا ہے جس میں مغربی تہذیب کا چشمہ آکر مل گیا ہے۔ اور سب حصوں کے مقابلے میں یہاں صوبجاتی تعصب کم ہے عرصہ دراز سے یہ علاقہ اپنے آپ کو ہندوستان کا قلب سمجھتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اسے اسی نظر سے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ عام بول چال میں یہ ہندوستان کہلاتا ہے۔

یہ اختلافات جغرافی ہیں مذہبی نہیں ہیں۔ ایک بنگالی مسلمان بہ نسبت ایک پنجابی مسلمان کے بنگالی ہندو سے کہیں زیادہ قریب ہے یہی حالت اور صوبوں کی بھی ہے۔ اگر بنگالی ہندو اور مسلمان ہندوستان کے کسی حصے میں یا اور کسی ملک میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو فوراً آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ پنجابی بھی خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو یا سکھ یہی کرتے ہیں۔ بمبئی کے مسلمان (خوجے، میمن اور بوہرے) بہت سے ہندوانہ رسوم کے پابند ہیں خوجوں (آغا خاں کے پیرووں) اور بوہروں کو شمالی ہند کے مسلمان راسخ العقیدہ نہیں سمجھتے۔

مسلمان، بحیثیت مجموعی خاص طور پر بنگال اور شمالی ہند کے مسلمان نہ صرف انگریزی تعلیم سے دور رہے بلکہ انھوں نے صنعتی ترقی میں

بھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ کچھ تو جاگیری انداز فکر کا نتیجہ تھا اور کچھ اس بات کا (کہ رومن کیتھولک مذہب کی طرح) اسلام نے سود خواری کی ممانعت کردی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ روپے کا لین دین کرنے میں بدنام ہیں۔ ان پٹھانوں کا ایک خاص قبیلہ ہے جو سرحد کے قریب کسی مقام کا رہنے والا ہے۔ غرض مسلمان انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگریزی تعلیم میں پسماندہ تھے اس لئے وہ مغربی فکر سے بہت کم متاثر تھے اور سرکاری ملازمتوں اور صنعتی کاروبار میں ان کا حصہ بہت کم تھا۔

ہندوستان میں صنعت نے تمام رکاوٹوں کے باوجود آہستہ آہستہ خاصی ترقی کرلی لیکن اس سے عوام کے افلاس میں کچھ فرق نہیں پڑا اور زمین پر جو حد سے زیادہ بوجھ تھا اس میں کمی نہیں ہوئی۔ بے روزگاروں کی لاکھوں کی تعداد میں سے چند ہزار صنعت میں لگ گئے۔ یہ تبدیلی بہت خفیف تھی اور اس نے اس مسئلے پر کوئی اثر نہیں ڈالا کہ ملک میں شہر اور قصبے دیہات بنتے چلے جاتے تھے۔ عام بے روزگاری اور زراعت پر حد سے زیادہ بوجھ ہونے کی وجہ سے مزدوروں کو ترک وطن کرکے دوسرے ملکوں میں جانا پڑا۔ اور وہاں ہر قسم کی ذلت برداشت کرنی پڑی۔ وہ عموماً جنوبی افریقہ، فیجی، ٹرینیڈاڈ، جمائکا، گیانا، مارشس، سیلون، برما اور ملایا گئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے طبقے یا افراد جن کو بدیسی حکومت کے زیر سایہ بڑھنے اور پنپنے کا موقع ملا عوام سے، جن کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی بالکل بے تعلق تھے۔ ان طبقوں کے پاس کچھ سرمایہ اکٹھا ہوگیا اور رفتہ رفتہ مزید ترقی کی صورتیں پیدا ہوگئیں۔ لیکن غربت اور بے روزگاری کا مسئلہ بنیادی طور پر جوں کا توں رہا۔

۱۰۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی اصلاح اور دوسری تحریکیں

مغرب کا اثر ہندوستان پر دراصل انیسویں صدی میں صنعتی تبدیلیوں اور دوسری تحریکوں کے ذریعے سے پڑا۔ خیالات کی دنیا میں بھی ایک ہیجان اور انقلاب پیدا ہوا۔ ذہنی افق، جو عرصہ دراز سے محدود ہو کر رہ گیا تھا، وسیع ہوا۔ پہلا ردعمل جو انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود تھا، یہ ہوا کہ ہر مغربی چیز اچھی سمجھ کر قبول کر لی گئی۔ کچھ ہندو، ہندوانہ رسم و رواج سے متنفر ہو کر عیسائیت کی طرف مائل ہوئے اور بنگال میں بعض بڑے بڑے لوگوں نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا۔ ان حالات سے متاثر ہو کر راجہ رام موہن رائے نے ہندو مذہب کو نئے ماحول اور اس کے مخصوص تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہا۔ چنانچہ انھوں نے برہمو سماج کی تحریک شروع کی جس کی بنیاد عقلیت اور سماجی اصلاح پر قائم تھی۔ ان کے جانشین کیشب چندر سین نے اس کو عیسائیت سے قریب تر کر دیا۔ برہمو سماج نے بنگال کے ترقی کرنے والے متوسط طبقے کو متاثر کر لیا مگر ایک مذہبی عقیدے کی حیثیت سے وہ محض چند افراد تک محدود رہا مگر ان میں بعض ممتاز شخصیتیں اور خاندان شامل تھے۔ لیکن یہ خاندان بھی سماجی اور مذہبی اصلاح کے پرجوش حامی ہونے کے باوجود، ہندوستان کے قدیم فلسفہ و روایات کی طرف مائل تھے۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی یہ رجحانات کارفرما تھے وہاں بھی مروجہ ہندو مذہب کے سخت اور بے لوچ نظام سے بیزاری پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک اہم اصلاحی تحریک سوامی دیانند سرسوتی

نے شروع کی۔ وہ گجرات کے رہنے والے تھے گران کی تحریک نے پنجاب کے ہندوؤں میں مقبولیت حاصل کی۔ یہ آریہ سماجی تحریک کہلاتی تھی، اور لوگوں کو ویدوں کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی تھی۔ اس کا مطلب دراصل یہ تھا کہ ویدوں کے زمانے کے بعد سے آرین عقیدے میں جو کچھ تبدیلیاں ہوئیں اُن کو ایک قلم مسترد کر دیا جائے۔ ویدانت کا سارا فلسفہ جس نے آگے چل کر نشو ونما پائی۔ وحدت وجود کا مرکزی تخیل اور ہمہ اوست کا نظریہ، اس کے نزدیک اتنا ہی قابل اعتراض تھا جتنی وہ ادنیٰ درجے کی تبدیلیاں جو عوام میں مقبول ہوئیں۔ ویدوں کی تعبیر بھی اس نے ایک خاص انداز میں کی۔ آریہ سماج درحقیقت اسلام اور عیسائیت کے اثرات کا ردعمل تھا۔ خصوصاً اسلام کے اثر کا ایک طرف یہ ایک اندرونی اصلاحی اور مجاہدانہ تحریک تھی اور دوسری طرف بیرونی حملوں کے مقابلے میں ایک مدافعانہ تنظیم آریہ سماج نے ہندو مت میں تبلیغ کو رواج دیا اور اس طرح اس میں اور دوسرے تبلیغ کرنے والے مذاہب میں تصادم پیدا ہوگیا۔ وہ اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کی زندگی کے ہر پہلو کو دوسرے مذاہب کی مداخلت سے محفوظ رکھے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ تحریک زیادہ تر پنجاب اور صوبجات متحدہ کے متوسط طبقے کے ہندوؤں میں پھیلی۔ ایک زمانے میں حکومت اس کو ایک سیاسی انقلابی تحریک سمجھتی تھی مگر چونکہ اس میں سرکاری ملازمین کی ایک بڑی تعداد شامل تھی اس لئے یہ اندیشہ جاتا رہا۔ اس لئے لڑکوں اور لڑکیوں میں تعلیم پھیلانے عورتوں کی حالت کو سدھارنے اور پسماندہ طبقوں کو اُبھارنے میں قابل قدر خدمت انجام دی۔

کم و بیش اسی زمانے میں بنگال میں ایک بزرگ تھے جو سوامی دیانند سے بہت مختلف تھے اور ان کی بزرگی نے جدید انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو بہت متاثر کیا۔ شری رام کرشن پرم ہنس ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ وہ کوئی عالم نہیں بلکہ ایک با خدا درویش تھے اور انھیں سماجی اصلاح سے بجائے خود کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ چیتن اور دوسرے ہندوستانی عارفوں کے سلسلے سے تعلق رکھتے تھے شدید مذہبیت کے باوجود اُن کے قلب میں بڑی وسعت تھی۔ معرفت کی لگن انھیں مسلمان اور عیسائی صوفیوں کے پاس لے گئی وہ سالہا سال ان کی صحبت میں رہے اور سخت سے سخت ریاضت کرتے رہے۔ آخرکار وہ کلکتے پہنچے اور کالی گھاٹ میں مقیم ہو گئے اور ان کی غیر معمولی شخصیت اور سیرت نے رفتہ رفتہ لوگوں کو متوجہ کرنا شروع کیا۔ جو لوگ اُن سے ملنے آتے، اور ان میں بعض ایسے بھی جو اس سیدھے سادے مذہبی آدمی کی ہنسی اُڑایا کرتے تھے، وہ ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ بہت سے لوگوں کو جو بالکل مغرب زدہ ہو گئے تھے اُن کے پاس جاکر ایسا معلوم ہوتا کہ اُنھوں نے وہ چیز پا لی جس کی کمی کو وہ محسوس کر رہے تھے۔ مذہبی عقیدے کی بنیادی باتوں پر زور دے کر انھوں نے ہندو مذہب اور فلسفے کے مختلف پہلوؤں میں ایک ربط پیدا کر دیا جس کا زندہ نمونہ خود اُن کی ذات میں نظر آتا تھا۔ بلکہ اُنھوں نے دوسرے مذاہب کو بھی اپنے دائرے میں شامل کر لیا وہ ہر قسم کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے خلاف تھے اور اس پر زور دیتے تھے کہ سب راستے حقیقت کی ایک ہی منزل تک لے جاتے ہیں۔ وہ اُن اولیا کے

مانند تھے جن کا ذکر ہم یورپ اور ایشیا کی تاریخوں میں پڑھتے ہیں۔ عصر جدید کے ماحول میں اُن کی شخصیت کو سمجھنا مشکل ہے تاہم وہ ہندوستانی زندگی کے رنگارنگ نقشے میں اچھی طرح کھپ گئے۔ لوگ ان میں نورِ حقیقت کی جھلک دیکھتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے ان کی شخصیت نے اُن لوگوں پر جنھوں نے ان کو دیکھا تھا گہرا نقش چھوڑا بلکہ بہت سے ایسے لوگ بھی جنھوں نے اُن کو کبھی نہیں دیکھا تھا اُن کی سوانح عمری کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے مثلاً رومین رولاں جس نے اُن کے اور اُن کے خاص شاگرد سوامی وویکا نند کے سوانح حیات مرتب کئے ہیں۔

وویکا نند اور شری رام کرشن کے دوسرے چیلوں نے مل کر فرقہ بندی سے آزاد رام کرشن مشن کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ وویکا نند ماضی کے پرستار تھے ہندوستان کی تہذیبی میراث پر فخر کرتے تھے مگر اس کے باوجود زندگی کے مسائل کو جدید نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے اور اُن کی ذات ہندوستان کے ماضی اور حال کی درمیانی کڑی تھی۔ وہ انگریزی اور بنگلہ میں بہت عمدہ تقریر کرتے تھے اور بنگلہ نثر اور نظم بہت اچھی لکھتے تھے۔ وہ ایک وجیہ اور شاندار پُرتمکین اور باوقار آدمی تھے ان کو اپنے آپ پر اور اپنے مقصد پر پورا بھروسا تھا اور اسی کے ساتھ اُن میں ایک زبردست قوت عمل تھی اور ان کے دل سے لگی تھی کہ ہندوستان کو ترقی کی راہ میں آگے بڑھائیں اُنھوں نے افسردہ دل اور پست ہمت ہندو قوم کو ایک نیا حوصلہ اور نئی قوت بخشی۔ اس میں خوداعتمادی پیدا کر دی اور اس کا رشتہ ماضی سے استوار کر دیا۔ وہ ۱۸۹۳ء میں شکاگو میں مذاہب عالم کی پارلیمنٹ میں شریک ہوئے اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایک سال سے

زیادہ رہے وہ یورپ سے گذرتے ہوئے ایتھنس اور قسطنطنیہ تک پہنچے اور مصر، چین اور جاپان بھی گئے۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے اُن کی شخصیت نے، اُن کی باتوں نے، اور اُن کے اندازِ گفتگو نے ایک ہلچل سی ڈال دی تھا اس ہندوستانیا سی کو ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد اُن کو یا اُس کے پیغام کو فراموش کرنا بہت مشکل تھا۔ امریکہ میں لوگ اُن کو "طوفانی" ہندو کہتے تھے۔ وہ خود بھی مغربی ممالک کے سفر سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اہلِ برطانیہ کے استقلال، اور اہلِ امریکہ کی خوش دلی اور جذبۂ مساوات کے بڑے مداح تھے۔ اُنھوں نے ہندوستان میں اپنے ایک دوست کو لکھا "امریکہ ہر خیال کو پھیلانے کے لئے بہترین میدان ہے" مگر اُن کو مغرب کی مذہبی زندگی متاثر نہ کرسکی اور اُن کا عقیدہ ہندوستان کی فلسفیانہ اور روحانی میراث پر اور زیادہ مستحکم ہوگیا ان کے لئے ہندوستان اتنی پستی کے باوجود مشعلِ ہدایت تھا۔

اُنھوں نے ویدانت کے ادویت فلسفے کی وحدتِ وجود کا پرچار کیا اور اُن کو پورا یقین تھا کہ ذی ہوش انسانوں کا آیندہ مذہب یہی ہوگا اس لئے کہ ویدانت ان کے نزدیک روحانیت کے علاوہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس جدید علمی تحقیقات سے ہم آہنگ ہے جو عالمِ طبیعی کے متعلق کی گئی ہے۔ اس کائنات کو جس خدا نے بنایا وہ کائنات سے جدا نہیں ہے، اسے جس ذہن خلاق نے پیدا کیا وہ مخلوق سے باہر نہیں ہے۔ یہ وہی اپنے آپ کو خلق کرنے والا، اپنے آپ کو فنا کرنے والا۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنے والا لامحدود وجود ہے جسے برہمہ کہتے ہیں" ویدانت کا نصب العین یہ تھا کہ انسان اپنی اندرونی الٰہی فطرت سے ہم آہنگ ہوجائے۔ انسان

یں خدا کا جلوہ دیکھنا ہی حقیقی معرفت الٰہی ہے۔ انسان کل مخلوقات میں سب سے برتر ہے۔ لیکن " ویدانت کے مجرد فلسفے کو روزمرہ زندگی میں شعریت اور حقیقت کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے، وید بالاکے گورکھ دھندے سے واضح اور معین اخلاقی ضابطے مرتب ہونے چاہیئں، یوگ کی طلسمات سے عملی نفسیات اخذ کرنی چاہیئے " ہندوستان کے تنزل کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے دائرے کو تنگ کر لیا تھا، اپنے من کی دنیا میں ڈوب کر باہر کی دنیا سے بے تعلق ہوگیا اور اس طرح اس کی تہذیب ایک فرسودہ اور جامد چیز بن کر رہ گئی تھی ذات پات جو اپنی ابتدائی شکل میں ضروری اور پسندیدہ چیز تھی جس کا مقصد انفرادیت اور آزادی کو فروغ دینا تھا، بالکل مسخ تھی اس نے عوام کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ذات پات ایک قسم کی سماجی تنظیم تھی جس کو مذہب سے علیحدہ رکھنا چاہیئے تھا۔ وویکانند اُن بے معنی مابعد الطبیعی بحثوں کو جو ہمنوں سے متعلق ہوا کرتی تھیں خصوصاً اونچے طبقوں کی چھوت چھات کو بہت بُرا کہتے تھے " ہمارا دھرم رسوئی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمارا معبود پکانے کا برتن ہے اور ہمارا مذہب چھوت چھات ہے "

وہ سیاست سے دور اور اپنے زمانے کے سیاسی لیڈروں سے خفا رہتے تھے لیکن انھوں نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ مساوات اور آزادی بہت ضروری چیز ہے اور عوام کی حالت کو سدھارنا چاہیئے خیال اور عمل کی آزادی کے بغیر زندگی اور ترقی اور فراغت ناممکن ہے۔ جہاں یہ آزادی نہ ہوگی، افراد اور قومیں تباہ ہو جائیں گی ہندوستان کی ساری امیدیں عوام سے وابستہ ہیں۔ اونچے طبقے جسمانی اور اخلاقی

طور پر مردہ ہو چکے ہیں" وہ مغرب کی ترقی پسندی اور ہندوستان کی روحانیت میں امتزاج کرنا چاہتے تھے۔ "ایک مغربی طرز کی سماج بناؤ جس میں ہندوستان کی مذہبی روح موجود ہو" مساوات، آزادی، قوت اور عمل کے لحاظ سے پکے مغربی بن جاؤ مگر اپنے مذہبی احساس اور عقائد میں پکے ہندو رہو۔ دویکانند روز بروز بین الاقوامیت کی طرف مائل ہوتے گئے "سیاست اور عمرانیات میں بھی جو مسائل آج سے بیس سال پہلے قومی تھے اب صرف قومی مصالح کی بنا پر حل نہیں کئے جاسکتے ان کا دائرہ اب بہت وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ان کا حل صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اُن کو بین الاقوامی مصالح کی وسیع تر روشنی میں دیکھا جائے۔ آج کل ہر طرف بین الاقوامی تنظیم، بین الاقوامی اتحاد، اور بین الاقوامی قانون کا شور مچا ہوا ہے یہ نوع انسانی کی وحدت کا ثبوت ہے۔ اسی طرح سائنس بھی روز بروز مادہ کے متعلق ایک وسیع تر نقطۂ نظر اختیار کر رہی ہے" ایک اور جگہ اُنھوں نے کہا ہے "کوئی ترقی اُس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ پوری دنیا ساتھ نہ دے اور یہ بات روز بروز واضح ہوتی جارہی ہے کہ کوئی مسئلہ نسلی، قومی یا اس قسم کے کسی اور محدود زاویۂ نظر سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ ہر خیال کو اس قدر وسیع ہونا چاہیئے کہ پوری دنیا کو گھیر لے۔ ہر آرزو کا دایرہ اس حد تک پھیلنا چاہیئے کہ سب انسان بلکہ کل ذی روح اس میں سما جائیں" یہ سب باتیں دویکانند کے فلسفہ ویدانت سے مطابقت رکھتی ہیں جس کا وہ ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک پرچار کرتے رہے۔

"مجھے یقین کامل ہے کہ کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو دوسروں سے الگ کر کے زندہ نہیں رہ سکتی جہاں کہیں عظمت و شان یا مصلحت یا تقدس

کے جھوٹے تخیلات کی بنا پر خلوت گزینی کی کوشش کی گئی اس کا نتیجہ ہمیشہ خلوت گزیں کے حق میں تباہ کن ثابت ہوا" " ہماری پستی کا سبب یہ ہے کہ ہم نے اور سب قوموں سے قطع تعلق کر لیا ہے اور اس کا واحد علاج یہ ہے کہ ہم پھر دنیا کے دھارے میں بہ جائیں۔ حرکت ہی " زندگی کی نشانی ہے "

انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے " میں سوشلسٹ ہوں اس لئے نہیں کہ اس نظام کو مکمل سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ بھوکے پیٹ رہنے سے آدھی روٹی بہتر ہے۔ دوسرے نظام آزمائے جا چکے ہیں، اور ناقص ثابت ہو چکے ہیں۔ آؤ اس کو بھی آزمائیں اگر اور کسی خیال سے نہیں تو اسی خیال سے سہی کہ یہ ایک نئی چیز ہے۔

ووِیکا نند نے بہت سی چیزوں سے بحث کی ہے مگر جس چیز پہ وہ بار بار زور دیتے ہیں وہ ابھے سے یعنی بے خوف رہو مضبوط بنو۔ اُن کے خیال میں انسان شقی ازلی نہیں بلکہ ذات الٰہی کا ایک جزو ہے اس لئے اس کو کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیئے " اگر دنیا میں کوئی گناہ ہے تو وہ کمزوری ہے، کمزوری سے بچو۔ کمزوری گناہ ہے، کمزوری موت ہے اپنشد کی تعلیم بھی یہی تھی۔ خوف برائی کی جڑ ہے خوف کی وجہ سے انسان گریہ وزاری شروع کر دیتا ہے۔ رونا پٹینا بہت ہو چکا۔ رقت کی انتہا ہو گئی۔ " اب ہمارے ملک کو ضرورت ہے اعصاب اور فولادی عضلات کی، اُس چٹانی ارادے کی جس کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ جو کائنات کے طلسم اسرار میں دندانہ گھستا چلا جائے جو اپنے مقصد کو ہر حال میں پورا کر کے رہے خواہ اس کے لئے سمندر کی تہ میں جانا پڑے خواہ موت کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنی پڑیں" وہ ہمارے مروجہ عقائد کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں" یہ مخفی علوم اور تصوّف .... یہ شب رُد تصورات ہو سکتا ہے کہ ان میں بہت بڑے حقائق پنہاں ہوں لیکن انھوں نے ہمیں قریب قریب تباہ کر دیا ہے .... حق کا معیار یہ ہے ہر اُس چیز کو جو تمھیں جسمانی ذہنی اور روحانی حیثیت سے کمزور کرتی ہے زہر ہلاہل سمجھو اور اس سے پرہیز کرو اس میں کوئی زندگی کا شائبہ بھی نہیں ہے وہ ہرگز حق نہیں ہو سکتی۔ حق قوت اور حیات بخشتا ہے حق عفت کا نام ہے، حق کمال علم کا نام ہے۔ تصوّف، باوجود اس کے کہ اس میں حقیقت کی ایک جھلک موجود ہے ضعف پیدا کرتا ہے ....
اپنے اپنشدوں کی طرف رجوع کرو جن سے قوت اور بصیرت اور روشنی حاصل ہوتی ہے ان سب پُراسرار، کمزور کرنے والی چیزوں کو چھوڑ دو اور اس فلسفے کو اختیار کرو۔ بڑے سے بڑے حقائق خود تمھارے وجود کی

نوٹ :- ان اقتباسات میں سے اکثر کے ماخذ حسب ذیل ہیں۔ وویکانند کی" کولمبیا سے المورہ تک کی تقریریں" مطبوعہ ۱۹۲۲ء اور" سوامی وویکانند کے خطوط" مطبوعہ ۱۹۴۲ء شائع کردہ ادویت آشرم"
مایاوتی، المورہ خطوط کے مجموعے میں صفحہ ۴۹۰ پر ایک خط خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ جو وویکانند ایک مسلمان دوست کو لکھتے ہیں :-
"خواہ ہم اس کو ویدانتی فلسفہ کہیں یا اور کسی لفظ سے تعبیر کریں حقیقت یہ ہے کہ ادویت کا عقیدہ مذہب اور فکر کے سلسلے میں حرف آخر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے سب مذہبوں اور فرقوں کو محبت کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ (بقیہ آیندہ صفحہ پر

طرح سہل اور سادہ ہوتے ہیں"۔ سب سے زیادہ وہ توہمات سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں" میرے نزدیک اگر آپ میں سے ہر شخص ملحد ہو جائے تو اس سے بہتر ہے کہ آپ توہم پرست اور سادہ لوح بن کر رہ جائیں۔ اس لئے کہ ملحد ایک جیتا جاگتا انسان ہے اور اس سے کوئی کام لیا جا سکتا ہے۔ توہم پرستی وہ چیز ہے کہ جہاں اس کا دخل ہوا، عقل غائب ہو جاتی ہے، دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور زندگی کی سطح پست ہو جاتی ہے .... اسرار پرستی اور ضعیف الاعتقادی ہمیشہ کمزوری کی نشانی ہوتی ہے۔"

اس طرح وویکا نند کی آواز ہندوستان کے انتہائی جنوبی گوشے

(بقیہ نوٹ گذشتہ صفحہ کا) ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ آئندہ روشن خیال انسانیت کا مذہب ہوگا۔ ممکن ہے ہندوؤں کو یہ شرف حاصل ہو کہ وہ اوروں سے پہلے اس حقیقت کو پالیں، اس لئے کہ ان کی نسل عبرانی اور عربی نسل سے بھی زیادہ قدیم ہے لیکن عملی ادویت جس کی بدولت انسان کل بنی آدم کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہے ابھی خود ہندوؤں میں عام طور پر موجود نہیں ہے۔

بلکہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اگر کسی مذہب کے پیرو اس قسم کی مساوات برتتے ہیں۔ خواہ انھیں عام طور پر اس کی فلسفیانہ اہمیت کا شعور نہ ہو جو ہندوؤں کو بہ خوبی حاصل ہے۔ تو وہ صرف ایک ہی مذہب ہے یعنی اسلام" مادر وطن کی امیدوں کا دارومدار اس پر ہے کہ یہ دونوں عظیم الشان نظام یعنی اسلام اور ہندویت اس طرح مل جائیں کہ اسلام کا پیکر ہو اور ویدانت کا دماغ۔ "میری چشم تخیل کو آنے والا مکمل ہندوستان شاندار اور ناقابل تسخیر اس بحران و ہیجان سے ابھرتا ہوا نظر آرہا ہے، اور وہ اسلام کا پیکر اور ویدانت کا دماغ رکھتا ہے۔"

راس کماری سے لے کر ہمالیہ کی بلندیوں تک گونجتی رہی یہاں تک کہ وہ ۱۹۰۲ء میں انتالیس سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔

وویکا نند کے ایک ہم عصر، جو در اصل ان کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، رابندر ناتھ ٹیگور تھے۔ انیسویں صدی عیسوی میں ٹیگور خاندان نے بنگال میں مختلف اصلاحی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس خاندان میں بڑے بڑے مذہبی آدمی اور اچھے اچھے فن کار اور مصنف پیدا ہوئے لیکن رابندر ناتھ ٹیگور ان سب سے بلند تر شخصیت رکھتے تھے اور رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں ان کی عظمت مسلم ہوگئی۔ ان کی تخلیقی جد و جہد ۶۰ برس تک جاری رہی اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ آج کل لوگوں میں سے ہوں۔ وہ سیاسی آدمی نہ تھے مگر اس درجہ حساس تھے اور انھیں ہندوستان کی آزادی اس قدر عزیز تھی، کہ وہ ہمیشہ شعر اور نغمے کے خلوت خانے میں نہیں رہ سکتے تھے۔ جب کبھی حالات ناقابل برداشت ہو جاتے تھے تو وہ گوشۂ خلوت سے باہر آکر پیمبرانہ شان سے حکومت برطانیہ یا خود اپنی قوم کو متنبہ کرتے تھے۔ انھوں نے اس سودیشی تحریک میں جو بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں سارے بنگال میں پھیل گئی تھی، نمایاں حصہ لیا۔ پھر امرتسر کے قتل عام کے موقع پر انھوں نے اپنا نائٹ کا خطاب واپس کر دیا۔ تعلیم کے میدان میں ان کے تعمیری کام نے جو انھوں نے بہت خاموشی سے شروع کیا تھا، شانتی نکیتن کو ہندوستانی تہذیب کا ایک اہم مرکز بنا دیا ہے۔ ہندوستانی ذہن پر خصوصاً اُن نسلوں پر جو ان کے سامنے پیدا ہوئیں ان کا بہت گہرا اثر پڑا۔ نہ صرف بنگالہ جس میں وہ خود لکھتے ہیں، بلکہ ہندوستان کی سب موجودہ زبانیں ایک حد تک ان کی تصانیف سے متاثر ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ

انھوں نے مشرق و مغرب کے تصورات کو ہم آہنگ کرنے میں مدد دی اور اس طرح ہندوستانی قومیت کی بنیادوں کو وسیع کیا وہ بین الاقوامیت کے بہت بڑے حامی تھے اور مختلف قوموں میں اشتراک عمل پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کا پیام دوسرے ملکوں اور دوسرے ملکوں کا پیام ہندوستان پہنچایا۔ مگر بین الاقوامیت کے باوجود ان کے قدم ہندوستان کی زمین میں مضبوطی سے گڑے ہوئے تھے اور ان کا ذہن اپنشدوں کی حکمت سے معمور تھا۔ عام دستور کے خلاف جیں جوں ان کی عمر زیادہ ہوتی گئی وہ اپنے خیالات میں اور زیادہ انتہا پسند ہوتے گئے۔ انفرادیت کے پرستار ہونے کے باوجود وہ روسی انقلاب کی برکات کے معترف تھے خصوصاً اُن کارناموں کے جو اس نے تعلیم، تہذیب اور صحت عامہ کی ترقی اور روح مساوات کے پیدا کرنے میں دکھائے۔ قومیت ایک تنگ نظرانہ عقیدہ ہے خصوصاً جب اس کا تصادم ایک تحکم پسند شہنشاہیت سے ہو تو وہ لوگوں میں ناکامی اور بے بسی کا احساس اور طرح طرح کی نفسی اُلجھنیں پیدا کر دیتی ہے۔ ٹیگور نے گاندھی کی طرح ہندوستان کی بہت بڑی خدمت کی کہ اس نے لوگوں کو ایک حد تک فکر و نظر کے تنگ دائرے سے نکال کر اُن وسیع تر مسائل پر غور کرنے پر آمادہ کیا جو تمام عالم انسانیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ٹیگور ہندوستان کے سب سے بڑے محب انسانیت تھے۔

بیسویں صدی کے اس نصف اول میں ٹیگور اور گاندھی کی شخصیتیں یقیناً ہندوستان میں سب سے زیادہ نمایاں اور سارے ملک پر چھائی ہوئی تھیں ان کا تقابل اور تضاد سبق آموز ہے۔ دونوں کی طبیعت اور مزاج میں زمین و

آسمان کا فرق تھا، ٹیگور ایک سیرزا ملش فن کار تھے جو اپنی جمہوریت پسندی کی وجہ سے عوام کے ہمدرد بن گئے تھے۔ وہ ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایات کے نمائندے تھے جس کا تقاضہ یہ تھا کہ انسان زندگی کی وسعتوں کی قدر کرے اور رقص و نغمے سے لطف اندوز ہو۔ گاندھی، جو عوام سے قریب تر اور ہندوستانی کسان کا نمونہ تھے۔ ہندوستان کی دوسری قدیم روایت یعنی ترک دنیا اور ریاضت کے علم بردار تھے اس کے باوجود ٹیگور دراصل ایک مفکر تھے اور گاندھی سراپا عمل۔ دونوں اپنے اپنے طور پر بین الاقوامیت کے حامی تھے مگر اسی کے ساتھ ہندوستانیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے دو مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ ٹیگور اور گاندھی کے سلسلے میں ہم موجودہ زمانے تک پہنچ گئے۔ لیکن اصل میں ہم پچھلے دور کا ذکر کر رہے تھے اور یہ دکھا رہے تھے کہ دویکانند اور دوسرے حضرات جس طرح ہندوستان کی گذشتہ عظمت پر زور دیتے تھے اور اس کے شاندار ماضی پر فخر کرتے تھے اس کا لوگوں پر خصوصاً ہندوستانیوں پر کیا اثر پڑا۔ خود دویکانند لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ ماضی میں بالکل گم ہو کر نہ رہ جائیں۔ بلکہ مستقبل پر بھی نظر رکھیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "اے خدا ہمارا ملک کب تک ماضی کی مالا جپتا رہے گا"۔ لیکن یہ ماضی کا جادو خود اُن کا اور اُن کے ساتھیوں کا جگایا ہوا تھا اور اس میں ایک خاص کشش تھی جس سے بچنا ناممکن تھا۔

ماضی کی یاد سے تسکین اور تقویت حاصل کرنے کا رجحان قدیم ادب اور تاریخ کے مطالعہ سے اور بڑھا خصوصاً اس انکشاف کے بعد کہ

مشرقی سمندروں میں ہندوستان کی نوآبادیاں موجود تھیں ہندوؤں کے متوسط طبقے کے دل میں اپنے روحانی اور قومی ورثہ پر اعتماد اور فخر کا جذبہ پیدا کرنے میں مسز اینی بیسنٹ کو بہت دخل تھا ان سب تحریکات میں ایک روحانی اور مذہبی رنگ موجود تھا۔ مگر اس کا پس منظر سیاسی تھا۔ نئے متوسط طبقے سیاسی رجحانات رکھتے تھے انھیں مذہب کی کچھ زیادہ تلاش نہ تھی لیکن وہ ایک تہذیبی لنگر ضرور چاہتے تھے جس کا سہارا لے سکیں، کچھ ایسی روایات جن سے اُنھیں اپنی برتری کا یقین ہو اور وہ ناکامی اور بے بسی کا احساس کم ہو جو بدیسی حکومت نے پیدا کر دیا تھا۔ ہر ایک ملک میں جہاں جذبۂ قومی نشو و نما پا رہا ہو مذہب سے بالکل الگ تہذیبی روایات کی تلاش ہوتی ہے اور ماضی کی نظریں دوڑائی جاتی ہیں۔ ایران نے اپنے مذہبی عقائد میں کسی قسم کی کمزوری پیدا کئے تغیر، خاص کرکے اپنے زمانۂ قبل اسلام کی شوکت و عظمت کی داستانوں کو دہرایا اور اس کی یاد سے اپنی موجودہ قومیت کی تعمیر میں فائدہ اُٹھایا دوسرے ملکوں میں بھی یہی ہوا۔ ہندوستان کا ماضی، اپنی ساری تہذیبی عظمت اور تنوع کے ساتھ سب ہندوستانیوں یعنی ہندو، مسلمان، عیسائی اور دوسری قوموں کی مشترکہ میراث تھا اور ان کے آبا و اجداد نے اس کی تعمیر میں حصّہ لیا تھا۔ مذہبی عقیدے کی تبدیلی نے اُن کو اس ورثہ سے محروم نہیں کیا۔ آخر یونانی، عیسائیت قبول کرنے کے بعد بھی بزرگوں کے کارناموں پر نازاں رہے۔ اور اطالوی تبدیلی مذہب کے بعد بھی جمہوریہ روما اور ابتدائی سلطنت روما کے شاندار زمانے پر فخر کرتے رہے۔ اگر ہندوستان کے سب باشندے اسلام لے آئے ہوتے یا عیسائیت قبول کر لیتے تب بھی یہ تہذیبی ورثہ اُن کا حوصلہ بڑھانے اور ان میں

وہ تمکین و وقار پیدا کرنے کے لئے کافی تھا جو کسی قوم کو ایک عرصے تک مہذب زندگی بسر کرنے اور مسائل حیات سے ذہنی کشمکش میں مصروف رہنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

اگر ہم ایک آزاد قوم ہوتے تو ہم سب موجودہ زمانے میں ایک مشترک مستقبل کی تعمیر کی کوشش کرتے اور ہم سب اپنے مشترک ماضی پر یکساں فخر کرتے ۔ بلاشبہ، مغلوں کے عہد حکومت میں، خود شہنشاہ اور اُن کے خاص خاص امرا، باوجود نووارد ہونے کے، اپنے آپ کو ہندوستان کے ماضی سے وابستہ کرنا چاہتے تھے اور اس پر فخر کرنے میں دوسروں کے ساتھ شریک ہونا چاہتے تھے ۔ لیکن تاریخ کے حادثات اور عمل نے جسے انسان کی پالیسی اور اس کی کمزوری سے مدد ملی حالات کا رُخ بدل دیا اور جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انھوں نے فطری ارتقا کو روک دیا۔ یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ جدید متوسط طبقہ جو مغرب کے سابقے اور صنعتی اور معاشی تبدیلیوں کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا ہے ۔ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک ہی رنگ کا ہوگا ایک حد تک ایسا ہوا بھی تاہم اس طبقے میں ایسے فرقہ وارانہ اختلافات پیدا ہوگئے جو جاگیری طبقے اور عوام میں موجود نہ تھے یا بہت کم تھے ۔ہندو اور مسلم عوام میں باہم تمیز کرنا مشکل تھا اور قدیم امرا کا طرز خیال اور طرز زندگی بھی یکساں تھا وہ اب تک ایک مشترک تہذیب کے حامل تھے اور اُن کے رسم ورواج اور تہوار بھی مشترک تھے ۔ مگر متوسط طبقوں میں نفسیاتی حیثیت سے اور آگے چل کر دوسری حیثیتوں سے بھی اختلاف پیدا ہوگیا ۔ شروع میں متوسط طبقے مسلمانوں میں تقریباً معدوم تھے ۔ ایک مدت تک وہ مغربی تعلیم سے گریز کرتے رہے تجارت اور صنعت سے دور رہے اور پُرانے جاگیری نظام کے

دلدادہ رہے ہندوؤں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا جس سے اُنھوں نے پورا فائدہ اُٹھایا اور برابر آگے ہی رہے۔ برطانوی پالیسی عام طور پر ہندوؤں کے موافق اور مسلمانوں کے خلاف رہی۔ سوا پنجاب کے کہ جہاں مسلمانوں نے دوسری جگہوں کی بہ نسبت مغربی تعلیم کو زیادہ آسانی سے قبول کر لیا لیکن دوسرے مقامات کے ہندو، پنجاب پر برطانوی تسلط ہونے سے پہلے ہی، بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ پنجاب میں بھی، باوجود اس کے کہ عام حالات ہندو مسلمانوں کے لئے تقریباً یکساں تھے ہندوؤں کو سیاسی حیثیت سے برتری حاصل تھی۔ بدیسی حکومت سے بیزاری کا جذبہ ہندو مسلم امراء اور عوام میں مشترک تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں دونوں شریک تھے لیکن مسلمانوں کو شدت سے اس بات کا احساس تھا اور بالکل بجا تھا کہ اس کے فرو کرنے کے سلسلے میں اُن پر زیادہ سختیاں کی گئیں اور انھیں بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ دہلی کی سلطنت کو نئے سرے زندہ کرنے کا خواب ہمیشہ کے لیئے ختم ہو گیا۔ دراصل یہ سلطنت انگریزوں کا زور پکڑنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس کو مرہٹوں نے مسمار کر دیا تھا اور خود دہلی میں اُن کا حکم چلتا تھا۔ پنجاب میں رنجیت سنگھ کا راج تھا۔ مغل حکومت شمالی ہند میں بغیر برطانیہ کی مداخلت کے تقریباً ختم ہو چکی تھی اور جنوبی ہند میں تو اس کا شیرازہ بالکل بکھر گیا تھا۔ تاہم نام نہاد شہنشاہ دہلی کے محل میں اب تک موجود تھا اور اگرچہ وہ پہلے مرہٹوں کا اور پھر انگریزوں کا گذارہ دار تھا مگر اتنا ضرور تھا کہ شاہانِ مغلیہ کی ایک نشانی باقی تھی۔ بغاوت کے دوران میں لازمی طور پر باغیوں نے باوجود اس کی کمزوری اور نارضامندی کے اس کے نام سے یہ رہی سہی نشانی بھی ختم ہو گئی۔

جب لوگ رفتہ رفتہ غدر کی ہولناک تباہی سے نکلے تو اُن کے ذہنوں میں ایک خلا تھا ۔ اور انھیں کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جو اس خلا کو پُر کردے۔ برطانوی حکومت کو تو چار و ناچار قبول کرنا ہی پڑا مگر ماضی سے قطع تعلق کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ حکومت بدل گئی بلکہ لوگوں کے دلوں میں تردد اور انتشار پیدا ہو گیا اور انھیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا۔ دراصل یہ قطع تعلق غدر سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اسی کی وجہ سے بنگال وغیرہ میں وہ تحریکیں شروع ہوئی تھیں جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں لیکن مسلمان اس زمانے میں عام طور پر ہندوؤں سے کہیں زیادہ خلوت پسند تھے وہ مغربی تعلیم سے بھاگتے تھے اور پرانے نظام کو دوبارہ قائم کرنے کا خواب دیکھا کرتے تھے اب یہ خواب باطل ہو چکا تھا مگر پھر بھی انھیں کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جس کا سہارا لے سکیں ۔ جدید تعلیم سے وہ اب بھی دور رہنا چاہتے تھے ۔ بہت کچھ بحث مباحثے کے بعد ، بڑی مشکل سے سر سید احمد خاں نے رفتہ رفتہ ان کے ذہن کو انگریزی تعلیم کی طرف مائل کیا اور علی گڈھ کالج کی بنا ڈالی سرکاری ملازمت کی یہی ایک راہ تھی اور اس ملازمت کی کشش پرانے تعصبات اور بیزاری پر غالب آگئی ۔ یہ دلیل کہ ہندو تعلیم اور ملازمت میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں موثر ثابت ہوئی اور مسلمان اس معاملے میں اُن کی ریس کرنے لگے ۔ پارسی اور ہندو صنعت اور کاروبار میں ترقی کر رہے تھے لیکن مسلمانوں کی ساری توجہ سرکاری ملازمت پر مرکوز تھی ۔

لیکن اُن کی یہ سرگرمیاں بھی ، جو درحقیقت ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود تھیں ، اُن کے ذہن کے انتشار اور تردد کو دور نہ کر سکیں ۔ ہندوؤں نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ماضی کے آغوش میں پناہ لی تھی ۔ قدیم فلسفے اور

ادب آرٹ اور تاریخ کا مطالعہ اُن کے لئے باعث تسکین ثابت ہوا تھا۔ رام موہن رائے، دیا نند، دویکا نند اور دوسرے حضرات نے نئی ذہنی تحریکیں شروع کی تھیں۔ ایک طرف وہ انگریزی ادب کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے تھے اور دوسری طرف اُن کے ذہن ہندوستان کے قدیم رشیوں اور سورماؤں کے افکار اور اعمال کی یاد سے اور ان اساطیر اور روایات سے معمور تھے جو وہ بچپن سے سُنتے آئے تھے۔

ان میں سے بہت سی چیزوں میں مسلم عوام بھی ہندوؤں کے ساتھ شریک تھے اس لئے کہ وہ ان قدیم روایات سے بخوبی آشنا تھے لیکن اب مسلمان خصوصاً اونچے طبقے کے لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے لئے ان نیم مذہبی روایات سے تعلق رکھنا مناسب نہیں اور ان کا مسلمانوں میں رواج پانا اسلام کے منافی ہے۔ انھوں نے اپنی قومیت کی بنیادیں دوسری جگہ تلاش کیں ایک حد تک یہ بنیادیں تاریخ ہند کے افغان اور مغل دور میں ملیں۔ مگر اس سے وہ خلا جو اُن کے ذہن میں تھا پُر نہ ہو سکا یہ دونوں دور ہندوؤں مسلمانوں میں مشترک رہے تھے اور ہندوؤں کے دل سے یہ احساس دور ہو چکا تھا کہ مسلمان حکمرانوں کی حکومت بدیسی حکومت تھی۔ مغل بادشاہ ہندوستان کے قومی بادشاہ تصوّر کئے جاتے تھے اگرچہ اورنگ زیب کے معاملہ میں کچھ اختلاف رائے تھا یہ بات معنی خیز ہے کہ اکبر کو جسے ہندو خاص طور پر پسند کرتے ہیں مسلمان پچھلے چند سال سے ناپسند کرنے لگے ہیں۔ پچھلے برس ہندوستان میں اکبر کی چہار صد سالہ سالگرہ منائی گئی، ہر طبقے کے لوگ، جن میں بہت سے مسلمان بھی تھے اس میں شریک ہوئے۔ مگر مسلم لیگ اس سے بالکل الگ رہی اس لئے کہ اکبر کی ذات ہندوستان کے اتحاد کی علامت تھی۔

ان تہذیبی بنیادوں کی تلاش میں ہندوستانی مسلمانوں (یعنی اوسط طبقہ کے لوگوں نے) اسلامی تاریخ کے ان دوروں کی طرف توجہ کی جب اسلامی تہذیب بغداد، اسپین، قسطنطنیہ، وسطی ایشیا اور دوسرے علاقوں میں ایک تخلیقی اور فاتحانہ قوت تھی۔ پہلے سے بھی ہندوستانی مسلمانوں کو تاریخ اسلام سے کچھ نہ کچھ دلچسپی تھی اور ہمسایہ اسلامی ملکوں سے ان کے تھوڑے بہت تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ حج کے موقع پر مختلف ملکوں کے مسلمان مکہ معظمہ میں جمع ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ سارے تعلقات محدود اور سطحی تھے اور ان کا ہندوستان کے مسلمانوں کے دائرہ نظر پر، جو صرف ہندوستان تک محدود تھا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ دلی کے افغان بادشاہ (خصوصاً محمد تغلق) قاہرہ کے عباسی خلیفہ کی قیادت کو تسلیم کرتے تھے۔ قسطنطنیہ کے سلاطین عثمانی خلیفہ بن گئے تھے مگر ہندوستان میں اُن کی خلافت کبھی تسلیم نہیں کی گئی۔ مغل شہنشاہ باہر کے کسی شخص کو خلیفہ یا مذہبی پیشوا نہیں مانتے تھے یہ تو انیسویں صدی کے آغاز کی بات ہے کہ مغل سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کی مساجد میں خطبہ میں سلطان ترکی کا نام لیا جانے لگا۔ غدر کے بعد یہ دستور عام ہو گیا۔

اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو اسلام کی گزشتہ عظمت کی [illegible] سے اور اس خیال سے کہ کم سے کم ترکی میں ایک آزاد مسلم ریاست با[illegible] ہے کچھ نفسیاتی تسکین حاصل ہوئی یہ احساس ہندوستانی قومیت کے خلاف اور اس سے متصادم نہ تھا۔ بہت سے ہندو بھی اسلامی تاریخ سے آشنا اور اس کے معترف تھے۔ انھیں ترکی سے ہمدردی تھی کیونکہ ترک بھی ان کی طرح ایشیائی تھے اور یورپ کی جارحانہ پالیسی کے شکار تھے۔

مگر ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی ہمدردی اتنی گہری نہیں تھی اور ان کی کسی نفسیاتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تھی۔

غدر کے بعد ہندوستانی مسلمان اس حیص بیص میں تھے کہ کون سی راہ اختیار کریں۔ حکومت برطانیہ نے جان بوجھ کر ان پر ہندوؤں کی بہ نسبت بہت زیادہ تشدد کیا تھا اور اس تشدد سے مسلمانوں کے وہ طبقے خاص طور پر متاثر ہوئے تھے جن سے نئے بورژوا طبقے کے پیدا ہونے کا امکان تھا وہ اپنے آپ کو بے بس اور بے کس محسوس کرنے لگے تھے۔ انگریز دشمن اور قدامت پرست ہو گئے برطانوی حکومت نے ان کے متعلق جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی ۱۸۵۸ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان رفتہ رفتہ بدل گئی اور ان کے موافق ہو گئی یہ تبدیلی اسی توازن قوت کے اصول پر مبنی تھی جسے انھوں نے ہمیشہ پیش نظر رکھا تھا مگر اس میں سر سید احمد خاں کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ اُن کو یقین تھا کہ مسلمانوں کی ترقی صرف اسی طرح ممکن ہے کہ وہ برطانوی حکام کے ساتھ اشتراک عمل کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی تعلیم کو قبول کر لیں اس طرح قدامت پرستی کے تنگ دائرے سے باہر نکلیں سر سید نے یورپی تہذیب کے جو مظاہر دیکھے تھے ان سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے چند خطوط جو انھوں نے یورپ سے لکھے تھے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی نظر مغرب کی چمک دمک سے خیرہ ہو گئی تھی اور وہ اپنا ذہنی توازن قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔

سر سید احمد خاں ایک پُرجوش مصلح تھے اور وہ اسلام اور جدید سائنٹیفک فکر میں مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے انھیں اسلام کے بنیادی

عقائد پر حملہ کرنا مقصود نہ تھا، بلکہ صرف کلام پاک کی عقلی تفسیر کرنا۔ انھوں نے نصرانیت اور اسلام کی بنیادی مشابہت کی طرف توجہ دلائی وہ پردے کے مخالف تھے اور ترکوں کی خلافت کے قائل نہ تھے۔ مگر سب سے زیادہ شغف انھیں جدید تعلیم کو رواج دینے سے تھا قومی تحریک کے شروع ہونے سے وہ بہت کھٹکے کیونکہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر برطانوی حکام کی ذرا سی بھی مخالفت کی گئی تو وہ اپنے تعلیمی پروگرام میں ان کی مدد سے محروم ہو جائیں گے۔ وہ اس مدد کو بہت ضروری سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے مسلمانوں میں برطانیہ کی مخالفت کو دھیما کرنے کی کوشش کی اور اُن کو نیشنل کانگریس سے، جو اس وقت تشکیل پا رہی تھی دور رکھا اُن کے قائم کئے ہوئے علی گڈھ کالج نے جن مقاصد کا اعلان کیا ان میں سے ایک مقصد "ہندوستانی مسلمانوں کو تاج برطانیہ کی اچھی اور مفید رعایا بنانا" بھی تھا۔ وہ نیشنل کانگریس کے اس بنا پر مخالف نہ تھے کہ وہ اس کو ایک ہندو جماعت تصور کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کے خیال میں یہ سیاسی حیثیت سے شدت پسند تھی (حالانکہ اس زمانے میں اس کی پالیسی بہت نرم تھی) اور ان کو برطانیہ کی مدد اور اشتراک عمل کی ضرورت تھی انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ غدر میں مسلمانوں نے بہ حیثیت مجموعی بغاوت نہیں کی اور ان میں سے بہت سے برطانوی حکومت کے وفادار رہے۔ وہ ہرگز ہندوؤں کے مخالف یا تفریق پسند نہ تھے۔ انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ مذہبی اختلافات کی کوئی سیاسی یا قومی اہمیت نہیں ہونی چاہیئے۔ ایک جگہ کہتے ہیں "کیا آپ ایک ہی ملک کے باشندے نہیں ہیں۔ یاد رکھئے کہ ہندو اور مسلمان کے لفظ محض مذہبی امتیاز کے لئے استعمال ہوتے ہیں ورنہ سب لوگ، خواہ

ہندو ہوں یا مسلمان اور وہ عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں، سب کے سب اس لحاظ سے ایک قوم ہیں۔"

سرسید احمد خاں کا اثر مسلمانوں کے اونچے طبقے کے کچھ لوگوں پر ہوا۔ اُنھوں نے شہری یا دیہاتی عوام سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ یہ عوام اپنے اونچے طبقوں سے تقریباً بے تعلق تھے اور ان کے مقابلہ میں ہندو عوام سے بہت قریب تھے۔ مسلمان امراء میں سے کچھ لوگ مغلیہ عہد کے حکمراں خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے مگر عوام اِن روایات کے حامل نہ تھے۔ ان میں سے اکثر ہندو سماج کے پست ترین طبقوں سے تبدیلِ مذہب کے ذریعے مسلمانوں میں شامل ہوئے تھے۔ ان کی حالت بہت افسوسناک تھی وہ انتہائی افلاس میں مبتلا اور استحصال کا شکار تھے۔

سرسیّد کے رفقائے کار میں کئی قابل اور مشہور افراد تھے۔ مذہب کی عقلی تعبیر میں سیّد چراغ علی اور نواب محسن الملک ان کے دست و بازو تھے تعلیمی سرگرمیوں میں منشی کرامت علی، منشی ذکا اللہ دہلوی، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی اور اُردو کے جدید شاعر حالی نے ان کا ساتھ دیا۔ جہاں تک مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے شروع کرنے اور انھیں سیاسی تحریک سے الگ رکھنے کا تعلق ہے سرسیّد احمد اپنی کوششوں میں کامیاب رہے۔ اُنھوں نے ایک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی اور نئے متوسط طبقے کے مسلمانوں نے جو سرکاری ملازمت اور آزاد پیشوں میں تھے۔ اس میں بہت شوق سے حصّہ لیا۔ جب اتحادِ اسلامی کی تحریک سلطان عبدالحمید کی سرپرستی میں شروع ہوئی تو ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کے کچھ لوگ اس سے متاثر ہوئے حالانکہ سرسید احمد خاں نے اس کی مخالفت

کی تھی اور اپنی تحریروں میں اس پر زور دیا کہ ہندوستانیوں کو سلطنت ترکی کے معاملات میں دلچسپی نہیں لینی چاہیئے ۔ نوجوان ترک تحریک کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے تاثرات مختلف تھے ۔ شروع شروع میں ہندوستان کے اکثر مسلمان اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اور عام طور پر لوگوں کی ہمدردی سلطان کے ساتھ تھی جس کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ وہ ترکی میں یورپی طاقتوں کی سازشوں کے خلاف سد سکندری کا کام دیتا ہے ۔ لیکن کچھ لوگوں نے ، جن میں ابوالکلام آزاد بھی تھے ، نوجوان ترکوں کا اور اُن کے آئینی اور سماجی اصلاح کے پروگرام کا خیر مقدم کیا ۔

۱۹۱۱ء کی جنگ طرابلس میں جب اٹلی نے دفعتاً ترکی پر حملہ کر دیا اور اس کے بعد ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان کے دوران میں ہندوستانی مسلمانوں میں ترکوں کے ساتھ ہمدردی کی ایسی زبردست لہر اُٹھی جسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی یوں تو سبھی ہندوستانیوں کو اُن سے تعلق خاطر اور ہمدردی تھی مگر مسلمانوں کے دلوں میں یہ جذبہ اس قدر شدید تھا جیسے ان کا اپنا معاملہ ہو ۔ آخری اسلامی سلطنت صفحۂ ہستی سے مٹ رہی تھی مسلمانوں کی آیندہ امیدوں کا مرکز تباہ ہو رہا تھا ۔ ڈاکٹر مختار انصاری ترکی میں ایک طبی مشن لے کر گئے اور اس کے لئے غرباتک نے چندہ دیا ۔ روپیہ اس قدر تیزی سے اکٹھا ہوا کہ خود ہندوستانی مسلمانوں کے کسی کام کے لئے آج تک نہیں ہوا تھا پہلی عالمگیر جنگ مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش تھی کیونکہ ترکی برطانیہ کے خلاف تھا ۔ وہ بے بسی کی حالت میں کچھ نہ کر سکے ۔ جب جنگ ختم ہوئی تو اُن کے دبے ہوئے جذبات ، خلافت کی تحریک میں اُبل پڑے ۔

۱۹۱۲ء ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی نشو و نما کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسی سال ان کے دو مشہور ہفتہ وار اخبار جاری ہوئے ان میں سے "الہلال" اردو میں اور "کامریڈ" انگریزی میں شایع ہوتا تھا۔ الہلال ابوالکلام آزاد (موجودہ صدر کانگریس) نے جاری کیا تھا یہ اُس وقت چوبیس سال کے ایک نوجوان تھے جنھوں نے ابتدائی تعلیم جامعہ ازہر قاہرہ میں پائی تھی اور بیس سال کی عمر سے پہلے ہی اپنے فضل و کمال، خصوصاً عربی اور فارسی کی قابلیت کے لئے مشہور ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان کے باہر کی اسلامی دنیا سے اور اُن اصلاحی تحریکوں سے جو وہاں جاری تھیں خوب واقف تھے اور یورپ کے حالات سے بھی باخبر تھے۔ اپنے معقولی نقطۂ نظر اور اسلامی علوم کے گہرے علم کی بدولت انھوں نے قرآن کی تفسیر عقلی رنگ میں لکھی۔ ایک طرف وہ اسلامی تہذیب اور روایات میں ڈوبے ہوئے تھے اور دوسری طرف مصر، ترکی، شام، فلسطین، عراق اور ایران کے بڑے بڑے لیڈروں سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے اور وہاں کی سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں سے متاثر تھے۔ ان کی تصانیف کی وجہ سے اسلامی ملکوں میں لوگ ان سے اتنے واقف تھے کہ شاید ہندوستان کے کسی مسلمان سے نہ ہوں گے۔ انھیں ترکی سے بڑی ہمدردی تھی اور جس جنگ میں وہ شریک ہوتا تھا اس سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا زاویۂ نظر وسیع تر اور معقول تھا اس لئے وہ پُرانے لیڈروں کے جاگیری تصورات ان کی مذہبی تنگ نظری اور تفریقی رجحانات سے دور رہے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہندوستانی قومیت کے حامی بن گئے۔ انھوں نے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک میں

قومیت کی نشو ونما کا مطالعہ کیا تھا۔ اور ہندوستان کی قومی تحریک کو بھی وہ اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے مسلمان بیرونی تحریکوں سے تقریباً بے خبر تھے وہ جاگیری ماحول کی چار دیواری میں قید تھے اور انھیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ ہر چیز پر مذہب کے نقطۂ نظر سے غور کرتے تھے اور اگر ان کو ترکی سے ہمدردی تھی تو محض ہم مذہبی کی وجہ سے تھی اور اس گہری ہمدردی کے باوجود وہ ترکی کی قومی اور دنیوی تحریکوں کے خلاف تھے۔

ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار اخبار الہلال میں اُن سے ایک نئی زبان میں خطاب کیا۔ صرف ان کے خیالات اور نقطۂ نظر ہی میں جدت نہ تھی بلکہ ان کی تحریر کا رنگ ہی نیا تھا۔ ان کا اسلوب بیان جاندار اور پُرزور تھا البتہ کسی قدر دقیق ضرور تھا اس لئے کہ اس پر فارسیت غالب تھی۔ وہ نئے خیالات کے لئے نئی ترکیبیں تراشتے تھے اور زبان کی موجودہ تشکیل میں ان کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ پرانے قدامت پرست مسلمان لیڈر ان سب باتوں سے خوش نہ تھے آزاد کی رائے اور طرز خیال پر سختی سے تنقید کرتے تھے تاہم اُن میں بڑے سے بڑا عالم بھی، مذہبی بحثوں میں آزاد سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ کیونکہ آزاد کا قرآن اور حدیث کا علم اُن سے زیادہ تھا ان کا ذہن ایک معجون مرکب تھا عہد وسطیٰ کے متکلمانہ خیالات، اٹھارویں صدی کی عقلیت اور عہد حاضر کے علمی رجحانات کا۔

پرانے لوگوں میں بھی چند حضرات آزاد کی تصانیف کو پسند کرتے تھے ان میں مولانا شبلی نعمانی جیسے عالم بھی تھے جو خود ترکی جا چکے تھے

اور علی گڑھ کالج میں سرسید احمد خاں کی صحبت میں رہ چکے تھے۔ مگر علی گڑھ کالج کی عام روایات سماجی اور سیاسی حیثیت سے قدامت پرستانہ تھیں اس کے ٹرسٹی زیادہ تر والیان ریاست اور بڑے بڑے زمیندار تھے جو جاگیری نظام کے مثالی نمائندے تھے۔ اس کے پرنسپل یکے بعد دیگرے کئی انگریز رہ چکے تھے جو سرکاری حلقوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ان حضرات کی بدولت علی گڑھ میں تفریقی رجحانات اور قومی تحریک اور کانگریس کی مخالفت نے پرورش پائی۔ اس کے طلباء کے سامنے صرف ایک ہی مقصد پیش کیا گیا اور وہ سرکاری ملازمت کے چھوٹے چھوٹے عہدوں کا حاصل کرنا تھا۔ اس کے لئے ایک ایسے رویہ کی ضرورت تھی جو حکومت کے موافق ہو اور جسے قومیت پسندی اور باغیانہ وشورش سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ علی گڑھ کالج کا یہ حلقہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا، اور تقریباً ہر مسلم تحریک کو کبھی کھلم کھلا اور کبھی درپردہ متاثر کرتا تھا۔ مسلم لیگ ان ہی حضرات کی کوشش سے وجود میں آئی ابوالکلام آزاد نے قدامت پرستی اور قومیت بیزاری کے اس قلعے پر حملہ کیا۔ یہ حملہ براہ راست نہیں بلکہ ایسے خیالات کی ترویج اور اشاعت کے ذریعے سے کیا گیا جنھوں نے علی گڑھ کی ان روایات کی بیخ کنی کر دی۔ اس نوجوان مصنف اور اخبار نویس نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک ہلچل مچادی اگرچہ بوڑھوں نے بہت کچھ تیوری چڑھائی مگر نوجوانوں کے دلوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ یہ ہیجان دراصل ترکی، مصر اور ایران کے واقعات اور ہندوستانی قومی تحریک کے شروع ہونے کی وجہ سے پہلے ہی سے موجود تھا۔ آزاد نے یہ ثابت کر کے کہ اسلام اور ہندوستانی قومیت میں کوئی تصادم نہیں

اس کو ایک خاص رنگ دیدیا۔ جس کی وجہ سے مسلم لیگ اور کانگریس ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئیں خود آزاد ۱۹۰۶ء میں جب کہ وہ بالکل نو عمر تھے مسلم لیگ میں شریک ہو گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت کے نمائندوں نے "الہلال" کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ پریس ایکٹ کے ماتحت اس سے بار بار ضمانت طلب کی گئی اور آخر کار ۱۹۱۴ء میں اس کا مطبع ضبط کر لیا گیا۔ اس طرح دو سال کی مختصر زندگی کے بعد الہلال ختم ہو گیا۔ آزاد نے ایک دوسرا ہفتہ وار اخبار "البلاغ" جاری کیا مگر یہ بھی ۱۹۱۶ء میں آزاد کے قید ہو جانے پر بند ہو گیا۔ تقریباً چار سال تک نظر بند رہنے کے بعد جب وہ قید سے رہا ہوئے تو انھیں نیشنل کانگریس کے لیڈروں کی صف میں جگہ ملی اور تب سے وہ برابر کانگریس کی سب سے بڑی مجلس عاملہ کے رکن ہیں اور اپنی کم عمری کے باوجود کانگریس کے اکابرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اُن کی رائے قومی اور سیاسی امور میں، اور فرقہ دارانہ اور اقلیتوں سے متعلق مسائل میں بہت وقیع سمجھی جاتی ہے۔ وہ دو مرتبہ کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں اور بار بار قید کی سختیاں جھیل چکے ہیں۔

دوسرا ہفتہ وار اخبار جو ۱۹۱۲ء میں "الہلال" سے چند مہینے پہلے جاری ہوا "کامریڈ" تھا یہ انگریزی میں نکلتا تھا اور اس نے مسلمانوں کے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کو بہت متاثر کیا۔ اس کے مدیر مولانا محمد علی تھے جو اسلامی روایات اور اکسفورڈ کی تعلیم کا ایک عجیب و غریب مرکب تھے۔ وہ شروع میں علی گڈھ کی روایات اور خیالات کے علم بردار تھے اور ہر قسم کی جارحانہ سیاست کے خلاف تھے۔ لیکن

اُن کا سا قابل اور پُر جوش آدمی اس جمود اور بے عملی کی زنجیروں میں مقید ہو کر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کا طرز تحریر ابتدا سے بہت پُر زور اور موثر تھا۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کے منسوخ ہو جانے کے بعد انھیں حکومت برطانیہ کی نیک نیتی پر بھروسا نہیں رہا جنگ بلقان نے انھیں بہت موثر کیا اور اُنھوں نے ترکی کی حمایت میں بڑے پُر جوش مضامین لکھے اور وہ بتدریج برطانیہ کے خلاف ہوتے گئے۔ اور جب ترکی پہلی عالم گیر جنگ میں شریک ہو گیا تو یہ مخالفت انتہا کو پہنچ گئی۔ کامریڈ میں اُن کا ایک مشہور طویل مضمون "ترکوں کا انتخاب" کے عنوان سے شائع ہوا جس کی وجہ سے اخبار ہی بند ہو گیا اس لئے کہ برطانوی حکومت نے اس کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد حکومت نے اُن کو اور اُن کے بھائی شوکت علی کو گرفتار کر لیا دوران جنگ میں اور اس کے ایک سال بعد تک نظر بند رکھا۔ یہ دونوں ۱۹۱۹ء کے آخر میں رہا کئے گئے اور فوراً نیشنل کانگریس میں شریک ہو گئے۔ علی برادران نے ۱۹۲۰-۲۱ء میں خلافت اور کانگریس کی تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیا اور اس سلسلے میں قید کی مصیبت برداشت کی۔ محمد علی نے کانگریس کے ایک سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور کئی سال تک کانگریس کی سب سے بڑی مجلس عاملہ کے ممبر بھی رہے ۱۹۳۱ء میں وہ دنیا سے رحلت کر گئے۔

وہ تبدیلی جو مولانا محمد علی میں پیدا ہوئی ہندوستانی مسلمانوں کی بدلتی ہوئی ذہنیت کی علامت تھی یہاں تک کہ مسلم لیگ بھی جو مسلمانوں کو قومی تحریک سے الگ رکھنے کے لئے قائم کی گئی تھی اور جس کی قیادت رجعت پسند جاگیردار طبقے کے ہاتھ میں تھی نوجوان نسل کے دباؤ اور اثر کو

قبول کرنے پر مجبور ہوئی وہ چارو ناچار قومیت کی رو میں بہ رہی تھی اس طرح وہ کانگریس سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں اس نے اپنا سیاسی عقیدہ حکومت کی وفاداری کے بجائے یہ قرار دیا کہ ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کرے مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" میں اس تبدیلی کی حمایت میں پرزور مضمون لکھے تھے۔

۱۱- کمال پاشا

ایشیا میں قومیت کی نشو نما

اقبال | کمال پاشا کی قدر ہندوستان کے مسلمان اور ہندو یکساں کرتے تھے اُس نے صرف ترکی کو بیرونی تسلط سے آزاد کیا اور اس کے اندرونی انتشار کو دور کیا بلکہ یورپ کی سامراجی طاقتوں خصوصاً انگلستان کی سازشوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ لیکن جب اتا ترک کی پالیسی ظاہر ہوئی۔ یعنی اُس کی مذہب سے بیگانگی، خلافت کا خاتمہ، سلطانی کی برطرفی، دنیوی ریاست کا قیام، اور درویشوں کے سلسلے کو توڑنا۔ تو اس کی یہ قدر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں باقی نہیں رہی اور وہ اس کی جدیدیت کی پالیسی سے بیزار ہو گئے۔ مگر اسی پالیسی کی وجہ سے نوجوان ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہ اور زیادہ ہردلعزیز ہو گیا۔ اتا ترک نے ایک حد تک خیالی عمارت کو مسمار کر دیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن میں غدر کے زمانے سے رفتہ رفتہ تعمیر ہو رہی تھی اور پھر ایک قسم کا خلا پیدا ہو گیا۔ بہت سے مسلمانوں نے اس خلاء ذہنی کو قومی تحریک

میں شریک ہوکر پڑ کر لیا بعض پہلے ہی شریک ہو چکے تھے۔ اور بعض تذبذب اور شبہے کے عالم میں اُسے دُور سے دیکھ رہے تھے۔ اصل کشمکش جاگیری انداز فکر اور جدید رجحانات میں تھی۔ جاگیردار طبقے کی قیادت عوام کی تحریک خلافت کے سیلاب میں بہ گئی تھی لیکن یہ خود تحریک سماجی اور معاشی حالات کی ٹھوس بنیادوں پر یا عوام کی ضرورتوں پر قائم تھی۔ اس کا مرکز ملک کے باہر تھا اور جب اتاترک نے اس مرکز ہی کو ختم کر دیا، تو تحریک خلافت کی ساری عمارت ایک دم سے بیٹھ گئی۔ مسلم عوام کے حواس جاتے رہے اور اُن میں کسی قسم کے سیاسی عمل کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ پُرانے جاگیردار قسم کے لیڈر تو ایسے موقعے کے انتظار ہی میں تھے۔ وہ برطانوی پالیسی کی مدد سے جس نے ہمیشہ ان کی دستگیری کی تھی پھر میدان میں آ گئے لیکن اب وہ پہلی سی بات نہ تھی کہ لوگ اُن کی قیادت کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔ اب حالات کا رنگ کچھ اور ہو گیا تھا مسلمانوں میں بھی۔ بہت دیر کے بعد ایک متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ عوام کی سیاسی تحریک نے جو نیشنل کانگریس کی قیادت میں اٹھی تھی، ان پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔

اگرچہ دراصل مسلمان عوام اور نئے متوسط طبقے کی ذہنیت کی تشکیل واقعات نے کی تھی۔ لیکن موخر الذکر طبقے خصوصاً اس کے نوجوان کو متاثر کرنے میں سر محمد اقبال کا اہم حصہ ہے۔ ابتدا میں اقبال نے اردو میں پُرزور قومی نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ جنگ بلقان کے دوران میں اُنھوں نے اسلامی موضوع اختیار کیے وہ اپنے زمانے کے حالات اور مسلمانوں کے عام جذبات سے متاثر ہوئے اور خود اُنھوں نے ان جذبات پر اثر ڈالا اور انھیں اور شدید کر دیا۔ لیکن وہ عوام کی قیادت نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ایک شاعر، عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیری نظام سے وابستہ تھے نسل کے اعتبار سے وہ کشمیری برہمن تھے۔ انھوں نے اپنی اُردو اور فارسی شاعری کے ذریعے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے ایک فلسفیانہ نظریہ مہیّا کردیا اور اُن میں تفریقی رجحان پیدا کردیا۔ یوں تو اُن کی سرد لعزیزی اُن کے کمال شاعری کی وجہ سے تھی، لیکن اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ مسلم ذہن کی اس ضرورت کو پورا کر رہے تھے کہ اُسے اپنے لئے ایک لنگر مل جائے۔ قدیم اتحاد اسلامی کا خیال اب بے معنی ہوگیا تھا۔ خلافت ختم ہوچکی تھی۔ سب اسلامی ملکوں میں اور خصوصاً ترکی میں قومیت پرستی کا زور تھا اور انھیں ایک دوسرے کی کوئی پروا نہ تھی۔ قومیت کا تصور ایشیا پر یورپ وامریکہ کی طرح چھاگیا تھا ہندوستان میں قومی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور برطانوی حکومت کو باربار للکار چکی تھی یہ قومیت ہندوستانی مسلمانوں کے دل کو لگتی تھی اور آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اہم حصّہ لیا تھا لیکن ہندوستان کی اس قومی تحریک میں ہندوؤں کا غلبہ تھا اور اُس پر اُن ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اس لئے مسلم ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے اس قومیت کو قبول کرکے یہ کوشش کی کہ اس پر اپنا اثر ڈالیں، بہت سے اس تحریک سے ہمدردی رکھنے کے باوجود حیص بیص کے عالم میں اس سے الگ رہے اور بہتوں نے تفریق کا راستہ اختیار کیا جس کی طرف اقبال کے فلسفے اور شاعری نے ان کی رہنمائی کی تھی۔

میرا خیال ہے کہ یہی وہ حالات تھے جس کے ماتحت اب سے چند سال پہلے تقسیم ہند کی آواز بلند ہوئی۔ یوں تو اس کے بہت سے

اصلی اور ضمنی اسباب تھے فریقین کی بہت سی غلطیاں اور حماقتیں تھیں اور سب سے بڑھ کر حکومت برطانیہ کی تفریقی پالیسی تھی۔ لیکن ان سب کی تہ میں یہ نفسیاتی کیفیت تھی جو علاوہ اور تاریخی اسباب کے اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے متوسط طبقے کی نشوونما بہت دیر میں ہوئی۔ آج ہمارے ملک میں جو اندرونی کشمکش نظر آتی ہے وہ صرف قومی تحریک اور غیر ملکی حکومت ہی میں نہیں بلکہ جاگیری نظام اور جدید تصورات و ادارات میں بھی ہے۔

یہ کشمکش مجموعی طور پر پوری قوم میں بھی نظر آتی ہے ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری بڑی بڑی جماعتوں کے اندر بھی۔ قومی تحریک جس کی نمایندگی نیشنل کانگریس کرتی ہے، یقیناً جدید تصورات و ادارات کی نشوونما کے تاریخی عمل کی علمبردار ہے اگرچہ وہ ان تصورات کو بعض مسلمہ اصولوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس میں ہر قسم کے لوگ، جو آپس میں شدید اختلافات رکھتے ہیں، جمع ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں میں ایک تنگ اور بے لوچ سماجی نظام نے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور دوسری جماعتوں کو بھی پچھڑا دیا۔ مگر اب خود اس سماجی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور اس میں وہ قوت نہیں رہی۔ بہرحال اس نظام میں اتنی قوت نہیں کہ وہ قومی تحریک میں جو وسیع معنی میں ہر قسم کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں پر حاوی ہے رڑا اٹکا سکے۔ اب قومی تحریک میں اتنا زور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر قسم کی رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھتی رہی ہے۔ مسلمانوں میں جاگیری عناصر بدستور طاقت ور ہیں اور عام طور پر انھیں عوام سے اپنی بات منوانے میں کامیابی ہوتی رہی ہے۔ ہندو متوسط طبقے اور مسلمان متوسط طبقہ کی

نشو و نما میں ایک نسل سے زیادہ کا فرق رہا ہے اور یہ فرق اب تک سیاست
معیشت اور دوسرے شعبوں میں نمایاں ہے اسی پس ماندگی نے مسلمانوں
میں خوف کی نفسیاتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

پاکستان یعنی ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجویز خواہ وہ جذباتی
حیثیت سے کتنی ہی کشش کیوں نہ رکھتی ہو، اس پس ماندگی کا علاج نہیں
ہے بلکہ یہ اندیشہ ہے کہ اس سے جاگیردار طبقے کو اور تقویت پہنچے گی
اور مسلمانوں کی معاشی ترقی میں تاخیر ہو گی۔ اقبال پاکستان کے اولین حامیوں
میں سے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کے لازمی خطرات
اور لغویت کو محسوس کر لیا تھا۔ ایڈورڈ تھامسن نے لکھا ہے کہ ایک ملاقات
کے دوران میں اقبال نے اُن سے یہ کہا کہ اُنھوں نے مسلم لیگ کے ایک
اجلاس میں صدر کی حیثیت سے پاکستان کی حمایت کی تھی مگر اُن کو یقین
تھا کہ یہ تجویز کُل ہندوستان کے لئے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے مضر
ہے۔ شاید اُنھوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس مسئلے پر زیادہ غور
نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک اس نے کوئی اہمیت نہیں حاصل کی تھی۔
ان کا عام نظریۂ زندگی پاکستان یا تقسیم ہند کے اس تصور کے ساتھ جو بعد میں
پیدا ہوا، نہیں کھپتا تھا۔

آخر عمر میں اقبال کا رجحان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا سوویٹ
روس کی زبردست کامیابی نے اُن کو بہت متاثر کیا اور اُن کی شاعری
کا رُخ بدل گیا۔ اپنی وفات سے چند مہینے پہلے جب وہ بستر علالت پر تھے
انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور میں نے بڑی خوشی سے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔
جب میں مختلف مسائل پر اُن سے گفتگو کر رہا تھا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ باوجود

اختلاف کے ہم دونوں میں کس قدر اشتراک خیال ہے اور کتنی آسانی سے ان کے ساتھ نباہ ہو سکتا ہے۔ اُن کو پُرانی باتیں یاد آرہی تھیں اور وہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر پہنچ جاتے تھے۔ میں خود بہت کم بول رہا تھا اور بڑی توجہ سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ میں اُن کا اور اُن کی شاعری کا مداح تھا اور مجھے بڑی خوشی تھی کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میرے رخصت ہونے سے ذرا دیر پہلے انھوں نے مجھ سے فرمایا "تم میں اور جناح میں کیا چیز مشترک ہے؟ وہ ایک سیاست داں ہیں اور تم مُحبِ وطن ہو" مجھے اُمید ہے کہ مجھ میں اور مسٹر جناح میں اب بھی بہت کچھ مشترک ہوگا۔ اب رہا میرا مُحبِ وطن ہونا تو یہ آج کل کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں سمجھی جاتی خصوصاً اس محدود معنی میں جس میں یہ لفظ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اگرچہ مجھے ہندوستان سے بڑی محبت ہے لیکن میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ساری دنیا کے مسائل تو درکنار خود اپنے ملک کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے لئے ہمیں قومی ہمدردی سے زیادہ وسیع جذبے کی ضرورت ہے۔ لیکن اقبال کا یہ خیال یقیناً صحیح تھا کہ میں کچھ زیادہ سیاست داں نہیں ہوں اگرچہ سیاست نے مجھے اپنے چنگل میں دبا رکھا ہے۔

۱۲- بھاری صنعتوں کا آغاز۔ تلک اور گوکھلے

جُداگانہ انتخابات

ہندو مسلم مسائل کے پس منظر کا مطالعہ کرنے اور ان محرکات کو سمجھنے کے

شوق میں جو پاکستان کے مطالبے کی تہ میں کارفرما ہیں میں تقریباً نصف صدی کو چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا ہوں۔ اس اثنا میں نہ صرف ملک کے نظم و نسق میں بلکہ لوگوں کی طبیعت اور مزاج میں بہت کچھ تبدیلی ہوئی۔ کچھ چھوٹی موٹی آئینی اصلاحات ہوئیں جن کا بار بار ڈھنڈھورا پیٹا جاتا ہے۔ مگر ان سے برطانوی حکومت کی مطلق العنانی اور ہمہ گیری میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اور عام افلاس اور بے روزگاری کے مسائل بھی جہاں کے تہاں رہے۔ ۱۹۱۱ء میں جمشید جی ٹاٹا نے ہندوستان میں بھاری صنعت کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے فولاد اور لوہے کے کارخانے، اس مقام پر قائم کیے جو بعد میں جمشید پور کے نام سے مشہور ہوا حکومت نے اس اقدام کو اور اس قسم کی دوسری کوششوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ان کی کسی قسم کی ہمت افزائی نہیں کی۔ چنانچہ فولادی صنعت کے شروع کرنے میں زیادہ تر امریکن ماہرین سے مدد لی گئی۔ یہ صنعت اپنے ابتدائی دور میں بہت سقیم حالت میں رہی لیکن ۱۴-۱۹۱۸ء کی جنگ کی بدولت سنبھل گئی۔ اس کے بعد وہ پھر گر گئی اور یہ اندیشہ تھا کہ انگریز حصہ داروں کے ہاتھ میں چلی جائے گی مگر قوم پرستوں کے احتجاج نے اسے بچا لیا۔

ہندوستان صنعتی مزدوروں کا طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ لوگ کمزور اور غیر منظم تھے اور کسانوں کے طبقے کا جس سے نکل کر یہ آئے تھے، معیار زندگی اس قدر پست تھا کہ ان کی اجرت کا بڑھنا اور ان کی حالت کا درست ہونا ناممکن تھا۔ جہاں تک غیر ماہر مزدوروں کا تعلق ہے لاکھوں بے روزگار موجود تھے جن کو بھرتی کیا جا سکتا تھا اس لئے کوئی ہڑتال کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ تقریباً ۱۹۲۰ء میں پہلی ٹریڈ یونین کانگریس وجود میں آئی۔ یہ نئی پرولتاری جماعت اس قدر قلیل تھی کہ ہندوستان کے سیاسی نقشے پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا

وہ دہقانیوں اور دیہاتی مزدوروں کے دریا کے سامنے چند قطروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد صنعتی مزدوروں کی آواز سُنائی دینے لگی اگرچہ بہت ہی کمزور تھی۔ غالباً اس کو نظر انداز کر دیا جاتا مگر روسی انقلاب نے لوگوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ صنعتی پرولتاری طبقہ کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ اس کے علاوہ کچھ بڑی بڑی ہڑتالیں بھی بہت منظم طریقے پر ہوئیں جن کی وجہ سے لوگوں کو اس تحریک کی طرف متوجہ ہونا پڑا کسانوں کا طبقہ، اگرچہ سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا اور اس کا مسئلہ ہندوستان کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ تھا، مزدوروں سے بھی زیادہ بے زبان تھا، اور اس کو سیاسی قائدین اور حکومت دونوں نے بھلا دیا تھا۔ سیاسی تحریک کی ابتدائی منزلوں میں اونچے متوسط طبقے، خصوصاً وکیلوں وغیرہ اور ان لوگوں کے مطالبات پر زور دیا جاتا تھا جو ملک کے نظم و نسق میں حصہ پانے کے آرزومند تھے۔ جب نیشنل کانگریس جو ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئی تھی سن بلوغ کو پہنچ گئی تو اس کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو نسبتاً زیادہ جنگ جو اور دبنگ تھے اور نچلے متوسط طبقے خصوصاً طلبہ اور نوجوانوں کی نمائندگی کرتے تھے تقسیم بنگالہ کے خلاف جو زبردست ایجیٹیشن ہوا اس میں بنگال میں اس قسم کے بہت سے قابل اور جنگجو لیڈر پیدا ہو گئے۔ مگر عصر نو کے حقیقی نمائندے بال گنگادھر تلک تھے جو مہاراشٹر کے رہنے والے تھے۔ پرانے طرز کی قیادت کے نمائندے بھی ایک مرہٹے گوپال کرشن گوکھلے تھے جو تلک سے عمر میں چھوٹے تھے فضا انقلابی نعروں سے گونج رہی تھی لوگوں کے مزاج برہم تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فریقین میں تصادم ہو کر رہے گا اس سے بچنے کے لئے لوگ کانگریس کے بوڑھے سرپرست دادابھائی نوروجی جن کو سارا ملک بزرگ مانتا تھا گوشۂ

عزلت سے کھینچ کر باہر لائے۔ کچھ دن کے لئے سکون ہوگیا مگر آخر ۱۹۰۶ء
میں ٹکر ہوکر رہی۔ جس میں بظاہر قدیم اعتدال پسند طبقہ کو فتح حاصل ہوئی
لیکن یہ فتح اس وجہ سے ہوئی کہ کانگریس کی تنظیم پر ان حضرات کا قبضہ تھا
اور ووٹ دینے والوں کا دائرہ اس وقت تک بہت محدود تھا۔ اس
میں کوئی شبہ نہ تھا کہ ہندوستان کے سیاسی خیال کے لوگوں کی
بہت بڑی اکثریت تلک اور ان کی جماعت کے ساتھ تھی۔ کانگریس کی
اہمیت بہت کم ہوگئی اور لوگ دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔
بنگال میں دہشت انگیزی کی تحریک شروع ہوئی۔ روس اور آئرلینڈ
کے انقلابیوں نے جو مثال قایم کی تھی اس کی پیروی کی جانے لگی۔ مسلم
نوجوان طبقہ بھی ان انقلابی تصورات سے متاثر ہو رہا تھا۔ اب تک علی گڑھ
کالج ان رجحانات کو روکنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب حکومت کے اشارے
پر آغا خاں اور دوسرے لوگوں نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانوں کو
ایک سیاسی پلیٹ فارم مل جائے وہ کانگریس سے دور رہیں۔ اس سے
بھی زیادہ اہم چیز جس نے ہندوستان کے مستقبل پر زبردست اثر ڈالا
یہ تھی کہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا۔ اب مسلمان امیدوار
صرف مسلمانوں کے حلقے سے کھڑے ہوسکتے تھے اور صرف انھیں کے
ووٹ سے منتخب ہوسکتے تھے ان کے چاروں طرف ایک سیاسی دیوار
کھینچ دی گئی جس نے ان کو باقی ماندہ ہندوستان سے الگ کردیا۔ امتزاج
اور اتحاد کا عمل جو صدیوں سے جاری تھا اور جس کو صنعتی ترقی نے اور تیز
کردیا تھا رک گیا یہاں تک کہ اس نے پوری سماجی اور عمومی زندگی کو گھیر لیا
ایک زہریلے پھوڑے کی طرح جس کی سمیت سارے جسم میں پھیل جاتی ہے۔

اس نے میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں بھی زہر پھیلا دیا اور آخر کار تفریق کے جذبے نے عجیب و غریب شکلیں اختیار کیں۔ ایک عرصے کے بعد سلمانوں کے علیحدہ ٹریڈ یونین، طالب علموں کی انجمنیں اور ایوانِ تجارت بن گئے۔ چونکہ مسلمان ان سب کاموں میں بہت پیچھے تھے اس لئے یہ ادارے اور انجمنیں فطری طور پر خود بخود نہیں بنی تھیں بلکہ مصنوعی طور پر بنائی گئی تھیں اور ان کی قیادت پرانے جاگیر دار قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی اس طرح ایک حد تک مسلمانوں کا متوسط طبقہ اور عوام بھی ترقی کی ان سب تحریکوں سے الگ تھے جو باقی ہندوستان کو متاثر کر رہی تھیں برطانوی حکومت اس سے پہلے ہندوستان میں بہت سے مستقل حقوق رکھنے والے طبقے پیدا کر چکی تھی اب جداگانہ انتخاب نے اس قسم کا ایک اور طاقتور طبقہ پیدا کر دیا۔

یہ کوئی عارضی خرابی نہ تھی جو سیاسی شعور کی نشوو نما کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جائے بلکہ یہ سرکاری پالیسی کے سائے میں پھیلتی چلی گئی اور اس نے ملک کے حقیقی مسائل پر، خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، یا معاشی پردہ ڈال دیا۔ اس نے ان لوگوں میں جن کے تعلقات پہلے خوشگوار تھے تفریق اور دشمنی پیدا کر دی۔ دراصل اس رعایت نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ان کو دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے کی عادت ہوگئی اور ان میں خود اعتمادی کا مادہ نہیں رہا ظاہر ہے کہ ایسے طبقوں، اور اقلیتوں کے ساتھ، جو تعلیمی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ ہوں، یہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے تھا کہ اس کمی کے پورا کرنے میں ہر امکانی مدد دی جائے خصوصاً ان کی تعلیمی ترقی کا خاص اہتمام کیا جائے۔ اس قسم کی کوئی کارروائی مسلمانوں، دوسری پسماندہ

اقلیتوں ۔۔۔ یا اچھوتوں کے لئے جنھیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی نہیں کی گئی۔ سارا زور اس پر تھا کہ ان لوگوں کو سرکاری ملازمت میں چھوٹے چھوٹے عہدے دئے جائیں چنانچہ ان کا عام ذہنی معیار بڑھنے کے بجائے بعض صورتوں میں اور پست ہو گیا۔

اس طرح جداگانہ انتخاب نے اُن جماعتوں کو جو کمزور اور پسماندہ تھیں اور زیادہ کمزور کر دیا۔ اس سے تفریقی رجحانات کو تقویت پہنچی اور قومی اتحاد کی نشو و نما رک گئی۔ یہ طریق انتخاب جمہوریت کے منافی تھا۔ اس نے نئے مستقل حقوق رکھنے والے طبقے پیدا کر دیئے جو انتہا درجے کے رجعت پسند تھے۔ اس کی وجہ سے ملک کا عام ذہنی معیار پست ہو گیا اور لوگوں کی توجہ ملک کے اصل معاشی مسائل کی طرف سے، جو سب کے لئے مشترک تھے، ہٹ گئی جداگانہ انتخاب کا سلسلہ مسلمانوں سے شروع ہوا۔ اور دوسری اقلیتوں اور جماعتوں میں پھیلتا چلا گیا یہاں تک کہ ہندوستان رنگ برنگ کے الگ الگ خانوں کا ایک عجیب و غریب نقشہ بن کر رہ گیا۔ ممکن ہے کہ جداگانہ انتخاب سے عارضی طور پر کچھ فائدہ ہوا ہو، اگرچہ مجھے تو نظر آیا نہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کو اس سے بے حد نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے طرح طرح کے تفریقی رجحانات پیدا ہوتے رہے یہاں تک کہ آخر کار ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

جس زمانے میں جداگانہ انتخاب کا نفاذ ہوا لارڈ مارلے وزیر ہند تھے۔ انھوں نے اس کی مخالفت کی مگر وائسرائے کے اصرار سے مجبور

ہو گئے۔ انھوں نے اپنے روز نامچہ میں دکھایا ہے کہ اس طریقے میں کیا خطرات
پوشیدہ ہیں اور یہ کس طرح لازمی طور پر نمائندہ اداروں کی ترقی میں رکاوٹ
پیدا کرے گا۔ شاید دا یسرائے اور اُن کے رفقاء کار کا مقصد ہی یہ تھا
۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی آئینی اصلاحات کے متعلق مانٹیگو چیمسفورڈ
رپورٹ کے نام سے جو تجویز پیش ہوئی اس میں بھی اُن خطرات پر زور دیا
گیا جو فرقہ وارانہ انتخاب میں مضمر ہیں " مذہبی اور طبقاتی تقسیم کے معنی
یہ ہیں کہ ایک دوسرے کے مخالف سیاسی محاذ قائم کر دیئے جائیں اس
کی وجہ سے لوگ مختلف مسائل پر شہریوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ مختلف
فرقوں کے افراد کی حیثیت سے غور کرتے ہیں .... اس لئے
ہم فرقہ وارانہ انتخاب کے طریقے کو حکومت خود اختیاری کے اصول
کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں "

آٹھواں باب

آخری دور (۲) قومیت اور سامراج

۱۔ متوسط طبقہ کی بے بسی اور گاندھی جی کا دور

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہندوستانی سیاست بہت دھیمی تھی۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ کانگریس میں دو دھڑے پیدا ہوگئے تھیں۔ انتہا پسند اور اعتدال پسند، اور ان دونوں میں آپس میں اختلافات تھے۔ دوسری یہ کہ زمانۂ جنگ کے قوانین و ضوابط نے سیاسی زندگی پر پابندیاں عائد کردی تھیں۔ پھر بھی ایک چیز نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی تھی اور وہ یہ کہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ اب رفتہ رفتہ قومیت کی طرف مائل ہو رہا تھا اور وہ مسلم لیگ کو کانگریس سے قریب لانے کی کوشش میں مصروف تھا یہاں تک کہ دونوں جماعتیں مل کر کام کرنے لگیں۔

جنگ کے زمانے میں صنعت نے ترقی کی اور بنگال کے سن کے کارخانوں اور بمبئی اور احمد آباد کی کپڑے کے ملوں نے سو فی صدی

سے سے لے کر دوسو فی صدی تک کا زبردست منافع اپنے حصے داروں کو تقسیم کیا۔ اس دولت میں سے کچھ تو ڈنڈی اور لندن کے سرمایہ داروں کی جیب میں پہنچی اور کچھ ہندوستانی کروڑپتیوں کی تجوریوں میں لیکن وہ غریب مزدور جنھوں نے اپنا خون پسینا ایک کرکے یہ روپیہ پیدا کیا تھا۔ اب بھی زندگی کی اُس پست سطح پر رہے۔ اب بھی ان کا ٹھکانا وہی گندی اور بیماری سے بھری ہوئی "کوٹھریاں تھیں جن میں نہ کھڑکیاں تھیں، نہ روشن دان، نہ اُجالا نہ پانی اور نہ گندے پانی کی نکاسی کے لئے نالیاں۔ اور یہ سب کچھ اُس محلوں سے معمور" شہر کلکتے کے آس پاس ہو رہا تھا، جس پر برطانوی سرمایہ کا قبضہ تھا۔ بمبئی پر ہندوستانی سرمایہ کی حکمرانی تھی۔ لیکن یہاں کی بھی یہ حالت تھی کہ ایک تحقیقاتی کمیشن کو پندرہ فٹ لمبے اور بارہ فٹ چوڑے کمرے میں چھ گھرانے رہتے ہوئے ملے۔ جن کے الگ الگ چولھے تھے۔ ان چھ گھرانوں میں چھوٹے بڑے ملا کر تیس آدمی تھے اور ان تیس میں سے تین عورتیں ایسی تھیں جن کے وضع حمل کا زمانہ بالکل قریب تھا یہ مثال عام تو نہیں کہی جا سکتی لیکن عام حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اور پھر یہ حالت سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۳۰ء کے درمیان کی ہے جب حالات پہلے بہت بہتر ہو چکے تھے۔ حالات کے بہتر ہونے سے پہلے جو حالت ہوگی اُسے سوچ کر تصور کانپ اٹھتا ہے۔[1]

---

[1] یہ واقعات اور اقتباسات مسٹر بی شیوا راؤ کی کتاب The Industrial Worker in India (Allen and Unwin, London 1939.) سے لئے ہیں۔ اس کتاب میں ہندوستانی مزدوروں کی حالت سے بحث کی گئی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب کبھی مِل کے مزدوروں کی یہ تنگ و تاریک آبادیاں اور کوٹھریاں دیکھنے گیا ہوں تو وہاں میرا دم گھٹنے لگا اور خون کھولنے لگا۔ میں ایک مرتبہ جھریا کی کوئلے کا معائنہ کرنے گیا اور یہاں میں نے عورتوں کو کام کرتے دیکھا۔ یہ افسوسناک تصویر کبھی میرے ذہن سے نہیں مٹ سکتی۔ درمیان میں عورتوں سے کانوں کے اندر کام لینے کی اجازت نہیں رہی تھی۔ لیکن اب پھر وہ پہلے کی طرح کام کر رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جنگی ضروریات کی وجہ سے اب زیادہ مزدوروں کی ضرورت ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ان جنگی ضروریات کے باوجود اب بھی لاکھوں آدمی بیکار ہیں اور بھوکے مر رہے ہیں۔ آدمیوں کی کمی نہیں، لیکن مزدوری اتنی کم اور حالات اتنے ابتر کہ بیکاری اور بھوک بھی لوگوں کے دل میں اس کام کی خواہش اور اُمنگ نہیں پیدا کر سکتی۔

انگلستان کی ٹریڈ یونین کانگریس نے ۱۹۲۸ء میں اپنا ایک وفد ہندوستان بھیجا تھا۔ اس وفد نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "آسام کی چائے میں ہر سال کروڑوں ہندوستانیوں کا پسینہ اور اُن کی بھوک اور مایوسی شامل ہوتی ہے۔ بنگال کے صحت عامّہ کے ڈائرکٹر نے اپنی ۱۹۳۷-۳۸ء کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ بنگال کے کسان "ایسی غذا کھاتے ہیں جسے کھا کر چوہے بھی پانچ ہفتے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔"

آخر کار جنگ عظیم ختم ہو گئی — جنگ کا خاتمہ سکون اور ترقی کا پیام لانے کے بجائے، ہمارے لئے پُر تشدد قوانین اور پنجاب کے مارشل لا کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ہندوستانیوں کے دل ذلت کے تلخ احساس اور غصے کی آگ سے بھڑک اُٹھے۔ جب ہمارے ملک کے لوگوں کو بس طرح

کچلا جا رہا ہو، اور دن رات کی نفع بازی ہمیں مفلس بنا کر برابر ہمارا خون چوس رہی ہو تو سیاسی اصلاحات اور بڑے بڑے عہدوں پر ہندوستانیوں کو مقرر کیے جانے کا ڈھونگ محض مضحکہ اور توہین نہیں تو اور کیا ہے؟ غرض ہماری قوم عجب کس مپرسی کی حالت میں تھی۔

لیکن ہم کیا کر سکتے تھے، اس منحوس صورت حال کو کس طرح بدل سکتے تھے؟ ہماری حالت ایک مہیب اژدہے کے چنگل میں جکڑے ہوئے بے بس انسان کی سی تھی — جس کا جسم مفلوج اور دماغ ماؤف ہو چکا ہو۔ کسانوں کے دلوں پر خوف اور غلامی کا تسلط تھا۔ مزدوروں کا بھی یہی حال تھا۔ متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مشعلِ ہدایت بن سکتے تھے، لیکن ہر طرف چھائی ہوئی تاریکی نے انھیں بھی گھیر رکھا تھا۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے ان کی حالت کسانوں سے بھی زیادہ قابلِ رحم تھی۔ یہ پڑھے لکھے لوگ جو نہ کھیتی باڑی کر سکتے تھے اور نہ اور کسی طرح کی محنت مزدوری، بے روزگاروں کی تعداد بڑھا رہے تھے مایوسی اور بے بسی انھیں تاریکی کے اور بھی زیادہ گہرے غاروں میں دھکیلے جا رہی تھی۔ مانا کہ کچھ کھاتے پیتے وکیل، ڈاکٹر، انجنیر اور کلرک بھی تھے۔ لیکن ان تھوڑے سے آدمیوں کی خوش حالی کا مجموعی حالت پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ کسان بھوکوں مر رہا تھا لیکن صدیوں سے وہ اپنے مخالف ماحول سے لڑنے کا عادی تھا اس لئے اس میں برداشت کی قوت تھی — اور غریبی اور فاقہ کشی کی حالت میں بھی اس میں ایک طرح کا پُرسکون وقار تھا، قسمت کے اٹل فیصلوں کے آگے سر جھکانے کی عادت۔ لیکن متوسط طبقہ خصوصاً غریب شرفا زندگی کے اس پس منظر سے محروم تھے۔ اس

محرومی اور مایوسی کے عالم میں، اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کا سہارا
لیں۔ انھیں نہ ماضی میں اُمید کی جھلک دکھائی دیتی تھی نہ مستقبل میں۔ نہ
وہ کسی سماجی مقصد کے علم بردار تھے اور نہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے
سکتے تھے کہ وہ کوئی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس کے لئے
یہ مصیبتیں بھر رہے ہیں۔ وہ پرانی رسموں کے بندے تھے مگر پرانی تہذیب
سے محروم۔ نئے زمانے کے حالات انھیں اپنی طرف کھینچتے تھے وہ ان
کی حقیقی روح سے یعنی سماجی اور سائنٹفک شعور سے بیگانہ اور بے بہرہ تھے
ان میں سے کچھ اپنی مایوسیوں سے بھاگ کر ماضی کے مردہ تصور میں
پناہ لیتے تھے۔ لیکن یہاں بھی انھیں سکون میسر نہیں تھا۔ بقول ٹیگور کے
ہمیں اپنی روح میں اس چیز کی پرورش نہیں کرنی چاہیے جو مر چکی ہے، اس
لئے کہ مردہ چیز موت کا پیام لاتی ہے۔ ان کا ایک گروہ وہ تھا جس نے
اپنے آپ کو مغرب کی بے جان اور بے رنگ تصویر بنا لیا۔ بے کسی کے
عالم میں انھوں نے اپنے جسم اور دماغ کے لئے ایک سہارا ڈھونڈنے
کی کوشش کی اور ناکام رہے۔ اس لئے ہندوستانی زندگی کے تاریک
سمندر کی سطح پر پڑے تیرتے رہے۔

لیکن ہم آخر کر ہی کیا سکتے تھے؟ ہندوستان کو غریبی اور مایوسی کے
اُس دلدل سے کیسے نکالتے جس میں وہ برابر دھنستا چلا جا رہا تھا۔
اس لئے کہ انگلستان نے ہیجان، مصیبت اور اضطراب کے چند برسوں
"خون، پسینے اور آنسوؤں" کی جو قربانی دی وہ ہماری قوم پشتوں سے دیتی
چلی آ رہی تھی۔ اور اس مسلسل قربانی نے ہندوستان کے جسم اور روح
دونوں کو کھوکھلا کر دیا تھا اور اُس کی زندگی کی رگ رگ میں اس مہلک

بیماری کا زہر سرایت کرچکا تھا، جو پھیپھڑوں کو چھلنی کرکے انسان کو آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر موت کی نیند سلا دیتی ہے۔ کبھی کبھی ہمارے دل میں یہ خواہش پیدا ہونے لگتی تھی کہ کاش ہیضہ یا طاعون کی طرح کی کوئی بیماری اس مرگ مسلسل کو مرگِ ناگہاں بنا دے۔ لیکن یہ خواہش آن کی آن میں رخصت ہوجاتی، اس لئے کہ بے مقصد جان بازی سے کام نہیں چلتا اور آتائی علاج سے پرانے بیماروں کو شفا نہیں ہوتی۔

عین اس زمانے میں گاندھی جی آئے ــــ تازہ ہوا کے اُن تیز جھونکوں کی طرح، جس سے انسان انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھے، روشنی کی اُس کرن کی طرح جو اندھیرے کو چیرتی ہوئی نکل جائے اور آنکھوں کے آگے سے سارے پردے ہٹا دے، اور اُس آندھی کی طرح جو ہر چیز کو خصوصاً انسان کے خیالات کو تہ و بالا کردے۔ گاندھی جی اونچے طبقوں کی بلندی سے اُتر کر نہیں آئے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے کروڑوں عوام کے اندر سے نکل آئے ــــ وہ انھیں کی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور انھیں ان کے حالِ زار کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ اُنھوں نے اُن لوگوں کو جو کسانوں اور مزدوروں کا خون چوس رہے تھے للکارا کہ ان غریبوں کا پیچھا چھوڑو اور اس نظام سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرو جو اس افلاس اور مصیبت کا سرچشمہ ہے۔ گاندھی جی کے ان لفظوں نے سیاسی آزادی کو ایک نئی شکل دے دی اور اس میں ایک نئے معنی پیدا کردئے۔ لیکن گاندھی جی نے جو کچھ ہم سے کہا اس میں سے ہم نے صرف تھوڑی سی باتوں کو مانا بلکہ بعض اوقات تو ایک بات بھی نہیں مانی۔ لیکن یہ سب چیزیں ضمنی حیثیت

رکھتی تھیں۔ اُن کی تعلیم کا نچوڑ بے خوفی اور سچائی تھی اور وہ عمل کا عام جذبہ جو ان پر مبنی ہو، جس میں ہر وقت عوام کی بھلائی کو پیش نظر رکھا جائے۔ ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ کسی انسان یا قوم کے لئے سب سے بڑی نعمت ابھئے یا بے خوفی ہے — صرف جسم کی بے خوفی نہیں بلکہ ذہن کی بے خوفی۔ ہماری تاریخ کے بالکل ابتدائی دور میں جنک اور یجنا ولک نے کہا تھا کہ لیڈروں کا سب سے بڑا منصب یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو نڈر اور بے خوف بنائیں۔ لیکن انگریزوں کی سلطنت میں ہندوستانی ذہن پر صرف خوف کا غلبہ ہے — وہ خوف جو رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے جس سے خون خشک ہو جاتا ہے اور دم گھٹتا ہے۔ پولیس اور خفیہ پولیس کا خوف، سرکاری عہدہ داروں کا خوف، جابرانہ قوانین اور جیل خانوں کا خوف، زمیندار کے کارندوں کا خوف، مہاجن کا خوف، بے روزگاری اور فاقہ کشی کا خوف۔ ہندوستان کی فضا پر ہر طرف خوف چھایا ہوا تھا اور خوف کی اس ہمہ گیر فضا میں گاندھی جی کی خاموش لیکن پُر یقین آواز گونجی! "ڈرو مت"، مگر کیا یہ آسان بات تھی؟ نہیں۔ خوف ایسے ڈراؤنے بھوت بنا لیتا ہے جو حقیقت سے بھی زیادہ بھیانک ہوتے ہیں — اگر ہم حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں تو وہ اتنی خوفناک نہیں رہتی۔

اس لئے ایسا معلوم ہوا جیسے یکایک خوف کا وہ بھیانک بوجھ جس سے لوگوں کے کندھے جھکے جا رہے تھے، ہلکا ہو گیا — یعنی بوجھ پوری طرح تو نہیں مگر بڑی حد تک اتر گیا۔ جس طرح جھوٹ اور ڈر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اسی طرح سچائی اور بے خوفی بھی۔ بے خوفی پیدا

ہوجائے تو سچائی خود بخود آجاتی ہے۔ ہندوستانی یکایک پہلے سے زیادہ سچے نہیں بن گئے، اور نہ ایک دم سے ان کی فطرت بدل گئی۔ پھر بھی چونکہ بے خوفی نے جھوٹ اور فریب کی ضرورت کو کم کردیا، اس لئے ان فطرت میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ یہ تبدیلی ایک نفسیاتی تبدیلی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے کسی ماہر نفسیات نے مریض کی پچھلی زندگی کا گہرا مشاہدہ کرکے اس کی ذہنی گتھیوں کا راز معلوم کرلیا اور مریض کو ان کی حقیقت کا علم ہوتے ہی یہ گتھیاں خود بخود سلجھ گئی ہوں

اس بات کا ایک اور نفسیاتی اثر بھی پڑا۔ لوگوں کے ذہن میں شرمندگی کا یہ احساس چٹکیاں لینے لگا کہ آخر اتنی مدت تک ہم نے کسی غیر قوم کی غلامی کو اور اس کی ذلتوں کو کیوں برداشت کیا۔ اور اس احساس نے یہ خواہش پیدا کی کہ اب چاہے جو کچھ بھی ہو اس غلامی سے نجات حاصل کرنی ضروری ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ سچے بن گئے تھے۔ بات صرف یہ تھی کہ گاندھی جی 'سچائی' کا مجسمہ بن کر ہمارے سامنے موجود تھے اور ان کی شخصیت کی کشش ہمیں کھینچ کر سچائی کی طرف لے آتی تھی۔ لیکن سچائی کیا ہے؟ مجھے یقین کے ساتھ نہیں معلوم۔ اس لئے کہ ہمارے لئے سچائی، یا سچائیاں، اضافی ہیں اور حقیقی سچائی ہمارے ادراک سے پرے ہے۔ ہر شخص کے ذہن میں سچائی کا ایک جداگانہ تصور ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور اس تصور میں اس کے ماحول، تربیت اور رجحانات کو خاص دخل ہوتا ہے۔ یہی حال گاندھی جی کا تھا۔ انسان جس بات کو سچ سمجھے اور سچ جانے وہی اس کے لئے سچائی ہے۔ اسے 'سچائی' کی تعریف

سمجھ لیا جائے تو میری نظر میں کوئی شخص ایسا نہیں جو گاندھی جی سے زیادہ سچائی کا پابند ہو۔ ایک سیاست داں میں اس صنعت کا ہونا بڑی خطرناک بات ہے اس لئے کہ اس طرح وہ اپنے دل کی بات دوسروں پر ظاہر کر دیتا ہے اور لوگوں کو اس کے بدلتے ہوئے پہلو آئینہ کی طرح صاف نظر آتے رہتے ہیں۔

گاندھی جی نے ہندوستان کے لاکھوں آدمیوں کو متاثر کیا، کسی کو کم، کسی کو زیادہ۔ بعض لوگ تو ان کے اثر سے بالکل بدل گئے اور بعض نے اپنی زندگی کے صرف چند پہلوؤں میں ان کا اثر قبول کیا یا یہ اثر کچھ عرصے کے بعد زائل ہو گیا۔ مگر بالکل زائل تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہا۔ مختلف لوگوں پر اس شخصیت کی تاثیر سے مختلف کیفیتیں طاری ہوئیں اور ہر شخص اپنی کیفیت خود ہی بیان کر سکتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی ترجمانی الکی بیاڈیس کے ان لفظوں میں کی جا سکتی ہے "جب ہم کسی اور کو باتیں کرتے ہوئے سنتے ہیں تو خواہ ان کی باتوں میں کتنی ہی فصاحت کیوں نہ ہو، اس بات کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن جب ہم تمھیں بولتے سنتے ہیں، یا کوئی دوسرا تمھاری کہی ہوئی بات کو دہراتا ہے، خواہ وہ اسے کتنی ہی بری طرح اسے دہرائے، تو مرد، عورتیں اور بچے، سب اسے سن کر مسرور اور مدہوش ہو جاتے ہیں — اور اگر آپ میرے دل کا حال پوچھیں، تو میں بغیر جھجک کے قسم کھا کر کہوں گا کہ اس کے لفظ مجھ پر عجیب و غریب اثر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جب میں اسے بولتے سنتا ہوں تو مجھ پر ایک مقدس سحر کا سا اثر ہوتا ہے۔ میرا دل سینے سے باہر نکلنے لگتا ہے

اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں ــــ صرف میری ہی یہ حالت نہیں ہوتی، بلکہ اور بہت سے آدمیوں کی بھی۔

"ہاں! میں نے پیریکلیز کو بھی سنا ہے، اور دوسرے بڑے بڑے مقرروں کو بھی اور میرا خیال ہے کہ وہ واقعی بڑے زبردست مقرر ہیں لیکن انھوں نے کبھی مجھے اتنا زیادہ متاثر نہیں کیا۔ انھوں نے کبھی میری ساری روح میں ہیجان برپا نہیں کیا، کبھی مجھ میں یہ احساس پیدا نہیں کیا کہ میں دنیا کی ذلیل ترین مخلوق ہوں۔ لیکن اُس نے اکثر میری یہ حالت کر دی ہے کہ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ اب اس طرح نہیں رہ سکتا جیسے رہتا ہوں۔۔۔۔"

"ایک چیز اور بھی ہے جو میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی ــــ شرم کا احساس، جس کی تمھیں شاید میری ذات سے توقع نہیں۔ لیکن سقراط ہی دنیا میں ایک ایسا آدمی ہے، جو میرے اندر شرمندگی کا احساس پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ اُس سے مفر نہیں۔ اور میں جانتا ہوں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ مجھے کرنا چاہئے ــــ اس کے باوجود جب میں اُس کے سامنے سے چلا آتا ہوں تو مجھے اس کا خیال بھی نہیں رہتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اور اس لئے میں ایک مفرور غلام کی طرح بھاگتا ہوں، اور جب تک ممکن ہوتا ہے اس کی نظر سے دور رہتا ہوں۔ لیکن پھر جب میری اُس کی ملاقات ہوتی ہے تو مجھے وہ ساری باتیں یاد آجاتی جن کا میں پچھلی دفعہ اقبال کر چکا ہوں، اور اس لئے قدرتی طور پر مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔۔۔

"مجھے کسی ایسی چیز نے ڈسا ہے جو سانپ سے بھی زیادہ زہریلی

ہے۔ حقیقت میں اس ڈسنے سے مجھے جتنی تکلیف اور بے چینی ہے وہ دنیا کی ہر تکلیف سے زیادہ ہے۔ کسی نے میرے دل کو ڈسا ہے، میرے دماغ کو ڈسا ہے، اور جو کچھ تم کہنا چاہو، اُسے بھی ڈسا ہے۔[1]

گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس ایک جاندار جماعت بن جاتی ہے

گاندھی جی پہلی مرتبہ کانگریس میں شامل ہوئے اور داخل ہوتے ہی انھوں نے اس کی ہیئت کو بدل ڈالا۔ اسے عوام کی جمہوری جماعت بنا دیا۔ یوں تو اس سے پہلے بھی جمہوری جماعت تھی لیکن اس کی جمہوریت صرف اونچے طبقوں تک محدود تھی۔ اب کسان اس میں جوق جوق شامل ہونے لگے اور اس نے ایک وسیع دیہی تحریک کی شکل اختیار کرنی شروع کر دی، جس میں متوسط طبقے کے بھی بہت سے لوگ شامل تھے دیہی عنصر آگے چل کر بہت بڑھ گیا۔ کانگریس میں ملوں کے مزدور بھی شامل ہوئے لیکن اجتماعی حیثیت سے نہیں بلکہ انفرادی حیثیت سے۔

کانگریس کی اس نئی جماعت کی بنیاد اور مقصد عمل تھا، ایسا عمل جو امن اور صلح کے ساتھ کیا جائے اب تک عمل کے بجائے جو کچھ ہوتا رہا تھا اُس کی صرف دو شکلیں تھیں ــــ بیٹھ کر باتیں کرنا اور ریزولیوشن پاس کر ڈالنا یا دہشت پسندی کے طریقوں پر کاربند ہونا۔ اب ان دونوں چیزوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا اور خاص کر دہشت پسندی کو کانگریس

---

1. From "The Five Dialogues in Plato." Everyman's Library.

کی بنیادی پالیسی کے خلاف قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ ایک نیا طریق کار کیا گیا۔ یہ طریقہ بنیادی طور پر پُر امن تھا لیکن اس میں یہ شرط تھی کہ ناحق کے آگے ہرگز سر نہ جھکاؤ۔ اس لئے جو لوگ اس پر عمل کرتے تھے انھیں لازمی طور پر دُکھ اور تکلیف کو خوشی سے برداشت کرنے پر تیار رہنا پڑتا تھا۔ گاندھی جی کچھ عجیب قسم کے امن پسند تھے۔ اس لئے کہ اُن میں اس امن پسندی کے ساتھ ساتھ بلا کی قوتِ عمل بھی تھی۔ وہ قسمت کے آگے یا کسی ایسی چیز کے آگے جسے وہ بُرا سمجھتے ہوں، سر جھکانے کے قائل نہ تھے۔ اُن میں مدافعت کی پوری قوت موجود تھی، اگرچہ یہ مدافعت بھی بے ضرر اور پر امن تھی۔

گاندھی جی کی دعوتِ عمل دو طرح کی تھی۔ پہلی دعوت غیر ملکی حکومت کے خلاف جدوجہد کی دعوت تھی اور دوسری اپنی سماجی خرابیوں کے خلاف لڑنے کی دعوت۔ کانگریس کا بنیادی مقصد تھا۔ ہندوستان کی آزادی اور اس آزادی کی جنگ میں عدم تشدد کا استعمال۔ لیکن اس بنیادی مقصد کے ساتھ ساتھ اس کے پروگرام میں اور بھی کئی اہم چیزیں شامل تھیں — قومی اتحاد، جو اقلیتوں کے مسائل کو حل کر سکے، نیچ ذاتوں کی اصلاح و ترقی اور چھوت چھات کی لعنت کا خاتمہ۔

گاندھی جی کو معلوم تھا کہ برطانوی حکومت کی عمارت کی بنیاد خوف، اور رُعب، کے علاوہ، لوگوں کے تعاون پر جو وہ دل سے یا بے دلی سے کرتے ہیں اور بعض ایسی جماعتوں کی مدد پر قائم ہے جن کا مفاد برطانوی حکومت سے وابستہ ہے۔ گاندھی جی نے سب سے پہلے انھیں بنیادی سہاروں اور ستونوں پر حملہ کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں

سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ لوگ حکومت کے دئے ہوئے خطاب واپس دے دیں۔ اگرچہ خطاب یافتہ لوگوں میں سے بہت کم اس تحریک سے متاثر ہوئے لیکن عوام میں خطابوں کی جو عزت تھی وہ جاتی رہی اور وہ محض ذلت کے نشان بن کر رہ گئے۔ زندگی کے نئے معیار قائم ہوگئے، نئی قدریں بن گئیں۔ اور سرکاری اور غیر سرکاری درباروں کی وہ ساری شان و شوکت جس سے لوگ بے حد مرعوب ہوا کرتے تھے، لوگوں کو بے معنی، حقیر اور شرمناک نظر آنے لگی، اس لئے کہ اس کی بنیاد لوگوں کی مفلسی اور مصیبت پر قائم تھی۔ امیروں میں اپنی امیری کے دکھاوے کی خواہش باقی نہیں رہی — کم از کم اپنے ظاہری رہن سہن میں انھوں نے انتہائی سادگی اختیار کرلی اور لباس میں بھی اُن میں اور معمولی لوگوں میں کوئی فرق اور امتیاز باقی نہیں رہا۔

کانگریس کے پرانے لیڈر، جن کی پرورش بالکل مختلف قسم کی غیر متحرک اور خوابیدہ فضاؤں میں ہوئی تھی عوام کے اس جوشِ بیداری سے گھبرا سے رہے تھے۔ لیکن بیداری اور احساس کی یہ لہریں جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں اتنی تند و تیز تھیں کہ انھیں بھی اپنے ساتھ بہالے گئیں۔ پرانے لیڈروں میں سے بہت تھوڑے سے ایسے تھے جو اس نئی ڈگر پر نہ آئے اور ان میں سے ایک مسٹر محمد علی جناح بھی تھے۔ اُنھوں نے کانگریس کو ہندو مسلمانوں کے کسی باہمی اختلاف کی وجہ سے نہیں چھوڑا تھا۔ بلکہ وہ اس لئے الگ ہوئے تھے کہ وہ اپنے آپ کو ان نئے آدرشوں سے ہم آہنگ نہ کرسکے، اور اس سے کچھ زیادہ اس لئے کہ اُنھیں وہ لوگ جو بے ڈھنگے کپڑے پہنتے تھے اور

ہندوستانی ہوتے تھے بالکل پسند نہیں کرتے تھے اور کانگریس انھیں سے بھری ہوئی تھی۔ ان کا سیاست کا تصور ذرا دیچسپ قسم کا تھا اور یہ اسمبلی کے اجلاسوں اور کمیٹیوں کے لئے زیادہ موزوں تھا کئی سال تک وہ اس نئی فضا ہم آہنگ نہ ہوسکے اور ہمیشہ کیلئے ہندوستان سے کہیں باہر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا وہ انگلستان میں جاکر آباد ہوگئے اور گئی

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے، اور میرے نزدیک اس میں صداقت بھی ہے کہ ہندوستانی سکون پسند اور مرنجان مرنج واقع ہوئے ہیں۔ غالباً ساری پرانی قومیں زندگی کے اسی تصور کی پابند ہوجاتی ہیں فلسفے کی قدیم روایات بھی قوموں کو سکون پسند بنا دیتی ہیں۔ لیکن گاندھی جی جو ہندوستانی آدرشوں کا زندہ مجسمہ ہیں اس کے بالکل برعکس ہیں ان کی ذات عمل اور سرگرمی کا خزانہ ہے وہ ایک جن کی طرح کام کرتے ہیں اور کراتے ہیں نہ خود چین لیتے ہیں اور نہ دوسروں کو لینے دیتے ہیں میرے خیال میں ہندوستان کی سکون پسندی کو بدلنے میں کسی نے اتنا زبردست حصہ نہیں لیا جتنا گاندھی جی نے۔

انھوں نے ہمیں دیہاتوں میں بھیجا اور دیہاتوں کی فضا عمل کے اس نئے پیام کے ان گنت پیامیوں کی سرگرمی سے گونج اٹھی سوتا ہوا کسان بیدار ہوگیا اور اپنے کنج عزلت سے باہر نکل آیا۔ ان سرگرمیوں نے ہم پر ایک دوسری طرح کا لیکن بہت معنی خیز اثر ڈالا۔ ہم نے اپنی زندگی میں شاید پہلی دفعہ دیہاتی کو اس کی پھوس کی جھونپڑی میں اچھی طرح دیکھا جہاں بھوک کا بھیانک آسیب ہر وقت اس کو ستاتا تھا۔ ہم نے ہندوستان کی حقیقی معاشیات جو بڑی بڑی اور عالمانہ لکچروں سے بھی نہیں سیکھی تھی ان دیہاتیوں کی سیر سے سیکھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

جو جذباتی انقلاب ہم میں پیدا ہوا تھا وہ اور زیادہ پختہ اور مستحکم ہو گیا۔ اب ہمارے لئے یہ ممکن تھا کہ زندگی کے پرانے معیار دوبارہ اختیار کر سکیں چاہے آگے چل کر ہمارے خیالات پھر بدل جائیں۔

معاشی، سماجی اور بعض دوسرے مسائل کے متعلق گاندھی جی اپنی ایک مستحکم رائے رکھتے تھے انھوں نے یہ رائے کانگریس کے سر زبردستی تھوپنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ خود برابر سوچتے رہے اور ان کی رائے میں وقتاً فوقتاً تبدیلی بھی ہوتی رہی ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ خیالات ایسے تھے جنھیں وہ کانگریس کی پالیسی میں داخل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن اس کوشش میں بھی انھوں نے برابر احتیاط سے کام لیا، اس لئے وہ جمہور کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ گاندھی جی اپنی فکر میں کانگریس کی رفتار سے بہت آگے نکل گئے اور انھیں پھر پیچھے لوٹ کر آنا پڑا۔ بہت سے لوگوں نے اُن کی رائے کے بعض حصوں سے اختلاف کیا اور کچھ لوگ ان کے بنیادی تصور ہی کے مخالف رہے۔ لیکن اکثر لوگوں نے ان کے خیالات کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ قبول کر لیا۔ اور یہ چیزیں وقت اور ضرورت کے مطابق کانگریس کی پالیسی میں داخل ہوتی رہیں۔ دو مختلف شکلوں میں گاندھی جی کے افکار نے کانگریس کی پالیسی پر ایک مبہم مگر گہرا اثر ڈالا۔ ایک تو لوگ ہر چیز کی قدر و قیمت کو اس معیار پر پرکھنے لگے کہ اس سے عوام کو کیا فائدہ ہوگا دوسرے وہ یہ سمجھنے لگے کہ مقصد خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، اُسے حاصل کرنے کے ذریعے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ ذریعے کا اثر مقصد پر پڑتا ہے اور اُسے بدل دیتا ہے۔

گاندھی جی بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی تھے، اور اُن کے رگ و ریشہ میں ہندو مذہب سرایت کئے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود اُن کے مذہب کا تصور رسم و رواج اور عقیدہ کے کٹرپن سے بالکل مبرّا تھا۔[1] اُن کے مذہبی عقیدے کی بنیاد قانون اخلاق تھا، جسے گاندھی جی 'صداقت' یا 'محبت' کا قانون کہتے ہیں۔ حق اور عدم تشدد ان کے نزدیک ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اور وہ ان دونوں لفظوں کو قریب قریب اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ہم جہاں چاہیں ایک کی جگہ پر دوسرے کو رکھ سکتے ہیں۔ گاندھی جی کا دعویٰ ہے کہ وہ مذہب کی روح کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس لئے وہ ہر اُس رسم و روایت کو رد کر دیتے ہیں جو ان کی تصوری تعبیر مذہب سے مطابق نہ ہو۔ انھوں نے کہا ہے کہ "میں کسی ایسی روایت یا رسم کا غلام بننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں، جس کے لئے میرے پاس کوئی اخلاقی جواز موجود نہ ہو" اور اس لئے عمل کے میدان میں گاندھی جی اپنے آپ کو بالکل آزاد سمجھتے ہیں وہ جس راستے

---

[1] گاندھی جی نے جنوری ۱۹۲۸ء میں فیڈریشن آف انٹرنیشنل فیلوشپ کے سامنے یہ کہا تھا کہ "مدتوں کے مطالعہ اور تجربہ کے بعد میں ان نتیجوں پر پہنچا ہوں۔ (۱) سب مذہب سچے ہیں (۲) سب مذہبوں میں کوئی نہ کوئی خامی ہے (۳) سارے مذہب مجھے اتنے ہی عزیز ہیں جتنا ہندو مذہب۔ میرے دل میں دوسرے مذہبوں کی وہی عزت ہے جو اپنے مذہب کی۔ اور اس لئے مذہب بدلنے کا خیال ایک ناممکن سی بات ہے..... ہمیں دوسروں کے لئے ہرگز یہ دعا ہرگز نہیں مانگنی چاہئے کہ 'اے خدا! انھیں بھی وہی روشنی دے جو تو نے مجھے دی ہے' بلکہ یہ دعا مانگنی چاہئے کہ انھیں اتنی روشنی اور سچائی دے جتنی ان کی انتہائی ترقی کے لئے ضروری ہے!"

پر چا ہتے ہیں چلتے ہیں اور جس طرح جی چاہتا ہے اپنے آپ کو حالات سے ہم آہنگ بنا کر، اپنی زندگی اور عمل کے فلسفے کو نشو ونما دیتے ہیں۔ اُن پر پابندی ہے تو صرف اس بنیادی قانون اخلاق کی جس کا حکم ناطق ہے۔ اس فلسفے کی صحت یا عدم صحت کی بحث الگ رہی ہو، لیکن وہ ہر چیز کو اسی کے پیمانے سے ناپتے ہیں، اور خاص کر اپنے قول و فعل کو۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست میں بھی، طرز عمل سے عام انسان کو طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں اور اس لئے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اس طرح کی کوئی دقت گاندھی جی کو اپنے بنائے ہوئے سیدھے راستے سے ہٹا نہیں سکتی — یہ اور بات ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے بھی وہ برابر اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ ہر اصلاح جو وہ چاہتے ہیں ہر نصیحت جو وہ دوسروں کو کرتے ہیں، سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھاتے ہیں۔ وہ ہر چیز پہلے اپنے آپ سے شروع کرتے ہیں اور ان کے قول و فعل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے خواہ کچھ بھی ہو، اُن استقلال میں فرق نہیں آتا۔ اور اُن کی زندگی اور عمل میں ایک خاص طرح کی تکمیل محسوس ہوتی ہے۔ جو ناکامیاں ان کو ہوئی ہیں انھوں نے بھی ان کے مرتبہ کو بلند کرنے میں حصہ لیا ہے۔

جس ہندوستان کو وہ اپنی خواہشوں اور آدرشوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے، اُس کے متعلق گاندھی جی کا کیا خیال تھا؟ "میں ایک ایسے ہندوستان کی بھلائی کے لئے کام کروں گا جس میں غریب سے غریب آدمی یہ سوچے کہ یہ اُس کا ملک ہے

اور اس کے بنانے میں اس کو بھی دخل ہے ـــــ ایسا ہندوستان جس میں ساری جماعتیں مکمل سکون اور اطمینان سے رہیں گی........ اس طرح کے ہندوستان میں چھوت چھات کی ذلت اور نشے بازی کی لعنت کے لئے کوئی جگہ نہیں ...... اس ہندوستان میں عورت کا وہی حق ہوگا جو مرد کا .... یہ ہے میرے خوابوں کا ہندوستان"
گاندھی جی کو اپنے ہندو ہونے پر ناز تھا، اور انھوں نے ہندو مذہب کو ایک عالمگیر شکل دینے کی کوشش کی اور سچائی کے وسیع دائرے میں کل مذاہب کو شامل کر لیا۔ انھوں نے اپنی تہذیبی میراث کو محدود اور مقید کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اور انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ" ہندوستانی تہذیب نہ پورے طور پر ہندو تہذیب ہے، نہ اسلامی اور نہ کسی اور طرح کی۔ یہ سب کا امتزاج ہے" ایک جگہ اور گاندھی جی کہتے ہیں" میں چاہتا ہوں کہ میرے مکان کے چاروں طرف سب ملکوں کی تہذیبوں کی ہوائیں آزادی سے چلتی رہیں۔ لیکن میں ہرگز نہیں چاہتا کہ ان میں سے کوئی ہوا مجھے اپنی جگہ سے ہٹا دے۔ مجھے دوسروں کے گھر میں ناخواندہ مہمان، سائل یا غلام بن کر رہنا پسند نہیں" فکر کی نئی لہروں نے بھی ان کے قدموں میں جنبش نہیں ہونے دی۔ وہ اب بھی مضبوطی سے اپنی جگہ پر کھڑے ہیں۔

اور اس طرح گاندھی جی کئی کام کرنے کے لئے اس سفر پر روانہ ہوئے ـــــ لوگوں کی روحانی وحدت انھیں واپس دلانے کے لئے، متغرب زدہ لوگوں کے ایک محدود طبقے اور عوام کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے لئے پرانی بنیادوں میں زندگی کے عناصر تلاش کرنے اور

ان پر کوئی عمارت کھڑی کرنے کے لئے اور عوام کو گہری نیند سے جگا کر ان کے جمود کو حرکت میں بدلنے کے لئے۔ گاندھی جی کی یکسو لیکن ہمہ رنگ فطرت میں ایک رنگ نمایاں نظر آتا ہے، اور وہ یہ کہ وہ عوام کے ساتھی ہیں، اُن سے گہرا روحانی تعلق رکھتے ہیں۔ اور نہ صرف ہندوستان ہی کے بلکہ ساری دُنیا کے ناداروں اور مفلسوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ گاندھی جی کے دل میں اس دبی اور کچلی ہوئی مخلوق کو اُبھارنے کا جو جذبہ ہے اُس کے مقابلے میں مذہب کا رنگ بھی پھیکا دکھائی دیتا ہے: "ایک نیم فاقہ کش قوم کے پاس نہ مذہب ہو سکتا ہے، نہ آرٹ اور نہ تنظیم"۔ میرے نزدیک صرف وہ چیز حسین ہے جو کروڑوں فاقہ کشوں کے لئے مفید بن سکے۔ پہلے ہم ضروری ضروری چیزیں انھیں دے دیں۔ زندگی کا حُسن اور اُس کی سجاوٹیں بعد میں آتی رہیں گی۔ . . . . . میں ایسے آرٹ اور ادب کا خواہش مند ہوں جو عوام سے ہم کلام ہو سکے"۔ یہ بدنصیب مفلس اور نادار کروڑوں انسان اُن کے تصور پر چھائے ہوئے تھے، اور باقی ہر چیز اسی تصور کے گرد چکر لگاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میری تمنا ہے کہ "ہر آنکھ سے آنسو کے قطرے پونچھ ڈالوں"۔

اور اس لئے اس میں ذرا بھی حیرت اور تعجب کی بات نہیں کہ اس حیرت انگیز شخص نے جو حد درجے کی خود اعتمادی اور ایک غیر معمولی قسم کی طاقت سے بھرپور تھا، جو ہر انسان کی مساوات اور آزادی کا پیامی بن کر ہمارے سامنے آیا تھا، اور جو اپنے سارے آدرشوں کو غریبوں کے لئے وقف کرنا چاہتا تھا، ہندوستان کے ہر آدمی

پر جادو کا اثر کیا اور ہر شخص ایک مقناطیسی کشش کے زور میں اس کی طرف کھنچنے لگا۔ اُن کی نظر میں یہ عجیب و غریب انسان گویا ماضی کو مستقبل سے ملا رہا تھا اور حال کی ساری مصیبتیں گویا اُس سفر کی ایک منزل تھیں جو ہمیں زندگی اور اُمیدوں سے بھرے ہوئے مستقبل کی طرف لئے جا رہا تھا۔ یہ مقناطیسی اثر صرف عوام ہی پر نہیں ہوا بلکہ پڑھے لکھے طبقے پر بھی — گو کبھی کبھی ان کے ذہنوں میں ایک الجھن بھی پیدا ہوتی تھی اور زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنا ذرا مشکل سا نظر آنے لگتا تھا۔ پھر بھی گاندھی جی نے ایک زبردست نفسیاتی انقلاب پیدا کر دیا۔ نہ صرف اُن لوگوں میں جو اس کے معتقد اور پیرو تھے، بلکہ اس کے مخالفوں میں، اور اُن مذبذب لوگوں میں بھی جو اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔

کانگریس پر گاندھی جی کا اقتدار تھا، لیکن عجیب و غریب قسم کا اقتدار اس لئے کہ اس کے باوجود کانگریس ایک جاندار، انقلابی اور ہمہ گیر جماعت تھی (جس میں ہر طرح کے خیالوں کے لوگ شامل تھے) اور کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے جدھر چاہے موڑ دے۔ جیسا دوسروں کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے گاندھی جی کو تھوڑا بہت جھکنا بھی پڑتا تھا۔ اور کبھی کبھی اُنھیں ایسے فیصلے بھی ماننے پڑتے تھے جو اُن کی رائے کے بالکل خلاف ہوتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جن معاملات کو وہ بے حد اہم سمجھتے تھے اُن پر مضبوطی سے جمے رہتے تھے اور اس لئے بعض موقعے ایسے بھی آئے جب اُن میں اور کانگریس میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ لیکن گاندھی جی

ہمیشہ ہندوستان کی آزادی اور اُس کی قومیت کی روح رواں رہے، اور اُن سب کے شدید مخالف جو ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اختلاف کے باوجود لوگ ہمیشہ اُن کے گرد جمع ہوئے اور سب نے اُن کی قیادت کے آگے سر جھکایا لیکن جب ہندوستان میں عملی جدوجہد کا دور نہ ہوتا تو کبھی کبھی لوگ ان کی قیادت اور رہبری سے سرتابی کر لیتے تھے۔ لیکن جوں ہی کسی جدوجہد اور عملی سرگرمی کا موقع آتا، آزادی کے اس علمبردار کو پھر وہی اہمیت حاصل ہوجاتی اور اختلافات دب جاتے۔

اسی طرح کا ایک دور ۱۹۲۰ء میں آیا۔ نیشنل کانگریس اور بڑی حد تک سارا مُلک اس رہبر کے بتائے ہوئے نئے راستے پر چلنے لگا اور بار بار اس کی ٹکر برطانوی قوت سے ہوئی۔ یہ کشمکش اور ٹکر لازمی نتیجہ تھی اس نئے طریقے کا اور اُن نئے حالات کا جو اس وقت مُلک میں پیدا ہوگئے تھے۔ لیکن یہ تحریک سیاسی چالوں یا ریشہ دوانیوں کی پیدا کی ہوئی نہیں تھی بلکہ اس کی تہ میں ہندوستانیوں کو قوی بنانے کی خواہش تھی اس لئے کہ قوت ہی ایسی چیز تھی جس سے وہ آزادی حاصل کرکے اُسے قائم رکھ سکتے تھے۔ حکومت سے عدم تعاون کی ٹکریں پیہم یکے بعد دیگرے ہوتی رہیں۔ اور ان ٹکروں سے ہندوستان کو بہت دکھ سہنے پڑے۔ لیکن یہ مصیبت کہ ہندوستانیوں نے خود مول لی تھی اور اس لئے ان سے پسپائی، شکست اور مایوسی کا جذبہ پیدا ہونے کے بجائے ایک خاص طرح کی قوت پیدا ہوتی تھی۔ پر ان ٹکروں میں، حکومت کے خوفناک ظلم و تشدد سے اُنھیں بھی دکھ اور نقصان پہنچا جو اس کے لئے تیار نہ تھے؛ اور بعض

صورتوں میں ان ظلموں نے بعض ایسے لوگوں کی ہمتیں بھی پست کر دیں
جو اپنی خوشی اور مرضی سے جدوجہد میں شریک ہوئے تھے۔ لیکن اکثر
لوگوں نے ان لوگوں کو ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ سہا اور ان چوٹوں
نے ان کے سینوں کو اور بھی مضبوط بنا دیا۔ جس زمانے میں کانگریس کی
قسمت کا ستارہ عروج پر نہیں تھا، اس زمانے میں بھی اس نے قوت
کے آگے سر نہیں جھکایا اور غیر ملکی حکومت کا دلیری سے مقابلہ کرتی رہی۔
اور وہ ہندوستان کی آزادی کی پُر جوش تمنا اور غیر ملکی حکومت کا مقابلہ
کرنے کے عزم بالجزم کی علامت بن گئی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہندوستان
کے اکثر لوگوں کو اس کے ساتھ ہمدردی تھی، اور گو ان میں سے بہت
سے اتنے کمزور، بے جان اور مجبور تھے کہ خود کچھ نہیں کر سکتے تھے
لیکن ان کی نظر قیادت پر لگی رہتی تھی۔ بعض حیثیتوں سے کانگریس ایک
جداگانہ جماعت تھی مگر کبھی کبھی مختلف جماعتوں کی متحدہ آواز بھی بن جاتی
تھی۔ لیکن حقیقت میں یہ اس سے بھی بڑھ کر تھی، اس لئے کہ اس میں
ہندوستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے دلوں کی دھڑکن شامل
تھی۔ کانگریس کے ممبروں کی تعداد بہت بڑی تھی لیکن محض اس
تعداد کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کانگریس سارے ملک کی
نمائندہ جماعت تھی۔ اس لئے کہ ممبروں کی تعداد صرف ان کی ممبر بننے
کی خواہش سے نہیں بڑھی بلکہ اس کے لئے ہمیں دور دراز دیہات
تک پہنچنا پڑتا ہے۔ اور پھر ایک بات اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کانگریس
کی حیثیت اکثر (جیسے آج کل) ایک خلاف قانون جماعت کی سی رہی
ہے۔ قانون کے نزدیک اس کا کوئی وجود نہیں اس لئے ہمارے

رجسٹروں اور کاغذوں پر پولیس کا قبضہ ہے۔

حکومت سے عدم تعاون کی تحریک جس زمانے میں باقاعدہ طور پر نہ بھی چل رہی ہو، اس زمانے میں بھی لوگوں کا عام رویہ حکومت کی مشینیری کے خلاف عدم تعاون کا ہی رہتا ہے، خواہ اس میں وہ جارحانہ شدت نہ ہو جو پہلے تھی۔ لیکن یہ عدم تعاون انگریزوں کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب بہت سے صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں تو ان حکومتوں اور انگریزوں کے درمیان خاصا اشتراکِ عمل رہا۔ پھر بھی فضا میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوا، اور کانگریسیوں کو اپنے سرکاری کاموں کے علاوہ باقی چیزوں میں جو طرزِ عمل رکھنے کی ضرورت تھی اس کے متعلق ہدایتیں جاری کردی گئیں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی قومیت اور غیر ملکی سامراج کے درمیان کوئی مستقل سمجھوتہ ممکن ہی نہیں ہوا تھا، یہ اور بات ہے کہ کام چلانے کے لئے وقتی طور پر کچھ عارضی سمجھوتے کرلئے جائیں۔ صرف آزاد ہندوستان ہی انگلستان کے ساتھ برابری کا کوئی سمجھوتا کرسکتا ہے۔ غلام ہندوستان نہیں کرسکتا۔

۳ ۔ صوبوں میں کانگریسی حکومتیں

برطانوی پارلیمنٹ نے کئی سال تک کمیشن مقرر کرنے، کمیٹیاں بنانے اور بحث مباحثے کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ اس قانون کی رو سے صوبوں کے لئے ایک طرح کی خود اختیاری حکومت اور مرکز میں ایک وفاق تجویز کیا گیا۔ لیکن اس کے

بعد بھی اتنی زیادہ پابندیاں تھیں کہ سیاسی ... معاشی اختیارات اب بھی برطانوی حکومت کے ہاتھ میں رہے ... حیثیتوں سے اس قانون نے سرکاری افسروں اور عہدہ داروں کے اختیارات اور زیادہ وسیع اور ان کے ہاتھ اور زیادہ مضبوط کر دیے۔ مرکزی وفاق کی شکل کچھ اس طرح کی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی قسم کی ترقی کا تصور ہی ممکن نہیں تھا۔ اس میں کہیں ذرا سی بھی گنجایش نہیں تھی کہ ہندوستانی جمہور کے نمائندے برطانوی عہدہ داروں کے انتظام میں کوئی دخل دے سکیں یا حکومت کے نظام میں کوئی تبدیلی کر سکیں۔ اس طرز حکومت میں کسی طرح کی تبدیلی کا اختیار اگر کسی کو تھا تو صرف برطانوی پارلیمنٹ کو۔ گویا یہ پورا نظام شروع سے آخر تک رجعت پسندی پر اور اس میں اصلاح و ترقی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اس نئے قانون نے برطانوی حکومت، رئیسوں، تعلقہ داروں اور ہندوستان کے دوسرے رجعت پسند گروہوں کے باہمی تعلق کو اور مضبوط بنا دیا۔ اس نے جداگانہ انتخاب کا دائرہ اور پھیلا دیا اور اس طرح ہندوستان میں افتراق کی جڑوں کو اور مستحکم کر دیا۔ اس نے برطانوی تجارت، صنعت بینک اور جہاز رانی کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ قوت دے دی، اور اس قوت میں کسی طرح کی دست اندازی کو قانونی جرم بنا دیا[۱]۔ اس قانون نے ہندوستان کے مالی، فوجی اور بیرونی معاملات بھی انگریزوں ہی کے ہاتھوں میں رکھے۔ اور وائسرائے کو پہلے سے بھی زیادہ با اختیار بنا دیا۔

---

[۱] اگلے صفحے پر دیکھیے۔

صوبے کی حکومتوں میں اختیارات بظاہر بڑی حد تک ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھے۔ لیکن ان خود اختیاری حکومتوں کی حالت بھی عجیب و غریب تھی۔ ان کے سارے اختیارات پر وائسرائے کی طرف سے ہر طرح کی روک تھام تھی۔ بلکہ صوبے کا گورنر بھی وائسرائے کی طرح ہر معاملہ میں دخل دے سکتا تھا۔ اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون کو رد کر سکتا تھا، اپنی مرضی سے کوئی خود ساختہ قانون نافذ کر سکتا تھا۔ غرض اسمبلی اور وزیروں کے اختلاف کے باوجود، جو اُس کے جی میں آئے کر سکتا تھا۔ مالیہ کا ایک بڑا حصّہ ایسے کاموں کے لئے وقف کر دیا جاتا تھا کہ اُسے کوئی ہاتھ نہ لگا سکے۔ اونچے عہدہ دار اور پولیس بالکل وزیروں کے

لہ برطانیہ کی صنعت اور تجارت کے نمائندے اب تک ان امتناعی قانون کو ہٹانے کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں برطانیہ کے اختلاف کے باوجود مرکزی اسمبلی میں ایک تجویز پاس ہوئی تھی جس میں ان امتناعی قانون کے ہٹا دینے پر زور دیا گیا تھا۔ ہندوستانی قومیت، اور ہندوستان کی سیاسی جماعتیں اور گروہ دل سے چاہتے ہیں کہ یہ قانون منسوخ ہو جائیں خصوصاً ہندوستانی صنعت کے نمائندوں کی یہ خواہش ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ لنکا کے ہندوستانی تاجر بالکل اسی طرح کے امتناعی اور حفاظتی قانون کا نفاذ لنکا میں کرانا چاہتے ہیں جن کی وہ انگریز تاجروں کے معاملے میں مخالفت کر رہے ہیں۔ خود غرضی انسان کو نہ صرف انصاف اور سچائی کی طرف سے اندھا کر دیتی ہے بلکہ وہ معمولی سی منطق اور سمجھ داری سے کام لینا بھی بھول جاتا ہے۔

خیال تھا کہ مرکزی وفاق ہندوستان کے لئے بڑی مناسب اور موزوں چیز ہے۔ لیکن جس شکل میں یہ وفاق اس قانون نے تجویز کیا تھا اُس سے ہندوستان میں برطانوی طاقت اور مفاد کو اور زیادہ تقویت حاصل ہو گئی تھی۔ عملی طور پر اس کے صرف اسی حصے کا نفاذ ہوا جو صوبوں کی حکومت خود اختیاری سے تعلق رکھتا تھا اور کانگریس نے فیصلہ کیا کہ وہ انتخابات میں حصہ لے گی لیکن اس سوال پر کہ قانون نے جو پابندیاں لگائی ہیں اُن کے باوجود صوبجاتی حکومتوں کی ذمہ داری لینی چاہئے یا نہیں، کانگریس میں بڑا زبردست بحث و مباحثہ ہوا۔ الیکشن میں کانگریس کو اکثر صوبوں میں زبردست کامیابی ہوئی۔ لیکن اب کانگریس وزارتیں بنانے میں ہچکچاہٹ رہی تھی تاوقتیکہ اُسے اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ گورنر اور وائسرائے روزمرہ کے معاملات میں دخل نہیں دے گا۔ کئی مہینوں کے بعد کچھ مبہم لفظوں میں اس بات کا یقین دلایا گیا کہ گورنر اور وائسرائے کسی قسم کا دخل نہیں دیں گے اور جولائی ۱۹۳۷ء میں صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو گئیں۔ گیارہ صوبوں میں سے آٹھ میں کانگریسی وزارتیں بنیں۔ سندھ، بنگال اور پنجاب باقی بچے۔ سندھ ابھی نیا نیا صوبہ بنا تھا۔ چھوٹا سا صوبہ تھا اور یہاں کے حالات میں ابھی استحکام نہیں پیدا ہوا تھا۔ بنگال میں کانگریس اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت تھی لیکن مجموعی حیثیت سے اسے اکثریت حاصل نہیں تھی اس لئے اس نے صوبے کی حکومت میں شریک ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ بنگال (یا کلکتہ) چونکہ ہندوستان میں برطانوی سرمایہ کا سب سے بڑا مرکز ہے اس لئے یورپ کے تجارتی عنصر کو یہاں اسمبلی میں حد سے زیادہ نمائندگی دے دی

گئی ہے۔ تعداد میں یہ لوگ صرف چند ہزار ہیں پھر بھی اسمبلی میں انھیں ۲۵ نشستیں دی گئی ہیں اور اس کے مقابلے میں غیر مسلموں کو صرف ۵۰ نشستیں، جن کی آبادی (اچھوتوں کو چھوڑ کر) ایک کروڑ ۷۰ لاکھ کے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز ممبروں کی اس خاصی بڑی جماعت کو بنگال کی سیاست میں بڑا دخل ہے اور وہ وزارتیں بنا اور بگاڑ سکتی ہے

کانگریس ۱۹۳۵ء کے قانون کو ہندوستانی مسئلہ کے عارضی حل کی حیثیت سے بھی منظور کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہ مکمل آزادی چاہتی تھی اور اس لئے اس قانون کی شدید مخالف تھی۔ لیکن اس کی اکثریت نے صوبوں میں خود اختیاری کی حکومتیں چلانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس طرح اب کانگریس دوہری پالیسی پر چل رہی تھی —— آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنا اور صوبوں کی حد تک ملک میں مفید اصلاحیں کرنا۔ دیہاتیوں اور زراعت کے مسئلہ کی طرف خاص طور پر فوراً توجہ کی سخت ضرورت تھی۔

اور اس لئے اس بات پر سوچ بچار کیا گیا کہ کانگریس دوسری جماعتوں کے ساتھ مل جل کر وزارتیں بنا لے۔ حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے کہ کانگریس تقریباً ہر جگہ (۸ صوبوں میں) اکثریت میں تھی۔ پھر بھی یہ بات زیادہ مناسب تھی کہ حکومت کے کاموں میں جتنے آدمیوں کو شریک کیا جا سکتا کر لیا جائے۔ ملی جلی وزارتیں بنانے میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی۔ اور پہلے سے بھی سرحد اور آسام کے صوبوں میں ملی جلی وزارتیں ہی ہوتی تھیں۔ پھر اگر سچ پوچھا جائے تو کانگریس خود ایک ملی جلی جماعت تھی اور اس کی حیثیت مختلف گروہوں اور جماعتوں کے ایک متحدہ محاذ کی سی تھی جسے ہندوستانی آزادی کے حصول کی زبردست

خواہش نے پیدا کیا تھا۔ گو کانگریس میں مختلف رنگ اور خیال کے گروہ شامل تھے لیکن مجموعی حیثیت سے اس میں ایک خاص طرح کا جذبہ تھا،
۱۔ اس کی نظر میں سماجی بھلائی کا خیال سمایا ہوا تھا اور اسی خیال نے اس میں خاموشی کے ساتھ جنگ کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ اب اگر وزارتیں بنانے کی خاطر اس میں دوسرے گروہوں کو شامل کیا جاتا تو اس میں ایسے گروہ آجاتے جن کا سیاسی اور سماجی مطمح نظر کانگریس سے بالکل مختلف تھا اور جنھیں عہدے اور وزارتوں کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وزارتیں بنانے میں یوں بھی طرح طرح کے تصادم تھے۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج کے نمائندوں یعنی وائسرائے اور گورنروں سے تصادم، بڑے بڑے عہدہ داروں سے تصادم، اور کسان اور مزدور کے مسئلوں پر مل والوں اور زمینداروں سے تصادم۔ پھر اس تصادم میں اور اضافہ کر لیا جاتا تو بڑی دقت کی بات تھی۔ اس لئے کہ کانگریس کے علاوہ اس وقت ملک میں جو دوسری جماعتیں تھیں وہ سیاسی اور سماجی حیثیتوں سے عموماً قدامت پسند تھیں۔ بلکہ بعض جماعتیں تو محض جاہ و منصب کی خواہاں تھیں اور بس! اگر ایسی جماعتوں اور عناصر کو حکومت میں شامل کر لیا جاتا تو کانگریس کا سارا سماجی نظام پستی اور انحطاط کی طرف مائل ہو جاتا یا کم از کم اس کے پورا ہونے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ضرور پیدا ہو جاتیں۔ اور بہت ممکن تھا کہ یہ عناصر گورنر سے ساز باز کر کے دوسرے وزرا سے بالکل الگ تھلگ ہو جاتے۔ اور یہ موقع ایسا تھا کہ ہمیں برطانوی قوت اور اقتدار کے سامنے ایک متحدہ محاذ بنانے کی ضرورت تھی۔ اس متحدہ محاذ میں ذرا بھی رخنہ پڑتا تو ہمارے

مفاد اور مقصد کو سخت نقصان پہنچا۔ کوئی چیز مختلف وزیروں کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی نہ پیدا کر سکتی، اُن کے مقاصد میں اتحاد نہ ہوتا اور اس طرح ہر وزیر اپنا اپنا الگ راستہ اختیار کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال کسی طرح موزوں اور مناسب نہ تھی۔

ہماری قومی زندگی میں بہت سے آدمی ایسے تھے، جنھیں ہم صرف سیاست داں کہہ سکتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ـــــ یہ حضرات محض منصب پرست تھے اچھے معنی میں بھی اور برے معنی میں بھی۔ کانگریس میں بھی، دوسری جماعتوں کی طرح دونوں طرح کے لوگ تھے۔ قابل، مخلص اور وطن کی محبت میں سرشار، مرد اور عورتیں اور ان کے علاوہ ایسے لوگ جو صرف جاہ و منصب کے خواہاں تھے۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد سے کانگریس کی حیثیت محض ایک سیاسی جماعت کی نہیں رہی تھی ـــــ اس پر اب انقلابی فکر اور عمل کا جذبہ چھایا ہوا تھا اور اس چیز نے اسے ایک خلاف قانون جماعت بنا دیا تھا۔ تشدد، سازش اور خفیہ سازباز کو انقلابی عمل کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ کانگریس کے عمل اور پروگرام میں ان چیزوں کو ذرا بھی دخل نہیں تھا، پھر بھی اس سے اس کی انقلابی شان میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لوگوں میں اس معاملے میں تو اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ کانگریس کا عمل صحیح تھا یا غلط، موثر تھا یا غیر موثر لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اُس کے عمل میں بے پناہ جرأت اور اعلیٰ درجے کا استقلال اور ثابت قدمی تھی۔ شاید انسان کے لئے کسی جذباتی موقعے پر اس طرح کی ہنگامی جرأت دکھانا زیادہ مشکل نہیں، عموماً ایسے موقعوں پر لوگوں کو جان دے دینے میں دریغ نہیں ہوتا۔ لیکن اپنی مرضی

کے خلاف زندگی کے سارے عیش و عشرت کو تج دینا بڑی ہمت اور جواں مردی کی بات ہے اور صرف ایک دو دن نہیں بلکہ مہینوں اور برسوں تک مسلسل اس طرح کی زندگی بسر کرنا اور بھی زیادہ جواں مردی ہے۔ یہ آزمائش بڑی سخت ہے اور بہت کم لوگ اس پر پورے اترتے ہیں۔ لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں آدمی اس سخت آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گذر گئے۔

کانگریسی وزارتوں کی زبردست خواہش تھی کہ کسی نئے ہنگامے کے پیدا ہو جانے سے پہلے ہی اسمبلیوں میں کسانوں اور مزدوروں کی بھلائی کے لئے کچھ قانون پاس کرلیں۔ حالات ہی کچھ اس طرح کے تھے کہ انھیں ہر وقت کسی آنے والے ہنگامے اور یکبارگی پیدا ہو جانے والی کشمکش کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ تقریباً ہر صوبے میں مجالس بالا بھی قائم کی گئیں اور حقِ رائے دہندگی کے محدود ہونے کی وجہ سے ان میں زمینداروں اور مل کے ساہوکاروں کو نمائندگی ملی۔ ان مجالس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں تھیں جن سے ترقی پسند قانونوں کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے تھے۔ ان ساری دقتوں کے ساتھ ساتھ اگر ملی جلی وزارتیں بھی بنالی جائیں تو دقتیں اور بھی زیادہ بڑھ جائیں۔ اور اس لئے سوائے صوبہ سرحد اور آسام کے باقی ہر جگہ کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملی جلی وزارتیں نہ بنائی جائیں۔

یہ فیصلہ کوئی قطعی فیصلہ نہ تھا اور اس میں ہر وقت ترمیم اور تبدیلی کی گنجایش تھی۔ لیکن تیزی سے بڑھتے ہوئے واقعات نے اس فیصلے میں کسی طرح تبدیلی کو ناممکن بنا دیا اور کانگریسی وزارتیں بہت سے

ایسے مسئلوں میں آلجھ گئیں جن کا سلجھانا بے حد ضروری تھا۔ ملی جلی وزارتیں بنانے کے خلاف جو فیصلہ کیا گیا تھا اس پر بعد میں لوگوں نے طرح طرح کی نکتہ چینیاں کیں اور اسے دانش مندی کے خلاف بتایا۔ لیکن اختلاف رائے کی گنجایش ہر چیز میں ہے۔ اور بات کے ہوجانے کے بعد عقل مندی بگھارنا بہت آسان ہے۔ لیکن میرا ذاتی خیال اب بھی یہی ہے کہ سیاسی حیثیت سے اور اس زمانے کے مخصوص حالات کو دیکھتے ہوئے ہمارا فیصلہ مناسب بھی تھا اور منطقی طور پر صحیح بھی۔ پھر بھی اس میں شبہ نہیں کہ فیصلے کا اثر ہندوستان کے فرقہ وارانہ تعلقات پر بہت برا پڑا اور بہت سے مسلمانوں کو اس فیصلے سے شکایت ہوئی اور انھوں نے کانگریس سے دوری اختیار کرلی۔ اور اس صورتِ حال سے رجعت پسند عنصر نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بعض حلقوں میں اپنا اثر اور اقتدار بڑھا لیا۔

سیاسی یا آئینی حیثیت سے اس نئے قانون یا صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے قیام سے برطانوی نظام حکومت میں کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوا۔ اصل اختیار اب بھی اُنھیں ہاتھوں میں رہا جن میں مدتوں سے تھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس نے لوگوں میں نفسیاتی تبدیلی ضرور پیدا کی اور ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس تبدیلی کا اثر شہروں سے زیادہ دیہاتوں میں نظر آتا تھا، گو صنعتی شہروں میں مزدوروں پر بھی یہ اثر اسی حد تک پڑا۔ لوگوں میں ایک خاص قسم کے سکون اور اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔ گویا ان کے کندھوں پر سے ایک بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ مدتوں

سے زندگی کا جو ولولہ دبا ہوا تھا وہ ہر جگہ لہریں لینے لگا۔ اور کچھ عرصے کے لئے جیسے لوگوں کے دل سے پولیس کے سپاہیوں اور خفیہ جاسوسوں کا ڈر بالکل جاتا رہا۔ اور غریب سے غریب کسان کے دل میں بھی عزتِ نفس کا احساس اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے یہ محسوس ہوا کہ اس کی بھی کوئی حقیقت ہے جسے دنیا نظر انداز نہیں کر سکتی۔ حکومت کی حیثیت اب اس کے لئے ایک ایسے ہوّے کی نہیں رہی جس تک پہنچنے کے لئے ان گنت سرکاری عہدہ داروں کا احسان اٹھانا پڑے — ایسے عہدہ دار جن تک نہ وہ پہنچ سکتا تھا نہ ان پر اثر ڈال سکتا تھا، جو ہر وقت اس کا خون چوسنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ حکومت کی اونچی اونچی کرسیوں پر اب ایسے لوگ بیٹھے تھے جنھیں وہ اس سے پہلے دیکھ چکا تھا، جن کی باتیں سنیں تھیں اور جن سے باتیں کی تھیں۔ کبھی کبھی یہ دونوں ایک ساتھ جیل خانے میں بھی رہے تھے اور اس لئے دونوں ایک لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔

جن شہروں میں صوبے کی حکومتوں کے مرکز تھے، جہاں پُرانی دفتری حکومت کی بارگاہیں تھیں، ان میں اب لوگوں کو نئی نئی طرح طرح کے منظر دکھائی دیتے تھے صوبوں کے سیکرٹریوں کے دفاتر گویا معبدِ حکومت کے مقدس حریم تھے۔ انھیں سے وہ پر اسرار احکام صادر ہوتے تھے جن پر کسی کو نکتہ چینی کی مجال نہ تھی۔ پولیس کے باوردی سپاہی، اور سرخ بانات کی چپکنیں پہنے اور پیٹیوں میں چمکیلی کٹاریں باندھے ہوئے چپراسی ان معبدوں کے راستوں کے نگہبان تھے، اور صرف اُن

خوش نصیبوں کو گذرنے دیتے تھے جن میں ہمت اور جرأت تھی یا
جن کے ہاتھوں میں کھنکتے ہوئے سکّوں کی تھیلیاں تھیں۔ اور اب
یکایک سارا منظر بدل گیا۔ شہروں اور گاؤں کے لوگ جوق جوق
آتے، آزادی سے ان مقدس بارگاہوں میں داخل ہوتے اور جدھر
ان کا جی چاہتا گھومتے پھرتے۔ اُنھیں ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ وہ اسمبلی
کے ہال میں جاتے، جہاں اسمبلی کے جلسے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ
وہ وزیروں کے کمروں کو بھی جھانک کر دیکھتے تھے۔ اور ان
آزادی سے گھومنے پھرنے والوں کو کوئی روکنے والا نہیں تھا، اس
لئے کہ اب وہ اس فضا میں اپنے آپ کو غیر نہیں سمجھتے تھے۔ اُنھیں
اس بات کا یقین تھا کہ یہ سب کچھ ان کا ہے، یہ اور بات ہے کہ
اس کی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ اسے اچھی طرح سمجھ نہ سکتے ہوں۔ پولیس کے
سپاہی اور چمکیلی کٹاروں والے چپراسی یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور بے بس
تھے پرانے معیار بدل چکے تھے۔ انگریزی لباس، جسے اب تک حکومت
اور اقتدار کی نشانی سمجھا جاتا تھا، اب کوئی معنی اور حیثیت نہیں رکھتا تھا۔
اور اس لئے اسمبلی کے ممبروں، دیہاتی کسانوں اور شہر کے معمولی باشندوں
میں امتیاز کرنا ناممکن سا تھا۔ ان سب کا لباس عموماً ایک ہی سا ہوتا تھا۔
جسم پر ہاتھ کا بنا ہوا کھدر اور سر پر گاندھی ٹوپی۔

پنجاب اور بنگال میں وزارتیں کچھ مہینے پہلے سے بن چکی تھیں
اور وہاں کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ وہاں کسی طرح کی پیچیدگی
نہیں تھی اور اس لئے یہ تبدیلی اس قدر خاموشی سے ہوگئی کہ زندگی کی
سطح میں ذرا بھی ہلچل پیدا نہیں ہوئی۔ خاص کر پنجاب میں تو بالکل پرانا نظام

قائم رہا اور وزیر بھی پرانے ہی رہے۔ وہ پہلے بھی حکومت کے بڑے عہدہ دار تھے اور اب بھی عہدہ دار ہی رہے۔ ان میں اور برطانوی سامراج میں کسی قسم کا اختلاف اور تصادم نہ تھا۔ اس لئے کہ سیاسی حیثیت سے وہی سامراج اب بھی پہلے کی طرح کارفرما تھا۔

کانگریس کے صوبوں اور بنگال اور پنجاب میں جو فرق تھا وہ شہری حقوق اور سیاسی قیدیوں کے معاملے میں فوراً ہی ظاہر اور واضح ہو گیا۔ بنگال اور پنجاب میں پولیس اور خفیہ والوں کا راج اب بھی قائم رہا اور سیاسی قیدیوں کو رہا نہیں کیا گیا۔ بنگال میں جہاں وزارت کو اکثر یورپین ووٹوں کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا تھا، ہزاروں اس طرح کے نظر بند بھی تھے جو بغیر کسی الزام یا مقدمہ کے سالہا سال سے یہ ایک نامعلوم مدت کے لئے قید میں پڑے سڑ رہے تھے۔ لیکن کانگریسی صوبوں میں پہلا کام یہی ہوا کہ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ ان میں سے بعض کی رہائی میں دیر لگی۔ اس لئے کہ ان پر تشدد کا الزام تھا اور گورنر ان کے رہا کرنے پر کسی طرح پر راضی نہ ہوتے تھے۔ آخر اسی مسئلہ پر اختلاف کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۹۳۸ء کے شروع میں یو۔ پی اور بہار کی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس پر گورنر نے اپنے اعتراض واپس لے لئے اور قیدی رہا کر دئے گئے۔

(۴) ہندوستانی ترقی پسندی اور برطانوی قدامت پسندی

نئی صوبہ جاتی اسمبلیوں میں دیہاتوں کے نمائندے کثرت سے آئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے زراعتی اور زمینداری اصلاحوں کا شدید تقاضہ ہوا۔ بنگال میں، کچھ تو بندوبست استمراری کی وجہ سے

اور کچھ دوسری وجہوں سے کسانوں کی حالت سب سے زیادہ ابتر تھی۔ اس کے بعد دوسرے تعلقہ داری صوبوں کا نمبر آتا تھا، مثلاً بہار اور یو۔پی۔ اور تیسرا نمبر ان صوبوں کا تھا جہاں شروع شروع میں تو کسانوں کو زمین پر ملکیت کے کچھ حقوق حاصل ہوئے تھے، لیکن بعد میں رفتہ رفتہ یہاں بھی بڑے بڑے تعلقہ دار پیدا ہوگئے تھے۔ ایسے صوبوں میں مدراس، بمبئی اور پنجاب وغیرہ تھے۔ بنگال میں بندوبست استمراری ہر طرح کی اصلاح کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اور ہر خیال کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اسے ختم کردینا چاہیئے۔ یہاں تک کہ ایک سرکاری کمیشن نے بھی یہی تجویز پیش کی ہے، لیکن جن لوگوں کا اس میں فائدہ ہے وہ برابر اسے قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ پنجاب اس لحاظ سے خوش قسمت رہا کہ اسے جوتنے کے لئے نئی نئی زمینیں مل گئیں۔

کانگریس کے لئے زمینداری کا مسئلہ سب سے اہم سماجی مسئلہ تھا اور اس نے پوری طرح غور و فکر کے بعد اس کے متعلق اپنی ایک پالیسی بنائی تھی۔ یہ پالیسی مختلف صوبوں میں کسی نہ کسی حد تک مختلف تھی، اس لئے کہ اوّل تو ہر جگہ کے حالات ایک سے نہیں تھے اور دوسرے ہر صوبے کی کانگریسی تنظیم میں جو جماعتیں شامل تھیں، وہ بھی ہر جگہ ایک سی نہیں تھیں۔ اس سلسلے میں کانگریس نے سارے ہندوستان کے لئے ایک پالیسی بنائی تھی۔ ہر صوبے نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم کرلی اور اس کی جزویات کو اپنے حالات کے مطابق کرلیا۔ اس معاملے میں یو۔پی کی کانگریس سب سے زیادہ ترقی پسند تھی اور اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ زمینداری نظام کو بالکل ختم کردیا جائے لیکن ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا

ایکٹ کے مطابق اس پالیسی پر پوری طرح عمل کرنا غیر ممکن تھا۔ اس لئے کہ وائسرائے اور گورنر کے اختیارات اور مجلس بالا کی موجودگی کے علاوہ بھی اس کے راستے میں اور بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ اور اس لئے اس نظام کی جڑوں کو ہلائے بغیر اس میں صرف کچھ موٹی موٹی تبدیلیاں ہی کی جا سکتی تھیں۔ اس مجبوری نے اصلاح کو مشکل اور بے حد پیچیدہ بنا دیا اور اصلاحوں میں توقع سے کہیں زیادہ دیر لگی۔

لیکن بہر حال ان مجبوریوں کے باوجود بعض اہم اصلاحیں نافذ کی گئیں اور دیہاتوں کے قرضے کے مسئلے پر بھی توجہ دی گئی۔ اور اس کے علاوہ کارخانوں میں مزدوروں کی حالت، صحت عامہ اور حفظان صحت، لوکل سلف گورنمنٹ، ابتدائی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم، صنعت و حرفت اور دیہات سدھار کے مسئلوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سے پہلے کی حکومتوں نے ان سماجی، تمدنی اور اقتصادی مسائل کی طرف سے بڑی لاپروائی اور بے توجہی برتی تھی۔ انھوں نے صرف پولیس اور مال گذاری کے محکموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر باقی سب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھی ان چیزوں کی طرف بھی تھوڑا بہت دھیان دیا گیا، کمیشن اور تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر ہوئیں اور انھوں نے برسوں کے سیر و سفر اور مشقتوں کے بعد موٹی موٹی رپورٹیں تیار کر دیں۔ یہ رپورٹیں اٹھا کر الماریوں میں بند کر دی گئیں اور ہوا ہوایا کچھ بھی نہیں۔ عام لوگوں کے مسلسل تقاضوں کے باوجود صحیح اعداد و شمار تک جمع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اور صحیح اعداد و شمار اور ضروری اطلاعات کی کمی کی وجہ سے ہر طرح کی اصلاح و ترقی میں رکاوٹ پیش آتی رہی۔ اس طرح

ان نئی صوبائی حکومتوں کے انتظام کے معمولی کاموں کے علاوہ، اور بہت سے ضروری کام کرنے پڑے، جو برسوں کی لاپروائی سے رکے ہوئے تھے۔ ایک ایسی ریاست کو جو صرف پولیس کے فرائض انجام دیتی تھی سماجی ضرورتوں کا کفیل بنانا تھا۔ یہ کام یوں بھی کچھ آسان نہ تھا۔ لیکن بعض چیزوں نے اسے اور بھی زیادہ دشوار بنا دیا۔ صوبے کی حکومتوں کے اختیارات بہت محدود تھے۔ ان میں اور مرکزی حکومت میں یعنی وائسرائے کی تحکم پسند اور استبدادی حکومت میں نقطۂ نظر کا شدید اختلاف تھا۔ اس کے علاوہ عام لوگ افلاس کے بوجھ میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ اُن کا ابھارنا بہت مشکل تھا

ہم ان مجبوریوں اور پابندیوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور یہ محسوس کرتے تھے کہ جب تک حالات بالکل بدل نہ جائیں ہم کچھ مفید کام نہیں کر سکتے اسی لئے ہمارے دلوں میں آزادی کی زبردست خواہش تھی۔ پھر بھی ہمارے دلوں میں ترقی کا جذبہ شعلہ کی طرح بھڑکتا تھا اور ہم ان ملکوں کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے جو زندگی کی دوڑ میں ہم سے بہت سی باتوں میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ سامنے امریکہ کی مثال تھی اور بعض مشرقی ملکوں کی بھی، جو برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ لیکن ان سب سے زیادہ ہماری نظر روس کی طرف تھی، جس نے بیس سال کی مختصر مدت میں، بیرونی جنگ وجدل، اندرونی اختلافات اور بظاہر اٹل دشواریوں کے باوجود اتنی حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ روس کی اشتمالیت بعض لوگوں کو پسند تھی اور بعض کو نہیں تھی لیکن اور بہت سی باتیں تھیں جنھوں نے سب کے دلوں کو مسحور کر لیا مثلاً سوویٹ یونین نے تعلیم اور تہذیب طب اور صحت میں حیرت انگیز ترقی کی تھی، قوموں کے باہمی

اختلافات کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا تھا اور اس طرح پر اپنے اور فرسودہ نظام کے بچے کھچے ملبے سے ایک بالکل نئی دنیا تعمیر کرلی تھی۔
ان باتوں سے عام لوگ ہی مسحور و متاثر نہیں ہوئے بلکہ رابندر ناتھ ٹیگور جیسے شخص نے، جو حددرجہ کے انفرادیت پسند تھے اور جنھیں اشتمالیت کے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی تھا، اس نئی تہذیب کی تعریف کی ہے اور اس کا مقابلہ اپنے ملک کی زبوں حالی سے کیا ہے۔ اپنے بستر مرگ پر انھوں نے روس کی اس ہمت اور جواں مردی کی طرف سے اشارہ کیا جس کی بدولت اس نے بیماری اور ناخواندگی کے خلاف لڑائی لڑی، افلاس اور جہالت کو رفتہ رفتہ ختم کردیا اور ایک بہت بڑے ملک کو اس ذلت سے نجات دی۔ "اس کا تمدن طبقوں اور فرقوں کے افسوسناک امتیازات سے پاک ہے روس نے جس تیزی سے حیرت انگیز ترقی کی ہے اس سے میرے دل میں مسرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ رشک کا بھی .... جب میں ایک طرف کوئی دو سو قوموں کو جن میں چند برس پہلے تک نشوونما کے مدارج کے لحاظ سے بے حد اختلاف تھا، یکجہتی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن دیکھتا ہوں، اور دوسری طرف اپنے وطن پر نظر ڈالتا ہوں، جہاں حد سے زیادہ متمدن اور ذی ہوش انسان وحشیوں کی طرح منتشر ہوتے جاتے ہیں، تو میرے دل میں لازمی طور پر دو مختلف طرح کی حکومتوں کے فرق کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے جن میں سے ایک کی بنیاد تعاون پر ہے اور دوسری کی استحصال پر۔ یہی وجہ ہے ان دونوں ملکوں کی حالتوں میں یہ زمین آسمان کا فرق ہے۔"
ہم سوچتے تھے کہ جب دوسروں نے اتنی ترقی کرلی تو آخر ہم کیوں

نہیں کرسکتے ؟ ہمیں اپنی لیاقت، اپنی ذہانت اپنے تحمل اور استقلال، اپنے عزم ترقی پر پورا بھروسہ تھا۔ ہم اپنی دقتوں کا اپنی غریبی اور جہالت کا رجعت پسند گروہوں اور جماعتوں کی موجودگی کا اپنے باہمی اختلافات کا پورا احساس تھا لیکن ہم ان سب چیزوں کا مقابلہ کرنے، اور ان پر غالب آنے کی ہمت رکھتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمیں اس کی زبردست قیمت دینی پڑے گی۔ لیکن ہم یہ قیمت دینے کے لئے تیار تھے اس لئے کہ کوئی قیمت اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی جو ہمیں موجودہ حالت میں ہر روز دینی پڑ رہی ہے مگر سوال یہ تھا کہ ہم اپنے اندرونی مسئلوں کو کس طرح حل کریں، جب کہ برطانوی حکومت اور اقتدار کا بیرونی مسئلہ ہر قدم پر سدِّ راہ ہے۔ اور ہماری ہر تدبیر کو بیکار کر دیتا ہے۔

پھر بھی چونکہ ہمیں صوبائی حکومتوں کی شکل میں ایک موقع ملا تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی محدود اور مقید کیوں نہ ہو — ہم چاہتے تھے کہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ لیکن ہمارے وزیروں کے لئے صورتِ حال بے حد ہمت شکن تھی وہ کام کی کثرت کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور حکومت کے مستقل ملازموں سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اُن کا ہاتھ بٹائیں گے اس لئے کہ دونوں میں ہم آہنگی نہ تھی، اور اُن کے نقطۂ نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ پھر یہ کہ بدقسمتی سے وزیروں کی تعداد بہت تھوڑی تھی ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ قوم کے روپئے کو کفایت شعاری سے خرچ کرتے اور سادہ زندگی بسر کرنے کا آدرش لوگوں کے سامنے پیش کریں گے۔ ان کی تنخواہیں بہت کم تھیں۔ اور ان کے مقابلے میں ان

کے سکریٹری یا انڈین سول سروس کے بعض ماتحت عہدہ دار ان سے چوگنی پچ گنی تنخواہیں لیتے تھے۔ ہمیں انڈین سول سروس کی تنخواہوں کو کم کرنے کا اختیار نہ تھا۔ پھر وزیر ریلوں میں سکنڈ کلاس یا کبھی کبھی تھرڈ کلاس میں سفر کرتے تھے، اور بہت ممکن تھا کہ اسی گاڑی میں ان کا کوئی ماتحت فرسٹ کلاس کے ڈبے میں یا کسی شاندار سیلون میں سفر کر رہا ہو۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ کانگریس کی مجلس منتظمہ نئے نئے احکام صادر کر کے برابر صوبوں کی حکومتوں کے کام میں مخل ہوتی رہتی تھی یہ بات بالکل غلط ہے۔ مرکزی مجلس کی طرف سے اندرونی انتظامات کے معاملے میں ذرا بھی دخل نہیں دیا جاتا تھا۔ کانگریس کی مجلس منتظمہ صرف یہ چاہتی تھی کہ بنیادی سیاسی معاملات میں سب صوبجاتی حکومتیں ایک ہی پالیسی پر عمل کریں اور کانگریس کے اس پروگرام کو جو انتخابی منشور میں پیش کیا گیا تھا۔ حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کریں۔ خاص کر گورنروں کے اور حکومت ہند کے بارے میں جو پالیسی بنائی گئی تھی اُس کی ہر صوبے میں یکساں طور پر پابندی ضروری تھی۔

مرکزی حکومت میں کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر، صوبجاتی آزادی کے نفاذ کا لازمی نتیجہ تھا کہ لوگوں میں صوبہ پرستی پیدا ہو جائے اور اس طرح ہندوستان کی وحدت کا احساس کم ہو جائے۔ غالبًا برطانوی حکومت کا یہی مقصد تھا اور یہ اُس کی اس پالیسی کے مطابق تھا کہ افتراق اور انتشار کے رجحانات کو تقویت پہنچائی جائے۔ حکومت ہند جو نہ رائے عامہ کے ہٹانے ہٹ سکتی تھی، نہ اس کے سامنے ذمہ دار تھی اور نہ اس کی کوئی پروا کرتی تھی اور برطانوی سامراج کی پرانی روایات کی پاسبان بن کر چٹان

کی طرح اپنی جگہ کھڑی تھی، اور سب صوبجاتی حکومتوں سے ساتھ ایک ہی پالیسی برتتی تھی۔ گورنر بھی شملہ ہی دلی سے آنے والی ہدایات کے ماتحت اسی پالیسی پر عمل کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر صوبوں کی کانگریسی حکومتیں جداگانہ راستوں پر چلتیں تو مرکزی حکومت ان میں سے ہرایک کو الگ الگ نبٹ لیتی اس لئے ضروری تھا کہ صوبجاتی حکومتیں ایک متحدہ محاذ بناکر حکومت ہند کا مقابلہ کریں۔ ادھر حکومت ہند کو یہ فکر تھی کسی نہ کسی طرح اس باہمی اتحاد اور تعاون کو ختم کردے اور جب اس کے سامنے کسی صوبے کا کوئی مسئلہ آتا تھا تو وہ دوسرے صوبوں سے جن کو اسی قسم کے مسائل درپیش تھے مشورہ کئے بغیر ہرایک سے الگ نبٹنا چاہتی تھی۔

صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہونے کے فوراً بعد ہی اگست ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی مجلس منتظمہ نے حسب ذیل تجویز پاس کی:۔

"مجلس عاملہ کانگریسی وزیروں سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ماہرین کی ایک کمیٹی، مقرر کریں جس کا کام یہ ہوگا کہ وہ ان اہم اور ضروری مسائل پر غور وفکر کرے جن کے حل کئے بغیر قومی تعمیر اور سماجی منصوبہ کی کسی اسکیم پر عمل ممکن نہیں۔ ان اہم مسائل کو حل کرنے کے لئے جہاں ایک طرف وسیع پیمانے پر جانچ پڑتال اور مواد کی فراہمی کی ضرورت ہے وہاں ایک واضح سماجی مقصد کا پیش نظر ہونا بھی لازمی ہے۔ ان میں سے بہت سے مسائل ایسے ہیں جنھیں محض صوبائی نقطۂ نظر سے حل نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ جن صوبوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں ان کے اغراض ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ مثلاً کوئی ایسی پالیسی بنانے

کے لئے جس کی مدد سے سیلابوں کو روکا جا سکے، پانی کو آب پاشی کے مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکے، مٹی کے کٹاؤ کی روک تھام کی جا سکے، ملیریا کی بیخ کنی ہو سکے ہائڈرو الکٹرک یا اسی طرح کی دوسری اسکیموں کے بنانے میں مدد مل سکے، یہ ضروری ہے کہ دریاؤں کی پوری پوری پیمائش کی جائے۔ اس مقصد کے لئے دریا کی پوری وادی کی پیمائش اور پوری جانچ پڑتال کی ضرورت ہے اور اس کام کے لئے حکومت کو ایک بڑے پیمانے پر منصوبے تیار کرنے پڑیں گے۔ اسی طرح صنعتوں کی ترقی اور ان کا باقاعدہ انتظام بھی مختلف صوبوں کے اتحادِ عمل اور تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے مجلسِ عاملہ کا مشورہ ہے کہ سب سے پہلے مختلف صوبوں کو بلاکر ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے، جو اس بات کا اندازہ لگائے کہ اس وقت ہمارے سامنے کون کون سے اہم مسائل ہیں، اور ان مسائل کو ہمیں کس طریقے اور کس ترتیب سے حل کرنا چاہئے۔ ماہرین کی اس کمیٹی کا یہ کام بھی ہوگا کہ اس طرح کے ہر مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لئے الگ الگ کمیٹیاں مقرر کرے تاکہ یہ کمیٹیاں متعلقہ صوبائی حکومتوں کو اس سلسلے میں مشورے دے سکیں اور انھیں بتا سکیں کہ کس حد تک اس معاملے میں مختلف صوبوں کا متحدہ عمل ضروری ہے؛"

اس تجویز سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صوبجاتی حکومتوں کو کس طرح کے مشورے دئے جاتے تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس کی مجلس منتظمہ کو معاشی اور صنعتی میدانوں میں مختلف صوبوں کے درمیان اتحاد اور تعاون پیدا کرنے کی کتنی زیادہ خواہش تھی۔ ان مشوروں میں خطاب صرف کانگریسی حکومتوں سے ہوتا تھا لیکن تعاون اور اتحاد کا دائرہ صرف

کانگریسی صوبوں تک محدود تھا۔ مثلاً کسی دریا کی مکمل پیمائش کا تعلق کئی صوبوں سے ہوسکتا ہے۔ فرض کیجئے ہم گنگا کی وادی کی پیمائش کرائیں اور دریائے گنگ کا ایک مستقل کمیشن مقرر کریں جو ایک نہایت ضروری کام ہے اور اب تک نہیں ہوا ہے۔ یو۔پی۔ بہار اور بنگال کے باہمی تعاون کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

اس تجویز سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کانگریس حکومت کی طرف وسیع پیمانے پر منصوبے بنانے کو کتنی اہمیت دیتی تھی۔ اس طرح کے منصوبے بنانا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرکزی حکومت جمہور کے قبضے میں نہ ہو اور صوبجاتی حکومتوں کے پاؤں کی بیڑیاں کٹ نہ جائیں۔ پھر بھی ہم یہ سب کچھ اس غرض سے کرنا چاہتے تھے کہ کچھ ضروری بنیادی کام ہوجائیں اور اس طرح آئندہ کے بڑے منصوبوں کی داغ بیل پڑ جائے۔ لیکن بدقسمتی سے صوبوں کی حکومتیں اپنے مقامی جھگڑوں میں اس طرح پھنسی رہیں کہ اس تجویز پر عمل شروع کرنے میں بہت دیر ہوگئی۔ ۱۹۳۸ء کے آخر میں ایک نیشنل پلیننگ کمیٹی بنی اور مجھے اس کا صدر مقرر کیا گیا۔

میں اکثر کانگریسی حکومتوں کے کاموں پر سختی سے نکتہ چینی کرتا رہتا تھا اور ان کی سست رفتاری پر مجھے بڑی جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ لیکن اب جب میں اُس گذرے ہوئے زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کارناموں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے جو بے شمار مشکلات کے باوجود انھوں نے سوا دو برس کی قلیل مدّت میں کر دکھائے۔ بدقسمتی سے ان کے بہت سے اہم کام ادھورے رہ گئے، اس لئے کہ عین اُسی وقت جب ان کاموں کے پورے ہونے کا وقت آیا تھا انھیں استعفیٰ دینا پڑا، اور ان کے جانشین،

یعنی برطانوی گورنروں نے ان کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ لیکن اتنی قلیل مدت میں بھی انھوں نے جو کام کئے وہ بے حد اہم ہیں کسانوں اور مزدوروں کو بہت فائدہ پہنچا اور ان کی قوت پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی۔ لیکن ان حکومتوں کا سب سے زبردست اور دوررس کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے بنیادی تعلیم، کے نام سے عام تعلیم کا ایک نیا طریقہ ہندوستان میں رائج کر دیا۔ یہ طریقہ نہ صرف تعلیم کے نئے اصولوں پر مبنی تھا بلکہ ہندوستان کے حالات کے لئے خاص طور پر موزوں اور مناسب بھی تھا۔

کانگریس نے جس اچھی تبدیلی کی طرف بھی قدم اٹھایا، اُس کے راستے میں غرض مند جماعتوں نے روڑے اٹکائے۔ یوپی حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ ان مزدوروں کی حالت کی تحقیقات کرے جو کانپور کے کپڑے کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ کارخانوں کے مالکوں نے (جن میں زیادہ انگریز تھے اور تھوڑے سے ہندوستانی) اس کمیٹی کے ساتھ انتہائی بد اخلاقی برتی اور جو معلومات اور اعداد و شمار انھوں نے حاصل کرنے چاہے ان کے فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ مزدور مدتوں سے مالکوں اور حکومت کی متحدہ مخالفتوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے اور پولیس ہر وقت ان کی مدد کے لئے تیار رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کانگریسی حکومت نے جب اس معاملے میں ایک نئی پالیسی پر عمل شروع کیا تو مالکوں کو یہ بات سخت ناگوار گذری مسٹر بی شیوا راؤ نے جنھیں ہندوستان کی مزدور تحریک کا بہت طویل تجربہ ہے اور وہ اس کے اعتدال پسند گروہ کے ایک رکن بھی ہیں؛ ہندوستانی آجر کے ہتکنڈوں کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے:

"ایسے (یعنی ہڑتال وغیرہ کے) موقعوں پر کارخانوں کے مالک پولیس کی مدد کے بل پر دیدہ دلیری اور بے انصافی سے کام لیتے ہیں اگر اس کا حال بیان کیا جائے تو جو شخص ہندوستان کے حالات سے واقف نہیں اُسے یقین ہی نہیں آئے گا۔ اکثر ملکوں کی حکومت، عام طور پر مالکوں کی طرف دار ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومتوں کی تنظیم ہی کچھ اس طرح کی ہے۔ لیکن مسٹر شیوا راؤ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں حکومت جو مالکوں کی حمایت کرتی ہے اس کی ایک اور وجہ بھی ہے ہندوستان میں حاکموں سے جو ذاتی عنادیا بیر ہے اُس کے علاوہ (چند افراد کو چھوڑ کر) ان کے دلوں میں عام طور پر یہ خوف بیٹھا ہوا ہے کہ مزدوروں کی سبھاؤں کو ابھرنے کا موقع دیا گیا تو اس سے عوام میں ایک طرح کی سیاسی بیداری پیدا ہو جائے گی۔ اور چونکہ ہندوستان میں وقتاً فوقتاً سیاسی جدوجہد کا جذبہ عدم تعاون یا سول نافرمانی کی تحریکوں کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے، اس لئے غالباً اُن کا خیال یہ ہے کہ عوام میں کسی طرح کی بیداری یا شعور کا پیدا ہو جانا اس خطرے کو اور بھی بڑھا دیتا ہے[۱]۔"

حکومتیں پالیسی بناتی ہیں، اسمبلیاں قانون پاس کرتی ہیں۔ لیکن اس پالیسی کو عمل میں لانا، قانون کو پاس کرنا عہدہ داروں اور افسروں ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لئے صدیوں کی حکومتوں کو مجبوراً آخر میں

---

[۱] B. Shiva Rao: "The Industrial Worker in India" (London 1939.)

مستقل عہدہ داروں، اور خاص کر انڈین سول سروس اور پولیس ہی کا محتاج ہونا پڑتا تھا۔ اور چونکہ ان پرانے عہدہ داروں کی پرورش تحکم پسندانہ روایات کی گود میں ہوئی تھی اس لئے انھیں یہ نئی فضا بالکل پسند نہیں تھی، جس میں پبلک کا رویہ کسی قدر دلیرانہ ہوگیا تھا، حکام کی اہمیت کم ہوگئی تھی اُنھیں ان لوگوں کی ماتحتی کرنی پڑتی تھی جنھیں اب تک وہ گرفتار کرنے اور جیل بھیجنے کے عادی رہ چکے تھے۔ شروع شروع میں انھیں اندیشہ تھا کہ معلوم نہیں حالات کا رخ کیا ہوگا۔ لیکن چونکہ کوئی انقلابی چیز ظہور میں نہیں آئی اس لئے رفتہ رفتہ انھوں نے پھر اپنے پرانے معمولات اختیار کر لئے۔ وزیروں کے لئے مقامی افسروں اور عہدہ داروں کے کاموں میں دخل دینا ممکن نہ تھا وہ صرف ایسے ہی معاملات میں دست اندازی کر سکتے تھے جو بالکل واضح اور صریحی طور پر قابل اعتراض ہوں یہ عہدہ دار آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اب اگر کسی حاکم کو کسی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بدل دیا جاتا تو اس کی جگہ آنے والا حاکم بھی وہی حرکتیں کرنے لگتا جو اس کے پیش رو نے کی تھیں۔ افسروں کی رجعت پسندی اور تحکم پسندذہنیت کو یکبارگی بدل دینا غیر ممکن بات تھی۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ تھوڑے سے آدمی اپنا رنگ بدل دیں، اور تھوڑے عرصہ سے کوشش کر کے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیں، لیکن ان افسروں اور عہدہ داروں کی اکثریت اس خیال کی نہ تھی۔ اور اس نے انھوں نے کسی حالت میں بھی اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں کی۔ بھلا اُن کے لئے کیسے ممکن تھا کہ وہ بالکل بدل جائیں ایک نئے دور کے پیامی بن جائیں؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ وہ مجبوری

کی بے دلی سے وزیروں کی اطاعت کرتے رہیں۔ حالات کا انداز ہی سدا سے ایسا تھا کہ ان نئی طرح کے کاموں کی اُمنگ اور ولولہ ان کے دلوں میں پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ کام کے جس طریقے پر انھیں عقیدہ نہ تھا اور جس کے متعلق وہ یہ بھی جانتے ہوں کہ اس سے ان کی جڑیں کھوکھلی ہوں گی، اسے وہ بھلا کس دل سے اختیار کرتے۔ بدقسمتی سے اکثریہ مجبوری کی اطاعت بھی نظر نہیں آتی تھی۔

سول سروس کے اونچے عہدہ دار، جو مدتوں سے تحکم پسندی اور عامرانہ حکومت کے عادی تھے، ان نئے وزیروں اور اسمبلی کے ممبروں کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ یہ ان کے دائرہ عمل میں بیجا مداخلت کرتے ہیں سول سروس کے لوگوں کا (اور خاص کر اس جماعت کے انگریز افسروں کا) اب تک اپنے متعلق یہ خیال تھا کہ اصل میں ہندوستان کے اجارہ دار وہ ہیں اور باقی سب ان کے تابع مہمل ہیں۔ انھیں ان دخل در معقولات دینے والوں کا آنا ہی گوارا نہیں تھا تو وہ ان کے احکام کی تعمیل کس طرح کر سکتے تھے۔ اُن کی حالت بالکل وہی تھی جو کسی کٹر ہندو کی ہوتی اگر کوئی اچھوت بے باکانہ اُس کے مقدس مندر میں گھس آتا۔ حاکمانہ اقتدار اور نسلی اور قومی برتری کا جو محل انھوں نے اتنی جانفشانی کے بعد کھڑا کیا تھا، اور جسے وہ اپنا دین و ایمان سمجھتے تھے، اب مسمار ہو رہا تھا۔ چینیوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ کو بے حد عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کو اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ سے جو گہرا جذباتی تعلق ہے وہ چینیوں کو بھی نہیں۔ انگریزوں کے لئے یہ رکھ رکھاؤ صرف ان کے انفرادی، نسلی اور قومی اقتدار ہی تک

محدود نہیں بلکہ اس کا گہرا تعلق ان کی حکومت اور ان کے دنیادی مفاد سے ہے۔ یہ سب کچھ دخل در معقولات دینے والوں کو کسی نہ کسی طرح گوارا کرنا پڑا۔ لیکن جوں جوں خطرے کا احساس ہوتا گیا یہ واداری بھی کم ہوتی رہی۔ یوں تو اس رویے کا اظہار انتظام کے ہر محکمے اور شعبے میں ہوتا تھا، حکومت کے مرکزی مقام سے دور کے ضلعوں میں اور بھی نمایاں تھا خاص کر ایسے معاملات میں جن کا تعلق ضبط اور امن سے ہے۔ اس لئے کہ یہ خاص مجسٹریٹ ضلع اور پولیس کا دائرہ عمل سمجھا جاتا ہے۔ کانگریسی حکومتوں نے فرد کی آزادی پر جو زور دیا تھا اُس سے مقامی افسروں نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اپنے علاقوں میں ایسی ایسی غیر مناسب اور غیر قانونی باتوں کو بھی جائز کر دیا جن کی اجازت کوئی حکومت بھی نہیں دے سکتی۔ بلکہ مجھے تو یہاں تک یقین ہے کہ خود مقامی افسروں نے لوگوں کو اس طرح کی غیر قانونی حرکتیں کرنے پر اُبھارا ان دنوں جو متعدد فرقہ وارانہ فساد ہوئے ان کی جہاں اور بہت سی وجہیں تھیں وہاں میرے خیال میں مجسٹریٹوں اور پولیس کی شہ بھی تھی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب کبھی اس طرح کے فساد کا انسداد سمجھداری کے ساتھ فوراً کر دیا گیا بات وہیں کی وہیں ختم ہوگئی۔ لیکن ہماری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ افسروں نے اپنے فرائض کے انجام دینے میں بے حد سستی اور دانستہ طور پر کوتاہی سے کام لیا۔ اور اس لئے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوگئی کہ انھوں نے یہ سب کچھ کانگریسی حکومت کے نام پر دھبہ لگانے کے لئے کیا تھا۔ یوپی میں کانپور کے صنعتی شہر میں مقامی افسروں کو اس طرح کی کوتاہیاں اور بدانتظامیاں کرنے کے بہت

زیادہ موقعے ملے۔ فرقہ وارانہ اختلافات، جنھوں نے کبھی کبھی بلوؤں کی شکل اختیار کرلی عام طور پر ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیانی زمانے میں زیادہ ہوئے کانگریسی حکومتیں قائم ہونے کے بعد اس طرح کے فتنے اور فساد نسبتاً کم ہوئے اور پھر بلوؤں کا انداز بالکل بدل گیا۔ انھوں نے ایک سیاسی اور منظم شکل اختیار کرلی۔

سول سروس ہندوستان میں خوش انتظامی کے لئے مشہور رہی ہے۔ اور اس شہرت میں خود سول سروس کے لوگوں کے پروپگنڈے کو بہت کچھ دخل ہے۔ لیکن اس نئے تجربے نے یہ بات ثابت کردی کہ وہ لوگ اسے محدود دائرے کے اندر خاص قسم کا کام کرنے کے عادی تھے اور اس کے علاوہ کچھ اور کرنے کی قابلیت ان میں مطلق نہیں تھی۔ اُنھیں جمہوری انداز میں کام کرنے کی تربیت ہی نہیں ملی تھی اور اس لئے نہ تو انھیں عوام کی خوشنودی حاصل تھی اور نہ اُن کا تعاون — وہ ان سے ڈرتے بھی تھے اور نفرت بھی کرتے تھے۔ ان کے ذہن میں سماجی ترقی کی کسی ایسی تجویز کا تصور ہی محال تھا جو تیزی اور سُرعت کے ساتھ کام کرسکے۔ ان کا تخیل محدود اور مقیّد تھا اور اُنھیں صرف اتنا آتا تھا کہ وہ دفتری کارروائیوں سے اس طرح کی تجویزوں میں روڑے اٹکائیں۔ کچھ لوگوں کو چھوڑ کر، سول سروس کے تقریباً سارے انگریز اور ہندوستانی افسروں کا یہی حال تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ لوگ اُس کام کے جو اُنھیں کرنا تھا بالکل اہل نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اِس طرح کی نااہلی اور ناقابلیت خود عوام کے نمائندوں میں بھی تھی۔ لیکن اس نااہلی کی تلافی اور کئی چیزوں سے

ہوجاتی تھی ــــ اُن میں عمل کا شوق اور جوش تھا، عوام سے ان کا قریبی تعلق تھا اور وہ ان کی ضرورتوں سے واقف تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنی غلطیوں کی اصلاح کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان میں ہمت تھی، زندگی کا جوش وخروش تھا، ذمہ داری کا شدید احساس تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض کو انجام دینے کی سچّی خواہش۔ اس کے مقابلے میں برطانوی حکّام اور ان کے مددگاروں میں حد درجے کی بے حسی اور قدامت پسندی نظر آتی تھی اور اس طرح ہندوستان میں، جو روایتوں کی سرزمین ہے، نقشہ الٹا نظر آتا تھا۔ انگریز جو یہاں ایک متحرک اور ترقی پذیر سوسائٹی کے نمائندے بن کر آئے تھے ہندوستان میں بے جان اور جامد روایات کے سب سے بڑے حامی اور نگہبان بن گئے۔ برخلاف اس کے خود ہندوستان میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو زندگی کے نئے تغیّر پذیر نظام کی نمائندگی کر رہے تھے۔ وہ تبدیلی چاہتے تھے ــــ نہ صرف سیاسی بلکہ سماجی اور معاشی تبدیلی ہندوستانیوں کے عمل کی محرک نئی نئی قوتیں تھیں جن کی شاید خود انھیں بھی خبر نہیں تھی۔ ہندوستان میں اس بدلے ہوئے نقشے کو دیکھ کر ایک بات یقینی طور پر واضح ہوجاتی ہے اور وہ یہ کہ گذرے ہوئے زمانے میں انگریزوں نے ہندوستان میں کتنی ہی تخلیقی اور ترقی پسندانہ روش اختیار کی ہو لیکن ایک مدّت سے ان کا رنگ بدل گیا تھا اور اب وہ ہندوستان میں ہر طرح کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ ان کی حاکمانہ زندگی کی رفتار بڑی سست اور دھیمی تھی اور اس رفتار سے وہ ہندوستانی زندگی کے کسی مسئلہ کو بھی حل نہیں کر سکتے تھے۔ اور اب تو یہ حالت تھی کہ ان کی زبان

سے جو بات نکلی تھی اس میں وہ پہلی سی وضاحت اور قوت نہ تھی بلکہ لفاظی لمبے لکا پن اور کھوکھلا پن پایا جاتا تھا۔

انگریز حاکموں نے ہندوستان میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ برطانوی حکومت اپنے بڑے بڑے افسروں کی مدد سے ہندوستان کو خود اختیاری حکومت کے مشکل اور پیچیدہ کام کی تعلیم دے رہی ہے لیکن جب انگریز ہمیں اپنی تعلیم کی نعمت سے مستفید کرنے کے لئے یہاں آئے اس سے پہلے بھی تو آخر ہم کئی ہزار برس تک خاصی کامیابی کے ساتھ، کام چلاتے رہے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم میں بعض صفات جو ہونی چاہئیں، نہیں ہیں اور بعض گستاخ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کوتاہیاں ہم میں برطانوی عہد میں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن بہر حال ہم میں خواہ کتنی ہی خامیاں اور کوتاہیاں کیوں نہ ہوں، یہ بات ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے حکام میں اس کی ذرا بھی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ہندوستان کو ترقی کے کے راستے کی طرف لے جا سکیں۔ ان حکام میں جو خوبیاں تھیں وہی ہمارے نقطۂ نظر سے ان کے نکمے پن کا باعث تھیں۔ اس لئے کہ جن صفات کی ضرورت پولیس کے آمرانہ انداز پر چلنے والی حکومت کو ہے، وہ ان سے بالکل مختلف ہیں۔ جن سے کسی ترقی پذیر جمہوری سوسائٹی میں کام چلتا ہے۔ اور اس لئے دوسروں کو کچھ سکھانے کی کوشش کرنے سے پہلے انھیں خود کچھ بھولنا پڑے گا ـــ انھیں خود فراموشی کے دریا میں غوطہ لگانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ بھول جائیں کہ ماضی میں وہ کیا تھے۔

صوبوں میں خود اختیاری جمہوری حکومت تھی اور مرکز میں ایک

آمرانہ اور استبدادی حکومت اور اس صورتِ حال کی وجہ سے عجب عجب تضاد پیدا ہو گئے تھے۔ کانگریسی حکومتوں کو آزادی کی حفاظت کی بڑی فکر تھی اور انھوں نے شہری خفیہ پولیس کی ہر طرف پھیلی اور چھائی ہوئی سرگرمیوں کو روکا۔ اس لئے کہ اس پولیس کا کام ہی یہ تھا کہ برابر سیاسی کارکنوں یا حکومت کے مخالفوں کا پیچھا کرتی رہی۔ صوبے کی حکومتوں نے تو یہ کر لیا لیکن مرکزی خفیہ پولیس اب بھی اسی طرح کام کرتی رہی، بلکہ اس میں اب پہلے سے بھی زیادہ زور پیدا ہو گیا نہ صرف ہم لوگوں کے خطوط راستے میں کھول کر پڑھ لئے جاتے تھے بلکہ بعض اوقات وزیروں کی تحریروں کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آتی تھی یہ سب کچھ انتہائی خاموشی سے ہوتا تھا اور سرکاری طور پر اس کا اقرار بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ پچھلے پچیس تیس برس میں میں نے کوئی خط کسی ہندوستانی کو یا اپنے کسی غیر ملکی ملاقاتی کو ایسا نہیں لکھا، جسے لکھتے وقت مجھے یہ احساس نہ رہا ہو کہ کوئی خفیہ پولیس کا محتسب اِسے کھول کر پڑھے گا یا اس کی نقل کرے گا۔ اور نہ اس عرصے میں میں نے ٹیلیفون پر یہ سمجھے بغیر کوئی بات کی ہے کہ اسے خفیہ پولیس کا کوئی آدمی ضرور سن رہا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمیشہ ہر خط کھول کر پڑھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اور کبھی محض خاص خاص خطوں کا احتساب کیا جاتا ہے۔ یہ باتیں لڑائی کے زمانے کی نہیں کر رہا ہوں، جب کہ دہرا احتساب ہوتا ہے۔

خوش قسمتی سے ہماری ساری سرگرمیاں کھلم کھلا ہوتی رہی ہیں اور ان میں کوئی بات بھی ایسی نہیں تھی جسے چھپانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن یہ احساس کہ ہر وقت ہماری باتوں کو چھپ چھپ کر سنا

جا رہا ہے، ہمارے خط پڑھے جا رہے ہیں اور ہماری ساری حرکات و سکنات کی نگرانی ہو رہی ہے، کچھ خوش گوار نہیں۔ اس سے جھنجلاہٹ اور کوفت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ چیز ذاتی تعلقات میں حائل ہوتی ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ محتسب میرے کندھوں کے پیچھے کھڑا میری لکھی ہوئی ہر بات کو پڑھ رہا ہے تو میرے لئے آسان نہیں کہ میں اپنی بات اسی طرح کہہ سکوں جیسے میں کہنا چاہتا ہوں۔

وزیروں نے سخت محنت سے کام کیا اور ان میں سے بہت سے اس بوجھ کو سہار نہ سکے۔ ان کی صحتیں خراب ہوگئیں، ساری تازگی اور شگفتگی ختم ہوگئی اور وہ تھکے ہارے انسان بن کر رہ گئے۔ لیکن ان کے سامنے ایک بلند مقصد تھا اس لئے وہ برابر کام میں لگے رہے، اور اپنے آئی۔سی۔ایس سکرٹریوں اور عملے سے بھی رگڑ رگڑ کر کام لیتے رہے۔ اُن کے دفتروں میں رات گئے تک روشنی جلتی رہتی تھی اور اسی لئے جب نومبر ۱۹۳۹ء کے شروع میں کانگریس حکومتوں نے استعفیٰ دیا تو بہتوں نے اطمینان اور خوشی کی سانس لی۔ سرکاری دفتر پھر پابندی کے ساتھ شام کو چار بجے بند ہونے لگے، پھر اُن کے خانقاہ نما گھروں میں خاموشی رہنے لگی، اور وہاں پرندے کو پر مارنے کی اجازت نہ رہی۔ زندگی پھر اپنی نرم اور دھیمی رفتار سے چلنے لگی اور شام کا وقت پولو، ٹینس، برج اور کلب کی تفریحوں کے لئے خالی ہوگیا۔ ایک منحوس خواب کا سا دور گذر گیا اور کام اور کھیل اب پھر پہلے کی طرح ہونے لگے۔ اگرچہ ان دنوں جنگ ہو رہی تھی (ابھی تک صرف یورپ میں، جہاں ہٹلر کی فوجوں نے پولینڈ کو کچل ڈالا تھا) لیکن یہ قصے ہندوستان سے بہت دور تھے اور یہاں

لڑائی کا کوئی اثر نہ تھا۔ سپاہی جنگ کے میدان میں لڑ کر اور جانیں دے کر اپنا فرض پورا کر رہے تھے، اور یہاں بھی اپنا فرض پورا کیا جا رہا تھا اور وہ یہ تھا کہ "گورے آدمی کا بوجھ" اور آن بان کے ساتھ اٹھایا جائے۔ کانگریسی حکومتوں نے بہت تھوڑے سے دن کام کیا۔ لیکن اس قلیل مدت نے ہمارے اس خیال کو اور بھی زیادہ راسخ کر دیا کہ ہندوستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ سیاسی اور اقتصادی نظام ہے جسے برطانیہ نے ہمارے اوپر مسلط کر رکھا ہے یہ صحیح ہے کہ ہماری روایات میں، ہمارے رسوم میں اور ہمارے سماجی طریقوں میں بہت سی ایسی خرابیاں ہیں جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، اور ان ساری خرابیوں کو دور کرنا بے حد ضروری ہے لیکن ہندوستان کے معاشی نظام میں پھیلنے اور بڑھنے کی جو فطری صلاحیت ہے اُس میں ان روایتی اور سماجی خرابیوں سے اتنی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی جتنی اس سیاسی اور اقتصادی پھندے سے جو برطانیہ نے ہمارے گلے میں ڈال رکھا ہے۔ اگر حکومت کا یہ "فولادی چوکھٹا" نہ ہو تو ترقی ناگزیر ہے۔ اور یہ ترقی خود بخود سماجی نظام میں ایسی تبدیلیاں پیدا کر دے گی کہ فرسودہ اور بے کار رسمیں اور روایتی پابندیاں غائب ہو جائیں گی۔ اس لئے ساری توجہ اس طرف مبذول کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ فولادی چوکھٹا توڑ کر پھینک دیا جائے جو وقت یا قوت دوسرے کاموں میں صرف کی جا رہی ہے وہ بے معنی ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی ریت میں ہل چلائے۔ حکومت کا فولادی چوکھٹا جاگیرداری کے نظام اور اس کی اور بہت سی پرانی یادگاروں کی حفاظت اور رکھوالی کرتا تھا چونکہ برطانیہ کے قائم کئے ہوئے سیاسی اور

معاشی نظام میں کسی طرح کی جمہوریت کی گنجائش ہی نہیں تھی اس لئے دونوں میں تصادم لازمی تھا یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک کی نیم جمہوری حکومت کو ہر وقت تصادم کا اندیشہ لگا رکھا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کی سرکاری آواز برابر یہ کہتی رہی کہ ہندوستان میں جمہوریت کو کامیابی نہیں ہوئی، اس لئے کہ ان کے نزدیک تو صرف وہ چیز کامیاب ہے جو ان کے بنائے ہوئے نظام، اور مفاد اور ان کی پیدا کی ہوئی قدروں کو قائم اور باقی رکھے۔ اب چونکہ اس طرح کی پابند اور غلام جمہوریت جس کے وہ خواہاں تھے نہ بن سکی، اور اس نے طرح طرح کی انقلابی تبدیلیوں کی طرف قدم اٹھایا، اس لئے برطانوی قوت اور اقتدار کے پاس صرف یہی حربہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ جمہوریت کے سارے پرفریب دعوؤں کو بھول کر دوبارہ خالص استبدادی طرز حکومت کی طرف رجوع کریں۔ برطانیہ نے ہندوستان میں جو طریقہ اختیار کیا، اس میں اور یورپ کی فاشیت میں نمایاں مشابہت ہے۔ قانون کی حکمرانی، جس پر انگریزوں کو ہمیشہ سے بڑا ناز تھا اب ایک "حالت محاصرہ" کی صورت میں تبدیل ہوگئی اور ملک پر خاص ضابطوں اور فرمانوں کے ذریعے حکومت ہونے لگی۔

(۵) اقلیتوں کا مسئلہ — مسلم لیگ اور مسٹر محمد علی جناح

پچھلے سات برسوں میں مسلم لیگ نے جو ترقی کی ہے وہ ایک غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں انگریزوں کی سرپرستی میں شروع ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی نئی پود کو نیشنل

حد سے زیادہ مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ جو مصیبتیں ہمیں اپنے سیاسی عمل میں جھیلنی پڑی ہیں وہ واقعی بہت سخت تھیں اور اُن کی تلخ یاد اب تک دلوں میں باقی ہے۔ پھر بھی ان پٹھانوں کا ضبط اور تحمل ایسا تھا کہ انھوں نے سرکاری فوجوں اور دوسرے مخالفوں کے خلاف ذرّہ برابر تشدّد کو بھی جائز نہیں رکھا۔ پٹھان کو اپنی بندوق اپنے بھائی سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، اسے ذرا سی بات پر جوش اور غصہ آجاتا ہے اور ذرا سے اشتعال پر بھی انسان کی جان لے لینا، ہمیشہ سے اس کی عادت ہے یہ سب ہوتے ہوئے یہ ضبط نفس واقعی معجزے سے کم نہیں۔

خان عبدالغفار خاں کی قیادت میں سرحد کا صوبہ مضبوطی سے کانگریس کے ساتھ رہا اور یہی حال ملک کے دوسرے حصوں میں متوسط طبقے کے اُن بہت سے مسلمانوں کا تھا جن میں سیاسی شعور پیدا ہو چکا تھا۔ کسانوں اور مزدوروں پر کانگریس کا بہت زیادہ اثر تھا، خاص کر یوپی جیسے صوبوں میں جہاں کسانوں اور مزدوروں کے لئے بہت معقول پروگرام بنایا گیا تھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مجموعی حیثیت سے مسلمان عوام پھر غیر محسوس طریقے سے انھیں پرانے جاگیری طرزِ خیال رکھنے والے مقامی لیڈروں کی جُھک رہے تھے، جو ہندوؤں اور دوسری قوموں کے مقابلے میں ان کے مفاد کی نگہبانی کا دعویٰ کرتے تھے۔

فرقوں کے باہمی اختلاف کا مسئلہ اصل میں صرف اتنا تھا کہ اقلیتوں کے جائز مطالبات پورے کئے جائیں اور انھیں اکثریت کے مقابلے میں کافی تحفظات حاصل ہوں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستان کی اقلیتیں، یورپ کی اقلیتوں کی طرح نسلی اور قومی خصوصیات پر مبنی نہیں۔

ہیں۔ وہ اصل میں مذہبی اقلیتیں ہیں۔ نسلی حیثیت سے ہندوستان ایک عجیب وغریب قسم کا معجون مرکب ہے۔ لیکن یہاں نسلوں کے مسئلے نہ کبھی اُٹھے ہیں اور نہ اُٹھ سکتے ہیں۔ مذہب ان نسلی اختلافات پر غالب آگیا ہے اور نسلیں ایک دوسرے سے اس طرح مل جل گئی ہیں کہ اُن میں کسی قسم کا امتیاز بے حد دشوار بن گیا ہے۔ مذہبی قیدیں ظاہر ہیں کہ مستقل نہیں ہوسکتیں، اس لئے کہ آدمی جب چاہے ایک مذہب کو چھوڑکر دوسرا مذہب اختیار کرسکتا ہے، اور مذہب کے بدل لینے کے بعد بھی اس کے نسلی پس منظر یا تمدنی یا لسانی روایات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ مذہب کا لفظ اگر واقعی اس کے صحیح مفہوم میں استعمال کیا جائے تو میرے نزدیک اسے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں ذرا بھی دخل نہیں، گو لوگ اس لفظ کو سیاست میں بھی کثرت سے استعمال کرتے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مذہبی معاملات میں عموماً رواداری برتتے ہیں۔ سیاسی معاملات میں مذہب کی جگہ فرقہ پرستی نے لے لی ہے۔ اور فرقہ پرستی ایک محدود قسم کی ذہنیت کا نام ہے، جس کی بنیاد تو مذہبی اشتراک پر ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں اس کا تعلق کسی خاص جماعت کے سیاسی اقتدار اور مفاد سے ہوتا ہے۔

کانگریس نے اور بعض دوسری جماعتوں نے بارہا اس بات کی کوشش کی کہ فرقوں کی باہمی رضامندی سے اس مسئلے کا تصفیہ ہوجائے۔ بعض اوقات تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی لیکن ہمیشہ ایک بنیادی دقت پیش آتی رہی یعنی برطانوی حکومت کی موجودگی اور اُس کی پالیسی۔ قدرتی بات تھی کہ انگریزوں کو اس طرح کا کوئی سمجھوتا پسند ہی نہیں آسکتا تھا۔

اس لئے کہ اس سمجھوتے کے بعد وہ سیاسی تحریک جس نے اب عوامی شعور کی صورت اختیار کرلی ہے، انگریزوں کے خلاف اور بھی مضبوط ہوجاتی۔ یہ ایک ایسا مثلث تھا، جس میں حکومت دونوں جماعتوں کے بیچ میں تھی اور وہ انھیں خاص رعائتیں دے کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر آمادہ کردیتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر باقی دو جماعتیں دانش مندی سے کام لیتیں تو اس رکاوٹ کو دور کرسکتی تھیں لیکن بدقسمتی سے اُنھوں نے کبھی عقل اور دور اندیشی سے کام ہی نہیں لیا۔ اور اس لئے جب کبھی کوئی سمجھوتا ہونے کے قریب ہوا، حکومت نے کوئی ایسی چال چلی کہ سب کیا دھرا خاک میں مل گیا۔

اقلیتوں کے لئے جو طریقے عموماً اختیار کئے جاتے ہیں (اور جیسے کہ لیگ آف نیشنز برابر اختیار کرتی رہی تھی) ان میں کسی جھگڑے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ ساری باتیں بلکہ ان سے کچھ اور زیادہ منظور ہوچکی تھی مذہب، تمدن، زبان، فرد اور جماعت کے بنیادی حقوق، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جن کی حفاظت اور ضمانت جمہوری آئین کے اُن بنیادی اصولوں سے خود بخود ہوجاتی ہے، جن کا اطلاق ہر شخص پر کیساں طور پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ ہندوستان کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر زمانے میں اقلیتوں اور دوسری چھوٹی جماعتوں کے ساتھ انتہائی رواداری اور حوصلہ افزائی کا برتاؤ کیا گیا ہے۔ یورپ میں جو شدید مذہبی لڑائیاں اور سختیاں ہوتی رہی ہیں۔ ان کی مثال ہندوستان کی

تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ اس لئے ہمیں کسی سے مذہبی اور تمدّنی رواداری کا سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں تھی — یہ چیزیں تو خود ہماری سرشت میں داخل تھیں۔ جہاں تک فرد کے حقوق اور سیاسی آزادی کے مسئلوں کا تعلق ہے ایک تو ہم ان خیالات سے متاثر ہوئے جو فرانس اور امریکہ کے انقلابوں کے محرک تھے دوسرے برطانوی پارلیمنٹ کی آئینی تاریخ سے آگے چل کر اشتراکی خیالات، اور روسی انقلاب کے اثرات نے ہمارے خیالات میں اقتصادی رجحان پیدا کردیا۔

فرد اور جماعت کے ان حقوق کی پوری حفاظت کے علاوہ، یہ بات بھی مسلّمہ طور پر طے تھی کہ حکومت کی مدد اور نجی ذرائع سے سماجی اور رسمی زندگی کے وہ سارے کانٹے راستے سے ہٹا دئے جائیں جو فرد اور جماعت کے مکمل ارتقا اور نشوونما میں حائل ہوتے ہیں۔ اور جو گروہ تعلیمی اور اقتصادی حیثیت سے پستی کی حالت میں ہیں انھیں جلد سے جلد ان بلاؤں سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔ اس کا تعلق خاص کر اچھوت ذاتوں سے تھا۔ اس کا بھی فیصلہ ہوچکا تھا کہ شہری زندگی کی رعایتوں میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی حصّہ ہو۔

پھر آخر باقی رہ گیا کیا؟ صرف یہ خوف کہ اکثریت کہیں سیاسی حیثیت سے اقلیت پر غالب نہ آجائے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اکثریت کسانوں اور مزدوروں سے مل کر بنتی ہے۔ اور ہر مذہبی فرقہ یا گروہ میں عوام اصل میں یہی ہیں، جن سے غیرملکی حکومتوں نے اور اونچے طبقے کے لوگوں نے ہر زمانے میں طرح طرح کے ناجائز فائدے اٹھائے

ہیں۔ مذہب اور تہذیب کے تحفظ کا یقین دلا دینے کے بعد، جو مسئلے انسان کی نظر کے سامنے سب سے پہلے آتے ہیں وہ معاشی اور اقتصادی ہیں اور ان مسئلوں کا انسان کے مذہب اور عقیدے سے ذرا بھی تعلق نہیں۔ اس لئے جماعتوں کے درمیان تو اختلاف اور تصادم ہو سکتے ہیں۔ لیکن مذہبوں کے درمیان تصادم کے کوئی معنی ہی نہیں، تاوقتیکہ مذہب کسی جماعت کے دنیاوی مفاد کی نمائندگی نہ کرنے لگے یہ سب کچھ تھا، اس کے باوجود لوگوں کے ذہن ہر چیز کو مذہبی تفرقوں کے رنگ میں دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور یہ عادت اُن میں حکومت اور فرقہ پرست گروہوں نے پیدا کر دی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دل میں، ہندوستان کی سب سے بڑی مذہبی جماعت یعنی ہندوؤں کا خوف بیٹھ گیا اور ان کے ذہنوں پر اُن کے غلبے کا خیال ہر وقت چھا رہنے لگا۔ حالانکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی اکثریت مسلمانوں جیسی بڑی اقلیت کے مفاد کو آخر کس طرح نقصان پہنچا سکتی ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ ملک کے کچھ حصوں میں ان کی اکثریت ہے۔ لیکن خوف کی بنیاد کبھی معقولیت پر نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کو (اور آگے چل کر دوسری چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو بھی) جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا۔ اور ان کے لئے آبادی کی نسبت سے زیادہ نشستیں مقرر کر دی گئیں۔ لیکن جس اسمبلی میں سارے نمائندے جمہور کے بھیجے ہوتے ہوں، اُس میں صرف چند نشستوں کی تعداد بڑھ جانے سے اقلیت اکثریت ہرگز نہیں بن سکتی۔ بلکہ میرے خیال

میں تو جداگانہ انتخاب نے حالات کو پہلے سے بھی بدتر بنا دیا اس لئے کہ اس صورت میں اکثریت رکھنے والی جماعت کو اقلیت سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ اور مشترک انتخاب کی صورت میں دلوں میں باہمی سمجھوتے اور رواداری کا جو جذبہ ہوتا ہے، جداگانہ انتخاب میں اب اُس کی کوئی گنجائش نہیں رہی، اس لئے کہ اب اُمیدوار کی غرض بجائے ساری جماعتوں کے صرف ایک گروہ یا جماعت سے وابستہ ہوگئی۔ اس موقعہ پر کانگریس نے ایک اور فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اُس نے طے کیا کہ اگر کسی ایسے مسئلے پر جس میں کسی خاص مذہبی اقلیت میں اختلاف رائے پیدا ہوجائے تو اس کا فیصلہ صرف رایوں کی اکثریت سے نہیں ہوگا بلکہ یہ معاملہ ایک غیر جانبدار عدالت کے سامنے یا بین الملی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس عدالت کے فیصلہ کو قطعی سمجھا جائے گا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی جمہوری نظام میں مذہبی اقلیتوں کو بھلا اس سے زیادہ اور کون سا تحفظ دیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کی ہے اور وہ یہ کہ بعض صوبے ایسے بھی تھے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اب چونکہ سارے صوبوں کو حکومت کے معاملے میں خود اختیاری حاصل تھی اس لئے مسلمان اکثریت کو اختیار تھا کہ وہ ان صوبوں میں اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتی، صرف چند معاملات میں جن کا تعلق سارے ہندوستان سے تھا اس پر تھوڑی، بہت پابندی تھی، باقی ہر چیز میں پوری پوری آزادی تھی۔ مرکزی حکومت میں بھی لازمی طور پر مسلمانوں کا خاصا اہم حصہ ہوتا۔

جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہاں فرقہ پرستی نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ یہاں اقلیتوں نے مسلمان اکثریت کے خلاف تحفظ مانگنے شروع کئے۔ اور اس طرح پنجاب میں ہندو، مسلمان اور سکھ کا مثلث بن گیا۔ چونکہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق حاصل تھا اس لئے دوسری جماعتیں بھی اپنے لئے خاص خاص رعائتیں اور تحفظ چاہتی تھیں۔ غرض ایک مرتبہ جداگانہ انتخاب شروع کر دینے کے بعد پیچیدگیاں، اختلاف اور دقتیں بڑھتی ہی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی ایک خاص جماعت کو آبادی کی نسبت سے زیادہ نمائندگی دی جائے گی تو اس میں کسی نہ کسی دوسری جماعت کا نقصان ضرور ہوگا اور اس کی نمائندگی آبادی کی نسبت کے مقابلے میں کم ہو جائے گی۔ اس چیز نے ناگوار نتیجے پیدا کئے۔ خاص کر بنگال پر اس کا بہت برا اثر پڑا اس لئے کہ وہاں یورپین جماعت کو حد سے زیادہ نمائندگی دے دی گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام نشستوں کی تعداد بہت کم ہو گئی۔ اور بنگال کے پڑھے لکھے لوگوں کو، جنھوں نے ہندوستان کی سیاست اور آزادی کی جنگ میں بہت نمایاں حصہ لیا تھا، پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ صوبے کی اسمبلی میں ان کی حیثیت بہت کم ہو گئی ہے اور اس میں حکومت کے بنائے ہوئے قانون کا ہاتھ ہے۔

کانگریس نے بھی بہت سی غلطیاں کیں ـــــ لیکن یہ محض طریق کار اور حکمت عملی کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں تھیں۔ یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ کانگریس کو محض سیاسی وجوہ کی بنا پر بھی فرقہ وارانہ اختلافات کی گتھی کو سلجھانے کی زبردست خواہش تھی تاکہ ترقی کے راستے میں جو

رکاوٹ ہے وہ کسی طرح دور ہو جائے۔ اُن جماعتوں میں جن کی بنیاد محض فرقہ پرستی پر تھی اس طرح کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اس لئے کہ اُن کے قیام کی خاص غرض صرف یہ تھی کہ وہ اپنی اپنی محدود جماعتوں کے کچھ خاص قسم کے مطالبات پر زور دیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس طرح کی جماعتیں کسی قسم کی تبدیلی کو پسند نہ کرتی تھیں۔ برخلاف اس کے کانگریس میں گو زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی، لیکن مسلمان بھی خاصی بڑی تعداد میں شامل تھے اور دوسری مذہبی جماعتیں مثلاً سکھ اور عیسائی بھی اس میں شریک تھے۔ اور اس لئے کانگریس مجبور تھی کہ وہ ہر مسئلہ کو وسیع قومی نقطۂ نظر سے دیکھے۔ اس کے لئے سب سے بڑا اور سب سے پہلا مسئلہ قومی آزادی اور ملک میں آزاد جمہوری حکومت کا قیام تھا۔ لیکن کانگریس کو اس بات کا بھی پوری طرح احساس تھا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں یہ بات مناسب اور موزوں نہیں کہ سیدھے سادے قسم کی جمہوریت قائم کر کے اکثریت رکھنے والی جماعت کو اقلیتوں کے دبانے اور ان پر حکومت کرنے کا پورا اختیار دے دیا جائے۔ ہم اتحاد بے شک چاہتے تھے اور ہمیں اتحاد ہو جانے کا پورا یقین بھی تھا لیکن ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ ہندوستان کی تمدنی زندگی کے تنوع اور اس کی لطافت کو ختم کر کے اُسے ایک ہی سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ اور اسی خیال کے پیش نظر خود مختار حکومت میں بھی تمدنی ترقی اور شخصی اور جماعتی آزادی کے تحفظات کی گنجائش رکھی گئی تھی۔

لیکن دو بنیادی مسئلے ایسے تھے جن پر کانگریس مضبوطی کے ساتھ

قائم رہنا چاہتی تھی — قومی اتحاد اور جمہوریت۔ یہی چیزیں تھیں جن کی بنیاد پر وہ قائم ہوئی تھی اور تقریباً نصف صدی کے ارتقائی دور میں اُس نے انھیں دو چیزوں پر زور دیا تھا۔ نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے کانگریس میرے خیال اور نظر میں، دنیا کی سب سے زیادہ جمہوری جماعتوں میں سے ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس کی ہزاروں شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی مدد سے اُس نے ہندوستانیوں کو جمہوری طریقے سکھائے اور اس معاملے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ گاندھی جی کی ہر دلعزیز اور غالب شخصیت کی موجودگی کے باوجود، کانگریس کی بنیادی جمہوری حیثیت کسی طرح بھی کم نہ ہوئی۔ یہ ضرور تھا کہ بعض نازک اور بحرانی موقعوں پر، دوسرے ملکوں کی طرح، یہاں بھی لوگوں کی نظر اپنے لیڈر کی طرف ضرور اٹھتی تھی۔ اور ہندوستان میں ایسے نازک اور بحرانی موقعے اکثر آتے رہتے تھے۔ کوئی اور بات اس سے مہمل نہیں کہ کانگریس کو ایک آمرانہ جماعت کہا جائے اور لطف یہ ہے کہ اس طرح کا الزام کانگریس پر عموماً برطانوی اقتدار کے ذمہ دار نمائندے لگاتے تھے، جو خود ہندوستان میں تحکم اور استبداد کی روحِ رواں ہیں۔

گذرے ہوئے زمانے میں، کم سے کم زبان سے برطانوی حکومت ہندوستانی اتحاد اور جمہوریت کی حامی اور علم بردار ہونے کا دعویٰ کرتی تھی۔ اُسے اس بات پر فخر تھا کہ اس نے ہندوستان میں سیاسی اتحاد پیدا کر دیا ہے۔ اور یہ بات اِس لحاظ سے صحیح ہے کہ ہم سب غلامی اور محکومیت کے معاملے میں متحد تھے۔ لیکن عجیب بات

ہے کہ اس کی پالیسی ہمیشہ اتحاد اور جمہوریت دونوں کے خلاف رہی ہے۔ اگست سنہ ۱۹۴۰ء میں کانگریس کی مجلس منتظمہ کو علانیہ یہ بات کہنی پڑی کہ ہندوستان میں برطانیہ کی پالیسی "ملک میں دشمنی اور اختلاف کا بیج بونے کی پالیسی ہے"۔ برطانوی حکومت کے ذمہ دار نمائندوں نے کھلم کھلا یہ کہنا شروع کر دیا کہ شاید کسی سیاسی تنظیم کے لئے ہندوستان کو اتحاد کی قربانی دینی پڑے۔ اس لئے کہ جمہوریت ہندوستان کے لئے بالکل موزوں نہیں۔ اُن کے پاس آزادی کے مطالبے اور ہندوستان میں جمہوری حکومت کے قیام کے تقاضے کا صرف یہی ایک جواب رہ گیا تھا۔ اس جواب سے ضمنی طور پر ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ برطانیہ ان دونوں مقاصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ جو اس نے اپنے سامنے رکھے تھے۔ اور یہ بات محسوس کرنے میں اُسے ڈیڑھ سو برس لگے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کا ہم خود بھی کوئی ایسا حل نہیں نکال سکے، جس پر سب جماعتیں راضی ہو سکتیں۔ ہم پر یہ ایک بڑا الزام ہے اور ہمیں اس کے نتیجے بھگتنے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی نئی تجویز یا تبدیلی پر ہر ایک کو راضی بھی کیسے کیا جائے؟ اس لئے کہ ہر زمانے میں ایسے جاگیری اور رجعت پسند عناصر موجود ہوتے ہیں جو ہر طرح کی تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں، اور ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی جو سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنا خیال اور رویہ برابر بدلتے رہتے ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی چھوٹی سی جماعت بھی کسی تبدیلی کی

مخالف بن کر کھڑی ہو جاتی ہے تو تبدیلی ناممکن بن جاتی ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ حکومت ان جماعتوں کی سرپرستی کرتی ہو خواہ وہ آبادی کے کتنے ہی تھوڑے سے حصے کی نمائندگی کرتی ہوں۔ ان حالات میں تبدیلی صرف کامیاب انقلاب سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ بات نمایاں طور پر ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس طرح کی جاگیری اور رجعت پسند جماعتوں کی کمی نہیں اور ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جو انگریزوں کی پروان چڑھائی ہوئی ہیں اور انھیں برابر برطانوی قوت اور اقتدار کا سہارا ملتا رہتا ہے۔

مسلمانوں میں بھی مسلم لیگ کے علاوہ بہت سی جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ ان میں سے ایک پرانی اور نسبتاً اہم جماعت جمیعت العلما کی تھی، جس میں ہندوستان کے ہر حصے کے مولوی اور عالم شامل تھے۔ اس جماعت کا عام رجحان روایتی اور قدامت پسندانہ تھا اور لازمی طور پر مذہبی بھی۔ اس کے باوجود سیاسی حیثیت سے یہ جماعت خاصی ترقی یافتہ اور سامراج کی مخالف تھی۔ سیاسی میدان میں وہ اکثر کانگریس کی حامی اور ہم خیال تھی اور اس کے ممبر کانگریس کے بھی رکن تھے اور اسی کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ احرار جماعت ذرا بعد میں قائم ہوئی اور اس کا زور پنجاب میں سب سے زیادہ تھا۔ اس جماعت میں اکثر نچلے متوسط طبقے کے مسلمان شامل تھے اور اس کا اثر خاص خاص علاقوں کے عوام پر خاصا گہرا تھا۔ مومن یعنی جلاہوں کی جماعت جو تعداد میں بہت زیادہ تھے لیکن بہت غریب، پس ماندہ، کمزور اور غیر منظم۔ یہ لوگ بھی مسلم لیگ کے مخالف اور کانگریس کے حامی تھے۔ لیکن کمزور تھے، اس لئے سیاسی عمل

اور جدوجہد سے بچتے تھے۔ بنگال میں کرشک (کسان) سبھا تھی۔ جمعیت علما اور احرار کانگریس کے معمولی کاموں میں بھی اُن کا ساتھ دیتے تھے اور برطانوی حکومت کے خلاف اس کی عملی جدوجہد میں بھی، اور اس لئے انھیں بھی کانگریس کے ساتھ تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن مسلمانوں کی خاص جماعت مسلم لیگ بھی جو برطانوی اقتدار کی محض زبانی مخالفت کرتی رہی اور اس سے آگے نہیں بڑھی۔ مسلم لیگ میں تبدیلیاں ہوئیں، اس نے ترقی بھی کی اور اس میں برابر کثرت سے مسلمان شامل ہوتے رہے لیکن اس کی قیادت برابر اونچے طبقے کے جاگیری عناصر کے ہاتھ میں رہی۔

ان جماعتوں کے علاوہ شیعہ مسلمانوں کی تنظیم الگ تھی، لیکن اس تنظیم نے کبھی کوئی واضح صورت اختیار نہیں کی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ جماعت محض کچھ سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ عرب میں اسلام کے ابتدائی دور میں خلافت کے مسئلے میں شدید اختلاف پیدا ہوگیا اور اس نے مسلمانوں میں دو فرقے سُنّی اور شیعہ، پیدا کر دیئے۔ وہ اختلاف مدتیں گزرنے کے بعد بھی اب تک باقی ہے، اور گو اس میں اب کوئی سیاسی مفہوم اور مقصد باقی نہیں رہا، لیکن اس نے دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھا ہے۔ سنی ہندوستان میں بھی اکثریت میں ہیں اور دوسرے ممالک میں بھی، سوائے ایران کے جہاں شیعوں کی اکثریت ہے۔ ان دونوں فرقوں کے درمیان کبھی کبھی مذہبی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے شیعوں نے اپنے آپ کو مسلم لیگ سے الگ رکھا اور مِلے جُلے انتخاب کی حمایت کی۔ لیکن اس اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی بہت سے سربرآوردہ شیعہ لیگ میں شامل ہیں۔

ان سب مسلمان جماعتوں اور ان کے علاوہ بعض اور جماعتوں نے

(جس میں مسلم لیگ شامل نہ تھی) مل کر آزاد مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ آزاد مسلم کانفرنس، مسلم لیگ کے خلاف گویا ایک متحدہ اور متفقہ محاذ تھا۔ اس کانفرنس نے سنہ ۱۹۴۰ء میں دہلی میں اپنا پہلا اجلاس کیا جو بہت کامیاب رہا۔

ہندوؤں کی خاص فرقہ پرست جماعت ہندو مہاسبھا ہے۔ یہ جماعت گویا مسلم لیگ کا جواب ہے لیکن اس کی اہمیت نسبتاً بہت کم ہے۔ یہ جماعت بھی لیگ کی طرح شدید قسم کی فرقہ پرست جماعت ہے، لیکن اپنی اس انتہائی تنگ نظری کو مبہم قسم کے قوم پرستانہ الفاظ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے، حالانکہ حقیقت میں اس کا رجحان قدامت پسندانہ ہے، ترقی پسندانہ نہیں۔ بڑی افسوسناک بات ہے کہ ہندو مہاسبھا کے لیڈر کبھی کبھی غیر ذمہ دارانہ اور شدید بدزبانی پر اتر آتے ہیں۔ اور یہی حال مسلم لیگ کے بعض لیڈروں کا بھی ہے۔ یہ زبانی لڑائیاں دونوں طرف کے لوگوں کے دلوں میں تلخی اور غصہ پیدا کرتی ہیں اور کبھی کبھی یہ تلخی عملی لڑائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

مسلم لیگ کے رویے میں اکثر مصالحت اور معقولیت کی کمی رہی ہے، لیکن ہندو مہاسبھا کا بھی رویہ کسی طرح اس سے کم غیر معقول نہیں رہا۔ پنجاب اور سندھ کی ہندو اقلیتیں اور پنجاب کے سکھ ہمیشہ ہر سمجھوتے اور تصفیے کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوئے ہیں۔ اور برطانیہ کی تو یہ پالیسی ہی رہی ہے کہ وہ ہمارے اختلافات کو اور زیادہ ابھارے اور اس لئے اس نے کانگریس کے مقابلے میں ان فرقہ پرست جماعتوں کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔

انتخابات بہت بڑی حد تک اس بات کے اندازے کی کسوٹی ہیں کہ کسی خاص جماعت یا گروہ کا لوگوں پر کتنا اثر ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں

جو الکشن ہوئے ان میں ہندو مہاسبھا کو سخت ناکامی ہوئی، اور سیاست کی
بساط پر ان کے مہرے پٹ گئے۔ مسلم لیگ نے مقابلتاً زیادہ کامیابی حاصل
کی، لیکن مجموعی حیثیت سے اس کا کارنامہ کچھ زیادہ وقیع نہیں تھا، خاص کر
اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ پنجاب اور سندھ میں
اسے سخت ناکامی ہوئی، اور بنگال میں بھی صرف تھوڑی سی کامیابی۔ سرحد
کے صوبے میں کانگریس کے زیادہ آدمی منتخب ہوئے اُس نے وہاں اپنی
وزارت قائم کرلی۔ اس کے مقابلے میں جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی کم
تھی وہاں لیگ نسبتاً زیادہ کامیاب ہوئی، حالانکہ ان صوبوں میں بھی خاصی
تعداد میں ایسے مسلمان منتخب ہوئے جن کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہ
تھا یا جو کانگریسی خیال کے تھے۔

اس کے بعد سے مسلم لیگ نے صوبوں میں کانگریسی حکومتوں اور
کانگریس کی تنظیم کے خلاف ایک زبردست مہم شروع کردی۔ ہر طرف سے
یہ آوازیں اُٹھنے لگیں کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں پر ظلم کررہی ہیں۔ حالانکہ
ان حکومتوں میں مسلمان وزیر بھی تھے گو وہ مسلم لیگ کے ممبر نہ تھے۔ یہ ان
مظالم کی تفصیل یا تو سرے سے بتائی ہی نہیں گئی، یا کسی چھوٹے سے مقامی
واقعہ کو، جس سے حکومت کا دور کا بھی تعلق نہ تھا توڑ مروڑ کر اور بڑھا کر بیان
کردیا گیا۔ کچھ محکموں کی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں کو جن کی فوراً اصلاح بھی
کردی گئی، مظالم سے تعبیر کیا گیا۔ اور کبھی کبھی تو بالکل جھوٹے اور بے بنیاد
الزام بھی لگائے گئے۔ یہاں تک کہ ایک باقاعدہ رپورٹ بھی چھاپ دی گئی،
جس کی بنیاد سراسر خیال آرائی پر تھی اور اس میں سچ کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔
کانگریسی حکومتوں نے الزام لگانے والوں کو بتایا اور ان سے ان الزاموں

کی تفصیلیں پوچھیں تاکہ اُن کی تحقیقات کی جائے۔ بلکہ اُن سے یہاں تک کہا گیا کہ وہ خود سامنے آئیں اور حکومت کی مدد سے خود معاملات کی جانچ پڑتال کریں۔ لیکن کسی نے اس موقعے اور مدد سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اور مہم برابر جاری رہی۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفے کے فوراً ہی بعد، ۱۹۴۰ء کے شروع میں کانگریس کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مسٹر محمد علی جناح کو ایک خط لکھا اور اخباروں میں بھی ایک اعلان شائع کیا کہ مسلم لیگ کے پاس اگر کانگریسی حکومتوں کے خلاف کچھ الزامات ہیں تو وہ اُنھیں سامنے لائے تاکہ تحقیقات اور فیصلے کے لئے اُنھیں فیڈرل کورٹ کے سامنے رکھا جائے۔ مسٹر جناح نے اس درخواست کو قبول نہیں کیا اور اس سلسلے میں ایک رائل کمیشن کی طرف اشارہ کیا۔ حالانکہ اس طرح کے کسی کمیشن کے قیام اور تقرر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح کے کمیشن صرف برطانوی حکومت ہی مقرر کرسکتی ہے۔ صوبوں کے اُن گورنروں میں سے بعض نے جو کانگریسی حکومتوں کے زمانے میں ان صوبوں کے حاکم تھے اس طرح کے بیان بھی دئے کہ ان حکومتوں کے اقلیتوں کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی یا قابل اعتراض سلوک نہیں کیا گیا۔ ۱۹۳۵ء کے قانون نے گورنروں کو اس طرح کے خاص اختیارات دئے گئے تھے جن سے وہ ضرورت کے وقت اقلیتوں کی حفاظت اور نگہبانی کرسکتے تھے۔

ہٹلر کے اقتدار کے بعد سے نازیوں نے پروپیگنڈے کے جو نئے طریقے اختیار کئے تھے میں نے اُن کا بڑے غور اور توجہ سے مطالعہ کیا ہے اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہندوستان میں کچھ اسی طرح کا

پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جب چیکوسلوواکیا سوڈیٹن لینڈ کے نازک دور سے گذر رہا تھا۔ مسلم لیگ کے لیڈروں نے اکثر نازی طریقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن پر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ سوڈیٹن لینڈ کے جرمنوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالت ایک ہی بتائی گئی تھی۔ اس زمانے کی تقریریں اور بعض اخباروں کے مضامین تشدد اور اشتعال کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ کانگریسی حکومت کے ایک مسلمان وزیر پر قاتلانہ حملہ کیا گیا اور مسلم لیگ کے کسی لیڈر نے اس بات کو برا نہیں کہا۔ بلکہ اس قصور کو نظرانداز کیا گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کے تشدد کے مظاہرے عام ہوگئے۔

اس صورتِ حال سے اور زندگی کے معیاروں کی پستی سے میرے دل میں سخت مایوسی پیدا ہوئی۔ تشدد عامیانہ پن اور غیر ذمہ داری بڑھتی جارہی تھی اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈر ان ساری چیزوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ان لیڈروں میں سے بعض کو خط بھی لکھے اور اُن سے درخواست کی کہ اس پستی اور بیہودگی کو روکیں، لیکن افسوس ہے کہ مجھے ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ جہاں تک کانگریسی حکومتوں کا تعلق ہے، یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ان کا اپنا فائدہ اسی میں تھا کہ وہ ہر اقلیت اور ہر چھوٹی جماعت کو خوش اور مطمئن رکھیں۔ اور انھوں نے اس بات کی امکانی کوشش بھی کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ دوسرے گروہوں کو نقصان پہنچا کر مسلمانوں کو ناجائز رعایتیں دی جارہی ہیں۔ لیکن اس وقت حکومتوں کے سامنے یہ مسئلہ نہیں تھا کہ وہ کسی خاص شکایت کو دور کرکے اُسے مطمئن کردیں۔ شکایتیں کرنے والے معاملات پر معقولیت کے ساتھ

سوچ بچار کرتے ہی نہیں تھے۔ برخلاف اس کے مسلم لیگ اور اس کے حامی مستقل طور پر عوام کے دلوں میں یہ یقین راسخ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کوئی نئی مصیبت نازل ہوئی ہے اور اس نئی مصیبت کی ذمہ داری کانگریس پر ہے۔ یہ مصیبت کیا تھی، یہ شاید کسی کو بھی معلوم نہیں تھا لیکن کم از کم یہ بات تو یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس سارے شور و غل اور ہجو و ملامت کے پیچھے کوئی نہ کوئی قوت ضرور کام کر رہی تھی۔ اگر بیچ میں کوئی نشست خالی ہوتی تو الکشن کے موقعے پر "اسلام خطرے میں" کے نعرے بلند کئے جاتے اور مسلمانوں سے قرآن کا واسطہ دے کر مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینے کی قسم لی جاتی۔

ان ساری باتوں کا اثر مسلمان عوام پر ہونا لازمی تھا۔ پھر بھی بڑی حیرت ہے کہ خاصی بڑی جماعت نے ان باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ لیگ نے جہاں اکثر ضمنی انتخاب جیتے۔ وہاں چند میں ہاری بھی۔ جن انتخابوں میں اس کی جیت ہوئی ان میں بھی رائے دینے والے مسلمانوں کی خاصی تعداد نے لیگ کے خلاف ووٹ دئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس جماعت پر کانگریس کے دیہی اور زرعی پروگرام کا زیادہ اثر تھا۔ پھر بھی مسلم لیگ کو اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ عوام کی حمایت حاصل ہوئی اور اس نے عوام کی جماعت کی حیثیت سے بڑھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں جو کچھ گندی باتیں ہو رہی تھیں اُن کا مجھے بے حد افسوس تھا، پھر بھی میں نے لیگ کی اس نئی صورت کو مستقبل کے لئے ایک نیک فال سمجھا اور میرے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ رفتہ رفتہ لیگ میں سے جاگیری عنصر خارج ہو جائے گا۔ اور ترقی پسند عنصر اس پر قبضہ جمائے گا۔ اصل میں اب تک ساری خرابی یہ تھی کہ

مسلمان سیاسی اور سماجی حیثیت سے حد درجے پس ماندہ تھے اور رجعت پسند لیڈروں نے اُن کی اس حالت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا تھا۔

مسلم لیگ کے لیڈروں میں مسٹر جناح سب سے زیادہ ترقی پسند تھے۔ بلکہ حقیقت میں ان کا مرتبہ ان سب لیڈروں سے نمایاں طور پر بلند تھا اور اس لئے ان کی قیادت مسلمانوں کے لئے ناگزیر سی چیز تھی۔ عام جلسوں میں انھوں نے کھلم کھلا ایسے لوگوں کی طرف سے بے اطمینانی کا اظہار کیا جو محض ابن الوقت ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنے بعض ساتھیوں کی خامیوں کا بھی تذکرہ کیا۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مسلمانوں میں جو لوگ ترقی پسند، بے غرض اور باہمت ہیں ان میں سے اکثر کانگریس کے ساتھ ہیں۔ لیکن قسمت نے اور حالات کے بہاؤ نے اُنھیں ایسے لوگوں میں پھنسا دیا تھا جن کی اُن کے دل میں ذرا بھی عزت نہیں تھی۔ وہ ان کے قائد تھے لیکن وہ اُنھیں صرف اسی طرح متحد رکھ سکتے تھے کہ خود بھی ان کے رجعت پسند خیالات کے دام میں اسیر ہو جائیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں تک خیالات کا تعلق ہے اُنھیں یہ اسیری ناگوار تھی۔ اس لئے کہ بظاہر تجدد پسند ہونے کے باوجود وہ اُس پچھلی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو جدید سیاسی رجحانات اور میلانات سے بے خبر تھی۔ معاشیات آج کل کی دنیا پر حکمراں ہے، لیکن وہ اس سے قطعاً نابلد تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں جو غیر معمولی تبدیلیاں ہوئی تھیں انھوں نے بظاہر مسٹر جناح پر کوئی اثر نہیں کیا۔ انھوں نے کانگریس کو اُسی وقت چھوڑ دیا تھا جب اس نے ایک نیا قدم آگے کی طرف بڑھایا تھا۔ اور اس کے بعد سے ان میں اور کانگریس کے تصورات میں برابر فرق بڑھتا رہا، اس لئے کہ کانگریس کے

رجحانات اب معاشی اور عوامی ہو گئے تھے۔ لیکن مسٹر جناح خیالات کے لحاظ سے شاید اب بھی اُسی جگہ کھڑے تھے جہاں وہ ایک نسل پہلے تھے۔ بلکہ میرے خیال میں تو وہ اور بھی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اس لئے کہ اب وہ ہندوستان کے اتحاد اور اس کی جمہوریت دونوں کے مخالف تھے۔ انھوں نے کھلم کھلا یہ بات کہہ دی ہے کہ "وہ کسی ایسے نظام حکومت میں رہنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس کی بنیاد مغربی جمہوریت کے مہمل تصورات پر قائم ہو۔" انھیں اس نتیجے پر پہنچنے میں خاصی دیر لگی کہ جس چیز کی حمایت وہ ساری عمر کرتے رہے وہ مہمل تھی۔

مسلم لیگ میں مسٹر جناح بالکل یکہ و تنہا ہیں۔ وہ ان سے بھی بالکل الگ تھلگ اور بہت دور ہیں جو اُن کے کام میں سب سے زیادہ شریک ہیں۔ سارے مسلمان ان کا احترام کرتے ہیں لیکن ڈر سے اور اس کی بنیاد محبت پر نہیں بلکہ رعب پر قائم ہے۔ سیاست داں کی حیثیت سے ان کی قابلیت میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن یہ قابلیت ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مخصوص ماحول سے وابستہ ہے۔ ایک مقنن سیاست داں کی حیثیت سے حکمت عملی کے ماہر کی حیثیت سے اور ایک شخص کی حیثیت سے سمجھتا ہے کہ اس نے ہندوستانی قومیت اور برطانوی اقتدار کے درمیان ایک توازن قائم کر رکھا ہے انھیں خاص امتیاز حاصل ہے۔ اگر حالات مختلف ہوتے اور انھیں حقیقی سیاسی اور معاشی مسائل کا مقابلہ کرنا پڑتا تو یہ کہنا دشوار ہے کہ ان کی قابلیت کس حد تک ان کی رہنمائی کرتی۔ غالباً انھیں خود بھی اس معاملے میں اپنے اوپر پورا بھروسا نہیں، حالانکہ اپنے متعلق اُن کی اپنی رائے بہت اچھی ہے۔ اس سے شاید یہ اندازہ لگانا

مشکل نہ ہوگی۔ ان کے تحت الشعور میں ہر قسم کی تبدیلی کے خلاف جو اندرونی جذبہ کام کر رہا ہے اس کی کیا وجہ ہے اور کیوں وہ کبھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر جو اُن سے پوری طرح متفق نہیں ہیں، ہندوستان کے مسائل پر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار اور بات چیت کریں۔ حالات کے موجودہ سانچے میں وہ پوری طرح ڈھلے ہوئے ہیں۔ نئے حالات سے وہ یا کوئی اور شخص مطابقت پیدا کر سکتا ہے یا نہیں، یہ کہنا دشوار ہے۔ لیکن کون سا جذبہ اُنھیں عمل پر آمادہ کرتا ہے، اور کون سا نصب العین انھیں آگے بڑھا رہا ہے؟ یا شاید ان کے دل میں خاص جذبہ ہی نہیں۔ بلکہ وہ اسی میں خوش ہیں کہ سیاست کے میدان میں شطرنج کا ایسا کھیل کھیل رہے ہیں جس میں انھیں اکثر اپنے حریف سے یہ موقع ملتا ہے 'شہ بچو'؟ اُن کے دل میں کانگریس کی طرف سے سخت نفرت معلوم ہوتی ہے، اور برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ جن چیزوں سے انھیں نفرت ہے، وہ تو سب کو معلوم ہیں، لیکن آخر انھیں پسند کیا چیز ہے؟ اپنی ساری قوت اور استقلال کے باوجود وہ ایک عجیب وغریب قسم کی منفی شخصیت رکھتے ہیں، جسے اگر کسی علامت یا نشان کے ذریعے ظاہر کرنا ہو تو سب سے موزوں نشان لفظ 'نہیں' ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کے اثباتی پہلو کو سمجھنے کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوتی ہے اور کوئی شخص اس کی حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا

جب سے ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت آئی، مسلمان قوم نے نئی قسم کی شخصیتیں بہت کم پیدا کی ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں اس زمانے میں بھی بعض حیرت انگیز شخصیتیں پیدا ہوئیں، لیکن عموماً یہ پرانی تہذیب سے وابستہ تھیں زمانے کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ

ہونا ان کے لئے مشکل بات تھی۔ ان حضرات میں بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ چلنے یا تمدنی اور معاشی حیثیت سے اپنے آپ کو نئے ماحول کے مطابق بنانے کی صلاحیت کی جو کمی نظر آتی تھی اُسے فطری نہیں کہا جا سکتا۔ اِس صورتِ حال کے ذمہ دار ایک حد تک تاریخی حالات تھے مگر اس کے علاوہ کچھ اور وجوہ بھی تھے۔ مثلاً مسلمانوں میں صنعتی متوسط طبقہ نسبتاً بہت زیادہ بعد میں پیدا ہوا، اور ان کی پوری زندگی کی بنیاد بڑی حد تک جاگیری رجحانات پر تھی۔ ان رجحانات نے ترقی کی راہیں مسدود کر دیں اور جوہرِ قابل کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا۔ بنگال میں مسلمانوں کی پس ماندگی سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اور اس کی دو وجہیں تھیں، ایک، تو یہ کہ برطانوی حکومت کے ابتدائی دور نے بنگال کے اونچے اور خوش حال طبقہ کا خاتمہ کر دیا تھا اور دوسرے یہ کہ بنگال کے موجودہ مسلمانوں کی اکثریت نومسلم تھی اند مدتوں سے زمانے نے انھیں ترقی کے مواقع سے محروم رکھا تھا۔ ل ہندوستان میں مسلمان کا متمدن اور اونچا طبقہ اپنی قدیم روایات سے اور زمینداری کے نظام سے وابستہ تھا۔ پچھلے چند برسوں میں ہندوستانی مسلمانوں میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہو گیا ہے، لیکن اب بھی علم و ہنر اور صنعتوں میں مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں۔ ہندو بھی پس ماندہ ہیں، اور بعض حیثیتوں سے وہ مسلمانوں سے بھی زیادہ قدامت پرستانہ فکر و عمل کی بندشوں میں گرفتار ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے سائنس، صنعت اور اس طرح کے دوسرے میدانوں میں بعض نمایاں شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ یہاں تک کہ پارسیوں کی چھوٹی سی جماعت سے بھی ہندوستان کو صنعت کے میدان میں بعض

بہت بڑے فائدے ملے ہیں۔ بات ذرا بے ربط سی ہے، لیکن شاید سننے والوں کے لئے یہ بات دلچسپ ہو مسٹر جناح کا گھرانا پہلے ہندو گھرانا تھا۔

پہلے اکثر قابل مسلمان اور ہندو سرکاری ملازمتوں میں چلے جاتے تھے اس لئے کہ ان دنوں اس سے زیادہ دلکش کوئی چیز نہیں تھی۔ لیکن جب سے آزادی کی سیاسی تحریک شروع ہوئی سرکاری ملازمتوں کی کشش کم ہوگئی اور قابل، مخلص اور باہمت نوجوان سیاست کی طرف آنے لگے۔ اسی زمانے میں بہت اچھے اچھے مسلمان کانگریس میں شریک ہوئے۔ آگے بعض مسلمان اشتراکی اور انتہائی پارٹیوں میں بھی داخل ہوئے۔ لیکن ان تھوڑے بہت ترقی پسند اور جوشیلے لوگوں کو چھوڑ کر مسلمانوں میں اچھے لیڈروں کی کمی رہی ہے اور اس لئے اب بھی مسلمان صرف سرکاری ملازمتوں کو ترقی کا سب سے اونچا زینہ سمجھتے ہیں۔ مسٹر جناح عام لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ وہ قابل تھے اور ان کے عزم میں استحکام اور استقلال تھا۔ انھیں منصب اور اقتدار کی کشش اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی تھی۔ دوسرے لیڈروں میں یہی کمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ میں ان کا مرتبہ اتنا بلند ہوگیا اور لوگوں کے دلوں میں ان کا احترام پیدا ہوگیا جو لیگ کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں کو میسر نہیں تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے استحکام اور استقلال سے ایک نقصان پہنچا۔ ان کے ذہن کے دروازے نئے خیالات کے لئے بند ہوگئے۔ اپنی جماعت پر ان کا جو زبردست تسلط ہے اس کی وجہ سے وہ اختلاف خیال کو بالکل برداشت نہیں کرسکتے خواہ خود ان کی جماعت کی طرف سے ہو یا دوسری جماعتوں کی طرف سے۔ مسلم لیگ ان کی ذات میں ختم ہوگئی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لیگ چونکہ

اب عوام کی جماعت بنتی جا رہی ہے ۔ اس لئے یہ عامرانہ قیادت اور اس کے فرسودہ تصورات کب تک باقی رہ سکیں گے ؟

جب میں کانگریس کا صدر تھا تو میں نے کئی مرتبہ مسٹر جناح کو لکھا کہ آپ ہمیں بتایئے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے ۔ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ لیگ کیا چاہتی ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں ۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ کانگریسی حکومتوں سے لیگ کو کیا کیا شکائتیں ہیں ۔ میرا مقصد یہ تھا کہ اس طرح خط و کتابت سے ہم بہت سی باتیں صاف کرلیں اور مراسلت کے دوران میں جو ضروری اور اہم مسائل پیدا ہوں اُن پر زبانی گفتگو کرلی جائے ۔ مسٹر جناح نے میرے خطوں کے لمبے لمبے جواب دئے لیکن مجھے میرے سوالوں کا جواب نہ ملا ۔ انھوں نے صاف صاف لفظوں میں مجھے یا کسی اور کو نہیں بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور لیگ کی شکائتیں کیا کیا ہیں ۔ بار بار ہم نے آپس میں خط و کتابت کی لیکن ہر دفعہ مبہم اور بے نتیجہ رہی اور مجھے واضح طور پر کوئی بات نہ معلوم ہوسکی ۔ اس پر مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں اپنے آپ کو کچھ بے بس سا محسوس کرنے لگا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مسٹر جناح کوئی صاف بات کہہ کر اپنے آپ کو پابند نہیں بنانا چاہتے ، اور ان کے دل میں سمجھوتے کی ذرا بھی خواہش نہیں ۔

اس کے بعد گاندھی جی ، اور ہم میں سے بہت سے لوگ کئی بار مسٹر جناح سے ملے ۔ ان لوگوں نے گھنٹوں آپس میں باتیں کیں لیکن کبھی ابتدائی مرحلے سے آگے نہ بڑھے ۔ ہماری تجویز یہ تھی کہ کانگریس اور لیگ کے نمائندے مل کر آپس میں باہمی مسائل کے متعلق گفتگو کریں ۔ مسٹر جناح نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ بات صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ

کانگریس مسلم لیگ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لے اور اپنے آپ کو خالص ہندو جماعت مان لے۔ اس شرط کے ماننے میں ایک بہت بڑی دقت تھی۔ ہم لیگ کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے اور اسی لئے سمجھوتے کی خواہش لے کر اس کے پاس گئے تھے۔ لیکن ہم ہندوستان کی دوسری مسلمان جماعتوں کو کس طرح نظر انداز کر دیتے، درآں حالانکہ ان میں سے کچھ کا ہم سے قریبی تعلق بھی تھا؟ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ایک خاص بڑی جماعت خود کانگریس میں بھی شامل تھی اور بعض ذمہ داری کے عہدے بھی مسلمانوں کے سپرد تھے۔ مسٹر جناح کے دعوے کو تسلیم کر لینے کے معنی یہ تھے کہ ہم اپنے پرانے ساتھیوں کو کانگریس سے نکال باہر کریں اور ان سے کہہ دیں کہ کانگریس کا دروازہ ان کے لئے بند ہے۔ اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد کانگریس کی بنیادی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے، اور وہ ایک ایسی قومی جماعت ہونے کے بجائے جو سب کے لئے عام ہے، ایک محدود مذہبی جماعت بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ چیز ہمارے تصوّر میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اگر کانگریس پہلے سے موجود نہ ہوتی تو ہمیں ایک ایسی قومی جماعت بنانی پڑتی جس کا دروازہ ہر ہندوستانی کے لئے کھلا ہوا ہو۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسٹر جناح اس بات پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں اور باقی ہر مسئلہ پر گفتگو کرنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم صرف یہی نتیجہ نکال سکتے تھے کہ وہ کوئی سمجھوتہ نہیں چاہتے، اور نہ وہ اپنے آپ کو کسی طرح پابند بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی خوشی یہ تھی کہ معاملہ اسی طرح چلتا رہے اور وہ سمجھتے تھے کہ اس برطانوی حکومت

سے اُنھیں کچھ اور بل جائے گا۔

مسٹر جناح کے مطالبہ کی بنیاد ایک نئے نظریے پر تھی — اور وہ یہ کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں، ہندو اور مسلمان۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ آخر دو قومیں کیسے ہوگئیں؟ اس لئے کہ اگر قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے تو ہندوستان میں صرف دو نہیں، بہت سی قومیں ہیں۔ دو بھائیوں میں سے ایک ہندو ہوسکتا ہے، دوسرا مسلمان، اور اس طرح یہ دونوں گویا دو قوموں کے رکن بن جاتے ہیں۔ یہ قومیں تو مختلف تناسب میں ہندوستان کے اکثر گانوں میں موجود ہیں۔ لیکن یہ ایسی قومیں ہیں جس کے درمیان کوئی حد بندی نہیں جو ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔

بنگال کا ایک مسلمان ایک ہندو، دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں، ایک ہی زبان بولتے ہیں، اور ایک ہی طرح کی رسوم اور روایات کے پابند ہیں، پھر بھی ان کی قومیں الگ الگ ہیں۔ یہ چیز میرے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ عہد وسطی کے کسی نظریے کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ قومیت کی منطقی تعریف دشوار ہے۔ میرے نزدیک تو قومی شعور کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت یہ احساس ہے کہ ہم ایک ہیں اور ہمیں ایک ہوکر باقی انسانوں کے مقابلے میں کھڑا ہونا ہے۔ یہ تصور ہندوستان میں کس حد تک موجود ہے، یہ ضرور ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ماضی میں ہندوستان کا ارتقا اور نشو و نما ایک کثیر الاقوام سلطنت کی حیثیت سے ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ ایک قومی شعور پیدا کرلیا۔ لیکن یہ سب تو محض نظریاتی اور فلسفیانہ باتیں ہیں اور ہمیں ان میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ آج کی بڑی سے بڑی سلطنتیں مثلاً امریکہ اور روس کثیر الاقوام سلطنتیں

ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن میں قومی شعور ابھی تک موجود ہے
مسٹر جناح کے دو قوموں کے نظریئے سے پاکستان کا ، یعنی ہندوستان کو ٹکڑوں میں بانٹ دینے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن اس سے بھی ' دو قوموں ' کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ تو سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں البتہ اس نے ایک مابعد الطبعی تصور کو ایک محسوس شکل دے دی اس نئی صورت حال نے بہت سے دلوں میں ہندوستان کے مسئلے کو جذباتی حیثیت سے اور بھی اہم اور شدید بنا دیا۔ عموماً قومی اتحاد کو ایک مسلمہ چیز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی اس کی مخالفت کرے اور اس پر حملے کر کے اس اتحاد میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے تو لوگوں کے دل میں اتحاد کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے۔ اور اس طرح انتشار کی کوششیں کبھی کبھی اتحاد کو اور بھی قوی بنا دیتی ہیں۔

کانگریس اور اس کے مقابل مذہبی اور فرقہ پرست جماعتوں کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق تھا۔ مذہبی اور فرقہ پرست جماعتوں میں مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا ' دو خاص جماعتیں تھیں۔ یہ جماعتیں نظری طور پر تو ہندوستان کی آزادی کی حامی تھیں، لیکن حقیقت میں ان کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ اپنی اپنی مخصوص جماعت کے لئے کچھ خاص تحفظات اور رعائتیں حاصل کرنے کے لئے انھیں برطانوی حکومت کا سہارا لینا پڑتا تھا اس لئے وہ کوشش کرتی تھیں کہ اُس سے کسی طرح کا تصادم نہ ہو۔ بہ خلاف اس کے کانگریس کا مقصد تھا ہندوستان کی آزادی اور اتحاد اور اس کے لئے آزادی کے علاوہ باقی ہر چیز فروعی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اس لئے اس کا برطانوی اقتدار

سے پیہم اور مسلسل تصادم ناگزیر تھا۔ ہندوستانی قومیت، جس کی نمائندگی کانگریس کر رہی تھی، برطانوی سامراج کی مخالف تھی۔ اس کے علاوہ کانگریس زرعی، معاشی اور سماجی پروگراموں پر بھی عمل کر رہی تھی۔ مسلم لیگ یا ہندو مہاسبھا نے ... کسی ... کی طرف نہ دھیان دیا تھا اور نہ اس سلسلے میں کوئی پروگرام بنانے کی کوشش کی تھی۔ اشتراکیوں اور اشتمالیوں کو وابستہ اس طرح کے معاملات سے گہری دلچسپی تھی اور انھوں نے اس سلسلے میں کچھ پروگرام بھی بنائے تھے جنھیں وہ کانگریس کے ذریعے سے بھی اور اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی عمل میں لانا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ پالیسی اور کام کے اعتبار سے کانگریس اور مذہبی فرقہ پرست جماعتوں میں ایک فرق اور بھی تھا۔ سیاسی معاوضہ، ہنگامی سرگرمیوں اور اسمبلیوں کے کام کے علاوہ کانگریس سب سے زیادہ زور بعض ایسے تعمیری کاموں پر دیتی تھی جن میں عوام کا بھلا ہو۔ گھریلو دستکاریوں کی تنظیم اور ترقی، اچھوتوں کی حالت کا سدھار اور آگے چل کر بنیادی تعلیم کی اشاعت اس تعمیری سلسلے کی اہم کڑیاں تھیں۔ دیہات سدھار کے کاموں میں حفظان صحت اور طبی امداد کے کچھ سادے طریقوں کے رائج اور عام کرنے کی اسکیم شامل تھی۔ کانگریس نے ان کاموں کے لئے الگ الگ جماعتیں قائم کر دیں اور یہ جماعتیں سیاسی میدان سے الگ ہٹ کر ان میں لگی رہتی تھیں۔ ان کاموں میں ہزاروں آدمی اپنا پورا وقت صرف کرتے تھے اور ان سے بھی کہیں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو فرصت کے وقت میں ان کی مدد کر دیتے تھے۔ یہ غیر سیاسی اور تعمیری کام اس وقت بھی ہوتا رہتا تھا جب خالص سیاسی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ جاتی تھیں، لیکن

جب حکومت اور کانگریس میں کھلم کھلا تصادم ہوتا تھا تو حکومت ان تعمیری
کاموں میں رخنے ڈالتی تھی۔ ان تعمیری کاموں کے اقتصادی پہلو پر لوگوں
نے اعتراض کئے ہیں لیکن ان کی سماجی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔
ان کاموں نے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو عوام کے قریب لا کر کھڑا کر دیا
لوگوں میں خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ کانگریسی مردوں
اور عورتوں نے مزدور سبھا اور کسان سبھاؤں کے سلسلے میں اہم کام کئے
ہیں اور ان میں سے اکثر سبھاؤں کی تشکیل اور تنظیم انھیں کی مدد اور سہارے
سے ہوئی۔ احمد آباد کے کپڑے کے ملوں کے مزدوروں کی سبھا ہندوستان
کی سب سے بڑی اور سب سے منظم مزدور سبھا ہے۔ یہ سبھا کانگریسیوں ہی
نے شروع کی تھی اور کانگریسیوں ہی کے قریبی تعاون سے اس نے اتنی ترقی
کی۔

ان ساری عملی سرگرمیوں نے کانگریس کے کام کے لئے ایک ٹھوس
بنیاد قائم کر دی۔ اور یہ چیز مذہبی اور فرقہ وارانہ جماعتوں میں قطعاً مفقود تھی۔ یہ
جماعتیں صرف شورش اور ہنگامے کے رنگ میں کام کرتی تھیں اور ان
میں رہ رہ کر ابال آتا تھا یا محض الکشن کے دنوں میں زیادہ جوش دکھاتی تھیں۔ انھیں
حکومت کے تشدد کا کوئی کھٹکا نہ تھا اور کانگریس کو ہر وقت اس کا مقابلہ کرنا
پڑتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جو لوگ منصب و اقتدار کے خواہاں تھے وہ ان
جماعتوں میں داخل ہو جاتے تھے۔ ان مذہبی اور فرقہ پرست جماعتوں کے
مقابلے میں احرار اور جمعیت العلما کو حکومت کے تشدد سے سخت نقصان
پہنچا، اس لئے کہ یہ جماعتیں بھی سیاسی حیثیت سے اسی راستے پر چلتی تھیں
جس پر کانگریس۔

کانگریس ایک طرف تو ہندوستان کی آزادی کی اُس خواہش کی نمائندگی کررہی تھی جو ہندوستان میں ایک نئے متوسط طبقے کی نشو ونما کے ساتھ برابر بڑھتی جارہی تھی، اور دوسری طرف بڑی حد تک نچلے طبقے کی اُس خواہش کی ترجمان تھی جو سماجی تبدیلی کے لئے اس میں پیدا ہورہی تھی۔ دیہاتی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنا اس کے پروگرام کا ایک خاص حصہ تھا۔ اس پروگرام نے کبھی کبھی خود کانگریس کے اندرونی حلقوں میں اختلافات پیدا کردیئے، اور بڑے بڑے زمیندار اور ساہوکار، قومیت کے حامی ہونے کے باوجود ان انقلابی اشتراکی تبدیلیوں کے خوف کی وجہ سے کانگریس سے الگ رہے۔ اشتراکی اور اشتمالی کانگریس میں داخل ہوئے اور انھوں نے کانگریس کی پالیسی پر اپنا اثر بھی ڈالا۔ ان کے مقابلے میں مذہبی اور فرقہ پرست گروہ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، جاگیری اور قدامت پسند عناصر پر مشتمل ہیں اور اس لئے ہر انقلابی سماجی تبدیلی کے مخالف۔ غرض فرقہ دارانہ جھگڑوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا (گو ان سب چیزوں میں اکثر مذہب کی آڑ لی جاتی تھی) بلکہ اصل میں لڑائی دو مختلف الخیال عناصر کے درمیان تھی — ان میں ایک قومی، جمہوری، سماجی اور انقلابی پالیسی کا علم بردار تھا اور دوسرا جاگیری نظام کی یادگاروں کا محافظ و نگہبان اور اس لئے جب کوئی نازک بحرانی موقع آجاتا تو موخرالذکر گروہ بیرونی قوت کا سہارا ڈھونڈھتا اور اُسے سہارا مل بھی جاتا، اس لئے کہ بیرونی قوت تو حالات کو موجودہ شکل میں قائم رکھنا ہی چاہتی تھی۔

دوسری جنگِ عظیم کے چھڑتے ہی ہندوستان میں ایک اندرونی

انتشار اور بحران شروع ہوگیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبے کی کانگریسی حکومتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن استعفیٰ دینے سے پہلے ایک مرتبہ پھر کانگریس نے مسٹر محمد علی جناح اور مسلم لیگ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد کانگریس کی مجلس منتظمہ کا جو پہلا جلسہ ہوا اس میں مسٹر جناح کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ لیکن وہ کسی وجہ سے اس میں شریک نہ ہوسکے۔ ہم اس کے بعد پھر اُن سے ملے تاکہ دُنیا کے بحرانی حالات کے پیش نظر ایک متحدہ پالیسی کی تشکیل ہوسکے۔ اس ملاقات سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا پھر بھی ہم نے گفتگو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور اسی دوران میں کانگریسی حکومتوں نے ایک سیاسی معاملے پر استعفیٰ دے دیا۔ اس کا مسلم لیگ یا فرقہ وارانہ مسئلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر بھی مسٹر جناح نے اس خاص موقعے کو کانگریس پر سخت حملہ کرنے کا سب سے زیادہ موزوں وقت سمجھا۔ اور صوبوں میں کانگریسی حکومتیں ختم ہونے پر لیگ نے یوم نجات منانے کا فیصلہ کیا۔ اسی موقعے پر انھوں نے کانگریس کے نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف بعض بہت نازیبا باتیں کہیں — اور خاص کر کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف، جن کی ہندو مسلمان دونوں بڑی عزت کرتے تھے۔ یوم نجات کی تحریک کچھ چلی چلائی نہیں ہندوستان کے بعض حصوں میں چند مسلمان جماعتوں نے بھی اس کے خلاف مظاہرے کئے لیکن اس نے تلخیوں کو اور بڑھا دیا اور یہ بات اور بھی مستحکم ہوگئی کہ مسٹر جناح اور اُن کی قیادت میں مسلم لیگ کا کانگریس سے سمجھوتا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں، یا دوسرے لفظوں میں وہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو آگے بڑھانا نہیں چاہتے۔

اُنھیں موجودہ حالات میں رہنا زیادہ پسند ہے۔

۷۔ نیشنل پلیننگ کمیٹی

۱۹۳۸ء کے آخر میں کانگریس کے ایما پر قومی منصوبہ بندی کے لئے ایک کمیٹی قائم کردی گئی۔ اس کمیٹی میں پندرہ ممبر تھے اور ان کے علاوہ صوبے کی حکومتوں اور ان ریاستوں کے نمائندے جو ہمارے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس کے ممبروں میں ہندوستان کے بڑے بڑے کارخانہ داروں، ساہوکاروں، ماہرین معاشیات، پروفیسروں اور سائنسدانوں کے علاوہ ٹریڈیونین کانگریس اور ویلج انڈسٹریز ایسوسی ایشن کے نمائندے شامل تھے۔ صوبوں کی غیر کانگریسی حکومتوں (بنگال، پنجاب اور سندھ) اور ہندوستان کی بعض بڑی ریاستوں (حیدرآباد، میسور، بڑودہ، ٹراونکور، بھوپال) نے اس کمیٹی کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ گویا یہ کمیٹی

سلہ یہ کتاب پوری لکھ لینے کے بعد مجھے کناڈا کے ایک فاضل ولفرڈ کینٹول اسمتھ کی ایک کتاب پڑھنے کو ملی۔ ولفرڈ کینٹول اسمتھ کچھ سال تک مصر اور ہندوستان میں رہے ہیں اور انھوں نے "ماڈرن اسلام ان انڈیا ـــــ اے سوشل انالیسیز" (لاہور ۱۹۴۳ء) کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے مسلمانوں کے خیالات اور افکار کے ارتقا کا بہت عالمانہ تبصرہ اور تجزیہ ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں سرسید احمد خاں اور ان کے بعد کے زمانے کی ترقی پسند اور رجعت پسند تحریکوں کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے علاوہ مسلم لیگ کے مختلف عہدوں اور دوروں کا حال بتایا ہے۔

بہت بڑی حد تک ہندوستان کی صحیح نمائندگی کر رہی تھی۔ اور اس میں حد بندیوں کو توڑ کر اور سرکاری اور غیر سرکاری عناصر کے اختلافات کو دور کر کے سارا ہندوستان شریک ہوا تھا۔ البتہ گورنمنٹ آف انڈیا نے عدم تعاون کا رویہ قائم رکھا اور وہ اس میں شریک نہیں ہوئی اس کمیٹی میں اونچے طبقے کے معاملہ فہم کاروباری لوگ بھی شریک تھے اور وہ لوگ بھی جنھیں خیال پرست اور نظریہ پرست کہا جاتا ہے۔ اور ان کے علاوہ اشتراکی اور نیم اشتمالی بھی صوبے کی حکومتوں اور ریاستوں سے صنعت و حرفت کے محکموں کے ڈائرکٹر اور ماہرین فن اس میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔

غرض یہ کمیٹی مختلف اور متضاد عناصر کا عجیب وغریب مجموعہ تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ سب کس طرح مل جل کر کام کر سکیں گے۔ میں نے اس کمیٹی کی صدارت کسی قدر تامل اور ہچکچاہٹ کے بعد قبول کر لی۔ اس لئے کہ یہ کام میری پسند کا تھا اور میں کسی طرح اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔

ہر قدم پر ہمارے لئے دقتیں ہی دقتیں تھیں۔ صحیح معنوں میں مفید منصوبے اور تجویزیں تیار کرنے کے لئے جس مواد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مہیا نہیں تھا اور ہر طرح کے اعداد و شمار کی انتہائی کمی تھی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کسی طرح کی مدد کرنے کو تیار نہ تھی۔ صوبے کی حکومتیں بھی گو ہمارے ساتھ اشتراک عمل کر رہی تھیں اور اُن کا رویہ ہمارے ساتھ دوستانہ تھا لیکن انھیں بھی شاید اس کام سے گہری دلچسپی نہیں تھی اور چونکہ یہ منصوبے سارے ہندوستان کے لئے بن رہے تھے اس لئے وہ ان میں بس دور ہی سے

دلچسپی لے رہی تھیں اصل بات یہ ہے کہ وہ خود اپنے مقامی جھگڑوں اور مسئلوں میں بہت الجھی ہوئی تھیں۔ کانگریس کے سربرآوردہ عناصر جن کے سایۂ عاطفت میں کمیٹی کی داغ بیل پڑی تھی اسے ناخلف اولاد کی طرح سمجھتے تھے انھیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ بچہ کس طرح پروان چڑھے گا اور آگے چل کر کیا کرے گا۔ اونچا کاروباری طبقہ تو یقینی طور پر اس کا سب سے بڑا نکتہ چیں تھا اور وہ اس کمیٹی میں محض اس خیال سے شریک ہوا تھا کہ باہر رہنے کے بجائے کمیٹی کے اندر رہ کر وہ اپنے مفاد کی نگہبانی زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا تھا۔

یہ بھی ظاہر تھا کہ کوئی جامع اور وسیع سماجی یا معاشی منصوبہ صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ملک میں ایک ایسی آزاد قومی حکومت ہو، جو پوری طرح با اختیار بھی ہو اور اسے عوام کا بھروسہ بھی حاصل ہو تا کہ سماجی اور معاشی نظام میں وہ جو بنیادی تبدیلیاں کرنی چاہیں اسے لوگ خوشی سے قبول کرنے پر آمادہ ہو سکیں۔ اس لئے کسی قومی منصوبے کی کامیابی کی پہلی شرط یہی ہے کہ ملک پر بیرونی اقتدار باقی نہ رہے اور اسے قومی آزادی حاصل ہو جائے۔ اس بڑی رکاوٹ کے علاوہ اور بھی بہت سی رکاوٹیں تھیں — ہماری سماجی پس ماندگی، ہمارا رسم و رواج اور ہمارا قدامت پرستانہ نقطۂ نظر۔ لیکن ان سب دقتوں کا بہر صورت مقابلہ کرنا تھا۔ اور اس لئے ہم جو منصوبے بنا رہے تھے وہ موجودہ زمانے سے زیادہ ایک غیر یقینی مستقبل کے لئے تھے۔ اور اسی لئے اس سارے کام پر حقیقت سے دوری کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ پھر بھی ہمیں اس کی بنیاد سنجیدہ زندگی پر رکھنی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ دل میں یہ امید بھی تھی کہ ہم جس مستقبل کے لئے یہ سب

کچھ کر رہے ہیں وہ زیادہ دور نہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر ہم موجودہ حالات میں صرف ضروری مواد فراہم کر کے اُسے منظم و مرتب کر لیں اور مستقبل کے کاموں کے کچے خاکے بنا لیں تو آئندہ کے مفید اور کارآمد منصوبوں کے لئے پختہ زمین تیار ہو جائے گی۔ اور صوبے اور ریاستیں بھی یہ سوچ سکیں گی کہ اپنے وسائل کو ترقی دینے کے لئے اُنھیں کن راہوں پر چلنا ہو گا۔ مختلف طرح کے معاشی، سماجی اور تمدنی وسیلوں اور سرگرمیوں کو مرتب اور منظم شکل میں لانے کی کوشش بجائے خود ایک بہت بڑی تعلیم تھی — ہمارے لئے بھی اور عام لوگوں کے لئے بھی۔ اس چیز نے لوگوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ فکر اور عمل کے محدود دائروں سے باہر نکلیں اور مختلف مسائل کے باہمی ربط و تعلق کو محسوس کر کے ان پر غور کریں اور اس طرح اُن میں کسی نہ کسی حد تک ایک مشترک اور وسیع مطمح نظر پیدا ہو سکے۔

پلیننگ کمیٹی کا سب سے پہلا مقصد ملک کو صنعتی اعتبار سے ترقی دینا تھا۔ اس لئے کہ "ملک میں صنعت کو رواج دئے بغیر غریبی اور بے روزگاری، قومی بچاؤ اور معاشی فلاح کے مسائل مجموعی طور پر حل ہی نہیں ہو سکتے۔ صنعتی ترقی کے سلسلے میں پہلی منزل یہ ہونی چاہیے کہ نیشنل پلیننگ کی ایک مفصل اسکیم تیار کی جائے۔ اس اسکیم میں بھاری صنعتوں، اوسط درجے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کی ترقی کے سلسلے میں تجویزیں پیش کی جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن ہندوستان کے متعلق کوئی منصوبہ تیار کرتے وقت زراعت کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ زراعت ہی اصل میں لوگوں کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اور اتنی ہی اہم وہ چیزیں ہیں جنھیں ہم "رفاہ عام کے کام" کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سب چیزیں ایک دوسرے سے وابستہ

تھیں اور ایک کو دوسری سے الگ کرنا اور ایک کی ترقی کے بغیر دوسری کو ترقی دینا غیر ممکن تھا۔ ہم پلاننگ کے کام پر جتنا زیادہ سوچ بچار کرتے تھے اتنا ہی اس کا دائرہ پھیلتا جاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہماری زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرلے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں ایک دم سے تنظیم و ترتیب پیدا کرنا چاہتے تھے، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ کسی ایک مسئلے کے متعلق ترقی کی تجویزیں بناتے وقت ہمیں تقریباً باقی ساری چیزوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کام میں غیر معمولی لطف آنے لگا اور میرا خیال ہے کہ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کی بھی یہی کیفیت تھی۔
لیکن اس کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر ہمارے خیالات دھندلے اور مبہم ہوتے جاتے تھے منصوبے کے چند بڑے بڑے پہلوؤں پر خاص توجہ کرنے کے بجائے ہماری نظر جزئیات میں الجھ جاتی ہے۔ غرض ہمارے کام میں ایک طرح کا انتشار سا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ بہت سی سب کمیٹیوں کے کاموں میں خاصی دیر لگی۔ اس لئے کہ ان میں سے کسی کے سامنے نہ کوئی واضح مقصد تھا اور نہ کام کو کسی ایک مقررہ وقت پر ختم کر لینے کی ضرورت کا احساس۔
کمیٹی میں اتنے مختلف اور متضاد قسم کے عناصر جمع تھے کہ ہم سب کا کسی بنیادی اجتماعی پالیسی یا سماجی تنظیم کے کسی خاص اصول پر متفق ہونا آسان بات نہ تھی۔ اس لئے اگر شروع ہی میں ہم اصولوں کی نظری بحث میں پڑ جاتے تو لازمی بات تھی کہ نقطۂ نظر کے بنیادی اختلافات کی وجہ سے ہم میں پھوٹ پڑ جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ بنیادی اصولوں کا پیش نظر نہ ہونا ایک بہت بڑا نقص تھا۔ لیکن ہم مجبور تھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ مجموعی اسکیم اور الگ الگ مسئلوں پر نظری بحث کرنے کے بجائے ان پر عملی نقطۂ نظر سے

غور کیا جائے اور پھر رفتہ رفتہ کچھ اصول قائم کئے جائیں۔ اس بحث میں ہمارے سامنے دو مختلف نقطۂ نظر تھے ۔ اشتراکیت کے حامی اس بات پر مصر تھے کہ نفع حاصل کرنے کے خیال کو چھوڑ کر منصفانہ تقسیم دولت کو اہمیت دی جائے اور سرمایہ داروں کے نمائندے یہ چاہتے تھے کہ تجارت اور صنعت میں آزادی باقی رہے اور جہاں تک ممکن ہو نفعے کے اصول کو قائم رکھا جائے اور زیادہ زور پیدائش دولت پر دیا جائے۔ ایک اور معاملے میں بھی دو مختلف رائیں تھیں۔ لوگ چاہتے تھے کہ بھاری صنعتوں میں تیزی سے ترقی ہو۔ بعض کا خیال تھا کہ دیہاتی اور گھریلو صنعتوں کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسے لوگوں کی کھپت ہو سکے جو بے کار ہیں یا جن کے پاس کام کی کمی ہے۔ نقطۂ نظر کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے نتیجوں میں بھی اختلاف کا ہونا لازمی تھا۔ خیالات کے مختلف ہونے میں کوئی ہرج نہ تھا، بشرطیکہ جتنا مواد موجود تھا اُسے ایک جگہ جمع کرکے مرتب کر لیا جاتا اور پھر ایک متحدہ پالیسی وضع کرکے، رایوں کے اختلافات ظاہر کر دئے جاتے۔ جب ان تجویزوں پر عمل کرنے کا وقت آتا تو اس وقت کی جمہوری حکومت ضرورت اور موقعے کے مطابق خود فیصلہ کر لیتی کہ کون سی بنیادی پالیسی پر عمل کرنا ہے۔ بالفعل ان کاموں کے لئے جو آئندہ کرنے ہیں بہت کچھ تیاری ہو جاتی اور قوم کے صوبوں اور ریاستوں کی مختلف حکومتوں کے سامنے اس ضروری مسئلے کے سارے پہلو آجاتے اور انھیں ان پر غور و فکر کا موقع مل جاتا۔

ظاہر ہے کہ بغیر کسی واضح مقصد یا اجتماعی نصب العین کے ہم کسی ایک مسئلے کے متعلق بھی غور و فکر نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ اپنے بڑے منصوبے

کے متعلق کچھ سوچا اس لئے ہم نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ ہم ہندوستان کے کل باشندوں کے لئے زندگی کا ایک معقول معیار چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا مقصد ہندوستان کے عوام کی بھیانک غریبی کو دور کرنا تھا۔ معاشیات کے ماہروں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ہندوستانیوں کی آمدنی کا اوسط کم سے کم پندرہ روپئے اور پچیس روپئے کے درمیان ہونا چاہئے۔ (یہ تخمینہ لڑائی سے پہلے کا ہے) مغربی معیار کے مقابلے میں یہ معیار بہت کم تھا۔ ہندوستان کی موجودہ آمدنی کا اوسط ۶۵ روپئے سالانہ فی کس ہے۔ جس میں امیر غریب، شہری اور دیہاتی سب شامل ہیں۔ چونکہ ہمارے ملک میں امیروں غریبوں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل ہے اور دولت صرف تھوڑے سے گنے چنے آدمیوں کے قبضے میں ہے اس لئے دیہاتیوں کی آمدنی کے اوسط کا اندازہ ۳۰ روپئے سالانہ لگایا گیا تھا۔ ان اعداد سے ہندوستان کی خوفناک غریبی اور عوام کی بدحالی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے پاس کھانے، کپڑے، مکان اور زندگی کی دوسری ضروری چیزوں کی حد سے زیادہ کمی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے اور ہر شخص کے لئے یقینی طور پر زندگی کا کم سے کم ضروری معیار قائم کرنے کے لئے قومی دولت کو بہت زیادہ بڑھانے اور پیداوار میں اضافہ کرنے کے علاوہ دولت کی منصفانہ تقسیم لازمی ہے۔ ہم نے حساب لگایا تھا کہ زندگی کا یہ مجوزہ معیار پیدا کرنے کے لئے قومی دولت میں ۵۰۰ یا ۶۰۰ فی صدی اضافہ کرنا ہوگا ایک دم سے اتنی ترقی ہمارے لئے ممکن نہیں تھی اور اس لئے ہم نے سوچا تھا کہ دس برس کے اندر اس دولت کو ۲۰۰ سے لے کر ۳۰۰ فی صدی تک بڑھا لیا جائے۔

پورے منصوبے کے لئے ہم نے دس برس کی مدت مقرر کی اور معاشی

زندگی کے مختلف دوروں اور مختلف حلقوں کے لئے ہم نے کچھ اعداد مقرر کرئے جو عملی حیثیت سے ہر وقت سامنے رکھے جا سکیں۔ ترقی کے جانچنے کے لئے بھی بعض طریقے تجویز کئے گئے مثلاً

۱ ۔ غذا کو بہتر بنانا ۔ بالغ کام کرنے والے کے لئے ایسی متوازن غذا جس میں ۲۴۰۰ سے لے کر ۲۸۰۰ تک حرارت کی اکائیاں موجود ہوں۔

۲ ۔ لباس میں ۱۵ گز فی کس سالانہ کے بجائے ۳۰ گز سالانہ فی کس کا استعمال

۳ ۔ مکان کم سے کم ۱۰۰ مربع فٹ فی کس۔

اس کے علاوہ جو چیزیں ضروری سمجھی گئیں وہ یہ تھیں !

(i) زراعتی پیداوار میں اضافہ۔

(ii) صنعتی پیداوار میں اضافہ۔

(iii) بے روزگاری کی کمی۔

(iv) فی کس آمدنی میں اضافہ۔

(v) جہالت کا خاتمہ۔

(vi) رفاہ عام کے شعبوں کی ترقی۔

(vii) فی ہزار ایک کے حساب سے طبی امداد کی فراہمی کا انتظام۔

(viii) زندگی کے متوقع معیار میں اضافہ

ہمارا مقصد تھا کہ ملک مجموعی حیثیت سے، جہاں تک ممکن ہو سکے، اپنی ضرورتیں خود پوری کرنے کے قابل ہو جائے۔ ہم بین الاقوامی تجارت کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اقتصادی سامراج کے بھنور میں پھنسنے سے ضرور بچنا چاہتے تھے۔ نہ ہمیں سامراجی قوت کا شکار رہنا پسند تھا اور نہ ہم خود اپنے میں سامراجی رجحانات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ملکی پیداوار میں [illegible]

اتنی تبدیلی ضرور ہو جائے کہ ہم اپنی غذا، کچے مال اور بنے ہوئے مال کی ضرورتوں
کو خود پورا کر سکیں۔ فالتو پیداوار بلا ضرورت باہر نہ بھیجی جائے بلکہ اُسے اُن چیزوں
کے مبادلے میں دیا جائے جن کی ہمیں ضرورت ہے۔ بیرونی منڈیوں کے بھروسے
پر اپنے قومی اقتصادی نظام کی بنیاد رکھنے میں دوسری قوموں سے تصادم کا
اندیشہ ہونے کے علاوہ ایک ڈر یہ ہے کہ اگر یہ منڈیاں ہمارے لئے بند ہو جائیں
تو ہمارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ گو ہم نے اپنے کام کی ابتدا کسی واضح اجتماعی نظریے کے ماتحت
نہیں کی تھی، لیکن ہمارے اجتماعی مقاصد بالکل صاف اور واضح تھے اور منصوبہ بندی
کے لئے ایک مشترک بنیاد بن سکتے تھے۔ اس سارے منصوبے کی بنیاد تنظیم اور
تعاون پر تھی۔ اور اس لئے صنعت میں آزاد مقابلے کو بالکل ختم تو نہیں کیا گیا۔
لیکن اس کا دائرہ بہت محدود کر دیا گیا۔ بچاؤ کی صنعتوں کے متعلق یہ فیصلہ ہوا
کہ اُن پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہئے۔ دوسری بنیادی صنعتوں کے متعلق اکثریت
کی رائے یہ تھی کہ وہ بھی حکومت کی ملکیت ہوں لیکن خاصی بڑی اقلیت کی
رائے یہ تھی کہ ان صنعتوں پر صرف حکومت کی نگرانی کافی ہے۔ لیکن نگرانی خاصی
سخت ہونی چاہئے۔ ضروریات عامہ (وسائل آمد و رفت وغیرہ) کے متعلق بھی یہ
فیصلہ کیا گیا کہ انہیں بھی حکومت کے کسی شعبے کی ملکیت ہونا چاہئے خواہ وہ
مرکزی حکومت خود ہو، یا صوبائی حکومت یا مقامی بورڈ۔ بعض لوگوں نے یہ مشورہ
دیا کہ لندن ٹرانسپورٹ بورڈ کی قسم کی کوئی چیز ان کی نگرانی کرے۔ دوسری ضروری
اور اہم صنعتوں کے متعلق کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں کیا گیا، لیکن یہ بات صاف
کر دی گئی کہ منصوبہ بندی بجائے خود ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی نہ کسی قسم
کی نگرانی ضروری ہے اور یہ مختلف صنعتوں میں حسب ضرورت کم و بیش ہو گی؛

چاہیئے۔ جو صنعتیں حکومت کی ملکیت میں ہوں گی ان کے متعلق یہ رائے دی گئی کہ ان کے انتظام کے لئے کوئی خود مختار پبلک ٹرسٹ موزوں ہوگا۔ اس طرح کے ٹرسٹ سے دو فائدے ہوں گے۔ اوّل تو یہ عوام کی ملکیت اور نگرانی میں ہوگا دوسرے اس کے قیام سے ان دقتوں اور بدعنوانیوں کا امکان بھی باقی نہیں رہے گا جو عام طور پر بلا واسطہ جمہوری نگرانی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

کسی قسم کی منصوبہ بندی کے لئے ضروری ہے کہ صنعت کے ہر شعبے اور ہر پہلو کی نشو و نما پر گہری نظر رکھی جائے اور وقتاً فوقتاً اس کی ترقی کا جائزہ لیا جائے۔ اس کام کے لئے ماہرین کی تربیت کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ صنعت کے پھیلاؤ میں مدد دے سکیں۔ اس سلسلے میں حکومت صنعتی اداروں سے اس طرح کے ماہروں کی تربیت کا کام لے سکتی ہے۔

زمین کی پالیسی کے متعلق کچھ عام اصول مقرر کر لئے گئے " زراعتی زمین دھاتوں کی کانیں، پتھر کی کانیں، دریا اور جنگل سب قومی دولت کی قسمیں ہیں اور یہ مجموعی طور پر ہندوستان کے رہنے والوں کی ملکیت ہونی چاہئیں"۔ زمین کے معاملے میں امداد باہمی کے اصول پر عمل ہونا چاہیئے اور رفتہ رفتہ زراعت کو اجتماعی اور امداد باہمی کے طریقوں پر لانا چاہیئے۔ چھوٹی چھوٹی زمینوں پر کسان کاشت کر سکتے ہیں لیکن اُن کے اور حکومت کے بیچ میں تعلقدار اور زمیندار وغیرہ کا ہونا بالکل ضروری نہیں۔ تعلقداروں اور زمینداروں کے پاس زمینوں کا جو دوامی پٹہ ہے اُسے رفتہ رفتہ حکومت کو خرید لینا چاہیئے۔ حکومت کو ایسی خالی پڑی ہوئی زمینوں پر جہاں کاشت ہو سکتی ہے فوراً بڑے پیمانے پر کاشت شروع کر دینی چاہیئے۔ امداد باہمی کے اصول پر جو زراعت

کی جائے وہ انفرادی ملکیت اور اجتماعی ملکیت دونوں صورتوں میں ہوسکتی ہے مختصر یہ کہ مختلف طریقوں کے لئے گنجایش رکھی گئی تاکہ تجربے کے بعد جو طریقہ زیادہ مناسب اور موزوں ہو اُسے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ رواج دیا جائے۔

ہمیں یا کم سے کم ہم میں سے بعض کو یہ اُمید تھی کہ قرضے کا کوئی اشتراکی نظام قائم کیا جاسکے گا۔ اگر بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی نہ بھی بنایا جائے تو انھیں کم سے کم حکومت کی نگرانی میں ضرور رہنا چاہئے تاکہ سرمائے اور قرضے پر حکومت کا اختیار رہے۔ برآمد اور درآمد تجارت کی نگرانی بھی کی جائے تو مناسب ہے۔ ان مختلف طریقوں سے زمین پر اور مجموعی حیثیت سے صنعت میں حکومت کا خاصا دخل اور نگرانی رہے گی اور اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور شخصی کوششوں کے لئے بھی ایک محدود دائرے میں گنجایش باقی رہے گی

اس طرح خاص خاص مسائل پر غور و فکر کرتے کرتے رفتہ رفتہ ہم نے اپنے اجتماعی مقاصد اور پالیسی کا تعین کر لیا۔ اس میں بہت سی چیزیں رہ گئی تھیں بعض جگہ ابہام بلکہ تناقض بھی تھا غرض اس اسکیم کو کسی طرح بھی مکمل نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ کمیٹی میں اتنے مختلف الخیال لوگوں کے جمع ہونے کے باوجود مجموعی حیثیت سے ہم متفقہ طور پر ایک ہی نتیجوں پر پہنچے تاجروں اور کارخانہ داروں کا گروہ ہماری کمیٹی میں سب سے بڑا گروہ تھا۔ اور بہت سے معاملات میں، خاص کر اقتصادی اور تجارتی مسئلوں میں اُنکا نقطۂ نظر یقینی طور پر قدامت پسندی کی طرف مائل تھا۔ لیکن تیزی سے ترقی کرنے کی خواہش، اور یہ یقین کہ صرف اسی طرح ہم اپنی غریبی اور بے روزگاری کے مسئلوں کو حل کرسکتے ہیں لوگوں

کے دلوں میں اتنا زبردست تھا کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے مخصوص اور محدود دائرہ فکر سے باہر نکل کر نئے انداز میں سوچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہم نے مسئلوں پر نظری حیثیت سے بحث کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ بلکہ ہر بڑے مسئلے کو ایک وسیع عملی نقطۂ نظر سے دیکھا تھا اور اس طریقے سے ہم خود بخود صحیح راہوں پر پڑ گئے تھے پلیننگ کمیٹی کے ممبروں میں آپس میں تعاون کا جو جذبہ تھا اُسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی، اس لئے کہ یہ فضا سیاست کی پرآشوب اور ہنگامہ خیز فضا سے بالکل مختلف تھی۔ ہمیں اپنے باہمی اختلافات کا علم تھا۔ پھر بھی ہم ہر بات پر ہر نقطۂ نظر سے بحث مباحثہ کرتے تھے اور عموماً ایک متفقہ فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

صرف کمیٹی ہی میں نہیں، بلکہ سارے ہندوستان میں لوگوں کی رائے اور خیال میں اتنا زیادہ اختلاف تھا کہ ہم منصوبہ بندی میں مکمل طور پر اشتراکی نقطۂ نظر اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، مجھے یہ نظر آ رہا تھا کہ ہماری منصوبہ بندی ہمیں لازمی طور پر اشتراکی نظام کے بعض بنیادی اصولوں کی طرف لے جا رہی ہے یعنی سوسائٹی میں اکتسابِ زر کے عنصر کو کم کرنا، اور مختلف رکاوٹوں کو دور کر کے اجتماعی ترقی کا راستہ صاف کر دینا۔ ہماری منصوبہ بندی کی بنیاد عوام کے مفاد پر تھی۔ ہم ان کی زندگی کا معیار بڑھانا چاہتے تھے، انھیں ترقی اور نشوونما کے موقعے دینا چاہتے تھے تاکہ جو صلاحیتیں ان میں مفقود ہیں انھیں اُبھرنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملے۔ اور یہ سب کچھ ہمیں جمہوری آزادی کے دائرے میں اس طرح سے کرنا تھا کہ اشتراکیت کی مخالف جماعتوں میں سے کم سے کم بعض ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ میرا خیال تھا کہ اگر اس طرح کا اشتراک اور

تعاون حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنی منصوبہ بندی کا معیار کسی حد تک کم بھی کر دینا پڑے تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ غالباً میں نے بہت زیادہ امیدیں باندھ لی تھیں لیکن میرا خیال تھا کہ اگر ہم نے صحیح راستے کی طرف کوئی بڑا قدم اٹھایا تو تبدیلیں بجائے خود جو زبردست قوت محرکہ ہوتی ہے وہ آئندہ ترقی اور ردوبدل کو زیادہ آسان بنا دے گی۔ اگر تصادم ناگزیر ہے تو ہمیں اس کا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا لیکن اگر اس کو دور کیا جا سکے یا کم کیا جا سکے تو ظاہر ہے کہ بڑے فائدے کی بات ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ سیاست کے میدان میں پہلے ہی سخت تصادم اور کشمکش موجود ہے اور اندیشہ ہے کہ آگے چل کر ملک میں بدامنی اور انتشار پیدا ہوگا۔ متفقہ رائے بڑی قابل قدر چیز تھی۔ بلند تصورات کی بنیاد پر منصوبے بنا لینا بہت آسان تھا لیکن ان منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے سے پہلے رائے عامہ کی تائید ذرا مشکل کام تھا۔

منصوبہ بندی کے لئے جس ضبط اور تنظیم کی ضرورت ہے اس میں شخصی آزادی پر کسی نہ کسی حد تک پابندیوں کا عائد ہونا لازمی ہے لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں منصوبہ بندی سے آزادی کو بہت فروغ ہو سکتا ہے۔ ہمارے لئے آزادی کے کھونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ہمیں تو آزادی حاصل کرنی ہے۔ اس لئے اگر ہم سلطنت کے جمہوری نظام کی پابندی کریں اور اسی معیشت کو امداد باہمی کے اصولوں پر نشوونما پانے کا موقع دیں تو ان بہت سے خطروں سے بچ سکتے ہیں جو قوت کے معدودے چند آدمیوں کے ہاتھ میں آجانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

کمیٹی کے ابتدائی اجلاسوں میں ہم نے سوالوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست بنائی تھی یہ سوال صوبوں اور ریاستوں کی حکومتوں، عمومی انجمنوں، یونیورسٹیوں

ایوان ہائے تجارت ٹریڈ یونینوں اور تحقیقی اداروں کو بھیجے گئے تھے۔ مختلف مسائل کی جانچ پڑتال کر کے ان پر رپوٹیں مرتب کرنے کے لئے ۲۹ سب کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ اِن میں سے آٹھ سب کمیٹیاں زراعتی معاملات کے لئے تھیں، کچھ صنعت وحرفت کے لئے پانچ تجارت اور مالیات کے لئے دو وسائل آمدورفت کے لئے دو فلاح عامہ کے کاموں کے لئے، دو ولادت اور امراض وغیرہ کے اعداد وشمار کے لئے، اور ایک ہندوستانی اجتماعی زندگی کی تنظیم میں عورتوں کی حیثیت کے تعین کے لئے ان سب کمیٹیوں کے ۳۵۰ ممبر تھے۔ مگران میں سے بعض ایک سے زیادہ کمیٹیوں میں کام کر رہے تھے۔ ان ممبروں میں سے اکثر اپنے اپنے کاموں کے ماہر تھے۔ تاجر، حکومتوں، ریاستوں اور میونسپلٹیوں کے عہدہ دار، یونیورسٹی کے پروفیسر اور لکچرر، ماہرین صنعت، سائنس داں، ٹریڈ یونینوں کے ممبر اور سیاسی کارکن غرض ملک کے مختلف حصوں میں جتنے قابل آدمی تھے ان میں سے اکثر کو ہم نے اکٹھا کر لیا تھا۔ صرف چند لوگ ایسے تھے، جنھیں ان کی خواہش کے باوجود سرکار سے ان کمیٹیوں میں کام کرنے کی اجازت نہیں ملی، یعنی گورنمنٹ آف انڈیا کے افسر اور عہدہ دار پھر بھی اتنے مختلف قسم کے لوگوں کا ہمارے کاموں میں شریک ہونا بہت سی حیثیتوں سے مفید ثابت ہوا۔ ہمیں اُن کی مہارت تجربے اور علم سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور وہ اپنے اپنے موضوع پر ایک وسیع نقطہ نظر کی روشنی میں غور کرنے لگے۔ اس کے علاوہ سارے ملک میں منصوبہ بندی سے ایک عام دلچسپی پیدا ہو گئی۔ لیکن اتنے زیادہ ممبر ہونے کی وجہ سے ایک حد تک نقصان بھی پہنچا۔ اس لئے کہ جب ہندوستان کے مختلف حصوں سے اس قدر مصروف آدمیوں کو بار بار جمع کرنا ہو تو کام میں دیر لگنی لازمی تھی۔

قومی زندگی کے مختلف شعبوں کے نمائندوں میں اتنی لیاقت اور اتنا

خلوص دیکھ کر مجھے حد سے زیادہ مسرت ہوئی اور ان مختلف قسم کے قابل اور مخلص لوگوں کی ملاقات سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ہمارے کام کا طریقہ یہ تھا کہ ہر سب کمیٹی اپنی عارضی رپورٹ مرتب کرے اور اسے پلیننگ کمیٹی کے پاس بھیج دے۔ پلیننگ کمیٹی یا تو تجاویز منظور کر لیتی یا اس کے بعض حصوں سے اختلاف کر کے اس پر اپنی رائے لکھ دیتی اور اسے سب کمیٹی کے پاس واپس بھیج دیتی۔ اس کے بعد سب کمیٹی اپنی مکمل رپورٹ تیار کرتی اور اس کی بنیاد پر ہم اس خاص مسئلے کے متعلق کسی فیصلے پر پہنچتے۔ ہماری کوشش برابر یہ ہوتی تھی کہ مختلف مسئلوں کے متعلق جو فیصلے کئے جائیں ان میں کسی حد تک ہم آہنگی ہو۔ اس طرح مختلف سب کمیٹیوں کی رپورٹیں مرتب ہو جانے کے بعد پلیننگ کمیٹی کا یہ کام تھا کہ وہ منصوبہ بندی کے پورے مسئلے پر مجموعی حیثیت سے غور کرے اور اس کی ساری پیچیدگیوں کو نظر میں رکھ کر ایک جامع رپورٹ مرتب کرے اور سب کمیٹی کی مختلف رپورٹوں کو اپنی رپورٹ کے ساتھ ضمیمے کے طور پر شامل کر دے۔ دراصل سب کمیٹیوں کی رپورٹوں پر غور کرنے کے دوران میں منصوبہ بندی کی مکمل رپورٹ آہستہ آہستہ مرتب ہوتی جاتی تھی۔

بعض اوقات کاموں میں اتنی دیر لگ جاتی تھی کہ ہم جھنجھلا اٹھتے تھے دیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ سب کمیٹیاں مقررہ پروگرام اور وقت کے مطابق کام کو پورا نہیں کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر ہم نے بہت سا کام کر لیا تھا۔ تعلیم کے سلسلے میں ہم نے دو دلچسپ فیصلے کئے تھے۔ ایک یہ کہ تعلیم کی ہر منزل پر لڑکوں اور لڑکیوں کی جسمانی صحت کے جانچنے کے لئے معینہ معیار ہوں۔ دوسرے یہ کہ لازمی سماجی خدمت کا ایک نظام قائم کیا جائے جس کے مطابق ۱۸ سال اور ۲۲ سال کی عمر کے درمیان ہر نوجوان مرد اور عورت

فلاح عامہ کے کسی کام میں حصہ ہے مثلاً زراعت، صنعت وغیرہ جسمانی یا دماغی معذوری کے علاوہ اور کسی وجہ سے کسی شخص کو اس خدمت سے مستثنیٰ نہ کیا جائے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ نیشنل پلیننگ کمیٹی اپنا کام بند کر دے۔ نومبر کے مہینے میں صوبے کی کانگریسی حکومتوں نے استعفیٰ دے دیا اور اس طرح ہمارے کام میں اور بھی دقتیں پیدا ہو گئیں اس لئے کہ صوبوں میں گورنروں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد انھیں ہمارے کام سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ سب کاروباری آدمی جنگی ضروریات کے ٹھیکوں سے روپیہ کمانے میں اس قدر مصروف تھے کہ انھیں منصوبہ بندی کے کام کرنے کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ صورت حال روز بروز بدل رہی تھی پھر بھی ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کام کو برابر جاری رکھیں، اس لئے کہ لڑائی کے حالات نے اب اسے پہلے سے بھی زیادہ ضروری اور اہم بنا دیا تھا۔ یہ یقینی بات تھی کہ لڑائی سے صنعت میں اور زیادہ ترقی ہوگی۔ اس لئے جو کام ہم نے اب تک کیا تھا اور اب کر رہے تھے، وہ اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوتا۔ اس زمانے میں ہمارے اُن سب کمیٹیوں کی رپورٹ تھی جنھوں نے انجنیری کی صنعتوں، آمد و رفت کے وسائل، کیمیاوی صنعتوں اور بعض دوسری صنعتوں کے بارے میں جانچ پڑتال کی تھی۔ یہ ساری چیزیں لڑائی کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھیں۔ لیکن حکومت کو ہمارے کام سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی، اور وہ اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی تھی۔ لڑائی کے ابتدائی مہینوں میں، جنھیں عام طور پر جنگ زرگری کا دور کہا جاتا ہے، حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانی صنعتوں کو ابھرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ آگے چل کر واقعات کے

کے رخ نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ اپنی ضرورت کی بہت سی چیزیں ہندوستان سے خریدے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستان میں بھاری صنعتیں شروع کرنے کے مخالف تھے۔ اور اس مخالفت کے معنی یہ تھے کہ کسی طرح بھی ہندوستان میں بھاری صنعتوں کا قائم کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے کہ حکومت کی اجازت کے بغیر مشینیں دوسرے ملکوں سے یہاں بالکل نہیں لائی جا سکتی تھیں۔

لیکن ان حالات میں بھی پلیننگ کمیٹی نے اپنا کام جاری رکھا اور سب کمیٹیوں کی تقریباً ساری رپورٹوں پر غور کر لیا۔ اب تھوڑا سا بچا ہوا کام ختم کر لینے کے بعد صرف منصوبہ بندی کی جامع رپورٹ مرتب کرنا باقی رہ گیا تھا۔ عین اسی موقع پر، اکتوبر ۱۹۴۰ء میں حکومت نے مجھے گرفتار کر کے ایک لمبی مدت کے لئے قید کر دیا۔ پلیننگ کمیٹی اور سب کمیٹیوں کے اور بھی بہت سے ممبر گرفتار ہوئے اور انھیں سزا ہو گئی۔ میری خواہش تھی کہ کمیٹی اب بھی اپنا کام کرتی رہے اس لئے میں نے اپنے اُن ساتھیوں سے جو جیل سے باہر تھے اس کام کو جاری رکھنے کی درخواست کی۔ لیکن میری عدم موجودگی میں وہ کمیٹی میں کام کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ اس کے بعد میں نے کوشش کی کہ پلیننگ کمیٹی کے سارے کاغذات اور مختلف رپورٹیں مجھے جیل میں مل جائیں تاکہ میں اُن کا مطالعہ کر کے رپورٹ کا مسودہ تیار کر لوں۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس بات کی بھی اجازت نہ دی۔ نہ کاغذات میرے پاس پہنچ سکے اور نہ اس سلسلے میں لوگوں سے ملاقاتیں کرنے کی اجازت دی گئی۔

غرض میرے جیل جانے سے نیشنل پلیننگ کمیٹی کا خاتمہ ہو گیا۔ جو کام ہم نے اب تک کیا تھا وہ گو پوری طرح مکمل نہیں ہوا تھا لیکن لڑائی کے زمانے

میں اُس سے خاصا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، مگر وہ ہمارے دفتر کی درازوں میں بند پڑا رہا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں مجھے رہا کر دیا گیا اور میں چند مہینے جیل کے باہر رہا لیکن دوسروں کی طرح میرے لئے بھی یہ زمانہ بڑے اضطراب اور ہیجان کا تھا۔ حالات نے نئے نئے رُخ اختیار کر لئے تھے۔ بحرالکاہل میں لڑائی ہو رہی تھی، ہندوستان کو بھی حملے کا خطرہ تھا، اور اس لئے جب تک سیاسی فضا صاف نہ ہوتی، ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑ کر پلیننگ کمیٹی کے ادھورے کام کو پورا کرنا ممکن نہ تھا — اور تھوڑے عرصے کے بعد مجھے پھر جیل بھیج دیا گیا۔

(۰) کانگریس اور صنعتیں

بڑی صنعتیں اور دیہی صنعتیں

کانگریس نے، گاندھی جی کی قیادت میں، مدتوں سے دیہی صنعتوں کو نئے سرے سے زندہ کرنے کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا خصوصاً ہاتھ کی کتائی اور بنائی پر بہت زور دیا تھا۔ لیکن وہ بڑی صنعتوں کی ترقی کی مخالف کبھی بھی نہیں رہی۔ اور جب بھی اُسے موقع ملا، اسمبلیوں میں یا اسمبلیوں کے باہر، اُس نے برابر ان کی ترقی پر زور دیا۔ صوبوں کی کانگریسی حکومتیں بھی برابر یہی کوشش کرتی رہیں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان جب ٹاٹا اسٹیل اینڈ آئرن ورکس پر ایک نازک وقت آیا تو مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے زور دینے ہی پر حکومت نے اسے مدد دی اور یہ کارخانہ اس نازک دور سے گذرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہندوستان میں جہاز سازی اور جہاز رانی کا مسئلہ قومی خیال کے لوگوں اور حکومت کے درمیان ہمیشہ سے جھگڑے اور اختلاف کی جڑ رہا ہے۔ کانگریس اور اس کے

علاوہ دوسری جماعتیں ہمیشہ اس بات کے خواہش مند رہی ہیں کہ ہندوستانی جہاز رانی کو ہر ممکن مدد پہنچائی جائے۔ اور دوسری طرف حکومت کو یہ فکر تھی کہ وہ جہاز کی بڑی بڑی برطانوی کمپنیوں کے مفاد کی حفاظت کرے۔ اس لئے ہندوستانی جہاز رانی کو حکومت کی مخالفت کی وجہ سے کبھی اُبھرنے کا موقع نہ ملا، حالانکہ اُس کے لئے نہ سرمائے کی کمی تھی اور نہ صنعتی اور انتظامی ماہروں کی۔ اور صرف جہاز رانی ہی پر موقوف نہیں جہاں جس معاملے میں بھی برطانیہ کے صنعتی، تجارتی یا اقتصادی مفاد کا سوال پیدا ہوا، حکومت کا رویہ ہمیشہ یہی رہا انگلستان کی مشہور بڑی کمپنی امپیریل کیمیکل انڈسٹریز کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی رعایتیں برتی گئیں جس سے ہندوستانی صنعت کو بہت نقصان پہنچا۔ چند سال ہوئے پنجاب کی معدنیات سے فائدہ اٹھانے کے لئے، اُسے ایک لمبی مدت کا پٹہ دیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس پٹے کے شرائط ظاہر نہیں کئے گئے تھے۔ غالبًا اس میں بھی 'پبلک کا کوئی مفاد' مدِ نظر ہو گا۔

صوبوں کی کانگریسی حکومتوں کی خواہش تھی کہ ملک میں پاور الکوہل کی صنعت قائم کریں۔ یہ بات مختلف پہلوؤں سے مفید اور ضروری تھی لیکن یو۔پی اور بہار میں اس کے قائم کرنے کا ایک خاص مقصد اور بھی تھا۔ ان صوبوں میں کثرت سے شکر کے کارخانے تھے اور شکر سازی کے سلسلے میں یہاں شیرے کی ایک بہت بڑی مقدار لازمی طور پر پیدا ہوتی تھی اور وہ کسی مفید کام میں نہیں لایا جاتا تھا۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ اس سے پاور الکوہل بنانے کا کام لیا جائے۔ اس کا طریقہ بے حد آسان تھا۔ اور اس میں کسی طرح کی دقت نہیں تھی، بجز اس کے کہ شیل اور برما آئل کمپنی کے مفاد پر اس کا اثر پڑتا تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے ان دونوں کے مفاد کی حمایت کی اور طاقت کے ذریعے بنانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لڑائی کے تیسرے سال میں جب برما انگریزوں کے ہاتھ سے چلا گیا اور تیل اور پٹرول کی درآمد بند ہوگئی تو حکومت کو خیال پیدا ہوا کہ پاور الکوہل ضروری چیز ہے اور اسے ہندوستان میں پیدا کرنا چاہیے۔ امریکن گریڈی کمپنی نے بھی ۱۹۴۲ء میں اس بات پر بہت زور دیا۔

مختصر یہ کہ کانگریس ہمیشہ سے ہندوستان میں بڑی صنعتوں کو شروع کرنے کی حامی رہی ہے۔ ساتھ ساتھ اس نے ہمیشہ گھریلو صنعتوں کی ترقی پر بھی زور دیا ہے، اور اس سلسلے میں عملی قدم اٹھایا ہے۔ کیا یہ دونوں نقطۂ نظر باہم متضاد ہیں؟ ممکن ہے اس لحاظ سے فرق ہو کہ ایک میں ایک پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور دوسرے میں دوسرے پہلو پر۔ لوگوں نے اب کچھ ایسے اجتماعی اور معاشی عناصر پر غور کرنا شروع کر دیا ہے جنھیں اس سے پہلے ہندوستان میں بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ جن ہندوستانی کارخانوں کے مالکوں سیاست دانوں نے بڑی صنعتوں کی حمایت کی اُن کے پیش نظر انیسویں صدی کے یورپ کی صنعتی ترقی تھی۔ اُن کی نظر اُن بہت سے برے نتائج کی طرف بالکل نہیں گئی جو بیسویں صدی میں اس سرمایہ دارانہ صنعتی نظام سے پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں جہاں زندگی کی ترقی اور نشو و نما تقریباً ایک صدی تک بالکل مسدود رہی، اندیشہ تھا کہ یہ نتائج اور زیادہ شدید ہوں گے اس لئے کہ اوسط درجے کی جو صنعتیں ہندوستان میں موجودہ معاشی نظام کے ماتحت شروع کی گئیں ان کی وجہ سے مزدوروں کی زیادہ کھپت ہونے کے بجائے بے روزگاری میں اضافہ ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف سرمایہ اکٹھا ہوتا رہا اور دوسری طرف

غریبی اور بے روزگاری بڑھتی رہی۔ اگر معاشی نظام اس سے مختلف ہوتا اور بڑی صنعتوں پر زیادہ زور دے کر انھیں منظم طریقے سے بڑھانے کی طرف توجہ کی جاتی تو ممکن تھا کہ یہ صورتِ حال نہ پیدا ہوتی۔

لوگوں کی اس بڑھتی ہوئی غریبی نے گاندھی جی کو بے حد متاثر کیا۔ میرے خیال میں، یہ صحیح ہے کہ زندگی کے متعلق گاندھی جی کا نقطۂ نظر سے مختلف ہے اُنھیں زندگی کے اُس بلند معیار اور عیش و عشرت کے فروغ سے ذرا بھی دلچسپی نہیں جس کے لئے روحانی اور اخلاقی قدروں کی قربانی دینی پڑے۔ اُنھیں راحت و آرام کی زندگی پسند نہیں۔ ان کے نزدیک کٹھن راستہ ہی اصل میں سیدھا راستہ ہے؛ اور عیش و عشرت کی محبت انسان کو گمراہ کر کے اسے نیکیوں سے محروم کر دیتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ چیز انھیں دکھ پہنچاتی ہے کہ غریبوں اور امیروں کے درمیان اتنی گہری خلیج ہے زندگی کے معیار اور ترقی کے مواقع کے لحاظ سے اتنا زبردست فرق ہے۔ ذاتی طور پر اپنے نفس کو تسکین دینے کے لئے وہ اس خلیج کو پار کر کے غریبوں کی طرف چلے گئے۔ اور صرف اتنی سی ترمیم کے ساتھ جو غریبوں کے لئے بھی آسانی سے ممکن ہے، انھوں نے اُن کے رہن سہن، ان کے لباس کو بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کی برہنگی کو اختیار کر لیا۔ معدودے چند امیروں اور افلاس کے بوجھ میں دبے ہوئے عوام کے درمیان یہ بڑا فرق ان کے نزدیک دو خاص وجہوں سے پیدا ہوا — اول تو غیر ملکی حکومت اور اس کے ساتھ معاشی استحصال۔ دوسرے مغرب کی سرمایہ دارانہ صنعتی تہذیب جو مشین کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ وہ ان دونوں چیزوں کے سخت مخالف تھے۔ اور حسرت کے ساتھ ان گذرے ہوئے دنوں کا تصور کرتے تھے جب گاؤں کی حیثیت کم و بیش ایک خود کفیل معاشرے کی سی تھی — جہاں

پیداوار، تقسیم اور خرچ میں خود بخود ایک توازن قائم تھا۔ جہاں سیاسی یا اقتصادی قوت سب پر منقسم تھی اور اس پر کسی ایک شخص کا قبضہ نہیں تھا، جہاں ایک سیدھی سادی جمہوریت کا راج تھا، جہاں امیر اور غریب کے درمیان اتنی گہری خلیج نہ تھی، جہاں بڑے بڑے شہروں کی خرابیوں کا وجود نہ تھا اور لوگ حیات آفریں زمین کے آغوش میں رہتے تھے اور کھلے میدانوں کی تازہ ہوا میں سانس لیتے تھے

گاندھی جی کے اور دوسرے لوگوں کے نظریہ زندگی میں یہ بنیادی فرق تھا۔ ان کی تقریر و تحریر اور ان کا عمل اسی فرق کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ زبان میں جو اکثر نہایت واضح اور پر زور ہوتی تھی یہ تاثیر ہندوستان کی اور دوسرے ملکوں کی قدیم مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کے مطالعے سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کا قول تھا کہ اخلاقی قدروں کو ہمیشہ برتری حاصل ہونی چاہیے، اچھے مقاصد کے حصول کے لئے ناسزا وار ذرائع اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں ورنہ فرد اور قوم دونوں فنا ہو جائیں گے۔

پھر بھی گاندھی جی محض خیال پرست نہ تھے جو اپنی تخیل کی دنیا میں محو ہو کر، زندگی سے اور اس کے مسائل سے بے خبر رہتے ہوں۔ وہ گجرات کے رہنے والے تھے، جو معاملہ فہم کاروباری آدمیوں کا دیس ہے۔ اور انھیں ہندوستانی دیہاتوں کی حالت کا اتنا علم تھا جتنا کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ اسی ذاتی تجربے کی بنا پر انھوں نے چرخے اور گھریلو دستکاریوں کا یہ پروگرام مرتب کیا تھا۔ اگر بے شمار بے روزگاروں اور کم روزگاروں کی فوری مدد کرنی ضروری تھی، اگر ہندوستان سے اس گھن کو نکالنا تھا جو سارے دیس کو کھائے جا رہا تھا، اگر دیہاتیوں کے معیار زندگی کو تھوڑا سا اونچا کرنا تھا، اگر انھیں اپاہجوں کی طرح دوسروں کا محتاج

رہنے کے بجائے خود اعتمادی سے کام لینے کی تعلیم دیتی تھی اور یہ سب کچھ بہت سے پیسے کی مدد کے بغیر کرنا تھا، تو اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں تھا جو گاندھی جی نے سوچا تھا۔ ان خرابیوں سے جو بدیسی حکومت اور معاشی استحصال کا لازمی نتیجہ ہیں اور اس غلامی سے جو اصلاح کی کسی بڑی اسکیم کو نافذ کرنے میں حائل ہوتی ہے قطع نظر کرکے ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ سرمائے کی کمی اور کام کرنے والوں کی کثرت ہے۔ اس لئے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اس بیکار جانے والی قوت کو جو کچھ پیدا نہیں کر رہی تھی، کس طرح کام میں لایا جائے۔ لوگ حماقت سے انسانی قوت اور مشینی قوت کا مقابلہ کرنے لگتے ہیں۔ بے شک مشین ایک ہزار یا دس ہزار آدمیوں کے برابر کام کر سکتی ہے لیکن اگر یہ دس ہزار آدمی بیکار بیٹھے رہیں یا فاقے کی زندگی بسر کریں تو مشین کے استعمال سے سماج کا نفع نہیں نقصان ہے جب تک کہ آنے والا زمانہ سماجی حالات میں تبدیلی نہ کر دے اگر بڑی مشین موجود نہ ہو تو مقابلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انسانی قوت کو پیداوار کے کام میں لگانا شخصی اور قومی دونوں حیثیتوں سے نفع بخش ہے اور بڑے پیمانے پر مشینوں کا استعمال اس مقصد کے منافی نہیں بشرطیکہ مشینیں آدمی کو بے روزگار بنانے کے بجائے، اسے روزگار دے سکیں۔

اگر ہم ہندوستان کا مقابلہ مغرب کے ان چھوٹے ملکوں سے کریں جو صنعتی حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہیں یا اسے روس یا امریکا جیسے وسیع و عریض لیکن نسبتاً کم آباد ملک کے مقابلے میں پیش کریں، تو اندیشہ ہے کہ ہم غلط نتیجے پر پہنچیں گے۔ مغربی یورپ میں صنعتی ترقی کا سلسلہ تقریباً ایک صدی سے جاری ہے اور یہاں کے رہنے والوں نے اپنے آپ کو رفتہ رفتہ حالات کے مطابق

بنا لیا ہے۔ پہلے ان علاقوں کی آبادی تیزی سے بڑھی، پھر ایک خاص جگہ پر قائم ہو گئی اور اب کم ہو رہی ہے۔ امریکا اور روس میں بڑے بڑے علاقے ایسے ہیں، جن آبادی بہت تھوڑی ہے۔ اور وہاں کی زمینوں میں کاشت کرنے کے لئے ٹریکٹر ایک لازمی چیز ہے۔ لیکن گنگا کی گنجان بسی ہوئی وادی میں جب تک یہاں کے سب لوگوں کی زندگی کا سہارا صرف کاشتکاری ہے، ٹریکٹر کا استعمال بالکل غیر ضروری ہے اسی طرح کے اور بہت سے مسئلے ہیں ہندستان میں کاشتکاری ہزاروں برس سے ہو رہی ہے اور زمین میں جتنی قوت باقی تھی وہ ختم ہو چکی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ٹریکٹروں کی گہری کھدائی سے زمین میں زیادہ جان پیدا ہو جائے گی؟ جب ہندوستان میں ریلیں چلائی گئیں اور اس کام کے لئے اونچے اونچے پشتے کھڑے کئے گئے تو پانی کے قدرتی بہاؤ کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا گیا۔ ان اونچے اونچے پشتوں نے پانی کے قدرتی بہاؤ میں رکاوٹیں پیدا کیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں آئے دن طغیانیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کھیتوں کی مٹی کٹ جاتی ہے اور ملیریا پھیلتا ہے۔

میں ٹریکٹروں اور بڑی مشینوں کا زبردست حامی ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ زمین پر سے بوجھ کم کرنے کے لئے، غریبی کو مٹانے اور زندگی کے معیار کو بڑھانے کے لئے، بچاؤ کے لئے اور اس طرح کے اور بہت سے کاموں کے لئے ہندوستان میں تیزی سے بڑے پیمانے کی صنعت کو رواج دینے کی ضرورت ہے اسی کے ساتھ ساتھ میرا خیال بھی ہے کہ صنعتی ترقی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے اور اس کے بے شمار خطروں سے بچنے کے لئے ہمیں بڑی ہوشیاری سے اپنے ملک کے حالات کا لحاظ رکھ کر منصوبہ بندی کرنی ہو گی۔ اس طرح کی منصوبہ بندی ان سب ملکوں کے لئے بڑی ضروری

چیز ہے جو ترقی کی راہ میں ابھی بہت پیچھے ہیں۔ مثلاً چین اور ہندوستان جو اپنی روایات رکھتے ہیں۔

چین ہیں میں نے صنعتی امداد باہمی کی جو انجمنیں دیکھیں وہ مجھے بہت پسند آئیں اور میرا خیال ہے کہ اس طرح کی کوئی تحریک ہندوستان کے لئے بھی خاص طور پر موزوں ہو سکتی ہے۔ اس میں کئی اچھی باتیں ہیں ہیں۔ وہ ہندوستانی ماحول میں اچھی طرح کھپ جائے گی، چھوٹی صنعتیں جمہوری طرز پہ قائم ہو جائیں گی اور لوگوں میں امداد باہمی کی عادت پیدا ہو گی۔ ہم اس اسکیم کو بڑی بڑی صنعتوں کے ساتھ ساتھ چلا سکتے ہیں۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہندوستان میں بڑی صنعتیں خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلیں، یہاں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لئے پھر بھی ایک بڑا میدان خالی رہے گا۔ خود سوویٹ روس میں بھی اُن امداد باہمی کی انجمنوں نے جن میں لوگ اپنے طور پر مال تیار کرتے ہیں ملک کی صنعتی ترقی اور نشوونما میں اہم حصہ لیا ہے۔

بجلی کی قوت سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر چھوٹی صنعتوں کو خاصی ترقی دی جا سکتی ہے اور اس طرح وہ معاشی حیثیت سے بڑی صنعتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بن سکتی ہیں۔ پچھلے چند برسوں سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ صنعتوں کی مرکزیت کو ختم کر دینا چاہئے۔ یہاں تک کہ ہنری فورڈ جیسے آدمیوں نے بھی اس خیال کی حمایت کی ہے۔ بڑے بڑے صنعتی شہروں کی زندگی انسان کو زمین اور زراعت سے بالکل بے تعلق کر دیتی ہے —— سائنس داں اس نفسیاتی اور حیاتی خطرے کی طرف بھی برابر اشارے کر رہے ہیں۔ بلکہ بعض سائنس دانوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر نسل انسانی کو دُنیا میں باقی رہنا ہے تو اُسے پھر زمین اور گاؤں کی طرف واپس جانا چاہئے۔ خوش

قسمتی سے سائنس نے انسان کے لئے یہ بات ممکن بنا دی ہے کہ وہ کھیتوں سے قریب رہ کر بھی نئی تہذیب اور نئے تمدن کی برکتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

لیکن پچھلے پچیس تیس برس سے ہمارے سامنے صرف یہ مسئلہ رہا ہے کہ جو قیود غیر ملکی حکومت نے اور ان سرمایہ داروں نے جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں ہم پر عائد کر رکھی ہیں ان کے باوجود ہم ہندوستان کی غریبی کو کس طرح دور کر سکتے ہیں اور لوگوں میں خود اعتمادی پیدا کر سکتے ہیں۔ گھریلو دستکاریوں کو ترقی دینے کی موافقت میں یوں تو ہر وقت بہت سی دلیلیں دی جا سکتی ہیں، لیکن ہمارے ملک کے موجودہ حالات میں یہ اقدام یقیناً سب سے زیادہ مفید اور کارآمد تھا ممکن ہے کہ ہم نے اس سلسلے میں جو طریقے اختیار کئے وہ سب سے اچھے اور سب سے زیادہ موزوں نہ ہوں۔ ایک مسئلہ بہت بڑا اور بے حد مشکل اور پیچیدہ تھا، دوسرے ہمیں برابر حکومت کے تشدد کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہمیں اپنے تجربوں اور غلطیوں سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ میرا خیال ہے کہ امداد باہمی کے طریقے کو شروع ہی سے رواج دینا چاہئے تھا، اور صنعتی ماہروں کی مدد سے ایسی چھوٹی چھوٹی مشینیں بنوانی چاہئے تھیں۔ جو گھروں اور گاؤں میں کام دے سکیں۔ اب یہ طریقہ رفتہ رفتہ رائج کیا جا رہا ہے۔ مشہور ماہر معاشیات جی۔ ڈی۔ ایچ۔ کول نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہاتھ سے بُنے ہوئے کپڑے کی صنعت کو فروغ دینے کی تحریک جو گاندھی جی نے شروع کی ہے محض ایک رومانی کا خبط نہیں جو ماضی کو زندہ کرنا چاہتا ہے، بلکہ یہ ہندوستانی گاؤں کی غریبی کو دور کرنے اور وہاں کے معیارِ زندگی کو بڑھانے کی ایک عملی کوشش ہے۔" اس تحریک کا یہ مقصد بھی تھا مگر اس کے سوا اور بھی بہت کچھ تھا اس نے ہندوستان کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ غریب کسانوں کو بھی انسان سمجھے، وہ یہ محسوس کرے کہ شہروں کی ظاہری آب و تاب کے

پیچھے دُکھ اور غریبی کی ہولناک تاریکی ہے، یہ جان لے کہ ہندوستان کی ترقی کا اندازہ کاغذ کے ٹکڑے سے لکھی پتیوں، با خوش حال وکیلوں اور ڈائرکٹروں کی زندگی کو دیکھ کر نہیں لگایا جا سکتا۔ آزادی محض کونسلوں اور اسمبلیوں کے قیام ہی سے نہیں مل جاتی، بلکہ کسان کے معیار زندگی کو بڑھانا اصل ترقی اور آزادی ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں ایک نئی "ذات" یا طبقہ پیدا کر دیا تھا یعنی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ، جس نے اور سب سے قطع تعلق کر کے اپنی ایک علیحدہ دنیا بسائی تھی، اور اگر کبھی احتجاج بھی کرتا تھا تب بھی اس کی نظر حکومت کی طرف رہتی تھی۔ کسی حد تک اس خلیج کو بھرا اور ان لوگوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ہم وطنوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں۔

مشینوں کے استعمال کے متعلق گاندھی جی کے جو خیالات تھے، اُن میں رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا ہوئی۔ انھوں نے کہا "مجھے مشینوں کے خبط پر اعتراض ہے، مشینوں پر نہیں۔" "اگر ہمارے ہر گاؤں میں بجلی پہنچ جائے تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں کہ گاؤں والے اپنے اوزار بجلی کی مدد سے چلائیں۔" گاندھی جی کا خیال تھا کہ کم سے کم موجودہ حالات میں یہ بڑی مشینیں لازمی طور پر طاقت اور دولت کو تھوڑے سے آدمیوں تک محدود کر دیں گی۔ "میں اس بات کو بہت بڑی ناانصافی اور بڑا گناہ سمجھتا ہوں کہ مشین کو صرف اس لئے استعمال کیا جائے کہ دولت اور طاقت تھوڑے سے ہاتھوں میں آجائے۔ اور آج کل مشین کو اسی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔" آگے چل کر گاندھی جی نے بھاری صنعتوں، بڑے پیمانے کی بنیادی صنعتوں اور آسایش عامہ کے وسائل کی ضرورت کو بھی تسلیم کر لیا، بشرطیکہ یہ حکومت کی ملکیت ہوں اور ان گھریلو صنعتوں کی نشوونما میں مخل نہ ہوں جو ان کی نظر میں انتہائی اہمیت رکھتی تھیں۔ اس سلسلے میں اپنی تجویزوں کا ذکر کرتے ہوئے

وہ لکھتے ہیں کہ "یہ سارا پروگرام ایک ریت کی سی دیوار ثابت ہوگا اگر اسے معاشی مساوات کی ٹھوس بنیادوں پر قائم نہ کیا گیا"

غرض گھریلو دستکاریوں اور چھوٹی صنعتوں کے پُرجوش حامی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بڑی صنعتیں، کسی نہ کسی حد تک ضروری اور ناگزیر ہیں۔ البتہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ان کا دائرہ محدود رہے۔ اس لئے اب سوال نقطۂ نظر کے اختلاف کا نہیں، بلکہ صرف اتنا ہے کہ دونوں طریقوں اور معاشی نظاموں میں سے کس پر کتنا زور دیا جائے اور کس طرح ان دونوں میں توازن پیدا کیا جائے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے اس نئے دور میں، کوئی ملک اس وقت تک سیاسی اور معاشی حیثیت سے آزاد نہیں رہ سکتا، جب تک وہ صنعت میں انتہائی ترقی نہ کرے اور وہ ان کی طاقت کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ فروغ نہ دے۔ اسی طرح جب تک وہ زندگی کے ہر شعبے میں صنعت کے نئے طریقوں سے کام نہ لے عام افلاس کو دور کرنا یا زندگی کے معیار کو بلند کرنا اس کے لئے ناممکن ہے۔ جو ملک صنعتی حیثیت سے پس ماندہ ہو وہ ہمیشہ بین الاقوامی توازن میں خلل ڈالتا ہے، اور ترقی یافتہ قوموں کے جارحانہ رجحانات کو ابھرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس طرح کا ملک اگر اپنی سیاسی آزادی کو قائم بھی رکھ سکے تو یہ آزادی برائے نام ہوگی اور معاشی اقتدار خود بخود دوسروں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ اور اس اقتدار سے لازمی طور پر اس کی چھوٹے پیمانے کی معیشت جیسے وہ اپنے فلسفۂ زندگی کے مطابق قائم رکھنا چاہتا ہے، درہم برہم ہو جائے گی اور اس لئے اگر کسی ملک کے معاشی نظام کی بنیاد گھریلو اور چھوٹی صنعتوں پر رکھنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔ اس طرح کے نظام سے نہ ملک کے بنیادی

مسائل حل ہو سکتے ہیں نہ اس کی آزادی قائم رہ سکتی ہے اور نہ وہ بین الاقوامی نظام میں ایک ماتحت نوآبادی کے سوا اور کسی حیثیت سے کھپ سکتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کسی ملک میں وہ بالکل مختلف اور متضاد قسم کے معاشی نظام ایک ساتھ چل سکتے ہیں جن میں سے ایک کی بنیاد بڑی مشینوں اور بڑے پیمانے کی صنعت پر ہو اور دوسرے کی گھریلو صنعتوں پر ؟ یہ صورت حال بالکل غیر ممکن ہے اس لئے کہ دو نظاموں میں سے ایک کا دوسرے پر غالب آجانا یقینی ہے، اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس مقابلے میں بڑی مشینوں ہی کو کامیابی ہوگی اگر ان کی ترقی کو زبردستی روکا نہ جائے۔ اس لئے سوال صرف معیشت اور پیداوار کے ان دونوں طریقوں کی ہم آہنگی اور مطابقت بلکہ دونوں میں سے ایک کا تسلط رہے گا اور دوسرے کو اس کا ضمیمہ بن کر رہنا پڑے گا ظاہر ہے کہ تسلط اسی معیشت کا ہوگا جو علم صنعت کے جدید ترین کارناموں پر مبنی ہے۔ اگر علم صنعت بڑی مشینوں کا تقاضا کرے، جیسا کہ وہ آج کل بڑی حد تک کرتا ہے، تو ہمیں بڑی مشینوں کو ان کے سارے لوازم کے ساتھ قبول کرنا پڑے گا۔ جہاں کہیں علم صنعت کے اصول کی لامرکزیت کی اجازت دیں چھوٹی صنعتوں کو رواج دینا چاہیئے۔ بہرحال ہمیں جدید ترین صنعتی طریقوں کی پابندی کرنی ہے۔ اگر ہم نے پیداوار کے فرسودہ اور پس ماندہ طریقوں کو مستقل طور پر اختیار کر لیا ہماری ترقی اور نشو و نما رک جائے گی۔

آج جبکہ دنیا نے، اور حالات کے تقاضے نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ بڑی صنعتوں کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا تو چھوٹی اور بڑی صنعتوں کے حسن و قبح پر بحث کرنا بالکل بے کار ہے۔ خود ہندوستان میں بھی حالات کا تقاضا یہی ہے اور اس میں اب ذرا بھی شبہے کی گنجایش نہیں کہ مستقبل قریب میں ہندوستان کو ایک بڑے

پیمانے پر صنعتی ملک بنا ہے۔ وہ اس سمت میں خاصا بڑا قدم اٹھا چکا ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعت کو غیر محدود اور غیر منظم طریقے سے رواج دینے میں جو خرابیاں ہیں، انھیں آج ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ یہ سوال اور ہے کہ یہ خرابیاں بڑی صنعتوں کا لازمی جزو ہیں یا اُس سماجی اور معاشی نظام کی پیدا کی ہوئی ہیں جس سے یہ صنعتیں وابستہ ہیں۔ اگر خرابیوں کی ذمہ داری معاشی نظام پر ہے تو ترقی کو الزام دینے کے بجائے ہمیں نظام کو جلد سے جلد بدلنے کی کوشش کرنی چاہیئے

اس لئے ہمارے سامنے اس وقت یہ سوال نہیں کہ پیداوار کے مختلف اور متضاد عناصر اور طریقوں میں کس طرح مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کی جائے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں معیشت کا ایک بالکل نیا نظام اختیار کرنا ہے جس کے معاشرتی نتائج اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔ اس بنیادی تبدیلی کے معاشی اور سیاسی پہلو بھی بہت اہم ہیں لیکن اس کے سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ خاص کر ہندوستان میں، جہاں ہم مدتوں سے فکر اور عمل کے قدیم طریقوں میں جکڑے ہوئے ہیں، نئے تجربات اور نئے طریقے بہت ضروری ہیں تاکہ ہمارے فرسودہ خیالات اور نقطۂ نظر میں تبدیلی ہو۔ اس طرح ہم اپنی جامد اور غیر متحرک زندگی کو جاندار اور متحرک بنا سکیں گے، اور ہمارے ذہنوں کے سامنے فکر اور عمل کی نئی راہیں کھل جائیں گی۔ نئے حالات سے نئے تجربے حاصل ہوتے ہیں اور انسان کا ذہن بدلتی ہوئی فضا سے ہم آہنگ ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ بات اب عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ بچے کی تعلیم کو کسی طرح کے ہنر یا دستکاری سے مربوط کرنا چاہیئے۔ اس طرح ذہن کو تحریک ہوتی ہے۔ اور ہاتھ اور دماغ کے کاموں میں ایک طرح کا ربط اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ذرا بڑے لڑکے اور لڑکی کے ذہن میں مشین سے تحریک پیدا ہوتی ہے۔ مشین کے

سلیقے سے ذہن ترقی کرتا ہے (بشرطیکہ اس سے موجودہ کارخانوں کے مزدور
کی طرح زبردستی اور اس کی مرضی کے خلاف کام نہ لیا جائے) اور اس کے سامنے
فکر کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ سائنس کے چھوٹے چھوٹے تجربات خوردبین سے
اشیاء کا مشاہدہ مظاہر قدرت کی تشریح اس کے ذہن میں ایک سرخوشی کا احساس
پیدا کرتی ہے۔ زندگی کے بعض عمل اس کی سمجھ میں آنے لگتے ہیں اور یہ خواہش پیدا
ہوتی ہے کہ بندھے ٹکے فقروں اور پرانے فارمولوں پر بھروسا کر لینے کے بجائے خود
تجربے کر کے دیکھے۔ خود اعتمادی اور آزاد راہی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ مایوسی
اور ناکامی جو ماضی کے زہریلے اثرات سے پیدا ہوتی ہے ختم ہو جاتی ہے۔ یہ نتائج
وہی تہذیب پیدا کر سکتی ہے جس کی بنیاد ہر آن بدلنے والے اور ترقی کرنے والے
صنعتی طریقوں پر قائم ہو۔ اس طرح کی تہذیب پرانی تہذیب و معاشرت میں فوری
اور نمایاں تبدیلی چاہتی ہے اور اس کے لئے جدید صنعتی نظام کا اختیار کرنا ضروری
ہے اس میں شبہ نہیں کہ اس تبدیلی سے نئے مسئلے اٹھتے ہیں نئی دقتیں پیدا
ہوتی ہیں لیکن وہ ہمیں ان مسئلوں کا حل بھی بتاتی ہے، ان دقتوں پر فتح پانا بھی
سکھاتی ہے۔

مجھے تعلیم کے ادبی پہلوؤں سے گہرا لگاؤ ہے اور میں قدیم ادب کا شیدائی
ہوں لیکن مجھے [illegible] کا بھی یقین ہے کہ سب لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے
طبیعیات، کیمیا اور خاص کر حیاتیات کی کچھ ابتدائی تعلیم اور اس کے تھوڑے سے
بہت عملی تجربے بے حد ضروری ہیں۔ صرف اسی طرح وہ نئی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں،
اس میں رہنے کے قابل بن سکتے ہیں اور کسی حد تک ان میں سائنٹفک نقطۂ نظر
پیدا ہو سکتا ہے۔ علوم طبعی اور صنعت کے کارناموں میں (جن میں یقیناً مستقبل
قریب میں اور بھی زیادہ ترقی ہوگی) سائنس کے اوزاروں کی باریکی اور خوبی میں مشینوں

کی نزاکت، اور قوت میں غرض اُن سب چیزوں میں جنھیں سائنس کی تحقیقات اور اُس کے عملی تجربوں نے پیدا کیا ہے، ایک طلسمات کا سا عالم نظر آتا ہے۔ فطرت کے دلکش کارخانے کے مشاہدے اور دنیائے فکر و عمل کی تسخیر میں سائنس کی کامیابی کو دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ یہ سب کچھ انسان کے ذہن کا پیدا کیا ہوا ہے ہم حیرت میں رہ جاتے ہیں۔

۸۔ حکومت صنعتی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے

لڑائی کی صنعتیں، ملکی صنعت کو اس کے اصلی راستے سے ہٹا دیتی ہیں

ہندوستان میں جمشید پور کا "ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل ورکس" ہی ایک ایسا کارخانہ تھا جسے ہماری صنعت کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اس طرح کی کوئی دوسری چیز نہ تھی اور انجینیری کے دوسرے کارخانے اس کے مقابلے میں چھوٹی چھوٹی سنتریوں کی دوکانیں تھیں۔ لیکن اس کارخانے کی ترقی کی رفتار بھی سرکاری پالیسی کی وجہ سے بہت سست رہی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ریل کے انجنوں، ڈبوں اور مال گاڑیوں کی بہت کمی محسوس کی گئی۔ ٹاٹا والے انجن بنانے پر تیار ہو گئے اور انھوں نے اس کام کے لئے دوسرے ملکوں سے مشینیں بھی منگا لیں۔ لیکن جب لڑائی ختم ہو گئی تو گورنمنٹ آف انڈیا اور ریلوے بورڈ (جو مرکزی حکومت کا ایک محکمہ ہے) نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے کی طرح انجن برطانیہ ہی سے منگائے جائیں۔ ظاہر ہے کہ انجنوں کے لئے اور کوئی بازار نہیں، اس لئے کہ ریلیں یا تو حکومت کی ہیں، یا برطانوی کمپنیوں کی۔ اس صورت میں ٹاٹا کو انجن بنانے کا ارادہ چھوڑ دینا پڑا۔

اگر ہندوستان صنعتی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے بنیادی طور پر تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ انجینیری اور مشینیں بنانے کی بہت بڑی صنعت، سائنٹفک تجربات کے ادارے، اور بجلی کی قوت۔ ہندوستان کی صنعتی منصوبہ بندی کے لئے یہ تینوں چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اس لئے نیشنل پلیننگ کمیٹی نے سب سے زیادہ زور انھیں پر دیا۔ ہمارے پاس یہ تینوں چیزیں نہیں تھیں اور صنعت کی توسیع میں طرح طرح کی رکاوٹیں برابر پڑ رہی تھیں۔ حکومت اگر ترقی پسند پالیسی اختیار کرتی تو ان رکاوٹوں کو آسانی سے دور کر سکتی تھی، لیکن اُس کی پالیسی اس کے بالکل خلاف تھی اور ہندوستان میں صنعتی ترقی کے نشوونما کو روکنا چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ جب دنیا کی دوسری لڑائی شروع ہوئی، اس وقت بھی حکومت نے مشینوں کی درآمد کی اجازت نہیں دی۔ اور آگے چل کر جہازوں کی کمی کو بہانہ بنا لیا گیا۔ ہندوستان میں نہ سرمایہ کی کمی تھی اور نہ ہنر کی، کمی صرف مشینوں کی تھی اور ہندوستان کے کاروباری لوگ مشینیں منگانے کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ اگر مشینوں کی درآمد میں سہولتیں دی جاتیں تو نہ صرف ہندوستان کی معاشی حالت کو بہت فائدہ پہنچتا بلکہ مشرق بعید میں لڑائی کا پورا نقشہ ہی بدل جاتا۔ بہت سی ضروری چیزیں جو دوسرے ملکوں سے، عموماً ہوائی جہازوں پر، بہت زیادہ روپیہ صرف کرکے اور بے حد دقتیں اُٹھا کے لائی گئیں، ہندوستان میں بن سکتی تھیں۔ ہندوستان، چین اور مشرق کے دوسرے علاقوں کا سلاح خانہ بن جاتا اور اس کی صنعتی حیثیت کناڈا یا آسٹریلیا کے برابر ہو جاتی لیکن جہاں ایک طرف لڑائی کی ضرورتیں اہم تھیں، وہاں برطانوی صنعت کے مستقبل کو بھی ہر وقت مدِ نظر رکھنا ضروری تھا، اور اس لئے یہ بات کسی طرح بھی مناسب نہیں سمجھی گئی کہ ہندوستان کی صنعتوں کو ترقی کا موقع دے کر، لڑائی کے بعد اُنھیں برطانیہ کی صنعتوں کا

بالمقابل بنا دیا جائے۔ حکومت کی یہ پالیسی راز میں رکھی گئی۔ بلکہ انگلستان کے رسالوں نے یہ ساری باتیں صاف صاف لکھیں۔ اور ہندوستان میں اس پالیسی کے خلاف برابر احتجاج ہوتا رہا۔

ٹاٹا اسٹیل کے دور اندیش بانی، جمشید جی ٹاٹا نے بصیرت سے کام لے کر بنگلور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کھول دیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ سائنٹفک تحقیقات کے معدودے چند نجی اداروں میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ بعض سرکاری ادارے پہلے سے موجود ہیں مگر وہ محدود مقاصد رکھتے ہیں۔ سائنس اور صنعت کی تحقیقات کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ امریکا اور روس میں ہزاروں انسٹی ٹیوٹ، اکیڈمیاں اور تحقیقی ادارے اس کام میں مصروف ہیں اور ہندوستان میں اس کی طرف سے اتنی بے توجہی برتی گئی کہ یہاں اس بنگلور انسٹی ٹیوٹ کے علاوہ اس طرح کا اور کوئی ادارہ ہی نہیں البتہ یونیورسٹیوں میں کچھ تھوڑا بہت کام ہو رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کے کچھ دن بعد اس کی کوشش کی گئی کہ تحقیق کے کام کی ہمت افزائی کی جائے۔ اگرچہ اس کام کا دائرہ محدود ہے لیکن اس سے اچھے علمی نتائج حاصل ہو چکے ہیں۔

حکومت نے صرف جہاز بنانے اور انجن بنانے ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ جب ایک مرتبہ موٹر سازی کی صنعت کو رواج دینے کی کوشش کی گئی تو حکومت نے اسے بھی دبا دیا۔ دوسری جنگ سے کچھ سال پہلے اس سلسلے میں کچھ تیاریاں کی گئی تھیں اور امریکا کی ایک مشہور کمپنی کے تعاون اور اشتراک سے ہر چیز کا پورا انتظام کر لیا گیا تھا۔ ہندوستان میں اس طرح کے کارخانے تو پہلے ہی سے موجود تھے جو باہر سے آئے ہوئے پرزوں کو جوڑ کر پوری موٹر بنا لیتے تھے۔ اب یہ سوچا گیا کہ خود ہندوستانی سرمائے، انتظام اور کارکنوں کی مدد سے موٹر د ا

کے سارے پرزے اور حصے ہندوستان ہی میں بننے لگیں۔ امریکن کارپوریشن نے شروع کے زمانے کے لئے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ اُن کے نمونوں سے مدد لے لی جائے اور اُن کے انجینیر اور ماہر کچھ عرصے تک کام کی نگرانی بھی کردیں۔ بمبئی کی صوبائی حکومت جو اُس زمانے میں کانگریسی وزارت کے ہاتھوں میں تھی مختلف قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ پلیننگ کمیٹی کو اس اسکیم سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ غرض ساری باتیں طے ہو چکی تھیں اور اب صرف مشینوں کا باہر سے لانا باقی تھا۔ لیکن وزیر ہند نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا اور ہندوستان میں مشینیں لانے کی اجازت نہیں دی۔ اُن کا خیال تھا کہ "اس نئی صنعت کے ہندوستان میں اس وقت شروع کردینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن مزدوروں اور مشینوں کی مدد لڑائی کے سلسلے میں زیادہ ضروری اور اہم ہے، وہ دوسری طرف لگ جائیں گی۔" یہ بات لڑائی کے ابتدائی چند مہینوں کی ہے جب کہ محض جنگ زرگری ہورہی تھی۔ اس اعتراض کے جواب میں ہماری طرف سے یہ کہا گیا کہ ہندوستان میں مزدوروں کی کمی نہیں، بلکہ بہت سے کام کرنے والے اس وقت بھی بیکار بیٹھے ہیں۔ جنگی ضرورت کا عذر بھی عجیب و غریب تھا اس لئے کہ جنگ کے لئے تو موٹروں کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن وزیر ہند جو لندن میں بیٹھے بیٹھے ہر بات کا قطعی فیصلہ کردیتے ہیں۔ دلیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر بھی پتہ چلا کہ امریکا کا ایک بہت بڑا اور با اثر کارخانہ بھی اس بات کا مخالف ہے کہ اس کے سوا کسی اور کمپنی کی مدد سے ہندوستان میں موٹروں کا کارخانہ کھولا جائے۔

ہندوستان میں نقل و حمل کے مسئلے نے لڑائی کے زمانے میں بڑی اہمیت حاصل کرلی۔ یہاں موٹر لاریوں، پٹرول، انجنوں، ریل کے ڈبوں، حتیٰ کہ کوئلے تک کی کمی محسوس کی جانے لگی۔ ان تجویزوں کو جو لڑائی سے پہلے ہندوستان کی

طرف سے پیش ہوتی رہی تھیں۔ اس طرح رد نہ کیا گیا ہوتا تو شاید ان ساری دقتوں کا حل کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ ریل کے انجن، ریل کے ڈبے، موٹر لاریاں اور فوجی لاریاں سب ہندوستان ہی میں بن سکتی تھیں۔ پٹرول کی جو شدید کمی محسوس کی جارہی تھی وہ الکوہل کی طاقت سے پوری ہو سکتی تھی۔ اب رہا کوئلہ تو ہندوستان میں اس کے ذخیرے کثرت سے تھے لیکن بہت کم مقدار میں نکال کر استعمال کیا جاتا تھا طلب کے بڑھ جانے کے باوجود، لڑائی کے دنوں میں کوئلے کی پیداوار بہت کم ہو گئی۔ کوئلے کی کانوں کی حالت اتنی ابتر اور مزدوری اتنی کم تھی کہ لوگوں کے لئے اس میں ذرا بھی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے عورتوں کے لئے کانوں میں کام کرنے کی جو پابندیاں تھیں وہ اٹھالی گئیں، اس لئے کہ عورتیں نسبتاً کم مزدوری میں مل جاتی تھیں۔ لیکن یہ کوشش اب بھی نہیں کی گئی کہ ان کانوں کے کام میں جو خرابیاں ہیں انھیں دور کیا جائے یا مزدوروں کو زیادہ مزدوری دی جائے تاکہ وہ خوشی سے یہ کام کرنے پر آمادہ ہو سکیں۔ کوئلے کی کمی کی وجہ سے صنعتوں کی ترقی رک گئی۔ حتیٰ کہ چلتے ہوئے کارخانوں کو بھی کام بند کرنا پڑا

ہندوستان سے سیکڑوں انجن اور ہزاروں ریل کے ڈبے مشرق وسطیٰ کو بھیج دئے گئے اور یہاں نقل و حمل کی دقتیں اور بھی بڑھ گئیں۔ کہیں کہیں تو ریل کی پٹریاں تک اکھاڑ کر کسی دوسری جگہ پہنچا دی گئیں جس بے تکلفی سے مستقبل کی دقتوں کا خیال کئے بغیر یہ سب کچھ کیا گیا اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان سارے کاموں میں نہ کسی منصوبے کو دخل تھا اور نہ دوراندیشی کو اور اس لئے ایک مسئلے کو تھوڑا بہت حل کرنے کے لئے جو ترکیب کی جاتی تھی اس سے فوراً ہی دوسرے اس سے بھی زیادہ اہم مسائل اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

۱۹۳۹ء کے آخر یا ۱۹۴۰ء کے شروع میں ہندوستان میں ہوائی جہاز

بنانے کا ایک کارخانہ کھولنے کی کوشش کی گئی۔ اس مرتبہ بھی ایک امریکی کمپنی سے سارے معاملات طے کر لئے گئے اور گورنمنٹ آف انڈیا اور ہندوستان کے آرمی ہیڈ کوارٹر سے پرزور درخواستیں کی گئیں۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ بار بار کے تقاضوں اور یاد دہانیوں کے بعد جواب آیا اور یہ تجویز نامنظور کر دی گئی جب ہوائی جہاز انگلستان اور امریکا سے خریدے جا سکتے ہیں تو پھر ہندوستان میں بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

لڑائی سے پہلے بہت سی دوائیں اور ویکسین جرمنی سے ہندوستان آیا کرتے تھے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی ان کا آنا بند ہو گیا۔ اور اس لئے فوراً یہ تجویز پیش کی گئی کہ کچھ ضروری دوائیں اور ویکسین ہندوستان میں بنائے جائیں۔ یہ کام بڑی آسانی سے سرکاری اداروں میں ہو سکتا تھا۔ مگر گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ تجویز نامنظور کر دی اور یہ کہا کہ جس چیز کی بھی ضرورت ہو وہ امپیریل کیمیکل لیبوریٹریز سے منگائی جا سکتی ہے۔ اس کے جواب میں جب یہ کہا گیا کہ وہی چیزیں ہندوستان میں بہت کم لاگت پر تیار ہو سکتی ہے اور فوجوں کے اور عام رعایا کے کام میں آسکتی ہیں تو ارباب حل وعقد اس پر بہت برہم ہوئے کہ ملکی مصالح میں اس طرح کے رکیک خیالات کو دخل دیا جاتا ہے اور انھوں نے فرمایا کہ "حکومت کوئی تجارتی ادارہ نہیں!"

حکومت تجارتی ادارہ تو نہیں، لیکن اُسے تجارتی اداروں کے مفاد میں سے ایک امپیریل کیمیکل ہی سے خاص دلچسپی ہے۔ اس زبردست ادارے کو ہندوستان میں بہت سی سہولتیں دی گئیں۔ ان سہولتوں کے بغیر بھی اس کے وسائل اتنے وسیع اور لامحدود تھے کہ ہندوستان کا کوئی کارخانہ (سوائے ٹاٹا) کے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان سہولتوں کے علاوہ اسے ہندوستان

اور انگلستان کے ارباب حل وعقد کی مدد اور حمایت بھی حاصل تھی۔ ہندوستان میں وائسرائے کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے چند ہی مہینے بعد لارڈ لنلتھگو امپیریل کیمیکلز کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے جلوہ نما ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کی بڑی تجارت اور گورنمنٹ آف انڈیا میں کتنا قریبی تعلق ہے اور اس تعلق کا مکمل پالیسی پر اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ لارڈ لنلتھگو جب ہندوستان کے وائسرائے تھے اُس زمانے میں بھی امپیریل کیمیکلز میں اُن کے بہت سے حصے ہوں۔ بہرحال اب انھوں نے وہ سب اثرات اور تعلقات جو وہ ہندوستان میں رکھتے تھے وہ خاص معلومات جو انھوں نے وائسرائے کی حیثیت سے حاصل کی تھیں، امپیریل کیمیکل کی خدمت میں پیش کردیں۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں جب لارڈ لنلتھگو وائسرائے تھے تو انھوں نے ایک موقع پر کہا تھا " رسد کے میدان میں ہم نے عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے ہندوستان کا اس سلسلے میں بہت اہم اور قابل قدر حصہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لڑائی کے ابتدائی چھ مہینوں میں جو ٹھیکے دیئے گئے تھے اُن کی قیمت تقریباً ۲۹ کروڑ تھی۔ اگلے چھ مہینوں میں، یعنی اپریل ۱۹۴۲ء سے لے کر اکتوبر ۱۹۴۲ء تک ان کی قیمت ۱۳۷ کروڑ ہوگئی اور اکتوبر ۱۹۴۲ء تک کے پورے زمانے میں اس کی قیمت ۲۴۴ کروڑ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ان رقموں میں وہ خرچ شامل نہیں ہے جو آرڈیننس فیکٹریوں میں ہوا، اور یہ خرچ بجائے خود بہت بڑا تھا[1]" یہ ساری باتیں لفظ بہ لفظ صحیح ہیں، اور جس وقت یہ کہی گئی تھیں، اُس کے بعد سے لڑائی

---

[1] یہ ساری رقمیں روپیوں میں ہیں۔

کی جدوجہد میں ہندوستان نے جو زبردست حصہ لیا ہے وہ اس سے بھی کہیں
زیادہ ہے۔ ان اعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر لڑائی کے زمانے میں ہندوستان
میں بے حد صنعتی ترقی اور صنعتی پیداوار ہوئی۔ حالانکہ اصل حالات اس سے بالکل
مختلف ہیں۔ اور ترقی کے اعداد کو دیکھ کر یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر یہ فرض
کر لیا جائے کہ ۱۹۳۵ء میں صنعتی کاموں کی مقدار سو تھی اس حساب سے ۳۹-۱۹۳۸ء
میں ۱۱۱ر۱ تھی ۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۱۱۴ر۴ ؛ ۴۱-۱۹۴۰ء میں اس کی رفتار ۱۱۲ر۱ اور
۱۲۷ کے درمیان گھٹتی بڑھتی رہی ؛ مارچ ۱۹۴۲ء میں ۱۱۸ر۹ تھی ؛ اپریل ۱۹۴۲ء
میں یہ گھٹ کر ۱۰۹ر۲ رہ گئی اور جولائی ۱۹۴۲ء تک پہنچتے پہنچتے ۱۱۶ر۴ ہو گئی۔ یہ
اعداد پورے نہیں ہیں، اس لئے کہ ان میں کارخانوں اور کیمیائی صنعتوں کے
اعداد شامل نہیں ہیں۔ پھر بھی ان سے بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر جولائی ۱۹۴۲ء کے اعداد کو سامنے رکھا جائے تو یہ پتہ
چلتا ہے کہ صنعتی سرگرمی زمانہ قبل جنگ کے مقابلے میں کچھ ہی زیادہ ہے۔ صرف
دسمبر ۱۹۴۱ء میں اس میں یکبارگی کچھ اضافہ ہوا اور اس کی مقدار ۱۲۷ر۸ تک
پہنچ گئی اور اس کے بعد پھر کمی شروع ہو گئی۔ اس کے باوجود حکومت صنعتی
اداروں کو جو ٹھیکے دے رہی تھی ان کی قیمت برابر بڑھتی جا رہی تھی اور لارڈ لنلتھگو
کے بیان کے مطابق، اکتوبر ۱۹۳۹ء سے لے کر مارچ ۱۹۴۲ء تک، چھ
مہینوں میں ان کی قیمت ۱۲۷ کروڑ ہو گئی۔

لڑائی کے سلسلے میں جو بڑے بڑے آرڈر صنعتی اداروں کو دئے گئے۔
ان سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی مجموعی صنعتی سرگرمی میں کوئی اضافہ ہوا۔
ہاں یہ ضرور ہوا کہ ملک میں لڑائی سے پہلے معمولی طور پر جو صنعتی کام ہوتے تھے۔
ان کے بجائے جنگی ضرورت کی چیزیں تیار ہونے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی

کی ضرورتیں تو پوری ہوتی گئیں لیکن عام ضرورت کی چیزوں کی پیداوار بہت ہی کم ہوگئی۔ اس صورتِ حال سے لازمی طور پر کئی اہم نتیجے پیدا ہوئے۔ ہندوستان کا بہت سا روپیہ لندن میں اسٹرلنگ قرضوں کی شکل میں جمع ہوتا رہا، پھر ہندوستان میں چند آدمیوں کے ہاتھ میں بہت سا روپیہ اکٹھا ہوگیا لیکن بحیثیت مجموعی ملک کو اپنی ضرورت کی چیزوں سے محروم رہنا پڑا، نوٹوں کی کثیر تعداد ملک میں پھیل گئی اور اس طرح قیمتیں بڑھتے بڑھتے کئی گنی زیادہ ہوگئیں ۱۹۴۲ء کے وسط تک غذائی بحران کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور ۱۹۴۳ء میں بنگال اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں کال نے لاکھوں آدمیوں کی جانیں لے لیں۔ لڑائی اور اس کے سلسلے میں جو سرکاری پالیسی عمل میں لائی گئی اس کا بوجھ ہندوستان کے کمزور کندھوں پر پڑا۔ اس کے کندھے اس بوجھ کو سہار نہ سکے، اور اس نے لاکھوں آدمی ایک ایسی موت مرے جو دنیا میں سب سے زیادہ ہولناک موت ہے یعنی انھوں نے فاقوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی جو اعداد و شمار میں نے دئے ہیں وہ ۱۹۴۲ء تک کے ہیں۔ اس کے بعد کے اعداد میرے پاس نہیں ہیں۔ اس کے بعد سے حالات میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ممکن ہے کہ ہندوستان کی صنعتی کارکردگی اب پہلے سے زیادہ ہو[1] لیکن ان اعداد سے بھی ہمارے سامنے جو تصویر آتی ہے وہ غالباً پہلے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ابھی وہی قوتیں کارفرما ہیں۔ وہی دور ہیں کے بعد دیگرے آتے ہیں اسی طرح عارضی لیپ پوت کردی جاتی ہے۔ ایک منظم اور جامع پالیسی کی کمی اب بھی محسوس ہو رہی ہے۔ برطانوی صنعت کے موجودہ اور آئندہ مفاد

---

[1] اگلے صفحے پر دیکھئے۔

کی حمایت اب بھی اسی طرح کی جا رہی ہے اور لوگ بھوک اور متعدی بیماریوں سے اسی طرح مر رہے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ موجودہ صنعتوں میں سے بعض (خاص کر کپڑے، لوہے اور جوٹ کی صنعتوں) کو بہت فروغ ہوا ہے، اور بڑے بڑے کارخانوں کے مالکوں، لڑائی کے ٹھیکہ داروں، ذخیرہ بازوں اور نفع خوروں میں سے بہت سے لکھ پتی اور کروڑ پتی ہو گئے ہیں، اور ہندوستانی زندگی کے اونچے طبقوں میں کچھ لوگوں نے سوپر ٹیکس کے باوجود بڑی دولت جمع کر لی ہے۔ لیکن مزدوروں کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا مزدوروں کے لیڈر مسٹر این۔ ایم جوشی نے

(پچھلے صفحے کا نوٹ) ایسا نہیں ہے۔ کلکتے کے رسالہ "کیپٹل" کے ۹ مارچ ۱۹۴۴ء کے پرچے میں ہندوستان کی صنعتی رفتار کے مندرجہ ذیل اعداد دئے ہوئے ہیں۔
(۳۶-۱۹۳۵ء) = ۱۰۰

۳۹—۱۹۳۸	۱۱۱٫۱
۴۰—۳۹	۱۱۴٫۰
۴۱—۴۰	۱۱۷٫۳
۴۲—۴۱	۱۲۲٫۷
۴۳—۴۲	۱۰۸٫۸
۴۴—۴۳	۱۰۸٫۴ (تخمیناً)
جنوری ۱۹۴۴ء	۱۱۱٫۷

اس میں اسلحہ سازی کی صنعت شامل نہیں ہے، اور ان اعداد سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چار سال سے زیادہ کی صنعتی سرگرمیوں کے بعد ہندوستان کی رفتار زمانہ قبل جنگ کی رفتار سے بھی کچھ کم تھی۔

مرکزی اسمبلی میں ایک دفعہ یہ بیان کیا کہ لڑائی کے زمانے میں ہندوستانی مزدوروں کی حالت اور بھی بدتر ہوگئی۔ زمیندار اور بڑے کاشتکار خاص کر پنجاب اور سندھ میں خوب پھلے پھولے۔ لیکن زرعی آبادی کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جس پر لڑائی کے حالات کا بہت برا اثر پڑا اور جسے بے حد تکلیفیں اٹھانی پڑیں مقدار زر کی افراط اور قیمتوں کے چڑھ جانے کی وجہ سے عام طور پر صارفوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی

۱۹۴۲ء کے وسط میں امریکا کا ایک صنعتی مشن — گریڈی کمیٹی — ہندوستان کی موجودہ صنعتوں کا معائنہ کرنے اور پیداوار بڑھانے کی تجویزیں پیش کرنے ہندوستان آیا تھا۔ اس مشن کا مقصد ایسی چیزوں کی پیداوار بڑھانا تھا جو لڑائی کے سلسلے میں کام آسکیں۔ اس مشن کی رپورٹ شائع نہیں ہوئی، غالباً اس لئے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس کے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی تاہم اُن کی بعض سفارشوں کا اعلان ضرور کیا گیا۔ اس کمیشن نے یہ سفارشیں کی تھیں کہ الکوہل کی طاقت پیدا کی جائے، لوہے اور فولاد کی صنعت کو اور ترقی دی جائے، بجلی کی قوت کو بڑھایا جائے اور المونیم اور صاف کی ہوئی گندھک کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور اس کے علاوہ مختلف صنعتوں میں تنظیم پیدا کی جائے۔ انھوں نے ایک سفارش یہ بھی کی تھی کہ امریکا کے نمونے پر ہندوستان میں بھی ایسے بڑے بڑے ادارے قائم کئے جائیں، جو حکومت کی پابندیوں سے آزاد رہ کر صنعتوں اور صنعتی پیداواروں کی تنظیم کر سکیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گریڈی کمیٹی کو حکومت ہند کے سست، لاؤبالی اور غیر اطمینان بخش طریقے پسند نہیں آئے۔ لیکن کمیٹی کے ممبر ٹاٹا اسٹیل ورکس کی خوش نظمی اور باقاعدگی سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہ ملحوظ رہے کہ ٹاٹا اسٹیل ورکس ایک زبردست صنعتی تنظیم ہے

اور اس کا سارا انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ گریڈی کمیٹی کی ابتدائی رپورٹ میں یہ بات بھی کہی گئی تھی کہ "مشن ہندوستانی مزدوروں کے کام کی خوبی اور اُن کی فطری صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوا۔ ہندوستانی ہاتھ کا سُگھڑ ہے۔ اور اگر اُسے کام کے تسلی بخش حالات میسر ہوں اور اپنی ملازمت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہو تو وہ جفاکش بھی ہے اور قابل اعتماد بھی"[۱]

پچھلے دو تین برسوں کے اندر ہندوستان میں کیمیا کی صنعت پیدا ہو گئی ہے، جہاز سازی کی صنعت نے تھوڑی بہت ترقی کی ہے اور چھوٹے پیمانے پر ہوائی جہاز بنانے کا کام بھی شروع کیا گیا ہے۔ تمام جنگی صنعتوں نے، جن میں جوٹ اور کپڑے کے کارخانے بھی شامل ہیں، سوپر ٹیکس کے باوجود بڑے نفعے کمائے ہیں اور ملک میں خاصا بڑا سرمایہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے کسی نئے صنعتی کاروبار میں سرمایہ لگانے کی ممانعت کر دی تھی۔ حال ہی میں اس مسئلے میں کچھ ڈھیل دے دی گئی ہے، اگرچہ لڑائی ختم ہونے سے پہلے کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لیکن اس تھوڑی سی ڈھیل نے بھی بڑے کاروباری لوگوں میں زبردست جوش اور سرگرمی پیدا کر دی اور بڑی بڑی صنعتی سکیمیں بن رہی

---

[۱] گریڈی کمیٹی کی رپورٹ کے نظر انداز کئے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بمبئی کے رسالہ کامرس نے ۲۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا کہ:

"یہ بات مسلم ہے کہ بیرونی ملکوں میں با اثر لوگ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس ملک (ہندوستان) کی آئندہ صنعتی ترقی کا بالکل گلا گھونٹ دیا جائے تاکہ لڑائی کے بعد کے زمانے میں مشرق اور مغرب میں کسی خطرناک مقابلے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے"

ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان، جس کی ترقی اب تک بالکل رُکی ہوئی تھی اب بڑے پیمانے کی صنعت شروع کرنے ہی کو ہے۔

بابِ نہم

دوسری عالمگیر جنگ

ہندوستان کی دوسری سیاسی انجمنوں کی طرح انڈین نیشنل کانگریس نے بھی عرصے تک اپنی جدوجہد کو صرف ملکی سیاست کے مسائل تک محدود رکھا اور غیر ملکی معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ۱۹۲۰ء میں اسے بیرونی معاملات سے بھی کچھ دلچسپی پیدا ہوئی اور اس وقت سے اس کی سیاست میں ایک جدید باب کا اضافہ ہوا۔ کانگریس کے علاوہ کچھ سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی تھے جو بیرونی سیاسیات میں دلچسپی لے رہے تھے مگران کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کی بھی چند انجمنیں تھیں جو مسئلہ فلسطین میں گہری دلچسپی رکھتی تھیں اور وقتاً فوقتاً فلسطین کے عربوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کی تجاویز منظور کرتی رہتی تھیں۔ ٹھیک اس زمانے میں ٹرکی، مصر اور ایران میں سماجی انقلاب رونما ہوا جس کو ہندوستانی مسلمانوں نے کسی قدر تشویش کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس انقلاب کا مقصد چند ایسی سماجی اصلاحات بھی تھیں جو ان کے نزدیک اسلامی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ اسی

زمانے میں کانگریس نے بتدریج ایک واضح غیر ملکی پالیسی اختیار کرلی جس کا مقصد سیاسی اور اقتصادی شہنشاہیت کے اقتدار کو ختم کرنا، اور اس کے لئے دوسری آزاد قوموں کے ساتھ تعاون کرنا تھا۔ یہ مقصد ویسے بھی ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کے عین مطابق تھا چنانچہ ۱۹۲۱ء میں کانگریس نے اپنی غیر ملکی پالیسی کے نظریے کی وضاحت میں ایک تجویز منظور کی جس میں دوسری قوموں کے ساتھ میل جول پیدا کرنے اور اپنے ہمسایہ ملکوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں کانگریس نے ایک آنے والی زبردست جنگ کے امکانات پر بحث کی اور دوسری عالمگیر جنگ کے شروع ہونے سے بارہ سال پہلے اس کے متعلق اپنے نظریے کی وضاحت کردی۔

یہ ہٹلر کے برسر اقتدار آنے سے پانچ چھ سال پہلے کا ذکر ہے جاپان نے منچوریا میں ابھی اپنی جارحانہ سرگرمیاں شروع نہیں کی تھیں۔ ادھر اٹلی میں مسولینی اپنی پوزیشن کو مضبوط کر رہا تھا لیکن اس کا وجود ابھی امن عالم کے لئے خطرہ نہیں بنا تھا۔ فسطائی اطالیہ اور انگلستان کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے اور انگلستان کے مدبرین مسولینی کو اکثر موقعوں پر خراج تحسین ادا کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ یورپ میں کئی اور چھوٹے چھوٹے ڈکٹیٹر بھی تھے مگر برطانیہ کے ان سب کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے البتہ سوویٹ روس اور برطانیہ کے تعلقات میں مکمل کشیدگی تھی اور آرکوس کے حملے کے بعد دونوں ملکوں نے اپنے اپنے سفیر واپس بلا لئے تھے۔ جمعیتہ اقوام اور بین الاقوامی لیبر آفس میں فرانس اور برطانیہ کا رویہ ہمیشہ قدامت پسندانہ ہوتا تھا چنانچہ جب تخفیف اسلحہ کے مسئلے پر بے حد طویل بحث مباحثے ہوتے

نو امریکہ اور تقریباً وہ سب ملک جو لیگ میں شامل تھے اس بات کے حامی تھے کہ ہوائی بمباری کو قطعاً ناجائز قرار دے دیا جائے مگر برطانیہ نے اس تجویز کی غیر مشروط حمایت نہیں کی کیونکہ وہ خود سالہا سال سے ہوائی جہازوں کو نظم ملکی اور امن عامہ کے لئے استعمال کرتا رہا تھا۔ چنانچہ عراق اور ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے کے دیہات اور قصبات میں جو بمباری برطانوی حکومت نے کی تھی وہ اس کے قول کے مطابق نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے کی گئی تھی اور وہ اپنے حق کو چھوڑ دینے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس مسئلے کا جمعیتہ اقوام اور تخفیف اسلحہ کانفرنس میں کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا۔

جرمنی جس نے وائمار کا جمہوری آئین اختیار کر لیا تھا اب باقاعدہ جمعیتہ اقوام کا ممبر تھا اور لوکارنو کا عہدنامہ یورپ کے دوامی امن کا پیش خیمہ اور برطانوی سیاست کی فتح سمجھا جانے لگا تھا۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ تھا کہ روس کو بالکل الگ کر دیا گیا تھا اور یورپ میں اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ روس اس زمانے میں اپنے انقلاب کی دسویں سالگرہ منا رہا تھا اور مشرقی ملکوں کے ساتھ جن میں خاص طور پر ٹرکی، ایران، افغانستان اور منگولیا شامل تھے رابطہ اتحاد پیدا کر چکا تھا۔ چین میں سیاسی انقلاب کا سیلاب پورے زور شور کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا اور قوم پرست چینی فوجیں آدھے سے زیادہ چین پر قابض ہو چکی تھیں۔ ان کو جد وجہد میں غیر ملکی مفاد سے جن میں برطانیہ خاص پر قابل ذکر متصادم ہونا پڑا کیونکہ چین کی اکثر بندرگاہیں اور بعض اندرونی علاقے برطانیہ کے زیر تصرف تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین کی مرکزی حکومت مختلف گروہوں

میں منتشر ہوگئی اور ملک میں خانہ جنگی کا دور شروع ہوگیا۔ دنیا کے یہ واقعات ایک عالمگیر تہذیب کا پیش خیمہ تھے۔ ایک طرف فرانس اور برطانیہ کی سرکردگی میں یورپ کی طاقتیں تھیں دوسری طرف روس تھا جس کے ساتھ کچھ ایشیائی ملک تھے۔ امریکا کا طرز عمل اس گروہ بندی میں غیر جانبدارانہ تھا۔ کیونکہ امریکا ایک طرف تو اشتراکیت کا شدید مخالف ہونے کی وجہ سے روس کے ساتھ نہیں مل سکتا تھا اور دوسری طرف برطانیہ پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ اقتصادی اور صنعتی میدان میں برطانیہ کا حریف تھا اس لئے وہ برطانوی پارٹی میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکا اپنی الگ تھلگ رہنے کی پالیسی پر کاربند رہنا چاہتا تھا اور آئے دن یورپ کے نا ہی جھگڑوں میں پڑنا پسند نہ تھا۔

گرد و پیش کے ان واقعات سے متاثر ہوکر قدرتی طور پر ہندوستان کو روس اور دوسرے ایشیائی ملکوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اگرچہ لوگوں کی ایک روز افزوں تعداد اشتراکیت کی طرف مائل تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں اشتراکیت کے اصول مقبول ہوگئے تھے۔ چین کے سیاسی انقلاب کی فتوحات کا لوگ جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کرتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح کبھی نہ کبھی ایشیا سے یورپ کا اقتدار ختم ہوجائے گا اور وہ دن دور نہیں جبکہ ہندوستان کا شمار بھی آزاد ملکوں کی صف میں ہونے لگے گا۔ ہندوستان کے لوگ ڈچ ایسٹ انڈیز، انڈوچائنا، مصر اور دوسرے مغربی ایشیائی ملکوں کی آزادی کی تحریکوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اسی دوران میں سنگاپور کو سمندری بیڑے کی ایک زبردست چھاؤنی بنا دیا گیا اور سیلون کی بندرگاہ ٹرنکاملی کو مضبوط بنایا جا رہا تھا۔ یہ تیاریاں آنے والی

جنگ کا پتہ دیتی تھیں اور اسی لئے برطانیہ روس کو اور مشرق کی بڑھتی ہوئی تحریک
آزادی کو کچلنے کے لئے اپنی طاقت کو مستحکم کر رہا تھا۔ یہ تھے دنیا کے حالات جس
وقت کانگریس نے اپنی غیر ملکی پالیسی قائم کی اور اس نے اعلان کیا کہ ہندوستان
اس جنگ میں ہرگز شریک نہیں ہوگا جو شہنشاہیت کے اصولوں کی خاطر
لڑی جائے گی اس لئے کسی حالت میں ہندوستان کو اس کے لوگوں کی منشا
کے خلاف لڑائی میں شامل نہ کیا جائے۔ اس کے بعد بار بار اس اعلان کو دہرایا
گیا اور ملک میں اس کا کافی پروپیگنڈا کیا گیا۔ چونکہ ہندوستان کے کسی فرد واحد
یا سیاسی انجمن نے اس خیال کی مخالفت نہیں کی اس لئے یہ نہ صرف کانگریس
بلکہ ہندوستان کی بنیادی پالیسی بن گئی۔ اس دوران میں یورپ کی سیاست
میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ جرمنی میں ہٹلر اور نازیت کا اقتدار قائم
ہو گیا۔ کانگریس نے ان نئے حالات سے اپنی بیزاری کا اعلان کرنے میں ذرا بھی دیر
نہیں کی کیونکہ ہٹلر اور اس کا عقیدہ نسلی امتیاز اور ملوکیت کا مادی شکل میں ظہور
تھا اور کانگریس کی جدوجہد اس نسلی منافرت اور ملوکیت کے مٹانے کے لئے
تھی۔ جاپان کے چین پر جارحانہ اقدام کو کانگریس نے اور بھی بری نظروں
سے دیکھا کیونکہ ہندوستانیوں کو چین سے قدرتاً ہمدردی تھی۔ حبشہ اور اسپین
کے واقعات، چین اور جاپان کی جنگ، زیکوسلواکیہ کا معاملہ اور عہدنامہ
میونک کے واقعات نے کانگریس کے جذبۂ نفرت کو اور بھی تقویت پہنچائی آنے
والی جنگ کے معاملے میں اس کی مخالفت اور بھی شدید ہو گئی۔

گو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنے والی جنگ کی نوعیت اس سے مختلف
ہوگی جو ہٹلر کے برسر اقتدار آنے سے پہلے خیال کی جاتی تھی تاہم برطانیہ کی
پالیسی ابتدا سے فسطائیت اور نازیت کی حامی تھی اور یقین کرنا مشکل تھا کہ

برطانیہ اپنی پالیسی کو یک لخت تبدیل کر کے آزادی اور جمہوریت کی حمایت میں صف آرا ہو جائے گا۔ برطانیہ کا شہنشاہیت کی طرف نمایاں رجحان اپنے مقبوضات کے ساتھ وابستگی اور روس اور اشتراکیت کے اصولوں سے بنیادی اختلافات ایسے امور تھے جن کو برطانیہ کسی حالت میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ہٹلر کو خوش کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جا رہی تھی اور یورپ کی سیاست پر اس کا غلبہ برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا جس کی وجہ سے طاقتوں کا پہلا توازن دگرگوں ہو رہا تھا اس چیز سے برطانوی سلطنت کے مفاد کو بھی خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ ان حالات میں برطانیہ اور جرمنی میں جنگ کے امکانات موجود تھے اور یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ جنگ کی صورت میں کانگریس کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ اور ہم کس طرح اپنی پالیسی کے دو متضاد رجحانات میں مطابقت پیدا کر سکیں گے کیونکہ ہمارے سامنے ایک طرف برطانوی سامراج کی مخالفت تھی دوسری طرف فسطائیت اور نازیت کی مخالفت، اور ہم اس کشمکش میں تھے کہ اپنی قومی اور بین الاقوامی پالیسی کے تضاد کو کس طرح دور کریں۔ موجودہ حالات میں ہمارے لئے یہ ایک بہت بڑا سوال تھا۔ لیکن اگر برطانیہ اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دے کہ ہندوستان میں اس نے اپنی سامراجی پالیسی کو ترک کر دیا ہے اور وہ عوام کی خوشنودی کو حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس سوال کا حل تلاش کرنے میں ہمیں مطلق دقت نہیں رہتی تھی۔

قومیت اور بین الاقوامیت کی کشمکش میں بالآخر فتح قومیت ہی کی ہوتی تھی۔ ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ خصوصاً جس ملک پر کسی بدیسی حکومت کا تسلط ہو اور جس کے ذہن میں آزادی کی مسلسل جدوجہد اور اس کے مصائب کی تلخ یاد ہنوز تازہ ہو اس سے اور کس فیصلے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس سے پیشتر

برطانیہ اور فرانس نے جمہوری اسپین اور چیکوسلوویکیہ سے غداری کر کے اپنے قومی مفاد کی قربانگاہ پر بین الاقوامیت کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اگرچہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ جس کو برطانیہ اور فرانس بزعم خویش قومی مفاد سمجھے ہوئے تھے وہ دراصل قومی مفاد نہ تھا۔ امریکہ کو اگرچہ انگلستان، فرانس اور چین کے کے ساتھ صریحی ہمدردی تھی اور وہ نازیت اور جاپانی عسکریت سے متنفر بھی تھا مگر وہ اپنے الگ تھلگ رہنے کے اصول پر سختی سے عامل رہنا چاہتا تھا لیکن پرل ہاربر کے واقعے نے امریکہ کو زبردستی میدان جنگ میں دھکیل دیا۔ سوویٹ روس جو بظاہر بین الاقوامیت کا زبردست حامی تھا سختی سے اپنی پالیسی پر عمل پیرا تھا اور اس کا یہ رویہ اس کے بہت سے دوستوں اور بہی خواہوں کے لئے حیرت کا موجب بنا ہوا تھا۔ جرمن فوجوں کے اچانک اور غیر متوقع حملے نے روس کو بھی میدان جنگ میں آنے پر مجبور کر دیا۔ سویڈن، ناروے، ہالینڈ اور بیلجیم نے جنگ سے علیحدہ رہنے اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی بیکار کوشش کی مگر آخر کار ان میں سے کوئی بھی جنگ کے شعلوں کی لپیٹ سے نہ بچ سکا۔ ادھر ٹرکی اپنی قومی پالیسی کے پیش نظر پانچ سال تک اپنی متلون غیر جانبداری کی خطرناک چٹان پر بیٹھا ہوا تماشا دیکھتا رہا۔ رہا مصر جس کی سرزمین پر لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں اس کا رویہ بہت عجیب و غریب تھا۔ وہ بظاہر ایک آزاد ملک کی حیثیت رکھتا تھا مگر دراصل اس کی حیثیت ایک نوآبادی کی سی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے جنگ میں شریک تھا اور اس ملک پر اتحادی فوجیں پورے طور پر قابض تھیں مگر دنیا کے دکھانے کے لئے اس کا شمار متحارب ملکوں میں نہیں تھا۔ مختلف ملکوں اور حکومتوں نے اپنے لئے جو کچھ بھی پالیسی اختیار کی اسے ایک طرح سے جائز قرار دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ کوئی جمہوری حکومت اپنے ملک

کے لوگوں کی تیاری اور ان کے تعاون کے بغیر جنگ میں یکایک نہیں کود سکتی بلکہ کسی مطلق العنان ملک کو بھی جنگ میں شریک ہونے کے لئے وجہ جواز تلاش کرنا پڑتی ہے لیکن وجہ جواز یا سبب کچھ بھی کیوں نہ ہو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب کسی ملک یا قوم کو کسی ایسے نازک موقعے سے دوچار ہونا پڑا ہے تو اس وقت صرف قومی مفاد کا خیال پیش پیش رہا ہے اور دوسرے تمام وہ خیالات جو قومی مفاد کے مطابق نہیں ہوتے نظر انداز کر دئے جاتے ہیں مگر عہد نامہ میونک کے موقعے پر یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ یورپ میں بے شمار بین الاقوامی انجمنیں اور فسطائیت کی مخالف جماعتیں کس طرح خاموش اور بے اثر ہو کر رہ گئیں۔ افراد اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو بین الاقوامیت کا رنگ دے کر اپنے ذاتی بلکہ بظاہر قومی مفاد کو بھی کسی بڑے مقصد کے لئے قربان کرنے کو تیار ہو جائیں مگر قوموں سے یہ توقع رکھنا فضول ہے۔ قوموں میں تو جوش و خروش اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ بین الاقوامی مفاد قومی مفاد کے عین مطابق ہو۔ کچھ مہینے گزرے لندن کے مشہور جریدہ "اکانومسٹ" نے برطانوی خارجی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا "ہماری خارجی پالیسی جس کے متعلق یہ امید کی جا سکے کہ اس پر ہمیشہ عمل کیا جا سکے گا صرف وہی ہو سکتی ہے جس میں ہمارے قومی مفاد کے لئے پورے طور پر واضح تحفظات موجود ہوں" حقیقت یہ ہے کہ کوئی قوم بین الاقوامی مفاد کو اپنے قومی مفاد پر ترجیح دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ بین الاقوامیت کا جذبہ اسی حالت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ قومی اور بین الاقوامی مفاد ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہوں۔

درحقیقت بین الاقوامیت کا جذبہ صرف آزاد ملکوں کے لوگوں ہی

میں پایا جاسکتا ہے کیونکہ محکوم ملکوں کے لوگوں کی تمام قوت فکر و عمل اپنی آزادی کے حصول کے لئے وقف ہوتی ہے۔ اس محکومیت کی مثال جسم میں سرطان کے پھوڑے کی سی ہے جو کہ نہ صرف اعضا کو تندرست رہنے سے روکتا ہے بلکہ اس کا اثر دل و دماغ پر بھی ہوتا ہے اور مریض کی تمام فکری اور عملی قوتوں کو متاثر کرتا ہے۔ کش مکش اس کا جزو لاینفک ہے اور یہ کش مکش تمام فکری قوتوں کو ایک ہی نقطے پر مجتمع کر کے دوسرے اہم ترین مقاصد کے مسائل کو نظرانداز کر دیتی ہے۔ زمانۂ گذشتہ کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کی یاد شخصی اور قومی ذہن میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے اور یہ چیز دل پر وہم بن کر چھا جاتی ہے۔ اور جب تک اس کے بنیادی سبب کو رفع نہ کیا جا سکے یہ وہم کسی طرح قابو میں نہیں آتا۔ بلکہ محکومی کے اثرات زائل ہونے کے بعد بھی صحت کی رفتار بہت آہستہ ہوتی ہے کیونکہ روحانی زخموں کے اندمال میں جسمانی زخموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عرصہ لگتا ہے۔

یہ تھا ہندوستان کے حالات کا پس منظر۔ لیکن پھر بھی مہاتما گاندھی نے ہماری قومی تحریک کو ایک ایسا رنگ دے دیا جس سے مایوسی اور منافرت باہمی میں بہت کمی پیدا ہو گئی۔ اگرچہ ان جذبات کا کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ جس حد تک ہماری قومی تحریک منافرت کے جذبے سے خالی ہے کسی اور ملک میں اس کی مثال نہیں پائی جاتی۔ گاندھی جی ایک پکے قومیت پرست تھے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ صرف ہندوستان ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے ایک پیغام لے کر آئے ہیں اور اسی لئے ان کے دل میں ایک عالمگیر امن و امان کی تڑپ تھی۔ قوم پرستی کے جذبات کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں اقوام عالم کی محبت تھی اور ان کا ذہن جارحانہ

تخیل سے یکسر خالی تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی خواہش کے ساتھ ان کا
یہ بھی عقیدہ تھا کہ دنیا میں آزاد ملکوں کا وفاق قائم کرنا ہمارا مقصد ہونا چاہئے
اگرچہ یہ مقصد بظاہر کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو۔ انھوں نے کسی موقع پر اپنے
خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "میرا قوم پرستی کا عقیدہ یہ ہے کہ میرا
ملک آزاد ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ہی اگر نسل انسانی کی بقا اور بہبودی
کے لئے ضرورت پڑے تو میرے ملک کا ہر باشندہ اپنی جان تک قربان کر دے
نسلی منافرت کے لئے ہمارے عقیدے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمارا قومیت
پرستی کا یہی تخیل ہے۔"

کسی اور موقع پر ایک مرتبہ کہا "میں ہمیشہ تمام دنیا کی بھلائی کے لئے
سوچتا ہوں۔ میری حب الوطنی میں تمام دنیا کے لوگوں کی بھلائی شامل ہے۔
اسی لئے میں ہندوستان کی خدمت میں تمام دنیا کی خدمت کو شامل سمجھتا ہوں۔
دنیا کی بڑی ریاستوں کا مقصد ایسی آزادی نہیں جس میں ایک ملک دوسرے
ملک سے بے تعلق ہو بلکہ خود اپنی مرضی سے ایک دوسرے کا پابند ہونا۔ دنیا کا
بہتر طبقہ ایسی خود مختار ریاستیں نہیں چاہتا جو ایک دوسرے سے برسر پیکار
رہیں بلکہ ان کا مقصد ایک ایسا عالمگیر وفاق ہے جو خود مختار ملکوں کو دوستی کے رشتے
میں منسلک کر دے۔ یہ ایک ایسی خواہش ہے جس کی تکمیل ممکن ہے یا شاید
نہ ہو سکے۔ میں اپنے ملک کی طرف سے کوئی بلند دعویٰ نہیں کرنا چاہتا لیکن
اپنی اس خواہش کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ ہم دنیا سے بے تعلقی
کی آزادی کی بجائے آزاد ملکوں کے ایک عالمگیر نظام میں شامل ہونے کے
خواہش مند ہیں جہاں سب ملک ایک دوسرے کے پابند ہوں۔ میں یہ ضرور
چاہتا ہوں کہ میرا ملک پورے طور پر آزاد ہو لیکن یہ آزادی کسی دوسرے ملک پر

جبر کی صورت میں نہ استعمال کی جائے "
جوں جوں ہماری قومی تحریک بڑھتی گئی اور تحریک میں خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ آزاد ہندوستان کس قسم کا ہوگا۔ اس کو کس قسم کے اختیارات ہوں گے اور دوسرے ملکوں کے ساتھ اس کے کیسے تعلقات ہوں گے؟ ملک کی وسعت اور ہمہ گیر وسائل کی بنا پر لوگوں نے بڑے بڑے اندازے لگانا شروع کئے۔ ہندوستان کسی خاص ملک یا قوموں کے خاص گروہ کا محض طفیلی بن کر رہنا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ اپنی آزادی سے نہ صرف ایشیا بلکہ تمام دنیا کی سیاست میں ایک زبردست انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے ذہن میں مکمل خود اختیاری حکومت کا تصور پیدا ہو گیا جو کہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتی تھی جبکہ برطانیہ اور اس کی سلطنت سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر دیا جائے۔ وہ درجۂ نو آبادیات کو خواہ وہ حکومت خود اختیاری سے کتنا ہی نزدیک کیوں نہ ہو ایک مہمل اور محدود شے سمجھنے لگے۔ ان کے خیال میں یہ چیز آزادی کی مکمل نشوونما میں ایک رکاوٹ ثابت ہو سکتی تھی۔ درجۂ نو آبادیات کے اگر یہ معنی سمجھے جائیں کہ تمام نو آبادیاں مادری ملک کے ساتھ ایک قریبی رشتے میں منسلک ہوں اور ان سب کا ایک ہی تہذیبی پس منظر ہو تو اس کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ اگر درجۂ نو آبادیات کا مفہوم ایک بڑے پیمانے پر بین الاقوامی تعاون سے ہے تو یہ چیز ہمارے لئے قابل قبول ہو سکتی تھی لیکن چونکہ اس کا پہلو یہ بھی تھا کہ ان ملکوں کے ساتھ جو اس خاص جمہوری نظام میں شامل نہیں ہیں ہندوستان کا تعلق محض برائے نام ہوگا اس لئے درجۂ نو آبادیات کا مفہوم محدود ہو کر رہ جاتا تھا اور ہمارا نظریہ چونکہ مستقبل کے متعلق نہایت امید افزا

تھا اس لئے ہم ان حدود کے پابند نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ ایک زیادہ وسیع پیمانے پر دوسری قوموں کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے۔ ہمارا مقصد اپنے مشرقی اور مغربی ہمسایہ ملکوں سے گہرے تعلقات پیدا کرنا تھا جن میں چین افغانستان، ایران اور سوویٹ روس خاص طور پر شامل ہیں۔ بلکہ ہم امریکہ سے بھی اگرچہ وہ ہم سے بہت دور ہے، قریبی تعلقات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ جس طرح ہم روس سے کچھ سیکھنا چاہتے تھے اسی طریقے پر بہت کچھ امریکہ سے بھی سیکھ سکتے تھے۔ مگر لوگوں کا یہ عام احساس تھا کہ ہمیں اب انگلستان سے کچھ اور نہیں سیکھنا ہے ہمارے لئے انگلستان سے فائدہ اٹھانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنی موجودہ ناخوشگوار بندشوں کو توڑ کر اس کے ساتھ مساویانہ تعلقات پیدا کرلیں۔

نوآبادیات کے نظام سے علیحدہ ہونے کا ہم نے جو ارادہ کیا تھا اس کی بڑی وجوہات برطانوی مقبوضات اور نوآبادیات میں ہندوستانیوں کے ساتھ نسلی امتیاز اور حقارت آمیز برتاؤ تھا۔ خاص طور پر جنوبی افریقہ کے واقعات ہمیں برابر اشتعال دیتے رہتے تھے اور چونکہ شمالی افریقہ اور کینیا براہ راست برطانوی نوآبادی پالیسی کے ماتحت تھے، اس لئے وہاں کے حالات اور بھی خراب تھے۔ یہ سن کر تعجب ہوگا کہ انفرادی حیثیت سے ہمارے تعلقات کنیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لوگوں سے بہت خوشگوار تھے کیونکہ وہ ایک نئی قسم کی روایات کے حامل تھے اور ان میں برطانیہ کی سماجی قدامت پسندی اور مختلف قسم کے تعصبات نہیں تھے۔

جب ہم ہندوستان کی آزادی کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد ایسی خود مختار حکومت سے نہیں ہوتی جو بالکل الگ تھلگ ہو ہم غالباً دوسرے

ملکوں کی نسبت کہیں زیادہ بہتر طور پر اس چیز کو سمجھتے تھے کہ پرانی قسم کی قومی حکومت خود اختیاری کے معنی ایک طرح کی تباہی کے ہیں اس کے برعکس اس نئے زمانے میں اقوام عالم کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل بہت ضروری ہے اس لئے ہم نے بار بار اس امر کی وضاحت کی کہ ہم اپنی قومی آزادی کو دوسری آزاد قوموں کے مانند ایک بین الاقوامی نظام کے ماتحت محدود کر دینے کے لئے قطعی آمادہ ہیں۔ سب سے بہتر ہمارے نزدیک یہ صورت ہو گی کہ اس بین الاقوامی نظام میں ساری دنیا یا کم سے کم اس کا بہت بڑا حصہ شامل ہو۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مختلف جغرافی خطوں کے کئی نظام ہوں مگر برطانوی کامن ویلتھ ان دونوں مجوزہ صورتوں میں سے کہیں بھی نہیں آتی۔ ہاں البتہ یہ کسی ایک بڑے نظام کا جزو ہو سکتی ہے۔

یہ امر موجب حیرت ہے کہ ہم اپنی انتہائی قومیت پرستی کے باوجود بین الاقوامیت کی طرف کس قدر مائل ہیں۔ کسی محکوم ملک کی قومی تحریک اس معاملے میں ہماری قومی تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ عام طور پر تمام محکوم ملکوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ بین الاقوامی پابندیوں سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایسے حضرات تھے جو اس بات پر اعتراض کرتے تھے کہ ہم جمہوری اسپین اور چین، ابی سینیا اور چیکوسلوویکیہ سے کیوں اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں اٹلی، جرمنی اور جاپان جیسی طاقت ور قوموں کی مخالفت مول لینا نہیں چاہئے۔ بلکہ برطانیہ کے ہر دشمن کو اپنا دوست سمجھنا چاہئے۔ بقول ان کے سیاست میں اصول پرستی کی گنجائش نہیں اسے تو اس سے مطلب ہے کہ طاقت حاصل کرے اور مناسب موقعے پر استعمال کرے۔ مگر اس قسم کے معترضین اپنی آواز زیادہ نہ اٹھا سکے کیونکہ کانگریس نے

اس چیز کے خلاف رائے عامہ پیدا کر دی تھی۔ مسلم لیگ نے اس دوران میں وضع احتیاط کو پوری طرح نبھایا اور کسی بین الاقوامی مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ ۱۹۳۸ء میں کانگریس نے ایک طبی وفد چین کے لوگوں کے لئے بھیجا۔ جس میں بہت سے ڈاکٹر، بہت سا طبی سامان اور ادویات شامل تھیں۔ کئی سال تک یہ وفد بہت مفید کام انجام دیتا رہا۔ اس زمانے کا ذکر ہے جبکہ سبھاش چندر بوس کانگریس کے صدر تھے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ کانگریس کوئی ایسا قدم اٹھائے جو جاپان، جرمنی یا اٹلی کے خلاف ہو اس کے باوجود کانگریس اور ملک کے اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سبھاش چندر بوس وفد کے بھیجے جانے کے مخالف نہیں ہیں چنانچہ کانگریس وقتاً فوقتاً مختلف صورتوں میں چین اور دوسرے ملکوں کے ساتھ جو نا انصافیت اور فسطائیت کے ستائے ہوئے تھے اظہار ہمدردی کرتی رہی اور انھوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ ان کی صدارت میں ہم نے اس قسم کی بہت سی تجاویز منظور کیں اور بہت سے مظاہرے کئے جن کو وہ پسند نہیں کرتے تھے مگر انھوں نے چپ چاپ مان لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان خیالات کو عوام کی حمایت حاصل ہے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کے ارکان اور سبھاش چندر بوس کے درمیان بہت سے ملکی اور غیر ملکی مسائل پر زبردست اختلاف تھا اور ۱۹۳۹ء کے آغاز میں اس اختلاف نے شدید صورت اختیار کر لی۔ اب انھوں نے کھلم کھلا کانگریس کی پالیسی پر اعتراضات کرنے شروع کر دئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگست ۱۹۳۹ء میں کانگریس کو ایک غیر معمولی قدم اٹھانا پڑا جبکہ اس نے اپنے سابق صدر کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔

۲ - کانگریس اور دوسری عالمگیر جنگ

اس طریقے پر کانگریس نے لڑائی کے متعلق اپنی ایک دو رنگی پالیسی قائم کی اور اُسے بار بار دُہرایا۔ اس پالیسی کی رو سے کانگریس ایک طرف فسطائیت نازیت اور جاپانی عسکریت کی مخالف تھی اس لئے کہ وہ ان کے اندرونی نظام کو بھی ناپسند کرتی تھی اور دوسرے ملکوں کے متعلق ان کے جارحانہ منصوبوں کو بھی۔ کانگریس کو ان ملکوں کے اُن مظلوموں سے بے انتہا ہمدردی تھی جو جارحانہ حملوں کی زد میں آچکے تھے اور اس ظلم و استبداد کو روکنے کے لئے ہر امکانی کوشش میں حصہ لینے کو تیار تھی یہاں تک کہ اس مقصد کے لئے اسے جنگ میں شریک ہونا بھی منظور تھا۔ دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کا زبردست سوال درپیش تھا۔ ہمارے لئے یہ مسئلہ صرف اسی وجہ سے اہم نہیں تھا کہ آزادی ہمارا وہ بنیادی مقصد ہے جس کے لئے ہم برسوں سے جدوجہد کر رہے ہیں بلکہ آنے والی جنگ کے امکانات نے اسے اور بھی اہمیت دے دی تھی ہم بار بار یہ اعلان کر چکے تھے کہ صرف آزاد ہندوستان ہی جنگ میں شریک ہو سکتا ہے اور صرف آزادی ہی وہ چیز ہے جو برطانیہ کے ساتھ گزشتہ تلخ تعلقات کو ہمارے ذہن سے مٹا سکتی ہے اور جس کے ذریعے سے ہم لوگوں میں حقیقی جوش پیدا کر کے اپنے زبردست ملکی وسائل کو بروئے کار لا سکتے ہیں ورنہ آزادی کے بغیر ہمارے لئے یہ لڑائی بھی پچھلی لڑائیوں جیسی ہوگی جن میں حریف طاقتیں سامراجی اغراض کی خاطر جنگ آزما ہوتی تھیں اور ان کا مقصد شہنشاہیت کا بچاؤ اور اسے برقرار رکھنا تھا ہمارے لئے یہ بات خلاف عقل اور ناممکن تھی کہ جس شہنشاہیت کے خلاف ہم اتنے عرصے سے جنگ آزما تھے

اب اسی کی حمایت میں صف آرا ہو جائیں اور اگر ہم میں سے کچھ لوگ کسی اعلیٰ مقصد کے پیش نظر اس کو دو برائیوں میں کمتر درجے کی برائی سمجھ کر اختیار بھی کر لیتے تو عوام کو اپنے ساتھ لینا ان کی طاقت سے بالکل باہر تھا۔ صرف آزادی ہی ایسی چیز تھی جو عوام کی قوت بروئے کار لا کر گزشتہ تلخی کو جوش عمل میں تبدیل کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہ تھا۔ کانگریس نے اس بات کا واضح طور پر مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو اس کے باشندوں یا ان کے نمائندوں کی مرضی کے خلاف جنگ میں شریک نہ کیا جائے اور ہندوستانی فوجیں لڑنے کے لئے سمندر پار نہ بھیجی جائیں۔ مرکزی مجلس واضع قوانین نے بھی جس میں مختلف گروہ اور سیاسی پارٹیاں شامل تھیں اس قسم کا مطالبہ پیش کیا۔ ہندوستان کے لوگوں کو مدت سے یہ شکایت تھی کہ ہندوستانی مسلح فوجوں کو برطانوی شہنشاہی مقاصد کی خاطر سمندر پار لڑنے کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ فوجیں ان لوگوں کے خلاف استعمال ہوتی ہیں جن سے ہمارا کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ہمیں ان کے جذبۂ آزادی کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے چنانچہ موجودہ جنگ سے پہلے بھی ہوا۔ ہندوستانی فوجیں کرائے کے سپاہیوں کی طرح برما، چین، ایران، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے حصوں میں استعمال کی گئیں۔ ان ملکوں میں ہندوستانی سپاہی کو برطانوی شہنشاہیت کی علامت سمجھا جانے لگا اور قدرتی طور پر ان ملکوں کے باشندے ہندوستان سے بدظن ہو گئے۔ مجھے ایک مصر کے باشندے کے یہ سخت الفاظ اچھی طرح یاد ہیں "تم لوگ صرف اپنی ہی آزادی نہیں کھو بیٹھے ہو بلکہ تم دوسرے ملکوں کے لوگوں کو غلام بنانے میں برطانیہ کی مدد کرتے ہو۔"

کانگریس کی ان دورنگی حکمت عملی کے دونوں پہلو ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اس تضاد کے ہم ذمہ دار نہیں تھے۔ اس وقت

کے حالات کا یہی تقاضا تھا۔ ان حالات میں جو پالیسی بھی اختیار کی جاتی اس میں تضاد ہوتا۔ ہم نے اس امر کی طرف توجہ دلائی برطانیہ کے لئے بھی فسطائیت اور نازیت کی مذمت کرنا اور اپنے شہنشاہی اقتدار کو ہاتھ سے نہ دینا دو متضاد چیزیں تھیں۔ اگرچہ یہ صحیح تھا کہ نازی اور فسطائی درندے خوفناک مظالم کے مرتکب ہو رہے تھے اور برطانوی شہنشاہیت ہندوستان اور دوسرے مقامات پر ایک طرح کا توازن حاصل کر چکی تھی لیکن ان دونوں کے درمیان فرق صرف زمانے اور درجے کا تھا نوعیت کے اعتبار سے دونوں چیزیں ایک ہی تھیں۔ اس کے علاوہ نازی اور فسطائی مظالم دور کی چیزیں تھیں جنہیں ہم اخباروں میں پڑھتے تھے۔ برطانوی سامراج کی لعنت ہمارے گھر میں موجود تھی اور ہماری تمام فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ ہم اس پر زور دیتے تھے کہ یہ کس قدر مہمل بات ہے برطانیہ دوسرے ملکوں میں اس جمہوریت کا علم بردار بنتا ہے جس سے ہندوستان میں خود اس نے ہمیں محروم کر رکھا ہے۔

بہر حال ہماری اس دورنگی پالیسی میں کتنا ہی تضاد کیوں نہ ہو یہ بات صاف ظاہر تھی کہ ہمارا عدم تشدد کا عقیدہ ملکی بچاؤ یا کسی حملہ آور کا مقابلہ کرنے میں ہمیں مسلح جنگ کرنے سے نہیں روک سکتا۔

میں ۱۹۳۸ء کے موسم گرما میں یورپ اور انگلستان گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے اپنی تقریروں اور تحریروں اور نجی گفتگو میں کھلے لفظوں میں کانگریس کی وضاحت کی اور اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ معاملات کو ان کے حال پر چھوڑ دینے میں کیا کیا خطرے ہیں۔ جب سوڈیٹن لینڈ کا معاملہ نازک ترین مرحلے پر پہنچ گیا تو چیکوسلوویکیہ کے باشندوں نے جو اس وقت سخت پریشانی میں مبتلا تھے مجھ سے یہ سوال کیا کہ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں ہندوستان کا کیا رویہ ہوگا۔ اس

وقت وہ لوگ زبردست خطرات میں گھرے ہوئے تھے اور ان کے لئے ہماری سیاست کی باریکیوں کو اور ہماری پرانی شکایتوں کو سمجھنا مشکل تھا پھر بھی وہ میرے جواب سے بہت خوش ہوئے اور اس کی معقولیت کے قائل ہو گئے

۱۹۳۹ء کے وسط میں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستانی فوجیں سمندر پار بھیجی گئی ہیں۔ غالباً یہ فوجیں سنگاپور اور مشرقِ وسطیٰ میں بھیجی گئی تھیں۔ ملک میں اس پر خوب لے دے ہوئی کہ لوگوں کے نمائندوں سے پوچھے بغیر ایسا کیوں کیا گیا۔ اگرچہ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ جنگ کے نازک موقعے پر فوجوں کی نقل و حرکت کو صیغۂ راز میں رکھنا ضروری ہوتا ہے پھر بھی قومی رہنماؤں کو راز میں شریک کرنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ مرکزی مجلس واضع قوانین میں پارٹیوں کے لیڈر موجود تھے اور صوبوں میں لوگوں کی نمائندہ حکومت تھی۔ اگرچہ عام حالات میں مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں سے مشورہ کرتی رہتی تھی اور ان کو اپنے رازمیں شریک کر لیتی تھی لیکن اس معاملے میں عوام کے نمائندوں اور قوم کی صریحی خواہش کا مطلق احترام نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس برطانوی پارلیمنٹ میں ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں جس کی رو سے صوبوں میں حکومتیں کام کر رہی تھیں یہ ترمیم کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ جنگ کے نازک حالات کی صورت میں تمام اختیارات مرکزی حکومت کو منتقل کر دئے جائیں۔ عام حالات میں اگر کسی جمہوری ملک میں وہاں کی سیاسی پارٹیوں کی رائے سے کیا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔ اگرچہ عام طور پر وفاقی ریاستیں یا خودمختار صوبے اپنے حقوق کا بہت خیال رکھتے ہیں اور کسی نازک موقعے پر اپنے اختیارات مرکزی حکومت کو آسانی سے دینا نہیں چاہتے۔ چنانچہ دول متحدہ امریکہ کی جمہوری ریاستوں میں ہمیشہ سے یہی کشمکش چلی آتی ہے اور حال ہی میں آسٹریلیا میں

لوگوں نے یہ تجویز کہ جنگ کے دوران میں جنگی مقاصد کے لئے صوبوں کے
بعض اختیارات مرکزی جمہوری حکومت کے حوالے کر دئے جائیں ماننے
سے انکار کر دیا حالانکہ امریکہ اور آسٹریلیا کی مرکزی حکومت اور مجالس واضع
قوانین میں ان صوبوں اور ریاستوں کے منتخب نمائندے شامل ہیں۔ اس کے
برعکس ہندوستان میں مرکزی حکومت مدت سے بالکل غیر ذمہ دارانہ اور
جابرانہ طرز کی ہے۔ وہ جمہور کی منتخب کی ہوئی اور وہ عوام اور صوبوں کے سامنے
جواب دہ نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت حکومت برطانیہ کے ایجنٹ کی ہے۔
صوبائی حکومتوں اور ان کی مجالس واضع قوانین سے اختیارات لے کر اس
قسم کی مرکزی حکومت کے اختیارات بڑھا دینا عام پسند صوبائی حکومتوں کو
کمزور بنا دینا اور صوبائی خود اختیاری کی جڑیں کاٹنا تھا۔ چنانچہ اس کی زبردست
مخالفت کی گئی۔ عوام کا خیال تھا کہ کانگریس نے جن ضمانتوں کے تحت میں حکومت
چلانے کی ذمہ داری لی تھی اس تجویز سے ان کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے۔
اور یہ بھی اندیشہ تھا کہ پہلے کی طرح اس جنگ میں بھی عوام کے منتخب نمائندوں
کے مشورے کے بغیر ہندوستان کو زبردستی دھکیل دیا جائے گا۔

کانگریس کی مجلس عاملہ نے حکومت برطانیہ کی اس پالیسی کی پر زور
مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح سے کانگریس اور مرکزی اسمبلی کی توہین
کی جارہی ہے چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ کانگریس اس قسم کی زبردستی کے
خلاف ہے اور وہ اس بات پر ہرگز رضامند نہیں ہو سکتی کہ لوگوں کی مرضی کے
بغیر ہندوستان کو ایسی سیاسی مصلحتوں کا جن کے نتائج بہت دور رس ہوں
پابند بنا دیا جائے۔ اگست ۱۹۳۹ء کے شروع میں کانگریس نے پھر اعلان
کیا کہ "دنیا کے اس نازک دور میں مجلس عاملہ کی ہمدردی قطعی طور پر ان لوگوں

کے ساتھ ہے جو آزادی اور جمہوریت کے مقصد کی حمایت میں کھڑے ہوئے ہیں چنانچہ کانگریس بار بار یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مشرق بعید میں فسطائیت کے جارحانہ اقدام کی مذمت کر چکی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اس غدارانہ پالیسی کی بھی مذمت کرتی ہے جو برطانیہ نے جمہوری اسپین اور چیکوسلوویکیہ کے ساتھ ہوتی ہے۔" اس کے علاوہ اس تجویز میں یہ بھی کہا گیا کہ برطانیہ کی گذشتہ پالیسی اور موجودہ واقعات واضح طور پر بتلا رہے ہیں کہ یہ حکومت آزادی اور جمہوریت کی حامی نہیں ہے بلکہ یہ ان اصولوں سے ہر وقت غداری کی مرتکب ہو سکتی ہے اس لئے ہندوستان ایسی حکومت کے ساتھ ہرگز تعاون کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے، اور نہ وہ اپنے ملکی وسائل اس جمہوری آزادی کی حمایت کے لئے پیش کر سکتا ہے جس سے خود اس کو محروم رکھا جا رہا ہے اور جس کے ساتھ غداری برتے جانے کا اندیشہ ہے۔" برطانیہ کی اس پالیسی کے خلاف کانگریس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ کانگریسی ممبران اسمبلی کو اگلے اجلاس میں شامل ہونے سے منع کر دیا گیا۔

اس آخری تجویز کے منظور کرنے کے تین ہفتے بعد ہی یورپ میں جنگ چھڑ گئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند دونوں اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ نہ صرف جنگی نازک مسائل میں بلکہ معمولی باتوں میں بھی ہندوستانی رائے عامہ کی مطلق پروا نہ کی جائے۔ چنانچہ مختلف صوبوں میں گورنروں اور سول افسران نے اسی پالیسی کے تحت میں کانگریسی حکومتوں سے تعاون کرنا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے کانگریسی صوبائی حکومتوں کو بڑی دشواریاں پیش آئیں اور عوام کے ذمہ دار حلقے اس چیز کو تشویش کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ انھیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو برطانیہ وہی رویہ

اختیار کرنے جو اس نے اب سے ۲۵ سال پہلے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں اختیار کیا تھا اور صوبائی حکومتوں اور رائے عامہ کے خلاف ہندوستان کو لڑائی میں دھکیل کر اس سیاسی ترقی کو جو اس دوران میں ہوئی ہے ختم کر دے اور ہماری تھوڑی بہت آزادی کو کچل کر ہمارے ذرائع اور وسائل سے بے روک ٹوک کام لینے لگے۔

لیکن اس پچیس سال کے عرصے میں ہندوستان میں بہت کچھ تبدیلی ہو چکی تھی۔ اب یہاں کے لوگ پہلے سے بالکل مختلف تھے انھیں شدت سے ناگوار تھا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کو ایک قسم کی جائداد منقولہ سمجھا جائے اور لوگوں کی رائے کو حقارت سے ٹھکرا دیا جائے۔ دیکھنا یہ تھا کہ کیا پچھلے پچیس سال کی جدوجہد اور قربانیاں بیکار چلی جائیں گی اور ہندوستان کے لوگ چپ چاپ بے عزتی برداشت کرلیں گے اور اس طرح مادر وطن کو رسوا کریں گے! بہت سے لوگوں میں ظلم اور بدی کا مقابلہ کرنے کی جرأت پیدا ہو چکی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ جہاں عزت کا سوال ہو وہاں ہرگز نہیں دبنا چاہیے چنانچہ وہ خوشی کے ساتھ حکومت برطانیہ کی مخالفت کے نتائج برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

اس کے علاوہ کچھ نوجوان لوگوں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس کو قومی تحریک اور لوگوں کی قربانیوں کا ذاتی علم نہ تھا ان کے نزدیک ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریکیں بھولے بسرے واقعات سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھیں، چونکہ انھیں خود آزمائش سے گزرنا نہیں پڑا تھا اس لیے وہ اکثر باتوں پر بغیر سوچے سمجھے اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ پرانے لوگوں پر زبردست اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے تھے اور ان کو کمزور، بزدل اور مصالحت پسند سمجھتے تھے ان کا

خیال تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے محض دھواں دھار تقریریں ہی کافی ہیں عمل کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر شخصی قیادت، سیاست اور معاشیات کے باریک اور پیچیدہ مسائل پر آپس میں جھگڑتے رہتے تھے وہ اگرچہ دنیا کے حالات سے باخبر نہیں تھے مگر ان پر بحث ضرور کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ناتجربے کار تھے اور ان میں پختگی اور متانت کی کمی تھی۔ اگرچہ ان میں بہت سی خوبیاں تھیں اور ملکی آزادی کے لئے جوش و خروش تھا لیکن مجموعی طور پر بڑی مایوسی ہوئی ممکن ہے یہ ایک عارضی کیفیت ہو جو دور ہو جائے بلکہ شاید ان تلخ تجربات کی وجہ سے جو انھیں اس زمانے میں ہوئے پہلے ہی دور ہو چکی ہو۔

قوم پرستوں کے ان حلقوں میں جو کانگریس کے اندر تھے اور معاملات میں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں مگر انگریزوں کی اس پالیسی کی جو انھوں نے ہندوستان کے ساتھ ہر ایک مرحلے پر برتی سب نے یکساں مذمت کی۔ انھیں اس پر بڑا غصہ آیا اور انھوں نے کانگریس پر زور دیا کہ وہ حکومت برطانیہ کا مقابلہ کرے اس لئے کہ ایک خوددار قومی تحریک اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس مسئلے کے مقابلے میں اور سب چیزوں نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی۔

یورپ میں جنگ کا چھڑنا تھا کہ وائسرائے نے فوراً ہندوستان کی طرف سے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک فرد واحد اور وہ بھی غیر ملک کا باشندہ اور اس نظام سلطنت کا نمائندہ جو ملک میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو کس طرح سے چالیس کروڑ انسانوں کو ان سے ذرا مشورہ کئے بغیر جنگ میں دھکیل سکتا ہے۔ ایسا نظام حکومت جس کی رو سے

کروڑوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ اس طرح کر دیا جائے یقیناً فرسودہ اور قابل اصلاح ہے۔

دوسری نوآبادیات میں اس بات کا فیصلہ عوام کے نمائندوں نے پورے بحث مباحثے کے بعد مختلف پہلوؤں پر غور کر کے کیا۔ مگر ہندوستان میں ایسا بالکل نہیں ہوا یہی بات لوگوں کو سخت ناگوار گزری۔

۳ - جنگ کا رد عمل

جب یورپ میں لڑائی ہوئی میں چنکنگ میں تھا۔ کانگریس کے صدر نے مجھے تار دیا کہ میں فوراً واپس آجاؤں چنانچہ میں اسی وقت واپس آگیا۔ جس وقت میں پہنچا کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں مسٹر جناح کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی مگر انھوں نے معذرت دی۔ وائسرائے نے نہ صرف باقاعدہ طور پر ہندوستان کو جنگ میں شریک کر دیا تھا بلکہ بہت سے مختلف ہنگامی قانون بھی جاری کر دئے تھے اور برطانوی پارلیمنٹ نے حکومت ہند کا ترمیمی بل منظور کر لیا تھا ان قوانین کا یہ نتیجہ ہوا کہ صوبائی حکومتوں کے اختیارات بہت محدود ہو کر رہ گئے چونکہ عوام کے نمائندوں سے اس سلسلے میں قطعاً مشورہ نہیں کیا گیا اس لئے لوگوں نے احتجاج کیا حکومت نے عوام کے جذبات اور ان کے واضح اعلانات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

آخر بہت بحث مباحثہ کے بعد ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس نے جنگ کے متعلق ایک لمبا چوڑا بیان شائع کیا وائسرائے کے اقدامات اور نئے ہنگامی قوانین کا ذکر کرتے ہوئے اس بیان میں کہا گیا "کہ مجلس عاملہ ان اقدامات

کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے"۔ اس بیان میں فسطائیت اور نازیت کی اور خاص طور پر پولینڈ میں جرمنی نازی حکومت کے جارحانہ اقدامات کی مذمت کی گئی اور جو لوگ یورپ میں ان کا مقابلہ کرتے ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا۔

اس اعلان میں یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ جہاں ایک طرف کانگریس تعاون کا ہاتھ بڑھا رہی ہے، وہاں یہ بات جتا دینا ضروری سمجھتی ہے " کہ اگر کوئی فیصلہ زبردستی ہمارے سر منڈھا گیا تو ہم اس کی مخالفت کریں گے "۔ اگر کسی نیک مقصد کے لئے تعاون درکار ہو تو وہ زبردستی اور جبر سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اور مجلس عاملہ اس امر سے اتفاق نہیں رکھتی کہ ہندوستان کے باشندوں کو ان احکامات کی تعمیل کرنا چاہیئے جو ایک غیر ملکی حکومت نے صادر کئے ہیں اس کے علاوہ شرکت عمل دو مساوی طاقتوں کے درمیان باہمی رضامندی سے اس مقصد کے لئے ہو سکتی ہے جس کو دونوں طاقتیں جائز اور نیک سمجھتی ہوں۔ چونکہ حال ہی میں ہندوستان کے لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے اور ہندوستان میں آزاد جمہوری سلطنت قائم کرنے کے لئے زبردست خطروں کا مقابلہ کیا ہے اور خوشی کے ساتھ بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اس لئے قدرتی طور پر ان کی ہمدردیاں جمہوریت اور آزادی کے ساتھ ہیں۔ مگر ہندوستان ایسی لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتا جس کے متعلق یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ جمہوریت آزادی کے لئے لڑی جا رہی ہے جبکہ خود ہندوستان کو آزادی سے محروم رکھا جا رہا ہے بلکہ جو کچھ تھوڑی بہت آزادی اسے حاصل تھی بھی وہ بھی اس سے چھینی جا رہی ہے۔

" مجلس عاملہ اس بات کو بخوبی جانتی ہے کہ برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں

نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ جمہوریت اور آزادی کے لئے لڑ رہی ہیں اور جارحانہ ظلم و تعدی کا خاتمہ کرنا چاہتی ہیں مگر گزشتہ واقعات کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں کہ زبانی لفظوں اور دعوؤں میں اور حقیقی مقصد اور ارادوں میں زمین آسمان کا فرق ظاہر ہوتا ہے"، آگے چلکر گزشتہ عالمگیر جنگ اور اس کے بعد کے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے قرارداد میں کہا گیا کہ "بعد کے واقعات نے نئے سرے سے یہ ثابت کر دیا کہ جن مقاصد کا بظاہر بڑے جوش و خروش کے ساتھ اعلان کیا گیا انھیں کس قدر شرمناک طریقے سے نظر انداز کر دیا گیا اب پھر یہ کہا جا رہا ہے کہ جمہوریت خطرے میں ہے اور اسے ضرور بچانا چاہیئے۔ جہاں تک اس بیان کے اس حصے کا تعلق ہے مجلس عاملہ کو اس سے پورا اتفاق ہے۔ اور ساتھ ہی مجلس یہ یقین بھی رکھتی ہے کہ مغرب کے باشندے آزادی اور جمہوریت کے نام سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور ان مقاصد کے لئے وہ قربانیاں دینے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ ان اصولوں کی خاطر قربانیاں دے چکے ہیں ان لوگوں کو اور ان کے جذبات اور اصولوں کو برابر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور ان سے غداری کی گئی ہے"۔

اگر جنگ کا مقصد موجودہ طاقتوں کا توازن، شہنشاہی مقبوضات، نوآبادیات اور خاص خاص لوگوں کے مفاد کو قائم رکھنا ہے تو ہندوستان کا ایسی جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر اس کا مقصد جمہوریت اور دنیا میں جمہوریت کے اصولوں پر نیا نظام قائم کرنا ہے تو ہندوستان کو اس جنگ سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ مجلس عاملہ کو اس امر کا بھی یقین ہے کہ ہندوستانی جمہوریت کے مفاد برطانوی جمہوریت یا دنیا کی جمہوریت سے

مختلف نہیں ہیں۔ مگر جمہوریت میں خواہ ہندوستان کی ہو یا کہیں اور کی، سامراج اور فسطائیت میں ایک ایسا زبردست اختلاف ہے جس کو کبھی نہیں مٹایا جا سکتا اگر برطانیہ کا جنگی مقصد جمہوریت کو قائم رکھنا اور اس کو پھیلانا ہے تو اس کو لازمی طور پر اپنے مقبوضہ ممالک میں سامراج کو ختم کر دینا چاہیئے۔

اس حالت میں ایک آزاد جمہوری ہندوستان دوسری آزاد قوموں کے ساتھ جارحانہ حملوں کی روک تھام اور اقتصادی تعاون کے لئے خوشی خوشی شریک ہوگا۔ وہ دنیا کے ایک ایسے نئے نظام کے قائم کرنے میں عملی حصہ جس کی بنیاد آزادی اور جمہوریت پر ہو اور جو نوع انسان کی ترقی کے لئے تمام دنیا کے علوم اور وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔

اگرچہ کانگریس کی مجلس عاملہ قومیت پرست جماعت تھی لیکن اس کا نقطۂ نظر بین الاقوامی تھا اور وہ جنگ کو صرف مسلح فوجوں کا مقابلہ ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم چیز سمجھتی ہے۔ تجویز میں آگے چل کر کہا گیا ہے۔ "یورپ میں جو نازک صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس کا تعلق صرف یورپ ہی سے نہیں ہے بلکہ تمام بنی نوع انسان سے ہے پچھلی لڑائیوں کی طرح یہ نہیں ہوگا کہ اس بحران کے گزرنے کے بعد کہ دنیا کا موجودہ نظام جوں کا توں قائم رہے۔ بلکہ دنیا سیاسی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے ایک نئے سانچے میں ڈھلے گی۔ وہ نیا سانچہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ دراصل موجودہ صورت حال ان سماجی اور سیاسی اختلافات کا نتیجہ ہے جو پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے برابر بڑھتے چلے آئے ہیں جب تک یہ اختلافات دور نہ ہو جائیں گے اور ایک نیا توازن قائم نہ کیا جائے گا یہ جھگڑے ختم نہیں ہوں گے۔ یہ نیا توازن صرف اس

بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے کہ ایک ملک کا دوسرے ملک پر غلبہ اور تسلط نہ رہے اور کوئی ملک کسی دوسرے ملک سے بیجا نفع نہ اٹھائے۔ اس کے علاوہ سب ملکوں کے فائدے کا خیال رکھتے ہوئے اقتصادی تعلقات از سر نو زیادہ منصفانہ طریقے پر قائم کئے جائیں۔ ان مسائل میں ہندوستان کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کیونکہ ہندوستان موجودہ سامراج کی ایک نمایاں مثال ہے اور جب تک اس مسئلہ کا حل نہ تلاش کیا جائے دنیا کی کوئی نئی تنظیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کے بے شمار ملکی وسائل کا خیال رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ اس کو دنیا کی تعمیر نو کے کام میں کافی اہم حصہ دیا جائے۔ لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے جبکہ ہندوستان ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنی تمام قوت عمل اس بڑے مقصد کے حصول کے لئے صرف کر دے۔ موجودہ زمانے میں آزادی ناقابل تقسیم ہے۔ اس لئے اگر دنیا کے کسی حصے میں بھی سامراجی تسلط قائم رکھنے کی کوشش کی گئی تو اور خرابیاں پیدا ہوں گی۔

آگے چل کر مجلس عاملہ نے ہندوستانی والیان ریاست کی اس پیش کش کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے یورپ میں جمہوریت کی حمایت کے لئے کی ہے اور اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر والیان ریاست اپنی اپنی ریاستوں میں بھی جہاں خالص شخصی حکومت ہے ایسی جمہوریت کو نافذ کر دیں۔ مجلس عاملہ نے ایک مرتبہ پھر ہر ممکن طریقے سے مدد دینے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ برطانیہ کی گذشتہ اور موجودہ پالیسی کو قابل اطمینان نہیں سمجھتی ہے اس لئے کہ اس پالیسی میں جمہوریت اور آزادی کو فروغ دینے کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ موجودہ جنگ کے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے یا ایسا کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ آگے چل کر اس

بیان میں کہا گیا "اس کی نزاکت کے پیش نظر اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ پچھلے چند روز میں حالات جس قدر تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں۔ انسانی ذہن اتنی تیزی کے ساتھ نہیں سوچ سکتا۔ مجلس عاملہ کی یہ خواہش ہے کہ اس مرحلے پر کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہ کیا جائے تاکہ کچھ دن میں یہ بات صاف ہو جائے کہ جنگ کے اغراض و مقاصد کیا ہیں اور ہندوستان کی موجودہ اور آئندہ حیثیت کیا ہوگی۔ اس لئے وہ برطانیہ کو دعوت دیتی ہے کہ "وہ واضح الفاظ میں بتا دے کہ جمہوریت اور سامراج کے معاملے میں اس کے جنگی مقاصد کیا ہیں، دنیا کے نئے نظام کے متعلق اس کا کیا خیال ہے اور وہ اسے اس وقت ہندوستان میں عملی جامہ پہنانے کے لئے کس حد تک تیار ہے کیا جنگ کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ سامراج کو ختم کر کے ہندوستان کو ایسی آزاد قوم تسلیم کر لیا جائے جو اپنی پالیسی کی تشکیل اپنے لوگوں کی مرضی کے مطابق کر سکے؟ کسی دعوے کی صحت کو جانچنے کا اصلی طریقہ یہی ہے کہ اس کا اطلاق کس حد تک موجودہ حالت میں کیا جا رہا ہے کیونکہ مستقبل کی تشکیل میں موجودہ وقت کو بڑا دخل ہے . . . . . . اگر موجودہ خوفناک جنگ بھی سامراج کے رنگ میں لڑی گئی اور اس کا مقصد اسی موجودہ نظام کو قائم رکھنا ہوا جو بجائے خود لڑائی کا سبب ہے تو یہ ایک نہایت افسوسناک واقعہ ہوگا۔"

یہ بیان بڑے غور و فکر کے بعد شائع کیا گیا اور اس کا مقصد ان رکاوٹوں کو دور کرنا تھا جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان پیدا ہو گئیں تھیں اور جن کی وجہ سے ان ملکوں کے تعلقات ڈیڑھ سو برس سے کشیدہ چلے آتے تھے اس کے علاوہ ایک بڑا مقصد تھا کہ کسی طرح ہم اس عالمگیر جنگ میں شریک ہونے کی خواہش میں اور عوام کے ہوش و خروش اور بے پناہ جذبۂ آزادی میں

مصالحت کر سکیں۔ ہندوستان کا اپنے حق آزادی کو جتانا کوئی نئی بات نہیں تھی یہ محض لڑائی یا بین الاقوامی صورت حال کا نتیجہ نہ تھا بلکہ مدت سے ہمارے ہر فکر و عمل میں یہی جذبہ کارفرما تھا اور کئی نسلوں سے ہمارا مرکز خیال بنا ہوا تھا۔ اس میں کوئی خاص دقت نہیں تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے متعلق ایک واضح اعلان کر دیا جائے اور اس پر موجودہ حالات کے مطابق جنگی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر عمل کیا جائے۔ سچ پوچھئے تو خود جنگی ضرورتوں کا یہی تقاضا تھا۔

ہندوستان کی آزادی تسلیم کرنے کے لئے صرف برطانیہ کے ارادے اور خواہش کی ضرورت تھی اگر وہ ایک بار دل میں ٹھان لیتا تو بڑی بڑی دقتیں کافور ہو جاتیں اور جو معمولی مشکلات رہ جاتیں وہ فریقین کے باہمی سمجھوتے سے رفع ہو جاتیں۔ اس زمانے میں ہر صوبے میں صوبائی حکومت موجود تھی۔ زمانۂ جنگ کے لئے ایک ایسی مرکزی حکومت جسے عوام کا اعتماد حاصل ہو قائم کر لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ یہ مرکزی حکومت جنگی کوششوں کو منظم کرتی، مسلح فوجوں سے پورا اشتراک عمل رکھتی اور صوبائی حکومتوں اور برطانوی حکومت کے درمیان تعلقات پیدا کرنے کا واسطہ بنتی۔ دوسرے آئینی مسائل کو اختتام جنگ تک کے لئے ملتوی کیا جا سکتا تھا اگرچہ بہتر یہی تھا کہ اس سے پہلے ہی ان کا مناسب حل تلاش کر لیا جائے۔ لڑائی کے ختم ہونے کے بعد عوام کے منتخب نمائندے ملک کے لئے ایک مستقل آئین مرتب کرتے اور ہندوستان اور برطانیہ کے معاملات کے متعلق کوئی عہدنامہ کر لیتے۔

کانگریس کی مجلس عاملہ کے لئے یہ پیش کش کوئی آسان بات نہ تھی جبکہ ملک کا بیشتر طبقہ بین الاقوامی معاملات میں کوئی دلچسپی لینا نہیں چاہتا تھا اور برطانیہ کی موجودہ پالیسی کے خلاف غصے اور نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔ ہم

اس بات کو جانتے تھے کہ طرفین کے دلوں میں جو بے اعتمادی اور شبہات مدتوں سے ہیں وہ ایک جادو کا منتر پڑھ کر پھونک دینے سے دور نہیں ہو سکتے تاہم ہمیں امید تھی کہ حالات کا تقاضا انگلستان کے رہنماؤں کو سامراج کے مقررہ راستے سے ہٹنے پر آمادہ کر سکے گا اور وہ دور بینی سے کام لیتے ہوئے ہماری پیش کش کو منظور کریں گے اور اس طرح ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان لڑائی جھگڑے ختم ہو جائیں گے اور جنگ کے لئے ہندوستان کا جوش و خروش اور اس کے پورے وسائل میدانِ عمل میں آسکیں گے۔

لیکن یہ اَن ہونی بات تھی برطانیہ نے اپنے جواب میں ہمارے تمام مطالبات کو نامنظور کر دیا۔ ہم پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ انگریزوں کو ہندوستانیوں کی دوست اور رفیق کار کی حیثیت سے ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ غلاموں کی مانند ان سے اپنے احکام کی تعمیل چاہتے ہیں۔ ہم نے وہی تعاون کا لفظ استعمال کیا تھا مگر طرفین نے اس کے علیحدہ علیحدہ معنی لئے ہمارے نزدیک تعاون وہ تھا جو دو برابر کے ملکوں میں ہو سکتا ہے، وہ تعاون کا مطلب یہ لیتے تھے کہ ہم ان کے کل احکام کی بے چون و چرا تعمیل کریں۔ ہمارے لئے صورت حال کو قبول کرنا ناممکن تھا۔ اگر ہم ایسا کرتے تو گویا اُن اصولوں سے غداری کے مرتکب ہوتے جن کو ہم نے اب تک پیش نظر رکھا ہے اور جن کی وجہ سے ہماری زندگی میں کچھ معنی پیدا ہو گئے ہیں اور اگر ہم میں سے کچھ لوگ اس پر تیار بھی ہو جاتے تو ہم عوام کو اپنے ساتھ نہ لے سکتے اور نہ صرف قومیت کی جان بخش فضا سے بلکہ اس بین الاقوامیت سے بھی دور ہو جاتے جو ہمارے پیش نظر تھیں ہماری صوبائی حکومتوں کے لئے بڑی دقتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ گورنر اور وائسرائے کی آئے دن کی مداخلت کا علاج یا تو یہ تھا کہ ہم خاموشی سے

سب گوارا کئے جائیں یا ان سے لڑیں۔ سول سروس وغیرہ کے عہدہ دار گورنروں کا ساتھ دیتے تھے اور وزیروں اور مجلس واضع قوانین کو محض خدائی فوجدار سمجھتے تھے۔ اس طرح سے گویا پھر ایک بار ایک مطلق العنان بادشاہ یا اس کے نمائندوں اور پارلیمنٹ کے درمیان پرانی آئینی جنگ چھڑ گئی بلکہ یہاں تو بادشاہ یا اس کے نمائندے بدیشی لوگ تھے جنھوں نے اپنی حکومت تلوار کے زور سے قائم کر رکھی تھی۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ گیارہ صوبوں میں سے جن آٹھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں ہیں وہ احتجاج کے طور پر مستعفی ہو جائیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وزرا کو استعفے دینے کے بجائے اس وقت تک حکومت چلاتے رہنا چاہئے جب تک کہ گورنر خود انھیں برخاست نہ کر دیں۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے جو دن بدن بڑھتا جا رہا تھا گورنروں اور وزیروں کے درمیان جھگڑا لازمی تھا اور اگر وہ خود مستعفی نہ ہوتے تو گورنران کو برخاست کر دیں گے۔ اس لئے انھوں نے استعفا دینے کا آئینی طریقہ اختیار کیا تاکہ مجلس واضع قوانین توڑ دی جائیں اور نئے انتخابات عمل میں لائے جائیں۔ چونکہ کانگریسی حکومت کے ساتھ زبردست اکثریت تھی اس لئے کوئی دوسری پارٹی وزارت نہیں بنا سکتی تھی گورنر نئے انتخابات سے بچنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اس امر کو بخوبی جانتے تھے کہ انتخابات کا نتیجہ کانگریس کی زبردست فتح کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے مجالس قوانین ساز کو توڑنے کی بجائے انھیں معطل کر دیا اور صوبائی حکومت اور مجلس واضع قوانین کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ وہ صوبوں میں بالکل مطلق العنان حاکم بن گئے، قوانین بنانے اور فرامین جاری کرنے لگے اور کسی منتخب جماعت یا رائے عامہ کے مشورے کے بغیر من مانی کارروائی کرنے لگے۔

برطانوی سیاست دانوں نے کئی موقعوں پر یہ کہا ہے کہ کانگریس کی مجلس عاملہ نے صوبائی حکومتوں سے استعفیٰ دلا کر ایک آمرانہ رویہ اختیار کیا۔ یہ عجیب و غریب الزام ان لوگوں کی طرف سے لگایا جاتا ہے جو نازی اور فسطائی حکومتوں کو چھوڑ کر سب سے زیادہ استبدادی اور آمرانہ رویہ رکھتے ہیں۔ درحقیقت کانگریس اپنی پالیسی کی بنیاد وائسرائے کے اس وعدے پر قائم کی تھی کہ صوبائی معاملات میں وزارتیں بالکل آزاد ہوں گی گورنر یا وائسرائے ہرگز مداخلت نہیں کریں گے اور اس پالیسی کے تحت میں مجالس وضع قوانین کے ممبروں کا انتخاب ہوا تھا اور وزارتیں مرتب ہوئی تھیں۔ مگر اب ہر معاملے میں دخل دیا جا رہا تھا۔ اور صوبائی حکومتوں کو جو اختیارات ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے دیئے گئے تھے۔ انھیں اور محدود کیا جا رہا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ایکٹ میں ترمیم کر دی تھی کہ جنگی مقاصد کے ماتحت صوبوں کے اختیارات میں مداخلت کی جا سکتی ہے۔ اس بات کا فیصلہ کہ کس حد تک صوبوں کے معاملات میں دخل اندازی کی جائے بالکل گورنمنٹ آف انڈیا یعنی وائسرائے پر چھوڑ دیا گیا تھا اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات کی حفاظت کے لئے کوئی آئینی تحفظ نہیں رکھے گئے تھے۔ کانگریسی وزارتیں ان باتوں سے صرف چشم پوشی کر کے حکومت چلا سکتی تھیں۔ گورنر جنرل جنگی ضرورت کے بہانے سے صوبائی حکومتوں اور مجالس قانون ساز کا ہر فیصلہ رد کر سکتا تھا اور اس میں اسے ہمیشہ نامزد کردہ مجلس عاملہ کا تعاون حاصل ہوتا تھا۔ ان حالات میں کوئی ذمہ دار وزارت حکومت نہیں چلا سکتی تھی۔ یا تو اسے گورنر اور سول افسروں کی مخالفت کی زد پڑتی یا مجلس قانون ساز اور عام رائے دہندوں کی۔ چونکہ ہر ایک مجلس قانون ساز جس میں کانگریسی ممبروں کی اکثریت تھی لڑائی کے شروع ہونے کے بعد کانگریس کے مطالبے کی با[illegible]

تصدیق کر چکی تھی۔ اس لئے وائسرائے کے اس مطالبے کو رد کر دینے کے یہ معنی تھے کہ کانگریسی حکومتیں یا تو استعفیٰ دے دیں یا مقابلے کے لئے تیار ہو جائیں۔ عوام چاہتے تھے کہ حکومت برطانیہ کے خلاف عملی تحریک شروع کر دی جائے۔ مگر کانگریس کی مجلس عاملہ جہاں تک ممکن تھا اس سے بچنا چاہتی تھی اس لئے اس نے نرم تر رویہ اختیار کیا۔ برطانوی حکومت کے لئے عوام یا رائے دہندوں کے جذبات کو جانچنے کا آسان ترین طریقہ یہی تھا کہ عام انتخابات عمل میں لائے جائیں مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یقینی طور پر انتخابات کا نتیجہ کانگریس کی زبردست فتح کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ بنگال اور پنجاب کے بڑے صوبوں اور سندھ کے چھوٹے صوبے میں وزارتیں مستعفی نہیں ہوئیں۔ بنگال اور پنجاب میں پہلے ہی سے گورنر اور اعلیٰ حکام من مانی کارروائی کرتے رہتے تھے اس لئے ان صوبوں میں کوئی تصادم نہیں ہوا۔ پھر بھی بنگال [illegible] گورنر صاحب وزیر اعظم سے ناراض ہو گئے اور ان کو اور ان کی [illegible] کو استعفا دینے پر مجبور کیا۔ سندھ میں بھی کچھ عرصے کے بعد وزیر اعظم نے وائسرائے کو ایک چٹھی لکھی جس میں برطانوی حکومت کے طرز عمل پر نکتہ چینی کی اور احتجاج کے طور پر اپنا خطاب واپس کر دیا مگر انھوں نے استعفا نہیں دیا۔ مگر چونکہ یہ چٹھی وائسرائے کے خیال میں خلاف ادب تھی اس لئے ان کے حکم سے گورنر نے وزیر اعظم کو برخاست کر دیا۔

کانگریسی وزارتوں کو مستعفی ہوئے تقریباً پانچ سال ہو چکے ہیں۔ ہر صوبے میں گورنروں کی شخصی حکومت قائم ہے اور جنگ کی آڑ لے کر ہم انیسویں صدی کے وسط کے دور استبداد میں دھکیل دئے گئے ہیں۔ پولیس اور سول افسروں کو وسیع اختیارات حاصل ہیں، اور اگر ان میں سے کوئی خواہ وہ ہندوستانی ہو یا انگریز برطانیہ کی اس بے رحمانہ پالیسی سے خفیف سا اختلاف ظاہر کرے تو اس پر قہر ٹوٹتا ہے

نازل ہوتا ہے۔ کانگریسی حکومت کا بہت سا کیا ہوا کام اکارت گیا اور ان کی بہت سی اسکیموں کو بند کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے کاشتکاروں کے متعلق بعض قوانین ابھی برقرار ہیں لیکن ان کا مطلب بھی اکثر کاشتکاروں کے مفاد کے خلاف لیا جاتا ہے۔ گذشتہ دو سال میں آسام، سرحد اور اڑلیسہ کے تین چھوٹے چھوٹے صوبوں میں صوبائی حکومتیں قائم کی گئیں۔ چال یہ چلی گئی کہ مجالس واضع قوانین کے بہت سے ممبروں کو قید کر دیا گیا اور اس طرح سے اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کر دیا گیا۔ بنگال میں موجودہ وزارت طاقت ور یورپین پارٹی کے رحم وکرم پر ہے۔ اڑلیسہ کی وزارت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی اور وہاں پھر وہی گورنر کی شخصی حکومت قائم ہوگئی۔ صوبہ سرحد میں وزارت کام چلاتی رہی مگر چونکہ اس کی پشت پر ممبران کی اکثریت نہیں تھی اس لئے حکومت نے اسمبلی کا اجلاس نہ ہونے دیا۔ پنجاب اور سندھ میں جو کانگریسی ممبران اسمبلی جیلوں سے باہر تھے ان کے خاص انتظامی احکامات نافذ کئے گئے جن کی رو سے انھیں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کر دیا گیا۔

۱۹۴۵ء کے شروع میں صوبہ سرحد میں بجٹ کے لئے مجلس واضع قوانین کا اجلاس طلب کرنا پڑا جس میں وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کی گئی اور بالآخر وزارت کو مستعفی ہونا پڑا اس کے بعد وہاں ڈاکٹر خاں صاحب کی سرکردگی میں کانگریسی وزارت قائم ہوگئی۔

کانگریس کی دوسری پیشکش اور برطانوی حکومت کا اسے نامنظور کرنا

مسٹر ونسٹن چرچل

آٹھ صوبوں میں جو شخصی حکومت قائم ہوگئی اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ صرف

چوٹی کے آدمی بدل گئے جیسا کہ عام طور پر وزارت کی تبدیلی کے موقع پر سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ ایک بنیادی تبدیلی تھی جو حکومت کے سارے نظام اس کی پالیسی اور اور طریقوں پر اثر انداز ہوئی۔ انتظامی محکموں اور افسروں پر اسمبلی وغیرہ کی جو تھوڑی بہت نگرانی تھی وہ ختم ہوگئی اور گورنر سے لے کر سول سروس اور پولیس کے معمولی افسروں کا برتاؤ عوام کے ساتھ بالکل مختلف ہوگیا۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ یہی کانگریسی وزارتوں سے پہلے کا رجعت پسندانہ دور واپس آگیا بلکہ حالات اور بھی بدتر ہوگئے۔ قانونی حیثیت سے تو یہ انیسویں صدی کی مطلق العنان شخصی حکومت کہی جا سکتی تھی لیکن عملاً اس سے کہیں زیادہ سخت تھی اس لئے کہ اس میں وہ اعتماد تھا اور نہ وہ پدرانہ شفقت تھی۔ حکومت کے انگریز افسروں پر خوف اور غصہ طاری تھا اس لئے کہ ان کا وہ اقتدار جو مدتوں سے قائم تھا ختم ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ کانگریس کا سوا دو سال کا عرصۂ حکومت ان پر بہت سخت گذرا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُن لوگوں کے احکام کی تعمیل کرنا جن کو وہ ذرا سی بات پر جیل میں بھیج دیا کرتے تھے ان کے لئے خوش گوار نہ تھا۔ اب ان کی خواہش صرف یہی نہیں تھی کہ کام کا وہی پرانا ڈھرا بندھ جائے۔ بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان مفسدوں کو اچھی طرح سبق دیا جائے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کسان ہو یا مزدور۔ کاریگر ہو یا دوکاندار کارخانے کا مالک ہو یا وکیل یا ڈاکٹر کالج کا طالب علم ہو یا ادنےٰ سرکاری ملازم، یہاں تک کہ بڑے بڑے ہندوستانی افسروں کو بھی جنھوں نے عمومی حکومت کا ساتھ دیا تھا یہ دکھانا تھا کہ ابھی برطانوی راج قائم ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شخصی ترقی اور فلاح و بہبود اسی برطانوی راج کے ہاتھ میں ہے ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں جنھوں نے عارضی طور پر حکومت کو غصب کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے وزیروں کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا تھا اب وہ بڑے صاحب

بنے ہوئے تھے اور صرف گورنر کے ماتحت تھے ان کی گفتگو میں وہی پرانی رعونت آگئی تھی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اپنے اپنے علاقوں میں پھر بازی لیڈر بن گئے۔ پولیس کو آزادی مل گئی کہ وہ پھر اپنی پرانی عادتیں اختیار کرلے کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر وہ بدعنوانیاں بھی کرے گی تو افسران بالا اس کی حمایت کریں گے۔ لڑائی کے نام سے ہر چیز پر پردہ ڈالا جاسکتا ہے۔

بہت سے ایسے لوگ بھی کانگریس پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے جو موجودہ صورت حال سے بیزار تھے اب انھیں کانگریسی حکومتوں کی بہت سی برکتیں یاد آئیں اور انھوں نے ان کے مستعفی ہوجانے پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کے نزدیک کانگریسی حکومتوں کو کسی حالت میں بھی استعفا نہیں دینا چاہئے تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ مسلم لیگی حضرات بھی ان حالات سے پریشان تھے۔

جب غیر کانگریسی لوگوں کا اور کانگریسی حکومت کے معترضین کا یہ خیال تھا تو ظاہر ہے کہ کانگریس کے ممبران اور ہمدردوں اور اسمبلی کے ممبران پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ کانگریسی وزرا اپنے وزارت کے عہدوں سے مستعفی ہوگئے تھے مگر انھوں نے مجالس مقننہ کی رکنیت سے استعفا نہیں دیا تھا۔ اسی طرح اسمبلیوں کے دوسرے ممبر اور صدر بھی مستعفی نہیں ہوتے تھے اس کے باوجود ان کو نظرانداز کردیا گیا اور نئے انتخابات بھی عمل میں نہیں لائے گئے۔ خالص آئینی نقطۂ نظر سے بھی یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی اور ملک میں اس کی وجہ سے سیاسی بحران کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کانگریس جیسی طاقت ور عظیم انقلابی جماعت جو ملک کے قومی جذبات کی نمائندہ تھی اور جس کی تاریخ آزادی کی جدوجہد سے بھری پڑی تھی اس آمرانہ شخصی حکومت کو کسی طرح برداشت نہیں کرسکتی تھی بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ملک میں جو کچھ ہو رہا تھا اسے وہ تماشائی کی طرح چپ چاپ

دیکھتی خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ یہ سب کچھ اس کے مٹانے کے لئے کیا جا رہا ہو۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ آئینی حکومت کے تعطل، عام سیاسی سرگرمی کی بندش اور ہندوستان کے بارے میں برطانوی پالیسی کے خلاف کوئی زبردست جوابی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ جب برطانوی حکومت نے اپنے جنگی مقاصد ظاہر نہیں کئے اور ہندوستان کو آئینی ترقی دینے سے بھی انکار کر دیا تو کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ اعلان کیا "کانگریس کے مطالبے کا برطانوی حکومت نے جو جواب دیا ہے وہ بالکل غیر تسلی بخش ہے بلکہ اس نے غلط فہمی پیدا کر کے بنیادی مسئلے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجلس عاملہ کے خیال میں برطانیہ کی اس کوشش کے صرف ایک ہی معنی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ برطانیہ اپنے جنگی مقاصد اور ہندوستانی آزادی کے متعلق کوئی اعلان کرنا نہیں چاہتی اور ملک کے رجعت پسند طبقے کی مدد سے ہندوستان پر اپنا شہنشاہی تسلط قائم رکھنا چاہتی ہے اور اس غرض کے حصول کے لئے طرح طرح کے غیر متعلقہ مسائل معرض بحث میں لا رہی ہے۔ کانگریس جنگ اور اس کی پیدا کردہ صورت حال کو خالص اخلاقی نقطۂ نگاہ سے دیکھتی ہے اور بنیوں کی طرح سودا کر کے اس سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتی اس سے پیشتر کہ کسی ثانوی مسئلے پر غور کیا جائے جنگی مقاصد کے اخلاقی پہلو اور ہندوستان کی آزادی کے متعلق کوئی تسلی بخش تصفیہ ہو جانا چاہئے۔ کانگریس عبوری دور کے لئے بھی حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے پر اس وقت تک ہرگز تیار نہ ہوگی جب تک کہ عوام کے نمائندوں کو پورے اختیارات نہ دے دئے جائیں۔"

آگے چل کر کمیٹی نے بیان کیا کہ برطانوی حکومت کے اعلانات کی روشنی میں کانگریس مجبور ہے کہ وہ برطانوی پالیسی سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے

چنانچہ اسی عدم تعاون کے سلسلے میں کانگریس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ صوبوں کی کانگریسی حکومتیں مستعفی ہو گئیں۔ عدم تعاون کی یہ عام پالیسی جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک برطانوی حکومت اپنی پالیسی میں تبدیلی نہ کرے۔ مگر مجلس عاملہ کانگریسی لوگوں کو یہ جتانا چاہتی ہے کہ ہر قسم کی ستیہ گرہ کا یہ بنیادی اصول ہے کہ اپنے مخالفین سے باعزت سمجھوتے کی کوشش کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے اگرچہ برطانوی حکومت نے کانگریس کے ساتھ گفت و شنید کا دروازہ بند کر دیا ہے پھر بھی کانگریس ایسے ذرائع تلاش کرتی رہے گی جن سے کوئی باعزت سمجھوتہ ہو سکے۔"

ملک میں عام بے چینی کو دیکھتے ہوئے اس خیال سے کہ کہیں نوجوان طبقہ تشدد کا طریقہ نہ اختیار کرے مجلس عاملہ نے لوگوں کو عدم تشدد کا بنیادی عقیدہ یاد دلایا اور یہ تاکید کی کہ کسی حالت میں بھی اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ اگر سول نافرمانی کی ضرورت بھی پڑے تو یہ بالکل امن پسندانہ طور پر ہونی چاہئے۔ اس نے بتایا "ستیہ گرہ کے معنی ہیں سب لوگوں کی خصوصاً اپنے مخالفوں کی خیر خواہی۔" عدم تشدد کی طرف جو اشارہ کیا گیا اسے جارحانہ حملے کے خلاف ملک کی حفاظت سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ صرف ان کارروائیوں سے جو ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں برطانوی حکومت کے خلاف کی جائیں۔

یہ ان مہینوں کا ذکر ہے جب کہ پولینڈ کی شکست کے بعد یورپ میں لڑائی ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ یہ "جنگ زرگری" کا دور تھا۔ عام لوگوں کے نزدیک لڑائی ہندوستان سے بہت دور تھی اور ہمارے ملک کے برطانوی افسروں کا بھی یہی خیال تھا۔ ہاں البتہ جہاں تک سامان جنگ کی فراہمی کا سوال تھا ہندوستان جنگ میں شریک تھا۔ ان دنوں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی برطانیہ کے ساتھ جنگی

کوششوں میں تعاون کرنے کی سخت مخالف تھی اور اس وقت تک رہی جب کہ
جون ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ اس ابتدائی زمانے میں یہ جماعت
خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی۔ عوام پر کمیونسٹ پارٹی کا کوئی خاص اثر نہ تھا
صرف نوجوانوں کی کچھ ٹولیاں اس جماعت میں شامل تھیں۔ لیکن چونکہ برطانیہ کی
مخالفت کو عوام کی مقبولیت حاصل تھی اور یہ جماعت اس کا بڑی شد و مد سے
پرچار کرتی اس لئے وہ بڑی سرگرم جماعت سمجھی جانے لگی۔

اس موقعے پر صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے عام انتخابات بڑی آسانی سے
عمل میں لائے جا سکتے تھے لڑائی کی وجہ سے اس میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ انتخاب
کے بعد فضا صاف ہو جاتی اور ملک کی اصلی حالت سب کے سامنے آ جاتی۔
لیکن برطانوی حکومت اسی اصلی حالت سے تو ڈرتی تھی کہ اس کی وہ سب
بے بنیاد دلیلیں غلط ثابت ہو جائیں گی جن میں دوسری مختلف پارٹیوں کی قوت
کا ذکر کرتی تھی۔ لیکن انتخابات نہیں ہوئے۔ دس سال سے صوبوں میں شخصی
حکومت قائم ہے اور نہ ہی مرکزی اسمبلی جس کا انتخاب تین سال کے لئے کیا گیا
تھا اور جس میں رائے دہندوں کی تعداد بہت محدود تھی اب تک موجود ہے۔
۱۹۳۹ء ہی میں جب لڑائی شروع ہوئی اس کی میعاد کو ختم ہوئے دو سال
گزر چکے تھے۔ ہر سال اس کی میعاد میں توسیع ہوتی رہتی ہے اس کے ممبر اور زیادہ
بوڑھے اور ناقابل تنظیم ہوتے جاتے ہیں اور بعض تو دنیا سے رحلت کر گئے ہیں۔
لوگوں کے دلوں سے انتخابات کی یاد بھی محو ہو چکی ہے۔ لیکن برطانوی حکومت
انتخابات کو پسند نہیں کرتی۔ ان سے زندگی کے معمولات میں دخل واقع ہوتا
ہے اور ہندوستان کی وہ تصویر جس میں مختلف مذہبوں اور جماعتوں کی کشمکش
دکھائی جاتی ہے مٹ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انتخابات کے نہ ہونے سے

اس میں بڑی آسانی ہوتی ہے کہ جو شخص یا جماعت حکومت کی منظورِ نظر ہو۔ اس کی اہمیت کو بڑھا کر دکھایا جائے۔ مجموعی طور پر سارے ملک میں اور خصوصاً ان صوبوں میں جہاں شخصی حکومت قائم تھی، حالات بہت نازک ہو گئے تھے۔ بہت سے کانگریسی اپنی معمولی سرگرمیوں کی بنا پر جیل بھیج دئے گئے تھے۔ کسان پولیس اور چھوٹے چھوٹے افسران کے ظلم و تعدی کے خلاف واویلا کر رہے تھے اور یہ افسر اُن سے زبردستی لڑائی کا چندہ وصول کر کے افسران کی خوشنودی حاصل کر لیتے تھے۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانے کا مطالبہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں جو مارچ ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ (بہار) کے مقام پر مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب سول نافرمانی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن پھر بھی اس وقت کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اٹھایا گیا اور صرف لوگوں سے تیار رہنے کے لئے کہہ دیا گیا۔

ملک کے اندرونی حالات بہت نازک ہوتے جا رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تصادم ناگزیر ہے۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ جو جنگ کی مصلحتوں کی بنا پر پاس کیا گیا تھا اب جائز قسم کی تحریکوں کو دبانے اور لوگوں کو گرفتار کر کے، اکثر بغیر مقدمہ چلائے جیل بھیجنے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔

تب لڑائی کے حالات میں اچانک تبدیلی ہوئی جرمنی نے سویڈن اور ناروے پر حملہ کر دیا اور کچھ عرصے کے بعد فرانس نے ہتھیار ڈال دئے تو اس کا لوگوں پر اور بھی زبردست اثر ہوا۔ قدرتی طور پر لوگوں کے تاثرات مختلف تھے لیکن ڈنکرک کی پسپائی کے فوراً بعد جب انگلستان پر زبردست ہوائی حملے ہو رہے تھے۔ ہندوستان کے لوگوں کو فرانس اور برطانیہ کے ساتھ دلی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ کانگریس

سول نافرمانی کی تیاریاں کر رہی تھی مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ آزاد انگلستان
کا وجود خطرے میں ہے تو اس تحریک کا خیال چھوڑ دیا۔
بعض لوگ اس خیال کے بھی تھے کہ چونکہ انگلستان مشکلات اور
خطرے میں گھرا ہوا ہے اس لئے ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرنے کا
یہی موقعہ ہے۔ لیکن کانگریسی لیڈران اس چیز کے سخت مخالف تھے اور یہ
سمجھتے تھے کہ ایسے موقعے سے فائدہ اٹھانا جب انگلستان پر مصیبت اور
خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں مناسب نہیں ہے وہ اپنے ان خیالات کو
کھلم کھلا ظاہر کرتے تھے اور اب کوئی سول نافرمانی کا نام تک نہ لیتا تھا۔ برطانوی
حکومت سے سمجھوتے کی ایک اور کوشش کی گئی۔ پچھلا مطالبہ بہت بڑا تھا۔ اس
میں یہ کہا گیا تھا کہ جنگ کے مقاصد کا اعلان کیا جائے اور ہندوستان میں آئینی
تبدیلیاں کی جائیں مگر موجودہ مطالبہ بہت واضح اور مختصر تھا اور اس میں صرف
ہندوستان کا ذکر تھا۔ اب کی بار صرف یہ خواہش کی گئی کہ ہندوستان کی آزادی
تسلیم کرلی جائے اور مرکز میں ایسی قومی حکومت قائم کی جائے۔ جسے مختلف پارٹیوں
کا تعاون حاصل ہو۔ پارلیمنٹ کو کسی نئے قانون کے پاس کرنے کی ضرورت نہیں
تھی۔ تجویز یہ تھی کہ وائسرائے موجودہ آئین کی حدود کے اندر ایک قومی حکومت قائم
کردیں۔ مجوزہ تبدیلیاں اگرچہ بہت اہم تھیں لیکن باہمی مفاہمت سے عمل میں
آسکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ قانونی اور آئینی تبدیلیوں کی بھی ضرورت تھی لیکن ان
کے متعلق کسی اور مناسب موقعے پر گفتگو ہوسکتی تھی۔ بشرطیکہ ہندوستان کا حق
آزادی اسی وقت تسلیم کرلیا جائے۔ ان شرائط کے ساتھ ہم جنگی کوششوں میں پوری
طرح شرکت کرنے کو تیار تھے۔ یہ تجاویز جو شری یت راجگوپال اچاریہ نے پیش
کیں کانگریس کے بار بار دہراتے ہوئے مطالبہ آزادی کے مقابلے میں بہت کم

تھیں۔ جو چیز ہم اس وقت مانگ رہے تھے وہ اس سے بہت کم تھی جو شدت سے مانگی جا رہی تھی۔ ان تجاویز پر فوراً عمل کرنے میں کوئی قانونی دقت درپیش نہیں تھی۔ ان میں دوسری اہم پارٹیوں کے مطالبات کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ قومی حکومت ایک مخلوط حکومت ہوتی۔ اور اسی کے ساتھ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مخصوص حیثیت کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا۔ وائسرائے کا عہدہ بدستور قائم رہتا۔ گو اس کو قومی حکومت کے فیصلوں کو مسترد کر دینے کا حق نہ ہوتا لیکن صدر حکومت کی حیثیت سے اس کی موجودگی کے معنی صاف طور پر یہ تھے کہ اس کا حکومت سے گہرا تعلق رہے گا۔ جنگ کا محکمہ کمانڈر انچیف کے ماتحت رہتا۔ برطانوی حکومت کا بنایا ہوا نظم و نسق بھی جوں کا توں رہتا۔ اس تبدیلی میں جو خاص مقصد پیش نظر رکھا گیا تھا کہ حکومت میں ایک نئی روح پیدا ہو جائے۔ جنگی کوششوں میں اور دوسرے اہم مسائل کے حل کرنے میں عوام کے تعاون سے مدد ملے۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اگر اس بات کا قطعی وعدہ کر لیا جاتا کہ ہندوستان کو لڑائی کے بعد آزادی دے دی جائے گی تو وہ نفسیاتی ماحول پیدا ہو جاتا جس کے اندر جنگی کوششوں میں پورا پورا تعاون ممکن تھا۔

پچھلے اعلانات اور تجربات کے بعد کانگریس کے لئے یہ تجویز پیش کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ جو قومی حکومت ان قیود کے ساتھ بنائی جائے گی وہ بے کار اور بے بس ہوگی۔ کانگریسی حلقوں میں اس کی زبردست مخالفت کی گئی اور میں خود بڑی مشکل سے بہت غور و خوض کے بعد اپنے آپ کو اس کی موافقت پر آمادہ کر سکا۔ میری موافقت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے پیش نظر وسیع تر بین الاقوامی مصالح تھے میں چاہتا تھا،

اگر باعزت طریقے پر ممکن ہو تو ہمیں فسطائیت اور نازیت کے خلاف جنگ میں دل وجان سے شرکت کرنی چاہیئے۔

لیکن ہمیں ایک زبردست مشکل درپیش تھی یعنی گاندھی جی کی مخالفت۔ ان کی اس مخالفت کی وجہ صرف ان کا امن پسندانہ عقیدہ تھا۔ ہماری پچھلی تجاویز کی، جن میں ہم نے جنگی کوششوں میں مدد دینا منظور کیا تھا، گاندھی جی نے مخالفت نہیں کی تھی۔ اگرچہ یقیناً وہ ان تجاویز کو ناپسند کرتے تھے۔ لڑائی کے شروع ہی میں انھوں نے وائسرائے کو بتا دیا تھا کہ کانگریس صرف اخلاقی مدد دے سکتی ہے لیکن کانگریس کا یہ خیال نہیں تھا جیسا کہ وہ بار بار کہہ چکی تھی۔ مگر اب گاندھی جی نے کانگریس کے پرتشدد جنگی کوششوں میں شریک ہونے کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ اس مسئلے میں ان کے احساسات اس قدر شدید تھے کہ انھوں نے اپنے رفیقوں سے کانگریس کی جماعت سے قطع تعلق کرلیا۔ اس بات کا ان سب لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا جو ان کے شریک کار تھے کیونکہ کانگریس کو جو آج قوت حاصل ہے وہ انہی کی بدولت ہے۔ لیکن بہرحال کانگریس یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ تھی کہ جنگ کی حالت میں بھی ان کا عدم تشدد کا اصول واجب العمل ہے۔ برطانوی حکومت سے سمجھوتہ کرنے کے لئے کانگریس اس قدر بے تاب تھی کہ اس نے اپنے محبوب لیڈر سے علیحدگی تک کو گوارا کرلیا۔

ملک کے حالات ہر لحاظ سے خراب ہوتے جارہے تھے۔ سیاسی اعتبار سے حالت ظاہر ہی تھی۔ جہاں تک اقتصادی حالت کا تعلق ہے اگرچہ لڑائی کی وجہ سے کاشتکار اور مزدور طبقے کی آمدنی بڑھ گئی تھی لیکن لوگوں کی بڑی تعداد سخت مصیبت میں تھی۔ جن لوگوں نے دراصل ہاتھ رنگے وہ جنگی منافع خور، ٹھیکیدار اور سرکاری افسر تھے۔ ان افسران میں زیادہ تر انگریز تھے جو کہ بہت بڑی

بڑی تنخواہوں پر رکھے گئے تھے۔ بظاہر حکومت کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ زیادہ منافع لینے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کیونکہ اس سے جنگی کوششوں میں خوب ترقی ہوگی۔ رشوت اور عزیز نوازی کا بڑا زور تھا اور عوام کی طرف سے ان چیزوں پر کوئی روک نہیں رہی تھی۔ پبلک کی نکتہ چینی کو جنگی کوششوں میں رکاوٹ خیال کیا جاتا تھا اور اس کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی ہمہ گیر دفعات کی مدد سے دبا دیا جاتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سخت مایوسی ہوتی تھی۔

ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم نے برطانوی حکومت سے سمجھوتے کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر حالات سمجھوتے کے لئے سازگار نہیں تھے۔ سول سروس وغیرہ کے ملازم اس زمانے میں ہر قسم کی بندش اور نکتہ چینی سے آزاد تھے۔ اور یہ آزادی انھیں دو قرن سے نصیب نہیں ہوئی تھی وہ مقدمہ چلا کر یا بغیر مقدمہ چلائے کسی شخص کو جس سے وہ ناراض ہوں جیل خانے بھیج سکتے تھے۔ گورنروں اور بڑے بڑے صوبوں میں غیر محدود اختیارات حاصل تھے اس لئے جب تک حالات انھیں مجبور نہ کردیں وہ کیوں کسی تبدیلی پر راضی ہونے۔ اس سارے سامراجی نظام کے صدر لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند تھے۔ اس تزک و احتشام کے ساتھ جو ان کے اعلیٰ عہدے کے شایان شان تھا نسلے کی چوٹیوں پر داد عشرت دے رہے تھے۔ موصوف جسم کے بھاری، ذہن کے سست، چٹان کی طرح مضبوط اور چٹان ہی کی طرح بے حس تھے جو خوبیاں اور خامیاں ایک امیر طبقے کے انگریز میں ہونا چاہئیں وہ ان میں موجود تھیں۔ چنانچہ انھوں نے خلوص اور دیانتداری کے ساتھ موجودہ الجھن سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی توتیں بہت محدود تھیں۔ وہ لکیر کے فقیر تھے اور ہر نئی چیز سے گھبراتے تھے۔ ان کا تخیل اس حکمران طبقے کی روایات سے محدود تھا جس کے وہ ایک

فرد تھے۔ وہ سول سروس کے افسروں اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے کانوں سے سنتے تھے اور ان ہی کی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ جو لوگ بنیادی سیاسی یا سماجی تبدیلیوں کا نام لیتے ان کو وہ شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے وہ ان لوگوں کو بھی ناپسند کرتے تھے جو سلطنت برطانیہ اور وائسرائے ہند کے اعلیٰ مقاصد کی کافی قدر نہیں کرتے تھے۔

اُس نازک زمانے میں جب جرمنی مغربی یورپ پر ٹوٹ پڑا انگلستان میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ یعنی مسٹر چمبرلین اپنے وزارت عظمیٰ کے عہدے سے الگ ہو گئے۔ بہت سی وجوہ سے لوگوں کو اس سے خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ مارکوئیس زٹلینڈ بھی جو طبقۂ امرا کے لئے باعث زینت تھے۔ انڈیا آفس سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کا بھی کسی کو ملال نہ ہوا۔ ان کی جگہ مسٹر ایمری مقرر ہوئے۔ مسٹر ایمری کی بابت لوگوں کو بہت خفیف سا علم بھی بہت کافی تھا۔ انھوں نے دارالعوام میں چین میں جاپان کے جارحانہ اقدام کی پرجوش تائید کی تھی اور اس کے جواز میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ اگر ہم نے چین میں جاپان کے رویے کی مذمت کی تو ہمیں ہندوستان اور مصر میں اپنے طرز عمل کی بھی مذمت کرنی ہوگی۔ یہ دلیل معقول تھی اگرچہ ایک غلط مقصد کے لئے پیش کی گئی تھی۔ در اصل جو شخصیت سب سے زیادہ اہم تھی وہ مسٹر ونسٹن چرچل کی تھی۔ مسٹر چرچل کی ہندوستان کی آزادی کے بارے میں جو رائے تھی وہ صاف اور واضح تھی اور اس کا بار بار اعادہ کیا جا چکا تھا۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے کٹر مخالف تھے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۰ء میں انھوں نے اپنی کسی تقریر کے دوران میں کہا تھا "ایک نہ ایک دن تمھیں گاندھی اور انڈین کانگریس کو اور ان مقاصد کو جن کے وہ علم بردار ہیں کچلنا ہوگا" اسی سال دسمبر میں انھوں نے یہ بھی کہا "برطانوی قوم کا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے کہ وہ

ہندوستانی زندگی اور ترقی کی نگرانی سے دست بردار ہو جائے ..... ہم تاج برطانیہ کے اس سب سے زیادہ درخشاں اور بیش قیمت ہیرے کو کھونا نہیں چاہتے جو ہماری تمام نوآبادیات اور مقبوضات سے زیادہ برطانوی سلطنت کی شان اور عظمت کا باعث ہے" درجہ نوآبادیات ہندوستان کا آئینی مقصد بتایا جاتا ہے اور بار بار اس چیز کو دہرایا گیا ہے۔ آگے چل کر ایک موقعے پر انھوں نے ان طلسمی الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے بتا دیا کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے درجہ نوآبادیات کا در اصل کیا مطلب ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۱ء میں انھوں نے کہا "ہم یہ سمجھتے رہے ہیں کہ منزل مقصود درجۂ نوآبادیات ہے لیکن یہ خیال کسی کا بھی نہیں کہ اس اصول اور پالیسی پر اتنی مدت کے اندر عمل کیا جا سکتا ہے جس کا پہلے سے اندازہ کرنا معقول یا مفید ہے۔ یہ اور بات ہے کہ رسمی طور پر ہندوستان کا یہ درجہ مان لیا جائے اور اس حیثیت سے اس کے نمائندے دوران جنگ میں کانفرنسوں میں شریک ہوں۔ ایک اور موقعے پر دسمبر ۱۹۳۱ء میں انھوں نے فرمایا تھا۔ بہت سے سربرآوردہ سیاسی لیڈروں نے درجہ نوآبادیات کے متعلق تقریریں کیں۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا مگر میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ ایک ایسی مدت کے اندر جس کا ابھی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کو کینیڈا کا سا نظام حکومت اور آئینی اختیارات دے دئے جائیں ..... اگر ہندوستان کو برطانوی سلطنت سے علیحدہ کر دیا جائے تو ہندوستان ایک طاقت کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا"

یہی تو سارا معاملہ ہے کہ ہندوستان ہی سلطنت برطانیہ کی کائنات ہے ہندوستان پر قبضہ رکھنے اور اس کے وسائل سے پورا فائدہ اٹھانے ہی سے انگلستان کی شان اور عظمت برقرار رہ سکتی ہے اور اسی کی بدولت وہ ایک

زبردست طاقت ہے۔ مسٹر ونسٹن چرچل کے ذہن میں انگلستان کا ایک ایسی تصویر
وسیع سلطنت کا مالک ہو اس لئے وہ ہندوستان کی آزادی کا خیال بھی
کر سکتے۔ اور درجۂ نوآبادیات کا بھی، جس کے متعلق مدت سے یہ کہا جا رہا
وہ ہماری دسترس سے باہر نہیں، تشریح کی جا چکی ہے کہ یہ محض رسمی اور
چیز ہے جسے آزادی اور اختیارات سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر ہم درجہ نوآباد
اُس کے حقیقی اور مکمل مفہوم میں بھی مسترد کر چکے ہیں اور ہمارا مطالبہ مکمل آزاد
اس لئے مسٹر ونسٹن چرچل کے اور ہمارے درمیان ایک زبردست خلیج ہے۔

ہمیں مسٹر ونسٹن چرچل کے الفاظ یاد تھے اور ہم جانتے تھے کہ وہ
ضدی اور بے لوچ آدمی ہیں۔ ان کے عہد حکومت میں ہمیں انگلستان
کچھ زیادہ توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنی غیر معمولی جرأت اور قیادت کے زبر
اوصاف کے باوجود وہ انیسویں صدی کے قدامت پسند، سامراجی انگلا
کے نمائندے ہیں وہ دنیا کے نئے نظام اور اس کی پیچیدہ مسائل اور قوتوں
سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور آنے والے دور کو جس کی تشکیل اب
ہے بالکل ہی نہیں سمجھ سکتے۔

۵۔ انفرادی سول نافرمانی

نشۂ آزادی کے سرور کے بجائے جس سے ہماری قوتیں ابھر آتیں
ہم قومی جوش و خروش کے ساتھ اس عالمگیر جنگ میں کود پڑتے ہم پر سرد مہ
مایوسی کی کیفیت طاری ہو گئی ہمارا مطالبہ آزادی مسترد کر دیا گیا۔ بڑے غرور و
کے ساتھ برطانوی حکومت اور اس کی پالیسی کو سراہا گیا وہ شرطیں گنوائی گئیں
کا پورا ہونا ہندوستان کی آزادی کے لئے ضروری تھا۔ ان میں سے بعض شر

تھیں جو کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ سب لمبی چوڑی تقریریں اور پارلیمنٹ کے رسمی مباحثے جن میں بہت شاندار الفاظ اور مرصع فقرے استعمال کئے گئے تھے محض سیاسی شعبدہ بازی تھی جس کے ذریعے سے برطانیہ کے اس مصمم ارادے کو چھپانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی کہ جب تک ہو سکے وہ ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھے اس کے یہ معنے تھے کہ ہندوستان کے زندہ جسم میں سامراج کے آہنی پنجے بدستور پیوست رہیں گے اس سے آزادی اور جمہوریت کے اس بین الاقوامی نظام کا اندازہ کیا جا سکتا تھا جس کی خاطر برطانیہ لڑنے کا دعوے کر رہا تھا۔

ایک اور چیز تھی جس سے برطانیہ کی نیت کا پتہ چل گیا۔ برما نے اپنا یہ واجبی مطالبہ پیش کیا تھا کہ لڑائی کے بعد نوآبادیات کا درجہ دے دیا جائے۔ یہ اس زمانے سے بہت پہلے کا ذکر ہے جب بحرالکاہل میں جنگ شروع ہوئی۔ چونکہ اس مطالبے کی تعمیل جنگ کے بعد ہونی تھی اس لئے اس سے جنگی کارروائیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ برما مکمل آزادی نہیں بلکہ صرف درجۂ نوآبادیات چاہتا تھا۔ ہندوستان کی طرح اس سے بھی بار بار یہ وعدہ کیا جا چکا تھا کہ برطانوی پالیسی کا مقصد برما میں درجہ نوآبادیات قائم کرنا ہے۔ برما کی صورت ہندوستان سے مختلف تھی۔ وہاں کی تقریباً ساری آبادی ایک ہی قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ اور جو اصلی یا فرضی اعتراضات برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کے معاملے میں کئے جاتے تھے ان کا اطلاق برما پر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر بھی برمیوں کا متحدہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور انھیں کسی قسم کا اطمینان نہیں دلایا گیا۔ درجہ نوآبادیات کا وعدہ مستقبل بعید کے لئے تھا۔ یہ ایک مبہم مابعد الطبعی تصور تھا جسے اس دُنیا سے اور اس زمانے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ قول مسٹر چرچل کے یہ محض زبانی جمع خرچ محض رسمی چیز تھی جسے حال میں یا مستقبل قریب میں عملی جامہ پہنانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ پھر بھی ہمارا خیال تھا کہ بڑی زبردست شخصیت

رکھتے ہیں اور کوئی بڑا قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی فرانس کے ساتھ مل کر متحدہ ریاست بنانے کی تجویز، ایک شدید جھگڑے کے موقعے پر کی گئی، یہ ظاہر کرتی تھی کہ ان میں دور اندیشی اور حالات کے مطابق بدلنے کی صلاحیت ہے اور ہندوستان کے لوگ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ شاید ان کے عہدے کی بے شمار ذمہ داریوں نے ان کے نقطۂ نگاہ میں وسعت پیدا کر دی ہو اور انھوں نے اپنی پہلی تنگ نظری اور تعصبات کو چھوڑ دیا ہو۔ جنگ کی مصلحتیں جنھیں وہ سب چیزوں پر مقدم رکھتے ہیں شاید انھیں یہ سمجھنے پر مجبور کر دیں کہ ہندوستان کی آزادی نہ صرف اٹل ہے بلکہ جنگی نقطۂ نظر سے بھی مستحسن ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اگست ۱۹۳۹ء میں چین جا رہا تھا تو انھوں نے ایک مشترک دوست کے توسط سے مجھے اس جنگ سے تباہ شدہ ملک میں جانے پر تہنیت کا پیغام بھیجا تھا۔

چنانچہ ہم نے یہ پیش کش بغیر کسی امید کے نہیں کی تھی اگرچہ وہ امید بہت زیادہ نہیں تھی۔ تھوڑے دن میں برطانوی حکومت کا جواب آگیا۔ یہ جواب صاف انکار کی صورت میں تھا اور اس کے الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ برطانیہ ہندوستان کو طاقت منتقل کرنا نہیں چاہتا اور اس نے تہیہ کر لیا ہے کہ آپس کے اختلافات کی خلیج کو اور وسیع کیا جائے اور قدامت پسند طبقے کو مزید تقویت پہونچائی جائے۔ وہ اپنے شہنشاہی اقتدار کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کے مقابلے میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا تھا کہ ہندوستان میں خانہ جنگی ہو اور وہ تباہ ہو جائے اگرچہ ہم اس قسم کے برتاؤ کے عادی ہو چکے تھے لیکن اس مرتبہ ہمیں سخت صدمہ پہنچا اور لوگوں میں مایوسی اور غصے کے جذبات بھڑک اٹھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس زمانے میں ایک مضمون لکھا تھا "تمھاری وہ راہ تو ہماری یہ راہ"۔ میں ہمیشہ سے ہندوستان کی آزادی کا حامی ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ اس کے بغیر نہ ہم بحیثیت قوم کے ترقی کر سکتے ہیں اور نہ

انگلستان کے ساتھ دوستانہ اور رفیقانہ تعلقات رکھ سکتے ہیں۔ مجھے ان دوستانہ تعلقات کی بڑی آرزو تھی۔ اب دفعتہً مجھے یہ محسوس ہوا کہ جب تک انگلستان کی ذہنیت پورے طور پر نہ بدل جائے ہماری اور اس کی راہ ایک نہیں ہوسکتی ہمیں مختلف راستوں پر چلنا ہوگا۔ اسی طرح برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں جو اعتراضات کئے جاتے تھے جو مہمل شرطیں لگائی جاتی تھیں وہ بھی محض باتیں ہی باتیں تھیں۔ ہر شخص جانتا تھا کہ انھیں اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اصلیت تو یہ تھی کہ برطانیہ کسی حالت میں بھی ہندوستان کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور ہندوستان اس کے پنجے سے چھوٹنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور سب باتیں محض وکیلوں کی موشگافیاں اور سیاست دانوں کی سخن سازیاں تھیں۔ صرف مستقبل ہی یہ بتا سکتا تھا کہ دو متضاد عناصر کی اس کشمکش کا کیا نتیجہ ہوگا۔

مستقبل نے بہت جلد یہ بتا دیا کہ برما میں برطانوی پالیسی کا کیا نتیجہ ہوا۔ ہندوستان میں بھی وہ پردہ جو مستقبل پر پڑا ہوا تھا رفتہ رفتہ اٹھنے لگا اور باہمی کشمکش اور منافرت، تکلیف اور مصیبت کے منظر نظر آنے لگے۔ ہم سے نہیں ہوسکتا تھا کہ برطانیہ کے ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو حقارت کے ساتھ رد کردینے کے بعد ملک میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا چپ چاپ تماشا دیکھتے رہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ جب اس پر خطر جنگ کے دوران میں جس میں دنیا بھر کے لاکھوں انسان زبردست قربانیاں دے رہے ہیں برطانیہ کا یہ رویہ ہے تو اس نازک دور کے گزر جانے کے بعد جب عوام کا کوئی دباؤ باقی نہیں رہے گا اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ ہمارے ساتھی چن چن کر جیل بھیجے جا رہے تھے ہماری روزمرہ کی سرگرمیوں میں مداخلت کی جا رہی تھی اور ان پر پابندیاں عائد کی جا رہی تھیں۔ ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی جنگ قومی تحریک اور مزدوروں کی تحریکوں کے خلاف ہر وقت جاری رہتی ہے۔

اُسے کوئی سخت کارروائی کرنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ سول نافرمانی کے شروع ہونے کا انتظار کرے۔ کبھی جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ہر محاذ پر پھیل جاتی ہے، کبھی کچھ دھیمی پڑ جاتی ہے مگر بجھتی کبھی نہیں۔

کانگریسی حکومتوں کے مختصر دور میں یہ آگ دبی ہوئی تھی[۱] لیکن ان کے مستعفی ہوتے ہی اس کے شعلے بھڑک اٹھے اور سرکاری افسر بڑے شوق سے کانگریسی لیڈروں اور اسمبلی کے ممبروں کے نام احکام صادر کرنے اور انھیں جیل بھیجنے لگے۔

اب کانگریس کے لئے یہ ناگزیر ہوگیا کہ وہ کوئی عملی قدم اٹھائے کیونکہ بعض اوقات خاموش بیٹھے رہنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ ہماری پرانی پالیسی کے مطابق یہ قدم صرف سول نافرمانی کی صورت میں اٹھایا جا سکتا تھا۔ مگر ہم نے اس کا خاص

---

[۱] بہت سے لوگ جنگ شروع ہونے سے پہلے قید ہو چکے تھے۔ میرے بعض نوجوان ساتھی پندرہ سال سے جیل کی مصیبت بھگت رہے ہیں۔ جب انھیں سزا ہوئی ان کا بچپن کا زمانہ تھا اب ان کے بال سفید ہو گئے ہیں اور وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ یو۔پی کے جیل خانوں میں مجھے اکثر ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یں تو کچھ عرصے کے بعد چھوٹ جاتا تھا۔ مگر وہ برابر جیل ہی میں رہے۔ اگرچہ وہ یو۔پی کے رہنے والے ہیں اور کئی سال تک یو۔پی کے جیل خانوں میں رہے ہیں مگر چونکہ ان کو پنجاب میں سزا ہوئی تھی اس لئے وہ پنجاب گورنمنٹ کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ یو۔پی کی کانگریسی حکومت نے ان کی رہائی کی سفارش کی مگر پنجاب کی حکومت اس پر راضی نہیں ہوئی۔

اہتمام کیا کہ عوام میں کوئی شورش نہ برپا ہو چنانچہ سول نافرمانی چند منتخب لوگوں تک محدود رکھی گئی۔ یہ عام سول نافرمانی سے مختلف تھی اور انفرادی سول نافرمانی کہلاتی تھی۔ درحقیقت یہ ایک زبردست اخلاقی احتجاج تھا۔ ایک سیاستداں کے نقطۂ نظر سے یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ ہم دانستہ ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے سے احتراز کر رہے تھے، اور حکومت کے لئے یہ آسانی پیدا کر رہے تھے وہ شورش کرنے والوں کو جیل بھیج سکے کسی اور ملک میں سیاسی تحریک یا انقلاب کا یہ طریقہ اختیار نہ کیا گیا۔ دراصل یہ مہاتما گاندھی کا مخصوص طریقہ تھا جس میں انقلابی سیاست کو اخلاقی اصول میں سمو دیا گیا تھا۔ چنانچہ جب کبھی اس قسم کی تحریک جاری ہوئی انھیں کی قیادت میں ہوئی۔ اس طرح وہ دنیا پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اگرچہ ہم برطانیہ کی پالیسی کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور اپنے اوپر تکلیفیں اٹھا کر اپنے غصے اور عزم کا اظہار کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارا یہ مقصد نہیں کہ شورش برپا کریں۔ یہ انفرادی سول نافرمانی بہت محدود پیمانے پر شروع کی گئی۔ کیونکہ اس میں شریک ہونے سے پہلے ہر مرد یا عورت کو کسی قسم کا امتحان دے کر اجازت لینا پڑتی تھی جو لوگ اس کے لئے چن لئے جاتے تھے۔ وہ کسی ضابطے کی خلاف ورزی کر کے گرفتار ہو جاتے تھے اور جیل بھیج دئے جاتے تھے۔ ہم نے اپنے دستور کے مطابق سب سے پہلے چوٹی کے آدمیوں یعنی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں، سابق وزیروں، آئین ساز مجالس کے ارکان آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور صوبائی کمیٹیوں کے ممبروں کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ تقریباً پچیس ہزار مرد اور عورتیں جیل پہنچ گئیں۔ ان میں ہماری صوبائی آئین ساز مجالس کے، جنھیں حکومت نے معطل کر دیا تھا، ارکان اور صدر بڑی تعداد میں شامل تھے۔ اس طرح سے ہم نے دنیا کو دکھا دیا کہ اگر ہماری منتخب شدہ اسمبلیوں کو

کام کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو ان کے ممبر ہرگز استبدادی حکومت کے آگے سر نہیں جھکائیں گے بلکہ جیل جانے کو اس پر ترجیح دیں گے۔

ان لوگوں کے علاوہ جنھوں نے سول نافرمانی میں حصہ لیا ہزاروں آدمی تقریریں کرنے کی بنا پر یا کسی اور الزام میں گرفتار کرلئے گئے اور جیل بھیج دئے گئے اور بہت سے لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے نظربند کردیا گیا۔ میں شروع ہی میں گرفتار ہوگیا تھا اور مجھے ایک تقریر کے جرم میں چار سال کی سزا دی گئی تھی۔

اکتوبر ۱۹۴۰ء سے ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے تک یہ سب لوگ جیل خانوں میں رہے۔ ہمیں جو کچھ معلومات حاصل ہوسکتی تھی اس کی روشنی میں ہم لڑائی کی رفتار کا اور ہندوستان کے اور دنیا کے واقعات کا مطالعہ کرتے رہے۔ ہم نے صدر روزویلٹ کا چہار گونہ آزادی کا اعلان اخبارات میں پڑھا۔ ہم نے اٹلانٹک چارٹر کا ذکر سنا۔ تھوڑے ہی دن بعد مسٹر ونسٹن چرچل کی یہ شرط بھی سن لی کہ اس چارٹر کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہوگا۔

جون ۱۹۴۱ء میں ہم اس چیز کو سن کر بہت پریشان ہوئے کہ ہٹلر نے یکایک روس پر حملہ کردیا اور اس کی وجہ سے جنگ کی حالت میں جو ڈرامائی تبدیلیاں ہوئیں ان کا تشویش ناک دلچسپی سے مطالعہ کرنے لگے۔

دسمبر ۱۹۴۱ء کو ہم میں سے بہت سے لوگ رہا کردئے گئے اس کے تین دن کے بعد پرل ہاربر پر اچانک حملہ ہوگیا اور بحرالکاہل کی جنگ شروع ہوگئی۔

۶ - پرل ہاربر کے حملہ کے بعد

مہاتما گاندھی اور عدم تشدّد

ہماری رہائی کے بعد بھی ہندوستان اور انگلستان کا مسئلہ جہاں کا تہاں تھا۔ قومی نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی جیل کی زندگی کا مختلف اثر ہوتا ہے بعض لوگ دب جاتے ہیں یا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن بعض پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں اور ان کے عقیدوں میں اور پختگی آجاتی ہے۔ عام طور پر دوسری قسم کے لوگوں کا عوام پر زیادہ گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگرچہ ہمارے قومی نقطۂ نگاہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن پرل ہاربر اور اس کے بعد کے واقعات نے ہمیں اور پریشان کر دیا اور ہم دنیا کے حالات کو اور ہی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس پریشانی کی فضا میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا فوری اجلاس طلب کیا گیا۔ اگرچہ اس وقت تک جاپانی کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھے تھے لیکن اتحادیوں کو زبردست نقصانات پہنچ چکے تھے اور ملک پر اس کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ کانگریس والوں کے دل میں یہ خواہش بڑھ گئی کہ ان خطروں کا مقابلہ کرنے میں عملی حصہ لیں۔ جیل جانا ان حالات میں بالکل بے معنی تھا۔ لیکن جب تک باعزت تعاون کی کوئی صورت نہ ہو اور لوگوں کو عمل پر ابھارنے کے لئے کوئی خاص محرک موجود نہ ہو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ محض آنے والے خطرے کا احساس کافی نہ تھا۔

جو کچھ پہلے ہو چکا تھا اس کے باوجود ہم جنگ میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے بے چین تھے خصوصاً ایسی حالت میں جب ہندوستان کی حفاظت کا سوال درپیش تھا مگر ہماری شرط یہ تھی کہ ملک میں ایک قومی

حکومت قائم کی جائے جس میں ہم ملک کی دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کریں تاکہ عوام کو یہ محسوس ہو کہ ہماری جنگی سرگرمی اس بیرونی طاقت کے دباؤ سے نہیں جس نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے بلکہ حقیقت میں قومی جدوجہد ہے۔ کانگریس میں اور دوسری پارٹیوں میں اس عام مسئلے کے متعلق کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن خلاف توقع خود ہمارے اندر شدید اصولی اختلاف پیدا ہو گیا۔ گاندھی جی نے کہا کہ وہ بیرونی جنگ کے سلسلے میں بھی جنگ کے اس قدر قریب آجانے کو وہ اپنے لئے ایک چیلنج اور اپنے عقیدے کے لئے ایک آزمایش سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اس نازک موقعے پر عدم تشدد کو ترک کردیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اہنسا اس قسم کا بنیادی اصول اور ہمہ گیر طریق کار نہیں جیسا ان کا عقیدہ تھا۔ اس لئے وہ اس اصول کے چھوڑنے کو یا اس میں کسی قسم کی ترمیم کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے بھلا وہ اس عقیدے کو کیسے ترک کر دیتے جس کے وہ ساری عمر پابند رہے اور جس پر ان کی تمام جدوجہد مبنی تھی۔ غرض وہ عدم تشدد کے لازمی نتائج اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے لئے تیار تھے۔

۱۹۳۸ء میں عہد نامہ میونک کے موقعے پر جب لڑائی شروع ہونے کے آثار نظر آرہے تھے اسی قسم کی دقت پہلی مرتبہ پیش آئی تھی۔ میں اس وقت یورپ تھا اس لئے اس بحث میں شریک نہ ہو سکا۔ لیکن جنگ کے ملتوی ہوجانے کی وجہ سے یہ مشکل ٹل گئی۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہونے کے موقعے پر نہ تو یہ سوال اُٹھا اور نہ ہم نے اس پر بحث کی۔ کوئی سال بھر بعد ۱۹۴۰ء کے موسم گرما کے آخر میں مہاتما گاندھی نے اس بات کو واضح کر دیا کہ وہ پر تشدد جنگ میں کسی طرح شریک نہیں ہو سکتے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ کانگریس کا بھی یہی طرز عمل ہو وہ ہر قسم کی اخلاقی اور مادی مدد دینے کے لئے تیار تھے مگر مسلح اور پر تشدد جنگ میں کوئی عملی

اعانت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس اس امر کا اعلان کر دے کہ ہندستان کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی وہ عدم تشدد کے اصول کو نہیں چھوڑے گی۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ عام طور پر ملک میں اور خود کانگریس میں بھی بہت سے لوگ عدم تشدد کے قائل نہیں رہے انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ جب ملک میں بچاؤ کا سوال پیدا ہوگا اس وقت ہندوستان کی آزاد حکومت عدم تشدد کو خیرباد کہہ کر بحری اور ہوائی طاقت تعمیر کرے گی۔ لیکن ان کی خواہش یہی تھی کہ اگر ممکن ہو تو کم از کم کانگریس عدم تشدد کا علم بلند رکھے اور لوگوں کو یہ تعلیم دے کہ وہ رفتہ رفتہ پر امن جدوجہد کا طریقہ اختیار کریں۔ ہندوستان کے فوجی طاقت سے مسلح ہونے کا تصور ان کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ ان کی دلی آرزو یہ تھی کہ ہندوستان عدم تشدد کی ایسی مثال پیش کرے جسے دیکھ کر دنیا کے اور ملک بھی جنگ اور تشدد کو ترک کر دیں۔ گو ہندوستان مجموعی طور پر عدم تشدد کو نہ مانتا ہو مگر کانگریس کے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب آزمائش کا وقت آئے تو اس اصول کو چھوڑ بیٹھے۔

کانگریس نے ایک مدت سے آزادی کی جدوجہد اور قومی اتحاد کے حصول کے لئے عدم تشدد کو اپنا اصول اور طریق کار بنا رکھا تھا۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھی تھی اور اس نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ بیرونی حملے سے بچنے کے لئے یا ملک میں اندرونی بدامنی کو روکنے کے لئے بھی اس اصول کا استعمال ہو سکتا ہے بر خلاف اس کے وہ ہندوستانی فوج کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتی تھی اور اس نے کئی بار یہ مطالبہ کیا کہ فوج کے سب افسر ہندوستانی ہونے چاہئیں۔ اس مسئلے کے متعلق مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے بارہا خود تجویزیں پیش کیں اور دوسری کی پیش کی ہوئی تجویزوں کی تائید کی۔ میرے والد مرحوم پارٹی لیڈر کی

حیثیت سے ۱۹۲۰ء کے بعد کے سالوں میں اسکین کمیٹی کے ممبر رہے جو فوج کی ازسرِ نو تنظیم کرے اور اس میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھانے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ بعد میں انھوں نے اس کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ جس کی وجہ محض سیاسی تھی اور اس کا عدم تشدد کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں صوبائی حکومتوں کے مشورے سے کانگریس پارٹی نے چند تجاویز پیش کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ فوج کی توسیع کی جائے، اس کے لئے موٹریں، ٹینک وغیرہ مہیا کئے جائیں، ہندوستان کی بحری اور ہوائی طاقت کو جو موجودہ حالت میں صفر کے برابر ہے ترقی دی جائے اور رفتہ رفتہ برطانوی فوج کو ہٹا کر صرف ہندوستانی فوج رکھی جائے۔ چونکہ ہندوستان میں انگریزی فوج کے مقابلے میں چار گنا خرچ آتا ہے اس لئے صرف ہندوستانی فوج رکھی جائے تو وہ بغیر مزید خرچ کے جدید ترین آلات حرب سے مسلح کی جاسکتی ہے۔ جس زمانے میں میونک کے عہدنامے کا چرچا ہورہا تھا ہم نے پھر اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی ہوائی طاقت کو بڑھایا جائے مگر حکومت نے اس کا یہ جواب دیا کہ ماہرینِ فن کی رائے اس کے خلاف ہے۔ ۱۹۴۰ء میں کانگریسی پارٹی نے مرکزی اسمبلی میں خاص طور پر اسی غرض سے شرکت کی ان سب تجویزوں کو دہرایا، اور یہ بتایا کہ ہندوستان کے بچاؤ کے انتظام میں حکومت ہند اور اس کے جنگی محکمے نے کس قدر نااہلی کا ثبوت دیا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے فوجی، بحری اور ہوائی طاقت یا پولیس کے معاملے میں کبھی عدم تشدد کا سوال نہیں اٹھا۔ یہ ایک مانی ہوئی بات تھی کہ عدم تشدد کا اصول صرف ہماری جنگ آزادی تک محدود ہے۔ اس میں شک نہیں اس اصول نے مختلف طریقوں سے ہمارے خیالات پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ اسی وجہ سے کانگریس نے عالمگیر تخفیف اسلحہ کی اور اس اصول کی پرزور حمایت کی سب قومی

اور بین الاقوامی جھگڑے بغیر جنگ کے طے ہو جایا کریں۔

جب صوبوں میں کانگریسی حکومتیں برسرِ اقتدار تھیں تو ان میں بعض نے یونیورسٹی اور کالج کے طلبا کو فوجی تربیت دینا چاہا لیکن حکومت کو یہ تجویز پسند نہیں آئی اور اس نے اسے چلنے نہیں دیا۔

اگرچہ گاندھی جی ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے مگر انھوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ وہ تو یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ بلوؤں کو فرو کرنے میں پولیس تشدد سے کام لے چنانچہ انھوں نے کئی بار ایسے موقعوں پر رنج کا اظہار کیا مگر انھوں نے اس کو کمتر درجے کی برائی سمجھتے ہوئے اس امید پر گوارا کر لیا کہ کبھی نہ کبھی ان کی تعلیم کا اثر ملک پر ضرور ہوگا۔ کانگریس کے ان رجحانات کو وہ اس قدر ناپسند کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے دو ایک سال بعد انھوں نے کانگریس کی رکنیت سے قطع تعلق کر لیا اگرچہ اس کے بعد بھی وہ بدستور اس کے مسلمہ رہنما اور مشیر بنے رہے۔ یہ صورت حال ہم سب کے لئے ناقابلِ اطمینان تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی کا شاید یہ خیال تھا کہ اس طرح سے وہ ذاتی طور پر کانگریس کے ان مختلف فیصلوں کے جو وہ وقتاً فوقتاً عدم تشدد کے اصول کے خلاف کرتی رہتی ہے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ گاندھی جی کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک طرف وہ قومی لیڈر ہیں اور دوسری طرف ایک پیام کے حامل ہیں جو صرف ہندوستان ہی کے لئے نہیں بلکہ کل عالم انسانیت کے لئے ہے۔ ان کی ان دونوں حیثیتوں میں ہمیشہ کشمکش رہتی ہے جو خود ان کی زندگی میں اور ہماری قومی سیاست میں نظر آتی ہے۔ حق کی مکمل پیروی اور زندگی، خصوصاً سیاسی زندگی کی مصلحتوں میں مطابقت پیدا کرنا بہت مشکل ہے حق کا خیال اگر انھیں آتا ہے تو اسے دل کے ایک کونے [illegible] ہیں اور اپنے عمل کی بنیاد مصلحت کو قرار دیتے ہیں سیاست میں ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے۔ اس کی صرف یہی وجہ نہیں کہ اربابِ سیاست بدقسمتی سے ایک خاص قسم کے مصلحت پرست

مخلوق واقع ہوئے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ محض اپنی ذاتی حیثیت سے کام نہیں کر سکتے۔ انھیں دوسروں سے کام لینا ہوتا ہے اور اس کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ دوسروں میں حق کو سمجھنے اور قبول کرنے کی کہاں تک صلاحیت ہے اس لئے حق میں تصرف کرنا اور اسے موجودہ حالات کے مطابق بنانا پڑتا ہے۔ یہ مطابقت ضروری ہے لیکن اس میں بہت سے خطرے ہیں۔ جن سے چشم پوشی کی عادت بڑھتی جاتی ہے۔

گاندھی جی جہاں اپنے عقائد اور اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہ سکتے ہیں وہاں ان میں دوسروں سے نبھانے کی اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ وہ دوسروں کی خصوصاً عوام کی طاقت اور کمزوری کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ حق کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس پر عوام کہاں تک عمل کر سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ ایک دم سے اپنا قدم روک لیتے ہیں جیسے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ مصالحت کی رو میں بہت دور تک بہ گئے ہیں اور فوراً اپنی لنگر گاہ پر واپس آجاتے ہیں۔ جب عمل کا وقت ہو تو وہ عوام کی طبیعت سے ہم آہنگ رہتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کو سمجھ کر ایک حد تک اپنے طرز عمل کو اس کے مطابق بناتے ہیں لیکن دوسرے موقعوں پر وہ نظریات پر زیادہ زور دینے لگتے ہیں اور حالات سے مطابقت کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ یہی فرق ان کی تحریروں میں اور ان کے عمل میں نظر آتا ہے یہ چیز عوام کو الجھن میں ڈال دیتی ہے اور ان سے بھی زیادہ دوسرے ملکوں کے لوگوں کو کیونکہ وہ ہندوستان کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک فرد واحد کس حد تک ایک پوری قوم کے خیالات پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ تاریخ میں اس قسم کے لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے

اپنی قوم کے خیالات پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ انھوں نے صرف اتنا ہی کیا ہو کہ جو خیالات پہلے سے لوگوں کے ذہن میں تھے انھیں ابھار دیا ہو یا اپنے زمانے کے مبہم احساسات کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہو۔ موجودہ زمانے میں گاندھی جی نے ہندوستانی ذہن پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ اثر کس صورت میں اور کب تک قائم رہے گا۔ اس کا جواب مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ ان کا اثر صرف انہیں لوگوں تک محدود نہیں، جو ان کو قومی لیڈر مانتے ہیں اور ان کے خیالات سے متفق ہیں بلکہ یہ اثر ان لوگوں پر بھی ہے جو ان سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو گاندھی جی کی فلسفۂ عدم تشدد اور ان کے اقتصادی نظریوں سے پورے طور پر متفق ہوں۔ لیکن کسی نہ کسی حد تک ان سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ وہ عموماً مذہبی انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور انھوں نے سیاسی مسائل اور روزانہ زندگی کے واقعات کو ایک خاص اخلاقی رنگ دے دیا تھا۔ ان کی تعلیم کے مذہبی پہلو کا اثر زیادہ تر ان لوگوں پر ہوا جنھیں مذہب سے لگاؤ ہے لیکن اخلاقی پہلو نے دوسروں کو بھی متاثر کیا بہت سے لوگوں کا معیار اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے بلند تر ہو گیا۔ بہت سے ایسے تھے جنھیں مذہبی اور اخلاقی مسائل پر کم سے کم غور ضرور کرنا پڑا اور غور و فکر کا کچھ نہ کچھ اثر عمل پر بھی ہوتا ہی ہے سیاست محض مصلحت پرستی نہیں رہتی جیسے دوسرے ملکوں میں ہے اور ہر فکر و عمل سے پہلے ذہن میں ایک مسلسل اخلاقی کش مکش رہا کرتی ہے کہ وقتی مصلحت کو بالکل نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا لیکن دوسری باتوں کا لحاظ رکھنے اور دور تک سوچنے سے اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی کا اثر ہندوستان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے اور راسخ ہو چکا ہے وہ کچھ اپنے فلسفۂ عدم تشدد یا اپنے اقتصادی

نظریوں کی وجہ سے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر نہیں مانے جاتے بلکہ ملک کی بہت بڑی آبادی ان کی ذات کو ایک علامت سمجھتی ہے ہندوستان کے عزم آزادی کی، سرفروشانہ جذبۂ قومیت کی، غرور اور طاقت کے آگے سر نہ جھکانے اور قومی ذلت کو گوارا نہ کرنے کی۔ اگرچہ لوگ سینکڑوں باتوں میں ان سے اختلاف رکھتے ہوں، ان پر اعتراض کرتے ہوں اور کسی خاص معاملے میں ان سے علیحدگی تک اختیار کر لیتے ہوں لیکن عمل اور جدوجہد کے موقعے پر، جب ہندوستان کے آزاد کرانے کا سوال ہو لوگ پھر ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے ہیں اور ان کو اپنا قدرتی لیڈر سمجھتے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب گاندھی جی نے جنگ کے اور آزاد ہندوستان کے مستقبل کے سلسلے میں عدم تشدد کا سوال اٹھایا تو کانگریس کی مجلس عاملہ کو اپنا خیال صاف صاف الفاظ میں ظاہر کرنا پڑا اور اس نے گاندھی جی سے کہہ دیا کہ وہ اس معاملے میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ہندوستان یا کانگریس کو اس کا پابند نہیں کر سکتی کہ آئندہ زمانے میں بیرونی معاملات میں بھی عدم تشدد سے کام لیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مسئلے پر ان سے کھلم کھلا ان بن ہو گئی۔ اس کے دو مہینے کے بعد مزید بحث مباحثہ ہوا اور فریقین ایک تجویز پر متفق ہو گئے جو آگے چل کر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رزولیوشن میں شامل کر لی گئی۔ سمجھوتے کی یہ تجویز گاندھی جی کے اپنے نقطۂ نظر کو ظاہر نہیں کرتی تھی بلکہ اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی نے بادلِ ناخواستہ کانگریس کی طرف سے عدم تشدد کے معاملے میں اس اعلان کا جاری ہونا منظور کر لیا ہے۔ اس درمیان میں حکومت برطانیہ کانگریس کی اس تازہ پیش کش کو کہ وہ قومی حکومت کی بنیاد پر لڑائی میں تعاون کرنے پر آمادہ ہے ٹھکرا چکی تھی۔

اب صاف نظر آ رہا تھا کہ حکومت سے تصادم ہونے والا ہے۔ کانگریس اور گاندھی جی دونوں یہ چاہتے تھے کہ جو کشیدگی آپس میں پیدا ہو گئی اس کو کسی طرح دور کیا جائے۔ عدم تشدد کے اصول کے متعلق جو فارمولا منظور کیا گیا تھا اس کا اب جنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ پہلے کی طرح اس دفعہ بھی ہماری پیش کش کو حکومت برطانیہ نے بری طرح سے ٹھکرا دیا تھا۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا تھا کہ عدم تشدد کے متعلق کانگریس کا نظریہ کیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ کانگریس کے خیال کے مطابق آزاد ہندوستان بیرونی تعلقات میں اس اصول پر کس طرح عمل کرے گا۔ اس تجویز کے اس حصے کے الفاظ یہ تھے :-

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی عدم تشدد کے اصول اور طریق عمل پر کامل عقیدہ رکھتی ہے اور اسے نہ صرف حصول آزادی کی کوششوں میں بلکہ جہاں تک ممکن ہے آئندہ آزاد ہندوستان میں بھی استعمال کرنا چاہتی ہے کمیٹی کا یہ خیال ہے اور حالات حاضرہ سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اگر دنیا کو تباہی سے بچانا ہے اور بربریت کے دور کی طرف واپس نہیں جانا ہے تو یہ ضروری ہے کہ دنیا کے سب ملکوں میں مسلح قوت کو ختم کر دیا جائے۔ ایک جدید سیاسی اور معاشرتی نظم قائم کیا جائے جس کی بنیاد عدل و انصاف پر قائم ہو۔ تخفیف اسلحہ کی حمایت میں آزاد ہندوستان اپنی پوری قوت صرف کرے گا بلکہ اس کے لئے تیار رہے گا کہ اپنی مثال سے دوسرے ملکوں کی رہنمائی کرے۔ ہندوستان کا یہ اقدام لازمی طور پر ملک کی اندرونی حالت اور دوسرے ملکوں کے رویے پر منحصر ہوگا مگر بہر صورت ہندوستان کی حکومت تخفیف اسلحہ کی پالیسی کو عمل میں لانے کے لئے ہر امکانی کوشش کرے گی۔ دنیا میں حقیقی امن وامان اسی وقت قائم ہو سکتا ہے اور تخفیف اسلحہ کی پالیسی پورے طور پر اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ قوموں میں جنگ اور کش مکش کے

اسباب دور کر دئے جائیں۔ ان اسباب کے دور کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ کسی ملک پر دوسرے ملک کا تسلط نہ رہنے دیا جائے اور کسی قوم کو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ دوسری قوم کے وسائل کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرے۔ ہندوستان اس مقصد کے لئے پرامن طریقے سے جد وجہد کرے گا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان ایک آزاد اور خود مختار قوم کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ آزادی اس کی تمہید ہوگی کہ ہندوستان آزاد اقوام کی برادری میں شریک ہو کر اور ان کے ساتھ مل کر دنیا کے امن و ترقی کی خاطر کام کرے گا۔"

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس تجویز میں جہاں کانگریس کی امن پسندی اور تخفیف اسلحہ کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے وہاں بہت سی شرائط کی تکمیل پر بھی زور دیا گیا ہے۔

۱۹۴۰ء میں کانگریس کے اندرونی اختلافات ختم ہو گئے۔ اس کے بعد ہم سب لوگوں کو سال بھر کے قریب جیل میں رہنا پڑا۔ ۱۹۴۱ء میں جب گاندھی جی نے مکمل عدم تشدد پر اصرار کیا تو حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے ممبر گاندھی جی کے نقطۂ نظر کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مجموعی طور پر کانگریس جس میں گاندھی جی کے وفادار پیرو بھی شامل ہیں عدم تشدد کے مسئلے میں گاندھی جی سے اختلاف رکھتی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا اور حالات جس تیزی سے پلٹا کھا رہے تھے اس کا ہم سب پر اثر ہوا۔ گاندھی جی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انھوں نے کانگریس پر زیادہ زور نہیں ڈالا کہ وہ ان کے نقطۂ نظر کو مان لے۔ اگرچہ اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ وہ کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔ گاندھی جی نے کانگریس میں پھر کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا۔ کچھ دن بعد جب سر اسٹیفورڈ کرپس اپنی تجاویز لے کر آئے اس وقت عدم تشدد کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ان

کی تجاویز پر محض سیاسی نقطہ نظر سے غور کیا گیا۔ اس کے بعد کے دور میں جو اگست ۱۹۴۲ء میں ختم ہوا گاندھی جی قومیت اور آزادی کے جوش میں اس پر بھی آمادہ ہو گئے کہ اگر ہندوستان عملاً آزاد ہو جائے تو کانگریس جنگ میں حصہ لے سکتی ہے ان کے لئے یہ ایک زبردست اور حیرت انگیز تبدیلی تھی جس سے انھیں ذہنی اور روحانی تکلیف ہوئی۔ ان کے دل میں دو چیزوں کے درمیان شدید کشمکش تھی۔ ایک طرف عدم تشدد کا عقیدہ تھا جسے وہ مقصد حیات سمجھتے تھے دوسری طرف ہندوستان کی آزادی تھی جس میں ان کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ آخر یہی ہوا کہ دوسری طرف کا پلہ جھک گیا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کا عدم تشدد کا عقیدہ کمزور ہو گیا البتہ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ موجودہ جنگ میں کانگریس اس پر عمل نہ کرے۔ عملی سیاست داں کی مصلحت اندیشی مذہبی رہنما کی اصول پرستی پر غالب آگئی۔ جب میں گاندھی جی کی اس ذہنی کشمکش پر غور کرتا تھا جس نے بارہا ان کے فکر و عمل میں بظاہر تناقص پیدا کر دیا اور مجھ پر اور میری سرگرمیوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا تو مجھے یہ عبارت یاد آجاتی تھی جو میں نے ڈلِل ہارٹ کی ایک کتاب میں پڑھی تھی :-

"یہ تصور کہ حصول مقصد کے لئے بالواسطہ کوشش زیادہ مفید ہے اُن سب چیزوں سے قریبی تعلق رکھتا ہے جن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ذہن کا اثر دوسرے ذہن پر، جو تاریخ انسانی کی تشکیل میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے، کس طرح پڑا کرتا ہے۔ لیکن اس تصور کو ایک اور سبق سے جو ہم نے تاریخ سے سیکھا ہے، مطابقت دینا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ ہم منزل مقصود پر یا اس کے قریب صرف اسی طرح پہنچ سکتے ہیں کہ حق کی پیروی میں ثابت قدم رہیں اور اس کی پروا نہ کریں کہ کیا نتیجہ نکلے گا اور اس کا مختلف لوگوں کے مفاد پر کیا اثر ہو گا۔

"تاریخ شاہد ہے کہ پیمبروں نے نوع انسانی کی ترقی میں نہایت اہم حصہ لیا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر انسان حق کا اظہار بے دھڑک کرتا ہے تو آخر میں اُسے عملی حیثیت سے بھی کامیابی ہوتی ہے لیکن اسی کے ساتھ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ پیمبر کی تعلیم کو لوگوں میں پھیلانا اور مقبول بنانا ان حضرات کا کام ہے جو "لیڈر" کہلاتے ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ فلسفے کے ساتھ ساتھ حکمت عملی کے بھی ماہر ہوں اور حق کی تلقین میں لوگوں کی قابلیت اور ظرف کا خیال رکھیں۔ ان کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک حق کا ادراک کرسکتے ہیں اور اس کے اظہار میں حکمت عملی سے کام لے سکتے ہیں۔

پیمبر پر پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ یہی ان کی کامیابی کا معیار ہے۔ لیکن اگر کسی لیڈر پر پتھر پھینکے جائیں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ یا تو حکمت عملی کی ی سے، یا اپنے اور پیمبر کے فرائض میں خلط مبحث کر دینے کی وجہ سے اپنا کام اچھی طرح انجام نہ دے سکا۔ اس کا فیصلہ صرف زمانہ ہی کرسکتا ہے کہ یہ قربانی جو انسان کی حیثیت سے اس کے لئے باعث عزت ہے اس ظاہری ناکامی کی تلافی کرے گی یا نہیں جو اُسے لیڈر کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ کم سے کم وہ لیڈروں کی عام کمزوری سے تو محفوظ ہے کہ وہ حق کو مصلحت پر قربان کر دیتے ہیں حالانکہ آخر میں اس سے ان کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

"کیا اس کا کوئی عملی طریقہ موجود ہے کہ انسان حق کے ادراک میں بھی ترقی کرتا رہے اور اُسے مقبول عام بنانے میں بھی؟ اگر آپ تدبیر جنگ کے اصول پر غور کریں تو اس مسئلے کا ایک حل سمجھ میں آتا ہے۔ تدبیر جنگ میں اس بات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ اصل مقصد کو برابر پیش نظر رکھا جائے مگر اس کے حاصل کرنے کے لئے وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو حالات کے لحاظ سے مناسب

ہو۔ حق کی مخالفت تو ضرور ہی ہوگی خصوصاً ایسی صورت میں جب وہ ایک نئے
خیال کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ لیکن اگر ہم مقصد کے ساتھ ساتھ طریق عمل
کا بھی لحاظ رکھیں تو مخالفت کی شدت میں کمی ہو سکتی ہے۔ اس مضبوط مورچے پر
جو عرصۂ دراز سے قائم ہے سامنے سے حملہ نہ کرو بلکہ گھوم کر بازو کی طرف سے
تاکہ حق کی زد میں وہ حصہ آئے جو آسانی سے ٹوٹ جائے۔ لیکن اس طرح کی ہر ایک
کوشش میں اس امر کی بڑی احتیاط ہونی چاہئے کہ حق سے انحراف نہ ہونے پائے
راہ حق کے رہبر و کے لئے اس سے بڑھ کر مہلک کوئی چیز نہیں کہ اس کا قدم بہک کے
باطل کی طرف چلا جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ہم اس پر نظر ڈالیں کہ خیالات کو
قبول عام حاصل کرنے سے پہلے کن کن منزلوں سے گذرنا پڑا تو معلوم ہوتا ہے
کہ ان لوگوں کو بڑی آسانی ہوئی جنھوں نے ان خیالات کو اس طرح پیش کیا کہ ہم
کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ایک پرانے سبق کو جسے تم نے بھلا دیا ہے۔
نئے لفظوں میں دہرا رہے ہیں۔ اس کے لئے دھوکا دینے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ
صرف نئے اور پرانے سبق کے تعلق کو ڈھونڈھ نکالنے کی کیونکہ دنیا میں بالکل نئی تو
کوئی چیز ہوتی ہی نہیں"

۷۔ سیاسی کش مکش

۱۹۴۲ء کے شروع کے مہینوں میں ہندوستان میں سیاسی کشاکش
بہت بڑھ گئی۔ اب جنگ ہندوستان سے بہت قریب آچکی تھی اور اس بات کا
قوی امکان تھا کہ ہندوستان کے شہروں پر ہوائی حملے ہوں گے۔ لوگوں کے دلوں
میں اس قسم کے سوالات پیدا ہو رہے تھے کہ جن مشرقی ملکوں میں جنگ کے شعلے
بھڑک رہے ہیں وہاں کیا ہونے والا ہے؟ ہندوستان اور انگلستان کے

تعلقات میں کیا تبدیلی پیدا ہوگی؟ کیا ہم اب بھی پچھلی تلخیوں کی یاد کی بنا پر، دور سے ایک دوسرے کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے رہیں گے اور اٹل تباہی کا شکار ہو جائیں گے؟ یا مشترکہ خطرے کا احساس ہمارے اختلافات کو دور کر دے گا!

شہروں کے بازار تک خواب غفلت سے چونک اٹھے ان میں گھبراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہر قسم کی افواہوں نے زور پکڑنا شروع کیا۔ دولتمند طبقہ مستقبل سے خائف تھا جو تیزی سے قدم بڑھاتا چلا آرہا تھا۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو یہ بات صاف نظر آتی تھی کہ آنے والا زمانہ اس سماجی نظام کو جس کے وہ عادی ہیں، مسمار کر دے گا اور ان کے مفاد اور مرتبے کو خطرے میں ڈال دے گا۔ کسان اور مزدور البتہ مطمئن تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس رکھا کیا ہے جو چھن جائے گا بلکہ وہ تو صدق دل سے چاہتے تھے کہ ان افسوسناک حالات میں کوئی تبدیلی ہو۔

ہندوستان کے لوگ عرصے سے چین سے ہمدردی رکھتے تھے اس لئے قدرتی طور پر وہ کسی حد تک جاپان کے مخالف تھے۔ شروع شروع میں یہ خیال تھا کہ بحرالکاہل کی جنگ چھڑ جانے سے چین پر دباؤ کم ہو جائے گا۔ ساڑھے چار سال تک چین تن تنہا جاپان کا مقابلہ کرتا رہا مگر اب اس کے ساتھ طاقتور اتحادی ملک شریک ہو گئے تھے۔ اس لئے قدرتاً اس کا بار ہلکا ہو جانا چاہئے تھا اور جو خطرات اس کو در پیش تھے ان میں کمی ہونی چاہئے تھی مگر ان اتحادی ملکوں کو شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ اور بڑھتی ہوئی جاپانی فوجوں کے سامنے برطانیہ کے مقبوضات کا مورچہ تیزی سے ٹوٹ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ عالیشان عمارت محض دیکھنے ہی دیکھنے کی ہو۔ لوگ اس کا مقابلہ چین سے کرتے تھے کہ وہ جدید آلات حرب سے محروم ہونے کے باوجود اتنے سال سے جاپان کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کر رہا ہے ان کے دلوں میں چین کی عظمت بڑھ گئی

اور اگرچہ وہ جاپان کو پسند نہیں کرتے تھے مگر انھیں اس سے خوشی ہوتی تھی کہ ایک ایشیائی مسلح طاقت کے مقابلے میں یورپ کی نوآبادیوں کا نظام جو مدتوں سے قائم ہے پاش پاش ہو رہا ہے۔ برطانیہ کے لوگوں کے دلوں میں بھی یہی نسلی امتیاز اور منافرت کا جذبہ موجود تھا۔ شکست اور مصیبت کی تلخی یوں بھی کچھ کم نہ تھی مگر جب یہ خیال آتا تھا کہ ایک ایشیائی اور مشرقی طاقت ان پر غالب آگئی تو رنج اور ذلت کا احساس اور بڑھ جاتا تھا۔ "ایک انگریز نے جو کہ ایک بڑے عہدے پر مامور تھا یہ کہا کہ زرد نسل کے جاپان کے بجائے اگر جرمنی "پرنس آف ویلز" اور "ریپلس" کو ڈبو دیتا تو اس کو اتنا رنج کبھی نہ ہوتا۔"

ہندوستان میں جنرل ویمو اور مادام چیانگ کائی شیک کا آنا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ اگرچہ سرکاری رسوم وقیود اور حکومت ہند کی خواہش کے مطابق وہ یہاں کے عوام سے نہ مل سکے لیکن اس نازک مرحلے پر ان کے ہندوستان آنے اور ہندوستان کی آزادی کی کھلم کھلا حمایت کرنے کی وجہ سے ہندوستانی قومیت کی تنگ حدود سے نکل کر بین الاقوامی مسائل سے روشناس ہو گئے جو اس وقت درپیش تھے۔ چین اور ہندوستان کا رشتۂ یگانگی اور مضبوط ہو گیا اور مشترکہ دشمن کے مقابلے میں چین اور دوسری قوموں کے ساتھ مل کر لڑنے کی خواہش ہندوستانیوں کے دل میں اور زیادہ بڑھ گئی۔ ہندوستان کے خطرے میں پڑ جانے سے لوگوں کے دلوں سے قومیت اور بین الاقوامیت کا اختلاف دور ہو گیا۔ اب اس راستے میں صرف ایک ہی رکاوٹ تھی یعنی برطانیہ کی پالیسی۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت ہند کو آنے والے خطرات کا کافی احساس تھا۔ وہ بہت پریشان اور متفکر تھی اور سمجھتی تھی کہ فوری قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہندوستان میں انگریز کچھ ایسے رسم پرست اور لکیر کے فقیر تھے، دفتری

کارروائی کے طول طویل سلسلے میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ ان کے خیال اور عمل میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔ انھیں کوئی جلدی نہ تھی، بے چینی کا احساس اور کام کی لگن نہ تھی۔ جس نظام کے وہ پابند تھے وہ ایک دوسرے زمانے کے لئے اور دوسرے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر تعمیر کیا گیا تھا۔ خواہ فوجی افسر ہوں یا ملکی حکام سب کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا کہ ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھیں۔ آزادی کی ہر تحریک کو کچل دیں۔ اس کام کے لئے ان میں اچھی خاصی قابلیت تھی لیکن جب انھیں ایک زبردست اور ظالم دشمن سے جدید طرز کی جنگ کرنی پڑی تو وہ اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہ بنا سکے۔ اس کی محض یہی وجہ نہ تھی کہ ذہنی حیثیت سے اس کے اہل نہیں تھے بلکہ یہ بھی تھی کہ ان کی قوتوں کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کی قومی تحریک کے کچلنے میں صرف ہوتا رہتا تھا۔ برما اور ملایا میں نئے حالات میں ان کے نظام حکومت کی ناکامی ایک ایسا زبردست واقعہ تھا جو ان کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی تھا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ برما کی سول سروس اسی قسم کی تھی جیسی ہندوستان میں بلکہ چند سال پہلے برما ہندوستان کے نظام حکومت کا ایک جز تھا۔ اس لئے وہاں حکومت کے وہی طریقے رائج تھے جو ہندوستان میں ہیں۔ اگرچہ برما کے واقعات نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ نظام حکومت کس قدر فرسودہ ہے مگر پھر بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور وائسرائے بہادر اور دوسرے اعلیٰ حکام اسی طرح حکومت کرتے رہے جیسے پہلے کرتے تھے۔ اب ان میں بہت سے بڑے حکام جو برما میں اس بری طرح سے ناکامیاب ہو چکے تھے اور شامل ہو گئے۔ چنانچہ شملے کی چوٹیوں پر ایک اور لاٹ صاحب براجنے لگے جس طرح لندن میں پناہ گزیں حکومتیں جمع ہو گئی تھیں اسی طرح ہندوستان کو برطانیہ کے مقبوضات سے بھاگے ہوئے

افسروں کی مہمان داری کی عزت نصیب ہوئی اور وہ ہندوستان کے برطانوی نظام میں بہت اچھی طرح کھپ گئے۔

جس طرح تھیٹر کے اسٹیج پر پرچھائیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں یہ اعلیٰ حکام اپنے پرانے معمولات کو پورا کرتے رہے وہ اپنے شاہانہ تزک و احتشام سے دربار، پریڈ، ڈنر، ڈنر سوٹ اور شاندار تصویروں سے ہم پر رعب جمانے کی کوشش کرتے رہے۔ نئی دہلی میں وائسرائے کا محل سب سے بڑا مندر تھا جہاں مہا پروہت یہ مقدس رسمیں انجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مندر اور پجاری تھے۔ یہ شاہانہ جاہ و جلال، یہ رسمیں اور تقریریں سب اس لئے تھیں کہ لوگوں کو مرعوب کیا جائے، اور چونکہ ہندوستانی اس قسم کے تکلفات کے عادی ہیں اس لئے وہ ان باتوں سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ لیکن اب نئے معیار قائم ہوگئے تھے، نئی قدریں پیدا ہوگئی تھیں، اس لئے لوگ اس نمود نمائش کا مذاق اڑانے لگے تھے۔ عام طور پر ہندوستانیوں کے متعلق یہ خیال ہے کہ یہ لوگ بہت سست ہیں اور جلدبازی سے گھبراتے ہیں لیکن اب کام کی لگن نے ان کے عمل میں تیز رفتاری اور قوت پیدا کر دی تھی۔

صوبوں کی کانگریسی حکومتوں میں خواہ کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں مگر انھیں یہ فکر ضرور تھی کہ کچھ کر دکھائیں اس لئے انھوں نے مسلسل سرگرمی اور محنت سے کام کیا اور بہت سے قدیم دفتری ضابطوں کو نظر انداز کر دیا پھر ہمیں یہ دیکھ کر غصہ آتا کہ اس شدید خطرے کے زمانے میں حکومت ہند اور اس کے بہت سے افسر انتہائی بے حسی اور سستی سے کام کر رہے تھے۔ اب ہندوستان میں امریکی فوجیں آئیں ان لوگوں کو یہ فکر تھی کہ کام ہو اور جلدی ہو۔ وہ حکومت ہند کے رسوم و ضوابط سے واقف نہیں تھے اور ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ انھیں تاخیر کی برداشت نہ تھی وہ

دفتری کارروائیوں اور ہر قسم کی رکاوٹوں کو جو ان کی راہ میں حائل ہوتی تھیں ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے اور نئی دہلی کی پرسکون زندگی میں خلل انداز ہوتے تھے۔ انھیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کس موقعے پر کیا لباس پہننا چاہئے۔ اور بعض اوقات وہ سرکاری آداب و رسوم جن کی پابندی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ نظر انداز کر دیتے تھے۔ امریکا جو مدد دے رہا تھا وہ تو سب کو اچھی لگتی تھی مگر امریکی لوگوں کو اعلیٰ سرکاری حلقے پسند نہیں کرتے تھے اور انگریزوں اور امریکیوں کے تعلقات اکثر کشیدہ رہتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوستانی مجموعی طور پر امریکیوں سے خوش تھے۔ ان کی مستعدی اور جوش عمل کا دوسروں پر بھی اثر پڑ رہا تھا اور ان میں اور انگریزوں میں جو ان صفات سے خالی تھے بڑا فرق نظر آرہا تھا۔ لوگوں کو ان کی یہ بات پسند تھی کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتے تھے اور سرکاری آدمیوں کی طرح حد سے زیادہ احتیاط نہیں کرتے تھے۔ ان نو وارد امریکیوں اور سرکاری حلقوں میں جو جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں ان سے عوام خوب لطف اندوز ہوتے تھے اور اس قسم کے بہت سے اصلی اور فرضی قصے لوگوں میں مشہور تھے۔

جنگ کے ہندوستان میں آجانے سے گاندھی جی کو بڑی تشویش تھی ان کی عدم تشدد کی پالیسی اور پروگرام کو نئے حالات سے مطابقت دینا آسان نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی فوج ملک پر حملہ آور ہو یا دو فوجیں آپس میں لڑ رہی ہوں تو سول نافرمانی خارج از بحث تھی۔ حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کرنا اور چپ چاپ حملے کو برداشت کر لینا بھی ناممکن تھا۔ سوال یہ تھا کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔ گاندھی جی کی رفقائے کار اور عام طور پر کانگریس کے سب ممبر اس بات پر متفق تھے کہ ایسے موقعے پر عدم تشدد سے کام نہیں چل سکتا اور مسلح حملہ آور فوجوں کا مقابلہ اس طریقے سے نہیں کیا جا سکتا۔ آخر میں مہاتما گاندھی نے تسلیم کر لیا کہ

ہم لوگوں کو یہ فیصلہ کرنے کا حق ہے مگر ان کو اس بات سے سخت تکلیف پہنچی اور وہ انفرادی حیثیت سے کسی ایسی کارروائی میں شریک ہونے کے لئے تیار نہیں تھے جو تشدد پر مبنی نہ ہو۔ لیکن ان کی حیثیت محض انفرادی حیثیت نہ تھی خواہ قومی تحریک میں ان کا کوئی سرکاری منصب ہو یا نہ ہو ان کی شخصیت سب سے ممتاز اور سب پر چھائی ہوئی تھی اور لاکھوں آدمی ان کے حکم پر چلتے تھے۔

گاندھی جی ہندوستان کو خصوصاً ہندوستانی عوام کو اتنی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ شاید ہی کسی نے آج تک سمجھا ہو۔ وہ سارے ہندوستان میں گھومے ہیں اور لاکھوں کروڑوں آدمیوں سے ملے ہیں مگر ان میں ایک اور چیز ہے جس کی وجہ سے انھیں عوام کے جذبات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ اُن میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ہر چیز کو ان کی طرح محسوس کرنے لگتے ہیں اور چونکہ عوام اس بات کو جانتے ہیں اس لئے ان سے دلی عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کا ابتدائی زمانہ گجرات میں گزرا اس لئے ہندوستان کے متعلق ان کا جو نظریہ ہے اس پر گجرات کا رنگ غالب ہے۔ گجرات میں زیادہ تر تجارت پیشہ لوگ رہتے ہیں اور وہ قدرتی طور پر امن پسند ہیں۔ جین مت کے اہنسا کے اصول نے ان پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اہنسا کا اثر بہت کم ہے اور بعض حصوں میں تو بالکل نہیں ہے۔ خصوصاً چھتریوں کے طبقے نے جو ہندوستان میں دور دور تک پھیلا ہوا ہے کبھی اہنسا کے اصول کو اپنی جنگ جوئی یا جنگلی جانوروں کے شکار کے شوق میں مخل نہیں ہونے دیا۔ دوسرے طبقے بھی جن میں برہمن شامل تھے مجموعی طور پر اس اصول سے بہت کم متاثر ہوتے۔ مگر گاندھی جی ہندوستان کی تاریخی اور ذہنی نشوونما کے متعلق ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد عدم تشدد کے اصول پر قائم ہے اگرچہ اکثر اس اصول سے انحراف بھی کیا گیا ہے۔

گاندھی جی کا یہ نظریہ دور از کار نظر آتا ہے، اور ہندوستان کے بہت سے مورخ اور مفکر ان سے متفق نہیں ہیں۔ مگر یہاں اس سے بحث نہیں کہ ہندوستانی زندگی کے موجودہ دور میں عدم تشدد کس قدر مفید ہو سکتا ہے بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ گاندھی جی تاریخ کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

کسی ملک کے جغرافی حالات اس کی تاریخ اور اس کے باشندوں کے اخلاق پر زبردست اثر ڈالتے ہیں۔ ہندوستان کو ہمالیہ پہاڑ اور سمندر نے دوسرے ملکوں سے بالکل الگ کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے جہاں ایک طرف وحدت کا احساس پیدا ہوا وہاں دنیا سے الگ رہنے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی۔ اس وسیع رقبے میں ہم رنگ و ہم آہنگ تہذیب نے جنم لیا جس کے لئے توسیع و ترقی کا بہت بڑا میدان تھا۔ ہر زمانے میں یہ کوشش رہی کہ اس تہذیبی وحدت کو برقرار رکھا جائے مگر جغرافی حالات نے اس وحدت میں کثرت پیدا کر دی شمالی اور وسطی ہند کا وسیع میدان دکن کے رنگ برنگ پہاڑی خطے سے مختلف تھا اور جو لوگ مختلف جغرافی علاقوں میں رہتے تھے ان کے عادات اور خصائل میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ تاریخ نے بھی شمالی ہند اور جنوبی ہند میں الگ الگ راہ اختیار کی اگرچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ دونوں کے راستے مل گئے۔ ہندوستان کا قریب قریب سارا علاقہ ہموار ہے خصوصاً روس کی طرح شمال میں بڑے بڑے میدان ہیں اس لئے بیرونی دشمنوں سے بچاؤ کی غرض سے ایک طاقتور مرکزی حکومت کا ہونا ضروری تھا۔ اگرچہ شمالی ہند اور جنوبی ہند دونوں میں زبردست سلطنتیں قائم ہوئیں مگر حکومت کا مرکز شمال ہی رہا ہے اور جنوب کو اکثر اس کے ماتحت رہنا پڑا۔ پرانے زمانے میں مضبوط مرکزی حکومت لازمی طور پر شخصی استبدادی حکومت ہوتی تھی۔ یہ محض ایک اتفاقی واقعہ نہ تھا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا ایک بڑا سبب مرہٹوں کی

مخالفت تھی. مرہٹے دکن کے پہاڑی علاقے کے رہنے والے تھے اور ان میں ابھی کچھ آزادی کی روح باقی تھی مگر شمالی میدان کے اکثر باشندوں میں غلامی سرایت کر چکی تھی۔ اسی لئے انگریزوں کو بنگال میں آسانی سے فتح حاصل ہو گئی اور زرخیز علاقے کے لوگوں نے چپ چاپ ان کی اطاعت قبول کر لی۔ وہاں قدم جمانے کے بعد وہ تمام ملک میں آسانی سے پھیل گئے۔

جغرافی حالات کی اہمیت اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی لیکن اب دوسرے عناصر ان سے زیادہ اثر ڈالتے ہیں. مثال کے طور پر اگرچہ پہاڑ اور سمندر اب نقل و حرکت میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ لیکن لوگوں کی سیرت اور ملک کی سیاسی اور اقتصادی حالت کی تشکیل میں انھیں اب بھی بہت کچھ دخل ہے۔ چنانچہ جب کسی ملک کو تقسیم کرنے اس کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے یا ملانے کی تجویز درپیش ہو ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا سوائے اس کے منصوبہ بندی عالمگیر پیمانے پر ہو۔ گاندھی جی کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے بہت گہری واقفیت ہے۔ اگرچہ انہیں تاریخ سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اور شاید ان میں وہ تاریخی شعور بھی نہیں ہے۔ جو بعض لوگوں میں ہوتا ہے مگر وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی تہذیب کی جڑیں کس طرح ان کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ وہ حالات حاضرہ سے بھی بہ خوبی واقفیت رکھتے ہیں اور ان کا گہرا مطالعہ کرتے رہتے ہیں لیکن لازمی طور پر ان کی توجہ کا مرکز ہندوستان کے موجودہ مسائل ہیں ان میں ان کی خاص صلاحیت ہے کہ مسئلے کی فروعات کو چھوڑ کر اس کی جڑ کو پکڑ لیتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اس لئے ان کی پالیسی مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے اور ان کی نظر بہت دور تک پہنچتی ہے۔ برنارڈ شا گاندھی جی کے بارے میں کہتا ہے کہ ان سے ترتیب لشکر میں کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ ہوتی ہوں

ان کی تدبیر جنگ ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ مگر اکثر لوگ انجام کار کو نہیں دیکھتے۔ انھیں وقتی کامیابی کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔

۸۔ سر اسٹیفرڈ کرپس کا ہندوستان آنا

جس وقت پینانگ اور سنگاپور انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور جاپانی فوجیں ملایا پر قابض ہوگئیں تو بہت سے ہندوستانی اور غیر ملکی وہاں سے بھاگ کر ہندوستان آ گئے۔ انھیں اپنا گھر بار ایک دم چھوڑنا پڑا تھا اس لئے سوا ان کپڑوں کے جو وہ پہنے ہوئے تھے اپنے ساتھ کچھ نہ لا سکے۔ اس کے بعد برما کے مفرور جن میں زیادہ تر ہندوستانی تھے لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان پہنچے ہندوستان میں سب لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ برما میں سول اور فوجی افسر انھیں ان کے حال پر چھوڑ کر چل دئے۔ انھیں دشمنوں سے گھرے ہوئے پہاڑوں اور گھنے جنگلوں میں سینکڑوں میل پیدل سفر کرنا پڑا۔ ان میں سے بہت سے راستے میں مر گئے۔ اور سینکڑوں دشمن کے ہاتھوں سے مارے گئے۔ اور ہزاروں بیماری یا فاقے سے لقمۂ اجل ہوئے۔ یہ جنگ کا ہولناک نتیجہ تھا جسے چار و ناچار برداشت کرنا تھا۔ لیکن ہندوستانی اور انگریز پناہ گزینوں کی جو تفریق کی گئی اس کے لئے جنگ وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ برطانوی پناہ گزینوں کو ہر طرح کی آسائش پہنچائی گئی اور ان کی نقل و حرکت میں ہر قسم کی امداد دی گئی۔ برما کے ایک ایسے مقام سے جہاں ہزاروں پناہ گزیں جمع ہوگئے تھے ہندوستان کو دو سڑکیں آتی تھیں۔ ان میں سے جو بہتر سڑک تھی وہ انگریزوں اور دوسرے یورپینیوں کے لئے مخصوص کر دی گئی اور اسے لوگ گوروں کی سڑک کہنے لگے۔ اس طرح نسلی امتیاز مصائب کی المناک داستانیں ہندوستان پہنچیں جو مصیبت زندہ بچ گئے تھے

وہ جہاں جہاں گئے اپنے ساتھ یہ داستانیں لے گئے اور انھوں نے ہندوستانیوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔

اسی زمانے میں برطانیہ کی جنگی حکومت کی طرف سے سر اسٹیفرڈ کرپس کچھ تجاویز لے کر ہندوستان آئے پچھلے دو ڈھائی سال میں ان تجاویز پر کافی بحث مباحثہ ہو چکا ہے اور اب وہ داستان پارینہ بن چکی ہیں جن لوگوں نے اس گفت و شنید میں حصہ لیا، وہ اگر اس کی تفصیل بیان کریں تو ایسی باتیں کہنی پڑیں گی جن کا کہنا ابھی خلاف مصلحت ہے۔ در اصل اس سلسلے میں کل متعلقہ مسائل لوگوں کے سامنے آچکے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے پہلے پہل ان تجاویز کو پڑھا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی اس لئے کہ میں سر اسٹیفرڈ کرپس سے بہت کچھ امید رکھتا تھا اور جو نازک حالات درپیش تھے ان کو دیکھ کر بھی یہی توقع ہوتی تھی کہ کوئی بڑا اقدم اٹھایا جائے گا۔ جتنا زیادہ میں نے تجاویز کو پڑھا اور ان کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اسی قدر میری مایوسی بڑھتی گئی۔ ایک ایسے شخص کو جو ہندوستان کے حالات سے پوری واقفیت نہ رکھتا ہو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ وہ بڑی حد تک ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن ان کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا تھا کہ ان میں کس قدر خاص طور پر خود اختیاری کے اصول کو، جو بنیادی چیز تھی، اس قدر مقید اور محدود کر دیا گیا تھا کہ ہمارا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا تھا

یہ تجاویز زیادہ تر مستقبل کے یعنی اس زمانے کے متعلق تھیں جب جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ اگرچہ ایک دفعہ اس قسم کی بھی تھی جس میں کچھ مبہم الفاظ میں موجودہ زمانے میں بھی اشتراک عمل کی دعوت دی گئی تھی۔ مستقبل کے آئین

میں اصول خود اختیاری پر زور دیتے ہوئے صوبوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو ہندوستان کے وفاق میں شامل نہ ہوں اور اپنی جداگانہ آزاد حکومت قائم کریں۔ ہندوستانی ریاستوں کو بھی اسی قسم کا حق حاصل تھا۔ ہندوستان کا متحدہ سلطنت میں شامل ہونا ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں کم و بیش چھ سو ریاستیں ہیں۔ ان میں سے چند بڑی ہیں مگر زیادہ تعداد چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی ہے جو علاقہ غیر سے گھری ہوئی ہیں۔ کرپس کی تجاویز کے یہ معنے تھے کہ یہ ریاستیں اور صوبے مل کر ایک نیا آئین مرتب کریں اُسے اپنی مرضی کے مطابق بنائیں اور جب چاہیں اس سے الگ ہو جائیں۔ غرض تفریق پسندی کا رنگ چھایا ہوا تھا اور ملک کے اہم مسائل کو خواہ وہ اقتصادی ہوں یا سیاسی کوئی اہمیت نہ دی جاتی۔ رجعت پسند طبقے باہمی اختلافات کے باوجود ایک طاقتور ترقی پسند متحدہ قومی حکومت کے قیام کو ناکامیاب بنانے کے لئے متحد ہو جاتے۔ صوبوں اور ریاستوں کی علیحدگی کے خوف سے آئین میں بہت سی ناپسندیدہ دفعات رکھنا پڑتیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مرکزی حکومت کمزور اور بے جان ہو کر رہ جاتی اور اس پر بھی بعض صوبے یا ریاستیں علیحدگی اختیار کر لیتیں۔ اُس وقت آئین میں تبدیلی کرنا اور اسے باقی ماندہ صوبوں اور ریاستوں کے لئے بہتر اور قابل عمل بنانا بہت مشکل ہوتا صوبوں سے مجلس آئین ساز کے ممبر جداگانہ مذہبی حلقہ ہائے انتخاب کی بنیاد پر چنے جاتے۔ اس سے تفریقی رجحان کو اور تقویت پہنچتی مگر موجودہ حالات میں اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ لیکن ریاستوں میں انتخابات کی صورت تجویز نہیں کی گئی تھی اور اس ۹ کروڑ ریاستی باشندوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ والیانِ ریاست کو جو ایک نیم جاگیری نظام کے علم بردار تھے یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی ریاست کی آبادی کے تناسب سے

اپنے نمائندے نامزد کر دیں۔ ممکن ہے کہ ان نامزد شدہ ممبروں میں کچھ قابل وزیر بھی ہوتے مگر یہ لوگ لازمی طور پر عوام کی نمائندگی کے بجائے مطلق العنان والیان ریاست کی نمائندگی کرتے۔ ان لوگوں کی تعداد آئین ساز جماعت میں ایک چوتھائی ہوتی اس لئے وہ اپنی تعداد، اپنی قدامت پسندانہ روش اور علیحدگی کی دھمکیوں سے مرکزی آئین ساز جماعت کے فیصلے پر بہت کچھ اثر ڈال سکتی۔ اس طرح آئین ساز اسمبلی منتخب اور نامزد ارکان کا ایک معجون مرکب ہوتی جس میں ارکان جداگانہ مذہبی حلقہ ہائے انتخاب، اور بعض مخصوص طبقوں کے نمائندے ہوتے اور نامزد ارکان والیان ریاست کے۔ اس پر طرّہ یہ کہ مشترک فیصلوں کو منوانے کے لئے کسی قسم کا قانونی دباؤ نہیں تھا۔ اس کے معنے یہ تھے کہ کسی چیز کا مکمل اور آخری فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس جماعت کے بہت سے ارکان کا رویہ بالکل غیر ذمہ دارانہ ہوتا کیونکہ وہ یہ سمجھتے کہ جب چاہیں اس مجلس سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں اور اس کے فیصلوں کو ماننے سے انکار کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کا تصور ہمارے لئے تکلیف دہ تھا۔ یہ ان سب عقائد اور جذبات کے منافی تھا۔ جو لوگوں کے دلوں میں موجزن ہیں۔ ہماری ساری تحریک کی بنیاد ہی ہندوستان کے اتحاد پر قائم رہ اور یہ جذبۂ وحدت جدید تحریک قومیت سے کہیں زیادہ گہرا اور پرانا ہے اور قدیم تاریخی زمانے سے چلا آتا ہے۔ قومیت کے موجودہ ارتقا نے اس عقیدہ اور جذبے کو لوگوں کے دلوں میں اس قدر قوی کر دیا ہے کہ وہ بے شمار لوگوں کے لئے جزو ایمان بن گیا ہے اور اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا مسلم لیگ نے ہندوستان کی وحدت سے انکار کیا لیکن عام طور پر لوگوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ خود مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ مسلم لیگ کا اعتراض دینوں یا علاقوں کی تفریق پر مبنی نہ تھا اگرچہ اس نے علاقوں کی تقسیم کی ایک مبہم سی

تجویز بھی پیش کی تھی۔ اس کی بنیاد عہد وسطیٰ کے مذہبی تصور قومیت پر قائم تھی جس کی رو سے ہندوستان کے ہر گاؤں یا قصبے میں دو یا دو سے زیادہ قومیں آباد ہیں۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی آبادی ہر جگہ ملی جلی ہے۔ اس لئے تقسیم ہند فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی مناسب حل نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا اور نئے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جذبات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تب بھی تقسیم ہند کے خلاف ٹھوس دلائل موجود ہیں۔ ہندوستان کے سماجی اور اقتصادی مسائل برطانوی حکومت کی پالیسی کی وجہ سے اس درجے نازک صورت اختیار کر چکے ہیں کہ اگر زبردست خطرات اور تباہی سے بچنا منظور ہے تو فوری اور ہمہ گیر ترقی کی ضرورت ہے اور یہ ترقی تبھی ہو سکتی ہے جب سارے ہندوستان کے لئے اور موثر منصوبہ بندی کی جائے اس لئے کہ ملک کے مختلف حصے ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ہندوستان ایک طاقتور اور خود کفیل ملک ہے۔ لیکن اگر اس کو متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ہر ٹکڑا اپنی جگہ پر کمزور ہوگا اور دوسروں کی امداد کا محتاج ہوگا۔ یہ دلائل پہلے بھی خاصے قوی تھے مگر موجودہ سیاسی اور اقتصادی حالات کی وجہ سے ان کی قوت اور بڑھ گئی ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی مستقل حیثیت ختم ہو رہی ہے۔ یا تو وہ ریاستوں میں مدغم ہو جاتی ہیں یا کم سے کم ان کے اقتصادی نظام میں شامل ہو جاتی ہیں۔ عام رجحان یہ ہے کہ مختلف ملکوں کے بڑے بڑے وفاق قائم ہوں یا کئی ملک مل کر ایک مشترکہ نظام حکومت قائم کریں۔ قومی حکومت کے بجائے اب متعدد قوموں کی مشترکہ حکومت کا تصور پیدا ہو رہا ہے اور مستقبل بعید میں ایک عالمگیر وفاق کی

جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ اس زمانے میں تقسیم ہند کا تخیل دنیا کی تاریخی اور اقتصادی نشوونما کی رو کے خلاف ہے اور ایک عجیب طلسم خیال معلوم ہوتا ہے۔

ا پھر بھی بعض اوقات کسی شدید ضرورت سے یا ناگہانی مصیبت سے مجبور ہوکر بہت سی نامناسب باتوں کو ماننا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ جو چیز عقل و عادت کی رو سے ناقابل تقسیم ہے حالات، اس کی تقسیم پر مجبور کردیں۔ مگر برطانوی حکومت کی طرف سے جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان میں ہندوستان کی کسی مقررہ اور معینہ تقسیم کا ذکر [illegible] ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صوبے اور ریاستیں بے شمار ٹکڑوں میں بٹ جائیں گی۔ ہر رجعت پسند، اور پسماندہ گروہ کو شہ دی جا رہی تھی کہ تقسیم کا مطالبہ کرے۔ غالباً ان میں سے کوئی بھی درحقیقت الگ ہونا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ ظاہر ہے چھوٹی چھوٹی جماعتیں اپنے پاؤں پر کیسے کھڑی ہو سکتی تھیں لیکن یہ لوگ اپنے اس رویے سے بہت سی مشکلات پیدا کر سکتے تھے اور ہندوستان کی آزاد ریاست کے بننے میں رکاوٹ ڈال سکتے تھے۔ اگر برطانوی پالیسی ان کے اس رویے کی تائید کرتی، جس کا بہت کچھ امکان تھا تو ہمیں ایک مدت تک آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ ہمیں برطانوی پالیسی کا بڑا تلخ تجربہ تھا اور ہم دیکھ چکے تھے کہ وہ ہر موقعے پر تفرقی رجحانات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہمیں کس طرح یقین ہو سکتا تھا کہ اس مرتبہ وہی پرانی پالیسی نہیں برتی جائے گی تاکہ یہ کہا جا سکے کہ برطانوی حکومت اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکتی اس لئے کہ اس کے ساتھ جو شرطیں تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اغلب تو یہی تھا کہ ایسا ہی کیا جائے گا۔ غرض کرپس کی تجاویز میں صرف یہی برائی نہیں تھی کہ وہ پاکستان کو پالیسی اور اصول پر تقسیم ہند کو منظور کرتی ہیں بلکہ ان سے نامحدود تقسیم کا راستہ کھل جاتا تھا۔ یہ چیز ہندوستان کی آزادی کے لئے ایک مسلسل خطرہ اور آزادی کے پورا ہونے میں

ایک مستقل رکاوٹ تھی۔

ان تجاویز کی رو سے ہندوستانی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ ریاستی باشندوں یا ان کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کے ہاتھ میں نہ ہوتا بلکہ مطلق العنان والیان ریاست کے ہاتھ میں۔ ہمارا اس اصول کو مان لینا کانگریس کی اس پرانی پالیسی کے منافی تھا جس کا ہم بارہا اعلان کر چکے تھے۔ اگر ہم ایسی حرکت کرتے تو گویا ریاستی باشندوں سے غداری کے مرتکب ہوتے اور ان غریبوں کو نہ جانے کتنے دن تک استبدادی حکومت کی مصیبت بھگتنی پڑتی۔ ہم والیان ریاست کے ساتھ انتہائی نرمی سے گفت وشنید کرنا چاہتے تھے تاکہ جمہوری حکومت کے قائم کرنے میں ان کا تعاون حاصل کر سکیں اور اگر برطانوی حکومت فریق ثالث کی حیثیت سے نہ ہوتی تو ہم اپنے اس مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتے لیکن والیان ریاست کی مطلق العنان حکومت کو برطانیہ کی حمایت حاصل تھی اس لئے وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے متحدہ نظام سے الگ رہیں اور اپنی رعایا کو دبانے کے لئے برطانوی فوج پر بھروسہ کریں بلکہ ہم سے یہ کہا گیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو ریاستوں میں غیر ملکی فوج رکھی جائے گی۔ ہندوستان کے مجوزہ وفاق میں اکثر ریاستوں کی حیثیت الگ تھلگ جزیروں کی سی ہوتی اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسی صورت میں غیر ملکی فوج وہاں کس طرح پہنچے گی اور مختلف ریاستوں کی فوجوں میں آمدورفت اور رسل ورسائل کا سلسلہ کیونکر رہے گا۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ غیر ملکی فوجوں کو متحدہ ہندوستان کے علاقے سے گذر جانے کا حق دیا جائے۔ گاندھی جی نے بار بار یہ اعلان کیا ہے کہ وہ والیان ریاست کے دشمن نہیں ہیں بلکہ ان کا رویہ ان لوگوں کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اکثر ان کے طرز حکومت پر خصوصاً اس

بات پر کہ انھوں نے اپنی رعایا کو ابتدائی حقوق سے بھی محروم کر رکھا ہے نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ مدتوں تک انھوں نے کانگریس کو ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرنے سے روکے رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی چاہتے تھے۔ ریاست کے باشندے خود ہی جد وجہد شروع کریں تاکہ ان میں خود اعتمادی اور قوت پیدا ہو۔ ہم میں سے بہت سے لوگ گاندھی جی کے اس نظریے سے متفق نہیں تھے۔ لیکن اس رویے کے باوجود گاندھی جی کا ایک بنیادی عقیدہ تھا جسے انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا "میرا جو طرز عمل ریاستوں کے متعلق رہا ہے اس کا ایک بنیادی عنصر یہ ہے میں کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ برطانوی ہند کے لوگوں کی آزادی کی خاطر ریاستی باشندوں کے حقوق کو بیچ ڈالا جائے"۔ پروفیسر بیریڈیل کیتھ نے جو سلطنت برطانیہ اور ہندوستان کے آئین کے زبردست ماہر سمجھے جاتے ہیں ریاستوں کے متعلق گاندھی جی کے مطالبے کی (جو دراصل کانگریس کا مطالبہ تھا) تائید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "تاج برطانیہ کے مشیر ہرگز یہ کہہ نہیں سکتے کہ ریاستوں کے باشندوں کو ان حقوق سے محروم رکھا جائے جو صوبوں کے باشندوں کو حاصل ہیں۔ بلکہ ان کا صریحی فرض ہے کہ ملک معظم کو یہ مشورہ دیں کہ وہ اپنے اختیارات سے کام لے کر والیان ریاست کو آئینی اصلاحات کے نفاذ پر مجبور کریں تاکہ بہت جلد ریاستوں میں بھی ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو سکے کوئی ایسا وفاقی آئین جس کی رو سے صوبوں کے نمائندے غیر ذمہ دار والیان ریاست کے نامزد کئے ہوئے نمائندوں کے ساتھ بیٹھنے پر مجبور کئے جائیں ہندوستان کے لئے ہرگز مفید ثابت نہیں ہوگا۔ حقیقت میں مسٹر گاندھی کا یہ دعوے بالکل صحیح ہے کہ جب تاج برطانیہ حکومت کے اختیارات عوام کو منتقل کرے گا تو والیان ریاست کو بھی یہی کرنا پڑے گا"۔ اگرچہ پروفیسر کیتھ نے یہ رائے اس

وقت دی تھی جب حکومت برطانیہ نے کچھ عرصہ پہلے وفاقی طرز حکومت کے متعلق اپنی تجاویز پیش کی تھیں لیکن سر اسٹیفورڈ کرپس کی موجودہ تجاویز کے سلسلے میں یہ اور بھی زیادہ مناسب ہیں۔

ان تجاویز پر جتنا زیادہ غور کیا گیا اتنی ہی زیادہ یہ ناقابل عمل معلوم ہوئیں ان کی رو سے ہندوستان میں ایک رنگ برنگ کی شطرنجی کا سا نقشہ نظر آتا جس میں بیسیوں برائے نام آزاد ریاستیں ہوتیں جن میں سے اکثر اپنی استبدادی حکومت کے بچاؤ کے لئے برطانیہ کی فوجی قوت کا سہارا ڈھونڈھتیں۔ ایسی صورت میں نہ سیاسی وحدت قائم رہتی اور نہ اقتصادی اشتراک ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ برطانیہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ذریعے جو اس کی نگرانی میں ہوتیں سارے ہندوستان پر سیاسی اور اقتصادی اقتدار قائم رکھتا۔[1]

مجھے معلوم نہیں کہ برطانوی جنگی کابینہ کا آئندہ کے لئے کیا ارادہ تھا۔ میرے خیال میں سر اسٹیفورڈ کرپس کی نیت بخیر تھی، اور وہ ہندوستان کو ایک آزاد متحدہ سلطنت کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن یہاں کسی ایک شخص کی

---

[1] سر جیفری ڈی مانٹ مورنس نے اپنی کتاب "دی انڈین سٹیٹس اینڈ انڈین فیڈریشن" مطبوعہ ۱۹۴۲ء میں اس کتاب پر بہت زور دیا ہے کہ دیسی ریاستوں کا وجود سراسر برطانوی قوت کی امداد پر موقوف ہے وہ لکھتے ہیں "ہندوستان میں ابھی تک بے شمار ریاستیں ہیں اور انھوں نے ترقی کے راستے میں ایک ایسی گتھی ڈال دی ہے جو فی الحال کسی طرح نہیں سلجھ سکتی۔ ۔ ۔ اگر کبھی برطانوی اقتدار ہندوستان میں ختم ہو گیا تو یہ لازمی طور پر مٹ جائے گی اور صوبوں میں ضم ہو جائے گی۔

رائے کی نیک نیتی کا سوال نہ تھا۔ ہمارے سامنے حکومت کی ایک دستاویز تھی جس کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا اور اس میں جو ابہام تھا وہ خاص کر کے رکھا گیا تھا۔ ہم سے یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ ہمیں یہ دستاویز ساری کی ساری منظور یا نامنظور کرنی ہوگی۔ ان کی تہ میں برطانوی حکومت کی وہی ایک صدی کی مسلسل پالیسی تھی جس کے مطابق وہ ہمیشہ ہندوستان میں افتراق پیدا کرتی رہی اور ہر اس عنصر کی جو قومی آزادی اور ترقی کے راستے میں روڑا اٹکائے حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ پچھلے زمانے میں جب کبھی اصلاحات کی طرف قدم بڑھایا گیا تو اس کے ساتھ ہمیشہ ایسی شرطیں اور پابندیاں لگائی گئیں جو ابتدا میں بالکل بے ضرر معلوم ہوتی تھیں لیکن آگے چلکر زبردست رکاوٹ ثابت ہوئیں۔

یہ ممکن تھا بلکہ یہ اغلب تھا کہ ان تجاویز سے جن ہولناک نتائج کا اندیشہ ہے وہ سب کے سب ظہور میں نہ آئیں۔ بہت سے لوگ جن میں والیان ریاست اور ان کے وزرا بھی شامل تھے یقیناً دانشمندی، حب وطن اور وسعت نظر سے کام لیتے اور ہندوستان کے اور دنیا کے مفاد کو مدنظر رکھتے۔ اگر ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ہم ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ایک دوسرے کی مشکلات اور پیچیدگیوں پر غور کرتے، اور بحث مباحثے کے بعد کوئی نہ کوئی معقول حل سوچ ہی لیتے۔ لیکن باوجود اس کے کہ بظاہر ہم کو حق خود ارادیت دیا جا رہا تھا، ہمیں یہ اجازت نہ تھی کہ اپنے معاملات کو اپنے طور پر طے کریں۔ حکومت برطانیہ کا قدم بیچ میں ہونا ضروری تھا اور اس کی حیثیت ایسی تھی کہ جتنی رکاوٹیں چاہے کھڑی کر دے۔ اس کے ہاتھ میں نہ صرف برطانوی ہند کے نظام حکومت اور سرکاری ملازمین کی باگ تھی بلکہ ریاستوں میں بھی برطانوی ریذیڈنٹ اور پولیٹکل ایجنٹ چھائے ہوئے تھے۔ والیان ریاست اگرچہ رعایا کے حق میں مطلق العنان

سے تھے نگران پر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی جو براہ راست وائسرائے کے ماتحت تھا پوری پوری نگرانی تھی۔ ان ریاستوں کے بہت سے بڑے وزیر والیان ریاست کی مرضی کے خلاف مقرر کئے گئے تھے اور وہ عموماً سول سروس وغیرہ کے ممبر تھے۔

اگرچہ ہم برطانوی تجاویز کے بہت سے مضر نتائج سے بچ گئے لیکن پھر بھی ان کی وجہ سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو نقصان پہنچا، ترقی کی رفتار سست ہوگئی اور بہت نئے خطرناک مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جو آگے چل کر ہمارے لئے زبردست مشکلات پیدا کرنے والے تھے۔ کچھ دن پہلے مذہب کی بنیاد پر جو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب قائم ہوئے تھے۔ ان ہی سے بہت کافی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اور اب تو ہر رجعت پسند گروہ کو موقع مل گیا جب چاہے ایک نیا جھگڑا کر دے اور یہ اندیشہ ہوگیا کہ ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا نامعلوم اور غیر معین مستقبل کے بارے میں جو جنگ کے بعد آنے والا تھا ہم سے مختلف قسم کی باتیں پہلے سے منظور کر لینے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ان مطالبات کے ماننے سے صرف کانگریس نے نہیں بلکہ سیاستدانوں کے اس انتہائی اعتدال پسند طبقے نے بھی جو ہمیشہ برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کرتا رہا ہے انکار کر دیا۔

کانگریس ملکی وحدت کی زبردست خواہش رکھنے کے باوجود اقلیتوں اور دوسرے طبقوں کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے بے چین تھی اس لئے اس نے یہ اعلان کر دیا کہ کسی علاقے کے باشندوں کو ان کی مرضی کے خلاف متحدہ ہندوستان میں شامل رہنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ انتہائی مجبوری کی صورت میں وہ تقسیم ہند کے اصول کو بھی ماننے کے لئے تیار تھی مگر اپنی طرف سے اس

خیال کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کرپس کی تجاویز کے بارے میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جو رزولیوشن منظور کیا اس میں یہ الفاظ تھے: "کانگریس ہندوستان کی آزادی اور وحدت کو اپنا نصب العین قرار دے چکی ہے اس وحدت کا توڑنا، خصوصاً موجودہ زمانے میں جب دنیا کی قومیں وسیع تر وفاق بنانے کی فکر میں ہیں، ہندوستان کی ہر جماعت کے لئے مضر ہوگا اور اس کا تصور نہایت تکلیف دہ ہے تاہم کمیٹی کا خیال ہرگز نہیں کہ کسی علاقے کے لوگوں کو ان کے مصمم اور بین ارادے کے خلاف متحدہ ہندوستان میں رہنے پر مجبور کیا جائے۔ اس اصول کو تسلیم کرتے ہوئے کمیٹی چاہتی ہے کہ ایسی فضا پیدا کرنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے جس میں مختلف علاقوں کے لوگ باہمی تعاون سے ایک مشترکہ قومی زندگی بسر کر سکیں۔ خود اختیاری کے اصول کا تقاضا ہے کہ کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جس سے نئے مسائل پیدا ہو جائیں اور کسی علاقے کے اندر دوسری بڑی جماعتوں پر جبر کرنا پڑے متحدہ ہندوستان کے بعد ہر علاقے کو اس حد تک کامل حکومت خود اختیاری حاصل ہوگی۔ جہاں تک ایک مضبوط قومی ریاست کے دائرے میں ممکن ہے۔ برطانوی جنگی وزارت نے جو تجویز اس وقت پیش کی ہے اس کا اثر یہ ہوگا کہ عین متحدہ ریاست کے قیام کے وقت جب کہ باہمی دوستی اور تعاون کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی علیحدگی کی کوششیں شروع ہو جائیں گی یہ تجویز بظاہر ایک فرقہ وارانہ مطالبے کو پورا کرنے کی غرض سے کی گئی ہے لیکن اس کے اور نتائج بھی ہوں گے یعنی مختلف فرقوں کے رجعت پسند گروہ جو ملک کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ طرح طرح کے جھگڑے کریں گے اور لوگوں کی توجہ ان اہم مسائل کی طرف سے ہٹ جائے گی جو اس وقت ملک کے سامنے ہیں؛"

آگے چل کر اس رزولیوشن میں یہ بھی کہا گیا۔ ان نازک حالات میں اصل

اہمیت موجودہ زمانے کی ہے۔ جو تجاویز مستقبل کے بارے میں پیش کی گئی ہیں وہ بھی اسی حد تک اہمیت رکھتی ہیں جہاں تک وہ حال پر اثر انداز ہوتی ہیں" اگرچہ کانگریس مستقبل کی تجاویز سے متفق نہیں ہو سکی پھر بھی وہ یہی چاہتی تھی کہ کوئی نہ کوئی سمجھوتا ہو جائے تاکہ وہ ملکی بچاؤ میں معقول حصہ لے سکے اس معاملے میں عدم تشدد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے اوّل سے آخر تک کوئی اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جن مسائل پر بحث کی گئی ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ملکی بچاؤ کا وزیر کوئی ہندوستانی ہونا چاہیئے۔

اس وقت کانگریس کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ جنگ کا خطرہ ہندوستان کے سر پر منڈلا رہا ہے اس لئے وہ اس پر تیار ہے کہ مستقبل کے مسائل کو نظر انداز کر کے اپنی ساری توجہ ایک ایسی قومی حکومت کی تشکیل پر صرف کر دے جو جنگی کاموں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ پورا تعاون کرے۔ حکومت برطانیہ نے آئندہ کے متعلق جو قطعی تجاویز پیش کی تھیں انھیں کانگریس کسی طرح منظور نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس طرح اسے بہت سی خطرناک پابندیاں قبول کرنی پڑتیں۔ اسے اس سے بحث نہ تھی کہ حکومت ان تجاویز کو واپس لے لے یا اس حیثیت سے کہ یہ برطانوی قوم کے منشا کو ظاہر کرتی ہیں قائم رہنے دے۔ بہ شرطیکہ یہ صاف ہو جائے کہ کانگریس نے ان تجاویز کو منظور نہیں کیا تاہم یہ چیز بالفعل عارضی طور پر تعاون کرنے میں کسی طرح مانع نہ تھی۔ موجودہ زمانے کے متعلق برطانیہ کی جنگی وزارت کی تجاویز مبہم اور نامکمل تھیں۔ البتہ ان میں یہ امر واضح کر دیا گیا تھا کہ ہندوستان کے بچاؤ کا معاملہ حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں رہے گا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس کے متعدد بیانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ سوائے بچاؤ کے محکمے کے باقی سب محکمے پورے طور پر ہندوستانیوں کے حوالے کر دئے جائیں گے

بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا تھا کہ وائسرائے کی حیثیت شاہ انگلستان کی طرح محض ایک آئینی حاکم کی ہوگی۔ اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ صرف ملکی بچاؤ کا مسئلہ بحث طلب رہ گیا۔ ہمارا کہنا یہ تھا کہ جنگ کے زمانے میں ملکی بچاؤ کے اندر قومی زندگی کی بہت سی سرگرمیاں شامل کرلی جاتی ہیں اور بڑی حد تک ہونی بھی چاہئیں تو پھر بچاؤ کے محکمے کو قومی حکومت سے الگ کر لینے کے بعد اس کے بعد اس کے پاس باقی کیا رہ جائے گا۔ پھر بھی کانگریس اس پر راضی ہوگئی تھی کہ مسلح فوجوں اور جنگی کارروائیوں پر برطانوی کمانڈر ان چیف کا پورا اختیار رہے گا۔ اور اس نے یہ بھی مان لیا تھا کہ عام جنگی پالیسی امپیریل اسٹاف کے ہاتھ میں رہے گی۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ قومی حکومت میں ایک وزیر دفاع بھی ہو۔

کچھ بحث مباحثے کے بعد سر اسٹیفورڈ کرپس اس پر راضی ہوگئے کہ ملکی بچاؤ کا محکمہ ایک ہندوستانی وزیر کے ماتحت رہے گا، لیکن اس محکمے کو صرف فوج اور پبلک کے تعلقات، پٹرول، سپاہیوں کے کھانے پینے کی دوکانوں، اسٹیشنری اور چھپائی، غیر ملکیوں کی مہمانداری اور فوج کے لئے آسائشیں بہم پہنچانے سے واسطہ ہوگا۔ اس عجیب وغریب فہرست کو دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ ہندوستانی وزیر دفاع کی حیثیت کس قدر مضحکہ خیز ہوتی مزید بحث ومباحثے کے بعد اس میں کچھ تبدیلی ہوئی۔ اگرچہ اب بھی کانگریس اور برطانوی حکومت کے زاویہ نگاہ میں بہت فرق تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ مجھے اور دوسرے لوگوں کو پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ سمجھوتا ہونے کا بہت کچھ امکان ہے۔ جنگی حالات کی بڑھتی ہوئی نزاکت ہم سب کو سمجھوتا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ہندوستان پر حملے کا خطرہ بہت زبردست تھا اور اس کا مقابلہ کرنا

ضروری تھا۔ یوں تو اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے مختلف طریقے ہو سکتے تھے۔ مگر حقیقت میں موجودہ حالات کے، اور اس سے بھی زیادہ مستقبل کے لحاظ سے اس کا موثر طریقہ صرف ایک تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت کوئی تصفیہ نہ ہوا تو بہترین موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا اور نہ صرف اس وقت ہمیں خطرات کا سامنا کرنا ہوگا بلکہ آئندہ کے لئے اس سے بھی بڑے خطرے پیدا ہو جائیں گے۔ ہمیں نئے اور بہتر اسلحے دونوں قسم کے ہتھیار فراہم کرنے تھے اور انھیں نئے طریقوں سے استعمال کرنا تھا۔ ایک نئے جوش، نئی امیدوں اور نئے عقیدے کی ضرورت تھی کہ ہمارا مستقبل ماضی اور حال سے مختلف ہوگا اور اس کا ثبوت اسی طرح مل سکتا تھا کہ فوری تبدیلیاں عمل میں آئیں شاید ہمارے وفور شوق نے ہمیں بے جا امیدیں دلائیں اور ہم کچھ عرصے کے لئے اس زبردست خلیج کو جو ہمارے اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان حائل تھی بھول گئے۔ اس کش مکش کو جو صدیوں سے چلی آرہی تھی خطرے اور تباہی کا احساس بھی آسانی سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ ایک سامراجی طاقت کے لئے بہت مشکل ہے کہ جب تک وہ بالکل مجبور نہ ہو جائے اپنے مقبوضات پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا حالات نے واقعی وہ احساس مجبوری پیدا کر دیا ہے؟ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے مگر ہمیں امید تھی کہ شاید ایسا ہی ہو

عین اس وقت جب کہ مجھے کامیابی کی پوری امید تھی عجیب وغریب واقعات پیش آنے لگے۔ امریکہ میں کسی جگہ تقریر کرتے ہوئے لارڈ ہیلی فیکس نے نیشنل کانگریس پر بہت سخت حملے کئے۔ خدا جانے اس کی کیا وجہ تھی کہ خاص طور پر امریکا میں انھوں نے یہ تقریر کی۔ بہرحال ایسی حالت میں جب کانگریس سے سمجھوتے کی گفت وشنید جاری تھی، وہ یہ جسارت اسی صورت میں کر سکتے

تھے جب وہ برطانوی حکومت کے خیالات اور پالیسی کی نمائندگی کر رہے ہوں۔ نئی دہلی میں لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ لارڈ لنلتھگو (جو اس وقت وائسرائے تھے) اور سول سروس کے اعلیٰ حکام سمجھوتے کے سخت مخالف ہیں۔ اور وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے اختیارات میں کمی ہو۔ غرض پس پردہ بہت کچھ ہو رہا تھا جس کا لوگوں کو اچھی طرح علم نہ تھا۔

جب ہم نے وزیر دفاع کے اختیارات پر بحث کرنے کے لئے سر اسٹیفورڈ کرپس سے دوبارہ ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ ہماری ساری پچھلی گفتگو بیکار تھی کیونکہ کسی وزیر کو بھی حقیقی اختیارات نہیں دئے جا رہے تھے۔ تجویز یہ تھی کہ وائسرائے کی موجودہ مجلس عاملہ بدستور قائم رہے البتہ اس میں کچھ اور ممبران کا اضافہ کر دیا جائے۔ جو سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہوں۔ وائسرائے کی کونسل کسی طرح کابینہ وزارت نہیں کہی جاسکتی تھی۔ کل اختیارات وائسرائے کے ہاتھ میں تھے کونسل ارکان محض مختلف محکموں کے افسروں یا سیکریٹریوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ آئینی تبدیلیوں میں دیر لگے گی اس لئے ہمیں اس پر اصرار نہ تھا۔ ہم صرف یہ چاہتے تھے آپس میں قرارداد ہو جائے۔ کونسل کو کابینہ وزارت کا درجہ حاصل ہوگا اور وائسرائے اس کے فیصلوں کو مسترد نہیں کرے گا۔ مگر ہم سے کہا گیا کہ وائسرائے کے اختیارات میں اصولاً یا عملاً کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی بات تھی جس کو سن کر ہم حیرت میں رہ گئے کیونکہ ہماری ساری پچھلی گفتگو بالکل مختلف بنیاد پر ہوئی تھی۔

ہم نے اس امر پر بحث کی کہ ہندوستان کی قوت مدافعت کو بڑھانے کے لئے کون سے ذرائع اختیار کئے جائیں۔ ہم ہندوستانی فوج کے دل میں یہ احساس پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ ایک قومی فوج ہے تاکہ جنگی کوششوں میں

حب وطن کا عنصر شامل ہو جائے۔ ہماری تجویز تھی کہ جلے کی صورت میں بڑی تیزی سے شہریوں کی فوجیں وطنی محافظ اور رضا کار دستے بھرتی کریں ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب کمانڈر انچیف کے ماتحت ہوتے۔ مگر ہمیں بتایا گیا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہندوستانی فوج در اصل برطانوی فوج کا ایک حصہ ہے اس کو قومی فوج سمجھنا تو درکنار اس کے لئے یہ الفاظ بھی استعمال نہیں کئے جا سکتے اس میں بھی بہت شبہ تھا کہ ہمیں محافظ وطن اور شہری فوجوں کے دستے بنانے کی اجازت دی جا سکے گی۔

مطلب یہ تھا کہ حکومت کا موجودہ ڈھانچہ جوں کا توں رہے گا۔ وائسرائے کے مستبدانہ اختیارات میں کچھ کمی واقع نہیں ہوگی۔ صرف اتنا ہوگا کہ ہم میں سے چند لوگ ان کے وردی پوش ملازم بن جائیں گے۔ مسٹر ایمری نے اٹھارہ مہینے پہلے جو پیش کش کی تھی اور جسے ہندوستان کے لئے باعث توہین سمجھا گیا تھا اس میں اور ان تجاویز میں ذرہ برابر فرق نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک نفسیاتی تبدیلی ضرور ہوتی۔ آخر افراد کی شخصیت کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہی ہے۔ قابل اور مضبوط آدمیوں کا طریق کار ان جی حضوریوں سے مختلف ہوتا جو عموماً وائسرائے کے ارد گرد رہا کرتے ہیں۔ ہمارے لئے اس صورت کو منظور کرنا یوں بھی بہت مشکل تھا اور اس وقت تو بالکل ناممکن تھا۔ اور اگر ہم ایسی جسارت کرتے تو ہمارے اپنے آدمی ہم سے پھر جاتے بلکہ جب بعد میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ گفت و شنید کے دوران میں ہم نے فریق مخالف کی بہت سی باتیں مان لی تھیں۔ تو بڑی لے دے ہوئی۔

اس ساری گفتگو میں جو سر اسٹیفورڈ کرپس کے اور ہمارے درمیان ہوئی اقلیت کے مسئلے یا فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ در اصل اس مرحلے پر

یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اگر مستقبل کی آئینی تبدیلیوں پر بحث کی جاتی تو بے شک اس مسئلے کی بڑی اہمیت ہوتی۔ لیکن مستقبل کے مسئلے کو تو ہم نے برطانوی تجویزوں پر پہلی نظر ڈالنے کے بعد ہی خارج از بحث قرار دے دیا تھا۔ اگر قومی حکومت کو مکمل اختیارات دینے کا اصول مان لیا جاتا تو یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا کہ اس حکومت میں مختلف فرقوں کا کیا تناسب ہوگا۔ لیکن چونکہ اس اصول پر ہمارا کوئی سمجھوتا نہیں ہوا اس لئے دوسرے سوال پر غور کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی ہم کو تو ساری فکر یہ تھی کہ ایک با اختیار قومی حکومت بن جائے۔ جسے بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کا اعتماد حاصل ہو اور ہم سمجھتے تھے کہ فرقہ وار تناسب کا مسئلہ طے کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی۔ مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس نے سر اسٹیفورڈ کرپس کو ایک چٹھی میں لکھا تھا۔ "ہم آپ کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جو تجاویز ہماری طرف سے پیش کی گئی ہیں وہ صرف ہماری ہی نہیں ہیں بلکہ انھیں ہندوستان کا متفقہ مطالبہ سمجھنا چاہیئے۔ ان مسائل کے بارے میں مختلف فرقوں اور پارٹیوں میں کسی قسم کا اختلاف رائے نہیں ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ پوری ہندوستانی قوم اور برطانوی حکومت میں ہے۔ ہم میں آپس میں جو اختلافات ہیں آئندہ کی آئینی تبدیلیوں سے تعلق رکھتے ہیں ہم اس پر راضی ہیں کہ اس وقت یہ سوال ملتوی کر دیا جائے تاکہ موجودہ نازک حالات میں ہندوستان کے بچاؤ کے لئے زیادہ سے زیادہ اشتراک عمل حاصل کیا جا سکے۔ یہ انتہائی بدنصیبی کی بات ہوگی کہ ہندوستانیوں کے اس اتفاق رائے کے باوجود حکومت برطانیہ ایک آزاد قومی حکومت کے قیام میں حائل ہو جو نہ صرف ہندوستان کے فائدے کے لئے بلکہ ان وسیع تر مقاصد کے لئے کام کرے گی جن کی خاطر لاکھوں انسان مصیبتیں اٹھا رہے ہیں اور اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔"

اس کے بعد صدر کانگریس نے اپنی آخری چٹھی میں لکھا "ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ صرف کانگریس کو اختیارات دے دئے جائیں بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی ہندوستانی قوم کو آزادی اور اختیارات حاصل ہوں...... ہمیں یقین ہے کہ اگر حکومت برطانیہ آپس کے اختلافات کو شہ دینے کی پالیسی ترک کر دے تو سب حلقوں اور فرقوں کے لوگ مل کر کوئی مشترکہ طرزِ عمل اختیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے شدید خطرے کے وقت بھی برطانوی حکومت اپنی اس تخریبی پالیسی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ برطانیہ کے نزدیک ہندوستان پر زیادہ سے زیادہ عرصے تک اپنا قبضہ قائم رکھنا، اور اس مقصد کے لئے تفریق اور انتشار پیدا کرنا، اس سے زیادہ اہم ہے کہ ملک کو آنے والے حملے سے بچانے کی موثر تدابیر اختیار کی جائیں۔ ہمارے لئے اور سب ہندوستانیوں کے لئے اس وقت سب سے بڑا سوال ہندوستان کی حفاظت اور سلامتی کا ہے اور ہم ہر چیز کو اسی کسوٹی پر کستے ہیں"

اسی چٹھی میں انھوں نے ہندوستان کے بچاؤ کے متعلق ہمارے نظرئے کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی "ہم میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ کمانڈر ان چیف کے معمولی اختیارات میں کمی کر دی جائے بلکہ ہم تو یہاں تک تیار تھے کہ بہ حیثیت وزیر جنگ انہیں اور زیادہ اختیارات دے دئے جائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ملکی بچاؤ کے معاملے میں ہمارے اور حکومت برطانیہ کے زاویہ نگاہ میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس مسئلے کو قومی رنگ دے دیا جائے تاکہ ہندوستان کا ہر مرد اور ہر عورت اس میں حصہ لے سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی قوم پر پورا اعتماد کریں اور اس زبردست جد و جہد میں

اس کا تعاون حاصل کریں۔ اس کے برعکس حکومت برطانیہ یہ چاہتی ہے کہ ہندوستانیوں
پر مطلق بھروسا نہ کیا جائے اور انھیں حقیقی اختیارات نہ دیئے جائیں۔ آپ دفاع
کے معاملے میں ملک معظم کی حکومت کی ذمہ داری اور اس کے فرائض کا ذکر
کرتے ہیں۔ یہ ذمہ داری اور یہ فرائض اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب
تک ہندوستانیوں کو اپنے کاموں کا ذمہ دار نہ بنایا جائے اور انھیں اپنے فرائض
کا احساس نہ دلایا جائے۔ اس کا ثبوت ان واقعات سے ملتا ہے جو حال
میں پیش آئے ہیں۔ حکومت ہند اس بات کو محسوس نہیں کرتی کہ جنگ [illegible]
صورت میں کامیابی سے لڑی جا سکتی ہے جب اسے عوام کی تائید حاصل ہو۔"

صدر کانگریس کی اس آخری چٹھی کے فوراً بعد سر اسٹیفورڈ کرپس ہوائی جہاز
کے ذریعے انگلستان واپس چلے گئے۔ لیکن روانگی سے قبل اور انگلستان پہنچنے
کے بعد انھوں نے چند ایسے بیانات دیئے جو سراسر واقعات کے خلاف تھے
اور جن سے ہندوستان کے لوگ بہت برہم ہوئے۔ باوجود اس کے کہ ہندوستان
کے ذمہ دار لوگوں نے بیانات کی تردید کی، سر اسٹیفورڈ کرپس اور بعض دوسرے
حضرات انھیں بار بار دہراتے رہے۔ حکومت برطانیہ کی تجاویز کو صرف کانگریس
ہی نے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر طبقے اور ہر پارٹی نے مسترد کر دیا۔ یہاں تک
کہ ہمارے انتہائی اعتدال پسند سیاست دانوں نے بھی ان کی ناپسندیدگی کا اظہار
کیا۔ مسلم لیگ کے سوا اور سب کی ناپسندیدگی کی وجوہ کم و بیش یکساں تھیں۔ لیگ
حسب معمول پہلے انتظار کرتی رہی کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس
نے اپنی مخصوص وجوہ کی بنا پر ان تجاویز کو نامنظور کر دیا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں
اور دوسرے مقامات پر یہ کہا گیا کہ کانگریس نے یہ تجاویز اس وجہ سے مسترد کیں
کہ گاندھی جی کا رویہ غیر مصالحانہ تھا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ

گاندھی جی نے، اور ان کے ساتھ اور بہت سے لوگوں نے، دو باتوں کی وجہ سے ان تجاویز کی شدید مخالفت کی تھی۔ ایک تو ہندوستان کی غیر معین اور نامحدود تقسیم کا دروازہ کھول دیا گیا تھا، دوسرے ہندوستانی ریاستوں کے نو کروڑ باشندوں کو اپنے مستقبل کی تشکیل میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ساری گفت و شنید، جس کا تعلق مستقبل سے نہیں بلکہ اس مسئلے سے تھا کہ فی الحال کیا تبدیلیاں کی جائیں، گاندھی جی کی عدم موجودگی میں ہوئی اس لئے کہ انھیں اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے چلا جانا پڑا۔ ان کا اس گفتگو سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان میں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی میں پہلے کئی موقعوں پر عدم تشدد کے بارے میں اختلاف ہو چکا تھا۔ اس وقت کمیٹی یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سے قومی حکومت بن جائے اور وہ حکومت برطانیہ کے ساتھ جنگ میں خصوصاً ہندوستان کے بچاؤ میں اشتراک عمل کرے۔

جنگ کا خیال لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا تھا اور ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا ہندوستان پر حملہ ہونے ہی والا ہے مگر سمجھوتے کی راہ میں جو رکاوٹ پیدا ہوئی وہ جنگی مسائل کی بنا پر نہیں تھی۔ اس لئے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ جنگ کا کام تو بہرحال ماہر فن ہی چلائیں گے نہ کہ عام لوگ۔ انتظام جنگ کے بارے میں تو بڑی آسانی سے سمجھوتا ہو سکتا تھا۔ اصل سوال قومی حکومت کے اختیارات کا تھا۔ یہ وہی ہندوستانی قومیت اور برطانوی سامراج کا پرانا جھگڑا تھا اور اس معاملے میں انگلستان اور ہندوستان کا انگریز حکمران طبقہ مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ جنگ کی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے مقبوضات کو دانتوں سے پکڑے رہے گا۔ اور اس کی پشت پر مسٹر ونسٹن چرچل کی رعب دار شخصیت تھی۔

۹- ناکامی

سر اسٹیفورڈ کرپس کے ساتھ گفت وشنید کے یکبارگی منقطع ہو جانے اور ان کے اچانک انگلستان واپس چلے جانے پر بڑا تعجب ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا اس حقیر سی پیش کش کے لئے جس کا وہ حصہ جو زمانہ حال سے متعلق ہے بالکل انھیں الفاظ کی تکرار ہے جو پہلے کئی بار کہے جا چکے ہیں برطانیہ کے جنگی کابینہ کے ایک وزیر نے انگلستان سے ہندوستان تک کے دور دراز سفر کی زحمت گوارا کی؟ یا یہ محض امریکہ کے لوگوں پر اثر ڈالنے کے لئے ایک پروپاگنڈا تھا؟ بہر حال ہندوستان کے لوگوں میں بڑی مایوسی اور برہمی پھیل گئی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ برطانیہ سے سمجھوتے کی کوئی امید نہیں اور ہندوستان کے لوگوں کو اس کا موقع نہیں دیا جائے گا کہ حسب دلخواہ بیرونی حملے کی مدافعت کریں۔ اس دوران میں ہندوستان پر چڑھائی کے امکانات بڑھتے جاتے تھے اور مشرقی سرحد کی طرف سے ہزاروں فاقہ زدہ پناہ گزیں اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ مشرقی بنگال میں حملے کے خوف سے گھبرا کر حکومت ہند نے لاکھوں کشتیاں جلا ڈالیں۔ (بعد میں بتایا گیا کہ یہ اس وجہ سے ہوا کہ کسی سرکاری حکمنامے کا مطلب غلط سمجھا گیا تھا) بنگال کے اس وسیع علاقے میں جگہ جگہ دریا ہیں اور آمد و رفت کا ذریعہ کشتیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کشتیوں کو ضائع کر دینے سے بہت سے لوگ باقی دنیا سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ ذرائع آمد و رفت کے ساتھ ساتھ ان کے روزی کمانے کے ذریعے بھی بند ہو گئے۔ بنگال کے قحط کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ رنگون اور نشیبی برما میں ہو چکا ہے وہ اب بنگال میں ہونے والا ہے۔ چنانچہ بنگال کو خالی کرنے کی بڑے پیمانے پر تیاریاں شروع

ہو گئیں۔ مدراس میں اس غیر مصدقہ خبر کی بنا پر (جو بعد میں جھوٹی ثابت ہوئی) کہ ایک جاپانی بیڑہ ہندوستان کے ساحل کے نزدیک آ گیا ہے بڑے بڑے سرکاری افسر مدراس سے بھاگ کھڑے ہوئے اور مدراس کی بندرگاہ کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا گیا تاکہ دشمن وہاں لنگر انداز نہ ہو سکے۔ بظاہر ہندوستان کی سول حکومت کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ البتہ قومی تحریک کے دبانے میں اب بھی بہت تیز تھی۔

اب ہمارے سامنے یہ سوال تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ہم اس چیز کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ بزدلی کے ساتھ ہندوستان کا کوئی حصہ حملہ آوروں کے قبضے میں دے دیا جائے۔ جہاں تک ہتھیاروں سے مقابلہ کرنے کا سوال تھا، یہ فوج کا اور ہوائی طاقت کا کام تھا۔ امریکہ سے مدد آنی شروع ہو گئی تھی جو زیادہ تر ہوائی جہازوں کی شکل میں تھی۔ اور اس کی وجہ سے لڑائی کی حالت آہستہ آہستہ بدل رہی تھی۔ ہم صرف ایک ہی طرح سے مدد کر سکتے تھے کہ اندرونی محاذ کی ساری فضا کو بدل دیں یعنی لوگوں کو ابھار کر ان میں ایک زبردست جذبہ پیدا کر دیں کہ وہ وطن کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے پر تیار ہو جائیں۔ اس مقصد کے لئے ہم شہری رضاکار فوج اور محافظ وطن دستے بھرتی کرنا چاہتے تھے مگر حکومت برطانیہ کی پالیسی نے اس میں بڑی دشواریاں پیدا کر دی تھیں۔ اس نازک موقعے پر ہر وقت دشمن کے حملے کا خطرہ تھا۔ حکومت باقاعدہ فوجی سپاہیوں کے سوا کسی ہندوستانی کو ایک بندوق تک دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ یہاں تک کہ ہم نے دیہات میں غیر مسلح حفاظتی دستے مرتب کرنے کی کوشش کی اسے بھی حکومت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی اور بعض اوقات سختی سے دبا دیتی تھی۔ عوام کو مدافعت کے لئے

منظم کرنے کی جو تحریک اٹھی تھی اس کی حوصلہ افزائی کرنا تو درکنار حکام اس سے
ڈرتے تھے اس لئے کہ وہ ہمیشہ سے اس قسم کی کوششوں کو باغیانہ اور برطانوی
حکومت کے لئے خطرناک سمجھتے آئے تھے۔ انھیں عموماً اس پرانی پالیسی پر قائم
رہنا پڑا اس لئے پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ وہ قومی حکومت کے
قیام کو منظور کرلیں، لوگوں پر بھروسہ کریں اور ان کو ملکی بچاؤ کے لئے منظم کریں
اس تجویز کو وہ قطعاً نامنظور کر چکے تھے اور کوئی درمیانی صورت تھی نہیں۔ اس
کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں کو بے جان اشیا کی طرح سمجھ لیا گیا۔ انھیں اپنے طور پر
کچھ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ حکومت جس طرح چاہتی تھی انھیں استعمال کرتی تھی۔
آخر اپریل ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں برطانوی حکومت
کے اس رویے کی سخت مذمت کی گئی اور صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ہم کسی ایسی
صورت کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں جس میں ہمیں ایک غیر ملکی حکومت کے
غلاموں کی طرح کام کرنا پڑے۔

یہ ناممکن تھا کہ ہم چپ چاپ آنے والی تباہی کا تماشا دیکھتے رہیں ہمیں
عوام کو مشورہ دینا تھا کہ وہ حملے کی صورت میں کیا تدابیر اختیار کریں۔ ہم نے انھیں
بتایا کہ چاہے برطانوی پالیسی سے کتنے ہی بیزار کیوں نہ ہوں انھیں برطانوی یا
دوسری اتحادی فوجوں کے کام میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے۔ کیونکہ
اس سے دشمن کو اس کے جارحانہ مقاصد میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ انھیں
کسی حالت میں بھی دشمن کے آگے سر جھکانا، اس کے احکام کی تعمیل کرنا، اس کے
انعام و اکرام کو قبول کرنا نہیں چاہئے اگر حملہ آور فوجیں لوگوں کے گھروں اور کھیتوں
پر قبضہ کرنا چاہیں تو جان پر کھیل کر مزاحمت کرنی چاہئے۔ مگر یہ مزاحمت پرامن
طریقے سے ہو۔ دشمن کے ساتھ مکمل عدم تعاون برتا جائے۔

بہت سے لوگوں کو یہ بات بالکل مہمل معلوم ہوتی تھی کہ بے تشدد عدم تعاون کے ذریعے کسی حملہ آور فوج کا مقابلہ کیا جائے چنانچہ انھوں نے طعن و تشنیع کے رنگ میں نکتہ چینی کرنی شروع کی۔ حالانکہ مہمل ہونا تو در کنار لوگوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی طریقہ ہی نہ تھا اور یہ طریقہ بڑی ہمت اور بہادری کا تھا۔ یہ مشورہ فوجوں کے لئے نہیں تھا، اور یہ امن مقابلے کو مسلح مقابلے کا بدل نہیں قرار دیا گیا تھا۔ یہ مشورہ صرف نہتے شہریوں کے لئے تھا جو مسلح فوجوں کے شکست پانے کے بعد عام طور پر حملہ آور کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں باقاعدہ مسلح فوجوں کے علاوہ دشمن کو تنگ کرنے کے لئے چھاپہ مار دستے بھی ترتیب دیئے جاتے ہیں لیکن ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کیونکہ اس کے لئے تربیت، ہتھیار، اور باقاعدہ فوجوں کا پورا تعاون درکار ہے اور اگر کچھ چھاپہ مار دستے بن بھی جاتے تب بھی یہ سوال تھا کہ باقی لوگ کیا کریں۔ عام حالات میں شہری آبادی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ دشمن کی اطاعت قبول کر لے۔ سنا جاتا ہے کہ برطانوی حکام نے بعض مخدوش علاقوں میں یہ ہدایات جاری کردی تھیں کہ جب فوج اور اعلیٰ افسر اس علاقے سے چلے جائیں تو عام لوگ بلکہ چھوٹے افسر بھی دشمن کی اطاعت قبول کرلیں۔

ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ پُر امن عدم تعاون دشمن کی بڑھتی ہوئی فوج کو نہیں روک سکتا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے شہری باشندوں میں سے اکثر اگر دشمن کا مقابلہ کرنے پر آمادہ بھی ہوجائیں تو انھیں اس میں بڑی مشکل پیش آئے گی۔ مگر پھر بھی ہمیں یہ امید تھی کہ جن قصبات اور دیہات پر دشمن کا قبضہ ہوگا وہاں تھوڑے بہت ہی سے آدمی ایسے ضرور نکلیں گے جو دشمن کے احکام کی تعمیل کرنے اور ان کو رسد پہنچانے سے انکار کردیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمن

ان لوگوں کو فوری سزا دے گا، اور غالباً وہ قتل کر دئے جائیں گے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگرچہ چند آدمی بھی مرتے دم تک مزاحمت کریں گے تو نہ صرف اس علاقے میں بلکہ سارے ہندوستان میں عام لوگوں پر اس کا بڑا زبردست اثر پڑے گا اور اس طرح ساری قوم میں مزاحمت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

کئی مہینے سے ہم قصبوں اور دیہاتوں میں سرکاری افسران کی مخالفت کے باوجود خوراک کی کمیٹیاں اور حفاظتی دستے قائم کر رہے تھے۔ خوراک کا مسئلہ ہمارے لئے تشویش کا باعث تھا۔ ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ نقل و حمل کی بڑھتی ہوئی دشواریوں اور جنگ کے دوسرے اثرات کی وجہ سے صورت حال نازک ہو جائے گی۔ حکومت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی ہم نے یہ کوشش کی کہ ہر جگہ خصوصاً دیہات میں چھوٹے چھوٹے رقبے اپنی ضرورتوں کو خود پورا کریں اور نقل و حمل کے لئے بیل گاڑیاں استعمال کی جائیں تاکہ اگر آمدورفت کے جدید ذرائع میسر نہ آئیں تو یہ ابتدائی ذریعہ کام دے سکے۔ اس کا بھی امکان تھا کہ اگر مشرق کی طرف سے حملہ ہوا تو پناہ گزینوں کی ایک بہت بڑی تعداد ملک کے مغربی حصے کی طرف چل کھڑی ہو گی جیسا کہ چین میں ہوا تھا۔ چنانچہ ہم نے ان کے استقبال اور آسائش کے انتظامات شروع کر دیئے۔ اگرچہ حکومت کی امداد اور تعاون کے بغیر تقریباً یہ کام ناممکن تھا پھر بھی ہم نے اپنی سی کوشش کی۔ حفاظتی دستوں کا مقصد یہی تھا کہ اس قسم کے کاموں میں امداد کریں، لوگوں میں دہشت نہ پھیلنے دیں۔ اور اپنے اپنے علاقوں میں امن و امان قائم رکھیں۔ ہوائی حملوں اور چڑھائی کی خبر چاہے وہ کسی دور دراز علاقے سے آئے سارے ملک کی شہری آبادی میں گھبراہٹ اور دہشت پیدا کر سکتی تھی اور اس کو روکنا نہایت ضروری تھا۔ حکومت نے اس سلسلے میں جو تدابیر اختیار کیں وہ

قطعاً ناکافی تھیں اور عوام کو ان پر مطلق اعتماد نہیں تھا۔ دیہاتی علاقوں میں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں بڑھتی جاتی تھیں۔

ہم نے بڑی بڑی منصوبہ بندیاں کیں اور ان پر کچھ تھوڑا بہت عمل بھی کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم الشان مسئلے کے حل کرنے میں ہماری ہماری کوششیں محض سطح تک محدود رہیں اس دشواری کا اصلی حل عوام میں اور حکومت میں مکمل تعاون اور اشتراک عمل تھا اور وہ ناممکن تھا۔ یہ صورت حال نہایت تکلیف دہ تھی۔ موقعے کی نزاکت ہمیں مجبور کر رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ کریں، ہمارے دل عمل کی خواہش سے لبریز تھے مگر ہمیں عمل کی اجازت نہ تھی۔ تباہی اور مصیبت کے بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے اور ہندستان بے بسی اور مجبوری، رنج اور غصے کی حالت میں بیرونی فوجوں کا میدان جنگ بنا ہوا تھا۔

اگرچہ مجھے لڑائی سے سخت نفرت تھی لیکن میں جاپان کے حملے کے خیال سے ذرا بھی خائف نہ تھا جنگ کا ہندوستان تک پہنچ جانا کتنا ہی ہولناک کیوں نہ ہو، مگر مجھے درپردہ ایک خوشی سی محسوس ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی بڑا حادثہ ہندستان کے کروڑوں آدمیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ تاکہ وہ موت کا سا سکون جس میں برطانیہ نے انھیں مبتلا کر رکھا ہے کسی طرح دور ہو وہ اس پر مجبور ہو جائیں کہ حال کی حقیقی مشکلات کا مقابلہ کریں، ماضی کی زنجیریں جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں توڑ دیں، چھوٹے چھوٹے سیاسی جھگڑوں کو عارضی مسائل کو جو ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں بھول جائیں ماضی سے بالکل قطع تعلق نہ کریں مگر اس میں ڈوب کر نہ رہ جائیں بلکہ حال اور مستقبل پر بھی نظر ڈالیں، اور اپنی زندگی کا رخ بدل کر اسے موجودہ اور آئندہ زمانے

سے ہم آہنگ بنائیں۔ جنگ کی بہت بڑی قیمت دینی پڑتی ہے اور اس کے نتائج غیر یقینی ہوتے ہیں۔ ہمارے اختیار میں ہوتا تو کبھی اسے اپنے ملک کے قریب نہ آنے دیتے۔ لیکن جب وہ آ ہی گئی تھی تو اس سے یہ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا کہ ہماری قوم میں سخت کوشی اور جفاکشی پیدا ہو اور اس پر وہ شدید روحانی واردات گذر جائے جس کے فیض سے ایک نئی زندگی کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لاکھوں آدمی مارے جاتے مگر لڑائی میں مرنا قحط میں مرنے سے بہتر ہے۔ مصیبت اور مایوسی کی زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ موت کے بطن سے نئی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ جن افراد کو یا قوموں کو مرنا نہیں آتا انھیں جینا بھی نہیں آتا " مردوں کا جی اٹھنا صرف وہیں ممکن ہے جہاں قبریں ہوں "

لڑائی ہندوستان تک آپہنچی لیکن اس سے ہم میں وہ روحانی ولولہ پیدا نہیں ہوا کہ ہم خوشی خوشی اپنی تمام قوتوں کو ایک مقصد کے لئے وقف کردیں، تکلیف اور موت کو بلکہ خود اپنے وجود کو فراموش کردیں۔ اور ہمارے سامنے صرف آزادی کا خیال ہو اور مستقبل کا تصور۔ ہمارے حصے میں تو رنج اور کلفت ہی آئی۔ آنے والی مصیبت کے خیال نے، جو کسی طرح ٹالے نہیں ٹل سکتی تھی، ہمارے احساسات کو اور تیز کردیا تھا اور ہمارے درد میں شدت پیدا کردی۔ ہم اس ناگزیر شخصی اور قومی مصیبت کی فکریں گھلنے لگے جس سے کوئی مفر نہ تھا۔

ہمیں فتح و شکست سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہم محوری طاقتوں کی فتح نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس صورت میں تباہی یقینی تھی۔ ہمیں یہ گوارا نہ تھا کہ جاپان ہمارے ملک کے کسی حصے پر قابض ہوجائے۔ اس کو تو بہر حال

روکنا ہی تھا اور یہ بات ہم لوگوں کو بار بار سمجھا چکے تھے۔ لیکن یہ محض ایک منفی نقطۂ نظر تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس جنگ کا مثبت مقصد کیا ہے اور اس کے بعد مستقبل کی کیا شکل ہو گی؟ کیا یہ بھی محض پچھلی حماقتوں اور مصیبت کی تکرار ہے، فطرت کی اندھی قوتوں کا کھیل ہے جسے انسان کی خواہشات اور مقاصد سے کوئی واسطہ نہیں؟ آخر ہندوستان کا کیا حشر ہو گا؟

ہمیں رابندرناتھ ٹیگور کی آخری وصیت یاد آ رہی تھی یعنی ان کا وہ پیام جو انھوں نے اپنے بستر مرگ سے قوم کے نام بھیجا تھا، "ظلم اور وحشت کے راکھشش نے ریاکاری کا پردہ اٹھا دیا ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اس کے خوفناک پنجے انسانیت کی تکہ بوٹی کر کے ہلاکت کا جشن منائیں گے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نفرت کے زہریلے انجرات نے فضا کو تاریک کر رکھا ہے۔ وہ دن آ گیا ہے کہ تشدد کی روح جو یورپ کی فطرت میں خوابیدہ تھی۔ بیدار ہو کر انسانیت کی پاک روح کو اپنی نجاست سے آلودہ کر رہی ہے" "قسمت کا چکر ایک دن انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دے گا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ ملک کو کسی ابتر حالت میں چھوڑ کر جائیں گے جب ان کے نظم ونسق کا دریا صدیوں سے بہ رہا ہے خشک ہو جائے گا تو غلاظت اور کیچڑ کے ڈھیر کے ڈھیر باقی رہ جائیں گے۔ کسی زمانے میں میرا عقیدہ تھا کہ یورپ سے تہذیب کے چشمے جاری ہوں گے لیکن، آج جبکہ میں اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں اس عقیدے کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔

جب میں چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے اس قابل فخر تہذیب کے کھنڈر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر بھی میں اس شدید گناہ کا مرتکب نہیں ہوں گا کہ انسانیت کی طرف سے مایوس ہو جاؤں۔ بلکہ یہ امید رکھوں گا

کہ اس ہولناک ہنگامے کے بعد تاریخ انسانی کا ایک نیا باب شروع ہوگا اور خدمت و ایثار کی روح فضا کو پاک وصاف کردے گی۔ شاید یہ صبح امید افق مشرق سے طلوع ہو جہاں سے آفتاب نکلتا ہے۔ وہ دن ضرور آئے گا۔ جب غیر مفتوح انسان، اپنی فتوحات کا رخ بدل دے گا اور سب رکاوٹوں کو دور کرکے انسانیت کے کھوئے ہوئے ورثے کو پھر سے حاصل کرے گا۔"

"آج ہم ان خطرناک نتائج کو دیکھ رہے ہیں جو اقتدار اور قوت کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ایک دن عارفان حقیقت کا یہ قول صحیح ثابت ہوگا:۔

ظلم سے انسان کامیاب ہوتا ہے، اپنے نفس کی خواہشات پوری کرتا ہے، اپنے دشمنوں پر فتح پاتا ہے، مگر اس کی زندگی کی جڑیں سوکھ کر رہ جاتی ہیں۔"

سچ ہے، ہمیں انسان کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ چاہے ہم خدا کے منکر ہو جائیں مگر ہم انسان کے منکر نہ ہوں۔ ورنہ پھر کائنات کی ہر شے بے کار اور بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ مگر اس وقت ہمارے لئے کسی چیز پر ایمان رکھنا اور یہ سمجھنا کہ آخر میں حق اور انصاف کی فتح ہوگی، بہت مشکل تھا۔

جسمانی اور ذہنی کوفت سے شل ہو کر اپنے ماحول سے پیچھا چھڑانے کے لئے کلو چلا گیا جو ہمالیہ کی اندرونی وادیوں میں واقع ہے

۱۰۔ قوم کی للکار

"ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز

پندرہ دن کے بعد کلو سے واپس آکر میں نے محسوس کیا کہ ملک کی اندرونی

حالت بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔ سمجھوتے کی آخری کوشش کے ناکام ہو جانے سے جو برہمی پیدا ہوئی تھی وہ بڑھتی جاتی تھی۔ لوگ عام طور پر یہ محسوس کرتے تھے اب انگریزوں سے کوئی امید رکھنا محض بے کار ہے۔ برطانوی حکومت کی طرف سے جو بیانات پارلیمنٹ میں اور دوسرے مقامات پر دئے گئے ان سے اس خیال کو مزید تقویت پہنچی اور لوگ اور زیادہ مشتعل ہو گئے۔ ہندوستان میں سرکاری پالیسی کا صرف مقصد یہ تھا ہماری روزمرہ کی سیاسی سرگرمیوں کو کچل دیا جائے چنانچہ ہر طرف سختیاں بڑھتی چلی جاتی تھیں۔ سر اسٹیفورڈ کرپس سے گفت و شنید کے دوران میں بہت سے سیاسی کارکن قید تھے۔ اب میرے بہت سے قریبی دوست اور رفیق کار بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت گرفتار کر کے جیل بھیج دئے گئے۔ رفیع احمد قدوائی مئی کے آغاز ہی میں گرفتار ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن بعد صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر سری کرشن دت پالیوال اور دوسرے لوگ پکڑ لئے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس طریقے سے ہم میں سے اکثر قومی کارکن ایک ایک کر کے راستے سے ہٹا دئے جائیں گے۔ اور ہماری قومی تحریک کو معطل کر کے رفتہ رفتہ ختم کر دیا جائے گا۔ کیا ہم ان سب باتوں کو چپ چاپ برداشت کر لیتے؟ ہمیں اس کی عادت نہ تھی اور ہماری شخصی اور قومی غیرت اس طرز عمل سے بھڑک اٹھی۔

ہم اس الجھن میں تھے کہ ان نازک حالات میں جب جاپان کے حملے کا خوف سر پر منڈلا رہا ہے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن ہمارا خاموش رہنا جنگی مصلحتوں کے لحاظ سے بھی مفید نہ تھا اس لئے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ جن کو ہم خوف اور تردد کی

نظر سے دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ملک میں ایسے نازک موقعے پر لوگ
طرح طرح کے خیالات رکھتے تھے۔ جاپان کی حمایت کا تو کوئی سوال نہ تھا کیونکہ کوئی
ہندوستانی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک کی حکومت سے نکل کر دوسرے کا محکوم
بن جائے بلکہ لوگوں کو عام طور پر چینیوں کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی تھی۔
لیکن کچھ تھوڑے سے لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر جاپان ہندوستان
پر چڑھائی کرے تو اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی آزادی حاصل
کی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو جاپان کا بالواسطہ حامی کہا جا سکتا ہے۔ ان پر
سبھاش چندر بوس کی ریڈیائی تقریروں کا بہت اثر تھا جو پچھلے سال پوشیدہ
طریقے سے ہندوستان سے نکل گئے تھے۔ مگر اکثر لوگ چپ چاپ ہاتھ پر ہاتھ
دھرے بیٹھے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ لیکن اگر
بدقسمتی سے حالات ایسے ہو جاتے کہ ہندوستان کا کچھ حصہ دشمن کے قبضے میں
آجاتا تو یقیناً بہت سے لوگ دشمن سے مل جاتے خصوصاً دولتمند طبقوں میں
سے جو اپنے جان و مال کی حفاظت کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں۔ ان کو برطانوی
حکومت نے بڑھایا تھا اور اسی نے ان میں ملک کے دشمنوں سے اشتراک
عمل کرنے کی ذہنیت پیدا کی تھی۔ یہ اس کے عادی تھے کہ ہوا کے رخ پر چلیں
اور ہر حال میں اپنا ذاتی فائدہ مدنظر رکھیں۔ فرانس، بلجیم، ناروے اور یورپ
کے اور بہت سے ملکوں میں جہاں دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا مکمل اشتراک عمل کی
مثالیں موجود تھیں ہم دیکھ رہے تھے کہ وشی کے لوگ بقول پرٹیناکس کے اس
کی فکر میں اپنا دماغ کھپا رہے تھے کہ کسی طرح سے بے غیرتی کو عزت، بزدلی کو بہادری،
کم ظرفی اور جہالت کو دانائی، ذلت کو نیکی، اور جرمنی کی فتح کے آگے خوشی سے
سر جھکا دینے کو فرانس کی نشاۃ ثانیہ ثابت کر دیں۔"

جب فرانس جیسے ملک میں جو اپنی انقلابی ذہنیت، اور حبِّ وطن کے لئے مشہور ہے دشمن سے اشتراکِ عمل ہو سکتا تھا، تو کچھ بعید از قیاس نہ تھا کہ ہندوستان کے دولتمند طبقے، جن میں مدت سے برطانوی حکومت کے زیر سایہ اشتراکِ عمل کی ذہنیت نشو ونما پا رہی تھی، اور جنھیں اس کے بڑے بڑے صلے مل چکے تھے، ایسا ہی کریں گے۔ اغلب یہ ہے کہ دشمن سے تعاون کرنے میں وہی لوگ پیش پیش ہوتے جو اس وقت برطانوی حکومت سے تعاون کر رہے تھے اور اپنی وفاداری کا ببانگ دہل اعلان کرتے رہتے تھے۔ یہ حضرات تعاون کے فن میں کمال رکھتے ہیں اور چاہے حکومت کی عمارتیں بنتی اور مسمار ہوتی رہیں۔ وہ ہر ایک کی چوکھٹ کو پکڑے رہتے ہیں۔ جاپانیوں کے بعد اگر دوبارہ اتحادیوں کی حکومت آتی تو وہ پھر اتحادیوں سے مل جاتے جیسا کہ اس قسم کے لوگ یورپ میں کر رہے تھے۔ ضرورت کے وقت یہ لوگ برطانیہ کی مخالفت کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے جو اس وقت اس سے بھی زیادہ شدید تھے جتنے کرپس مشن کے ناکامی کے بعد تھے۔ اور ان کے ساتھ اور بہت سے لوگ ذاتی فائدے اور موقع پرستی کی بنا پر نہیں، بلکہ مختلف محرکات کے باعث آئندہ مصالح اور وسیع تر مقاصد کو نظر انداز کر کے اسی رو میں بہ جاتے۔ غرض ان حالات کو دیکھ کر ہم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور ہم یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر عوام اسی طرح جبراً قہراً برطانوی پالیسی کے آگے سر جھکاتے رہے تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے اور لوگوں کی اخلاقی پستی انتہا کو پہنچ جائے گی۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہندوستان پر حملہ ہوا اور مشرق کے کچھ علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا تو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی نظامِ حکومت درہم برہم ہو جائے گا اور ملک میں ابتری پھیل جائے گی۔ ملایا اور برما کے واقعات ہمارے

سامنے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ اگر لڑائی کا پانسہ دشمن کے موافق پڑا تب بھی وہ ملک کے کچھ زیادہ حصے پر قبضہ نہیں کر سکے گا۔ اس لئے کہ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور ہم چین کی جنگ میں یہ دیکھ چکے تھے کہ ملک کی وسعت کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ اہمیت اسی صورت میں ہے جب لوگ ملک کے وسیع رقبے سے فائدہ اٹھانے کا عزم رکھتے ہوں، ہار کر دشمن کے آگے سر نہ جھکا دیں بلکہ اس کا مقابلہ کریں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ اتحادی فوجیں ہٹ کر ملک کے اندرونی مورچوں پر چلی جائیں گی اور بہت بڑے علاقے کو دشمن کے لئے چھوڑ دیں گی۔ اگرچہ غالباً چین کی طرح یہاں بھی وہ اس سارے علاقے پر قبضہ نہیں کرے گا۔ غرض ہمارے سامنے یہ سوال تھا کہ ان علاقوں میں اور ملک کے دوسرے حصوں میں جہاں ابتری پھیل گئی ہو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ جہاں تک ہمارے امکان میں تھا ہم نے لوگوں کو ذہنی اور مادی حیثیت سے ان نازک حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر دیا تھا۔ ہم نے مقامی انجمنوں کو اس قسم کی تربیت دی تھی کہ وہ موقعہ پڑنے پر امن و امان قائم رکھ سکیں اور نظم و نسق چلا سکیں اور لوگوں کو یہ تاکید کی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو دشمن کا جم کر مقابلہ کریں۔

ہم اپنے دل میں سوچتے تھے آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ چینی اتنے سال سے مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں اور روس کے باشندے اور سوویٹ یونین کی دوسری قومیں اس بے جگری، استقلال اور جوش و خروش سے لڑ رہی ہیں؟ یوں تو دوسرے ملکوں میں بھی لوگ بہادری سے لڑ رہے تھے اس لئے کہ ان کے دل میں اپنے ملک کی محبت تھی وہ جارحانہ حملے سے خائف تھے اور اپنی تہذیب معاشرت کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ پھر بھی جنگی کوششوں میں جو جوش و

خروش روس کے لوگوں نے دکھایا اس کی مثال کوئی دوسرا ملک پیش نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کے اور ملک بھی ڈنکرک کے موقعے پر اور اس کے بعد خوب جی توڑ کر لڑے مگر جب یہ نازک موقعہ گزر گیا تو ان کا اخلاقی جوش کسی قدر سرد پڑ گیا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ ان کو مستقبل کے متعلق کچھ شبہات ہیں گو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لڑائی تو کسی نہ کسی طرح جیت ہی لینی چاہئے مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا۔ سوویٹ یونین میں لوگوں کو کسی قسم کے شبہات نہیں تھے۔ انھیں جنگ کے مقاصد پر بحث کرنے کی ضرورت نہ تھی (اور اس کی اجازت بھی نہ تھی) اس لئے کہ انھیں اپنے حال اور مستقبل پر پورا اعتماد تھا۔

اس کے برعکس ہندوستان کے لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ حال سے بیزار تھے اور مستقبل انھیں بھی اتنا ہی تاریک نظر آتا تھا۔ انھیں دشمن کے مقابلے پر ابھارنے کے لئے حب وطن کا وہ جذبہ موجود نہ تھا جو آزاد قوموں میں ہوتا ہے بلکہ صرف یہ خیال تھا کہ ملک کو بیرونی حملے سے بچانا چاہئے ورنہ ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گی بہت تھوڑے لوگ تھے جو بین الاقوامی مصلحتوں سے متاثر تھے۔ لیکن ان جذبات کے ساتھ ساتھ عوام میں ناراضگی کا جذبہ بھی موجود تھا کہ ایک غیر ملکی سامراجی حکومت انھیں اپنے اشاروں پر چلا رہی ہے، ان کے جذبات کو کچل رہی ہے اور ان کے وسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ان کے نزدیک وہ نظام حکومت جس میں ہر چیز ایک مطلق العنان حاکم کی مرضی پر موقوف ہے، بنیادی طور پر [illegible] تھا۔ یوں تو آزادی سب کو عزیز ہے مگر سب سے زیادہ اس کی قدر وہ لوگ کرتے ہیں جو اپنی آزادی کھو چکے ہیں یا کھونے والے ہیں۔ عہد جدید میں آزادی بہت [illegible] قیود اور شرائط کی پابند ہے۔ جو لوگ آزادی کی نعمت سے محروم ہیں انھیں ان پابندیوں کی خبر نہیں۔ وہ اپنے ذہن میں آزادی کی ایک خیالی تصویر قائم کر لیتے

ہیں اور اس کی آرزوئیں اُن کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ جو چیز آزادی کی راہ میں حائل ہو اُسے وہ مٹانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ جس آزادی کی خاطر ہندوستان میں لاکھوں آدمیوں نے اس قدر جانفشانی کی اور اتنی مصیبتیں اٹھائیں اس میں نہ صرف رکاوٹ پڑ رہی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک عرصۂ دراز کے لئے ٹل جائے گی۔ بجائے اس کے کہ ہندوستانیوں کے اس جذبے کو عالمگیر جنگ کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا اور قوت کے اس عظیم الشان ذخیرے کو ہندوستان کی حفاظت اور اس کی اور ساری دنیا کی آزادی کے لئے استعمال کیا جاتا۔ جنگ کو قومی تحریک سے بالکل بے تعلق رکھا گیا اور لوگوں کو اس سے کسی فائدے کی امید نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ کسی کو خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، مایوس کر دینا دانشمندی کے خلاف ہے۔

البتہ کچھ لوگ ہندوستان میں ایسے بھی تھے جو اس جنگ کو مختلف ملکوں کے سیاست دانوں کی چھوٹی چھوٹی اغراض کا تابع نہیں بلکہ اس سے برتر اور وسیع تر سمجھتے تھے، جو اس کی انقلابی اہمیت کو اپنے گھروں کے اندر محسوس کرتے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کے نتائج فوجی فتوحات، اور عہد ناموں اور سیاست دانوں کی دھواں دھار تقریروں تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ دنیا کو کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اکثریت اور ملکوں کی طرح یہاں بھی ان لوگوں کی تھی جن کا زاویہ نگاہ بہت محدود تھا یہ اپنے آپ کو واقعیت پسند کہتے تھے اور محض وقتی مصلحت کو دیکھتے تھے جنھوں نے اپنے آپ کو برطانوی پالیسی کے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور اگر کوئی دوسری حکومت یا پالیسی ہوتی تو اس کے ساتھ بھی اسی طرح تعاون کرتے بعض اس پالیسی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس

کے آگے سر جھکا دینا نہ صرف ہندوستان کے بلکہ دنیا کے ساتھ غداری کرنا ہو۔ لوگوں پر جمود، بے حسی اور بے عملی کی کیفیت طاری تھی۔ یہ ہندوستانیوں کی پرانی کمزوری ہے جسے دور کرنے کی ہم اتنے دن سے انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔

ادھر ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ کشمکش جاری تھی اور مایوسی اور بیزاری کا جذبہ بڑھتا جا رہا تھا، ادھر گاندھی جی نے چند مضامین لکھے جن سے دفعتہً لوگوں کے خیالات میں ایک نیا رجحان پیدا ہو گیا یا یوں کہنا چاہئے کہ جیسا اکثر ہوا کرتا ہے، ان مضمونوں نے لوگوں کے مبہم خیالات کو ایک معین اور واضح شکل دے دی۔ گاندھی جی کے لئے اس نازک موقعے پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور واقعات کے آگے سر تسلیم خم کر دینا ناقابل برداشت تھا۔ ان کے خیال میں اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل تھا کہ ہندوستان کی آزادی تسلیم کر لی جائے اور آزاد ہندوستان اتحادی قوموں کے ساتھ مل کر دشمن کے جارحانہ اقدام کا مقابلہ کرے۔ لیکن اگر ہمیں اپنی آزادی کے تسلیم کئے جانے کی امید نہ ہو تو ہمارا فرض ہے کہ موجودہ نظام حکومت کی مخالفت میں کوئی نہ کوئی قدم اٹھائیں تاکہ لوگ اس جمود و غفلت سے چونکیں جس نے ان کے قوائے عمل کو ماؤف کر کے انھیں اس قدر بے بس کر دیا کہ وہ آسانی سے جارحانہ اقدام کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی نیا مطالبہ نہ تھا۔ وہی بات تھی جو ہم عرصے سے کہتے چلے آ رہے تھے مگر گاندھی جی کی تقریر اور تحریر میں ایک نیا جوش اور تقاضا تھا اور عملی جدوجہد کی طرف اشارہ تھا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں تھا کہ گاندھی جی ہندوستانیوں کے موجودہ جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہے تھے۔ قومیت اور بین الاقوامیت کی کشمکش میں قومیت کو فتح ہوئی اور گاندھی جی کے ان مضامین نے سارے

ہندوستان میں ہل چل مچا دی۔ پھر بھی یہ قومیت کسی حالت میں بین الاقوامیت کی مخالف نہ تھی بلکہ دل و جان سے کوشش کر رہی تھی کہ کوئی ایسی راہ نکلے کہ وہ بین الاقوامی نظام میں کھپ جائے بہ شرطے کہ اسے باعزت اور موثر طریقے سے اس نظام میں شریک ہونے کا موقع ملے۔ اس لئے کہ دونوں میں کوئی لازمی تضاد نہ تھا اس لئے کہ ہندوستانی قومیت، بہ خلاف یورپ کی قومیت کے دوسری قوموں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ ان کے ساتھ اس طریقے سے تعاون کرنا چاہتی تھی جس میں دونوں کا فائدہ ہو اس کے نزدیک قومی آزادی صحیح بین الاقوامیت کی بنیاد اور اس کے پہنچنے کی سیڑھی تھی اور اس کی بنا پر ہندوستان فسطائیت اور نازیت کے خلاف جنگ میں تعاون کر سکتا تھا مگر ان دنوں یورپ میں جس بین الاقوامیت کا اس قدر چرچا تھا اس پر تو یہ شبہہ ہونے لگا تھا کہ یہ وہی سامراجی طاقتوں کی پرانی پالیسی ہے جس نے بظاہر ایک نیا لباس پہن لیا ہے مگر حقیقت میں وہ بھی نیا نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ بین الاقوامیت خود ایک جارحانہ قومیت تھی جو سلطنت یا کامن ویلتھ یا انتداب کے نام سے اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتی تھی۔

ہم میں سے بعض اس نئی صورت حال سے بہت گھبرائے۔ ہم یہ سوچتے تھے کہ عملی تحریک جب تک موثر نہ ہو محض بیکار رہے اور اگر کوئی موثر تحریک شروع کی گئی تو اس سے جنگی کوششوں میں رکاوٹ پڑے گی اور وہ بھی اس نازک موقعے پر جب ہندوستان پر حملے کا خطرہ ہے۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کے عام طرز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بین الاقوامی مصالح کی اہمیت کو نظر انداز کر کے معاملات کو صرف تنگ قومی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ لڑائی کے پچھلے تین سال میں ہم نے دانستہ طور پر یہ رویہ اختیار کر رکھا تھا کہ حکومت برطانیہ

کو پریشان نہ کریں اس میں شک نہیں کہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں یہ احتجاج بڑے پیمانے پر تھا اور ہمارے تیس ہزار چوٹی کے آدمی جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی جیل بھیج دیئے گئے تھے۔ لیکن پھر بھی جیل جانے کی تحریک منتخب افراد تک محدود رکھی گئی اور عام شورش سے اور حکومت کے کاروبار میں خلل ڈالنے سے پرہیز کیا گیا۔ یہ تو ہم کر نہیں سکتے تھے کہ پھر اسی سلسلے کو دہرائیں۔ اگر کچھ کیا جاتا تو وہ اس سے مختلف اور زیادہ موثر ہونا چاہئے تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا اس کا اثر لازمی طور پر ہندوستان کی مشرقی سرحد کی جنگ پر نہیں پڑے گا اور دشمن کو تقویت نہیں پہنچے گی؟

یہ سب مشکلات ہمارے سامنے تھیں اور آخر ہم نے گاندھی جی سے ان کے متعلق بحث کی لیکن فریقین ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے عمل یا ترک عمل کے متعلق جو فیصلہ بھی کرتے اس میں طرح طرح کے خطرات تھے۔ ضرورت اس کی تھی کہ مختلف صورتوں میں جو خطرے پیش آسکتے ہیں ان کا موازنہ کر کے کمتر درجے کی برائی کو اختیار کیا جائے۔ گاندھی جی سے ہماری جو گفتگو ہوئی اس سے ایک یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بہت سے مسائل جو مبہم تھے واضح ہو گئے اور گاندھی جی نے ان بین الاقوامی مسائل کی اہمیت کو جن کی طرف ان کو توجہ دلائی گئی تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد جو مضامین گاندھی جی نے لکھے ان میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی تھی۔ اب وہ خود بین الاقوامی مصلحتوں پر زور دینے لگے اور ہندوستان کے مسئلے کو ان کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بنیادی نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھیں اس پر سخت اعتراض تھا کہ ہم ہندوستان میں برطانیہ کی آمرانہ اور جابرانہ پالیسی کو چپ چاپ برداشت کرتے رہیں اور وہ اس پر مصر تھے کہ ہمیں

اس کی مخالفت میں کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔ ان کے نزدیک اس وقت سر تسلیم خم کر دینے کے یہ معنے تھے کہ ہندوستان کی روح کچل کر رہ جائے گی اور جنگ کا جو کچھ بھی نتیجہ ہو ہندوستانی بہر حال غلامانہ روش اختیار کریں گے اور انھیں عرصۂ دراز تک آزادی حاصل نہیں ہوگی۔ دشمن کے حملے کے وقت عارضی شکست یا پسپائی کی صورت میں بھی وہ دشمن کے آگے سر جھکا دیں گے اور مزاحمت ترک کر دیں گے، اس طرح ہماری قوم کی ہمت بالکل ٹوٹ جائے گی اور پچیس سال کی مسلسل جدوجہد سے ان میں جو طاقت پیدا ہوئی ہے وہ جاتی رہے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو بھول جائے گی اور جنگ کے بعد جو فیصلہ ہوگا وہ انھیں پرانے سامراجی رجحانات کے ماتحت ہوگا۔ گاندھی جی دل و جان سے ہندوستان کی آزادی کے طالب تھے مگر ان کے نزدیک ہندوستان کی حیثیت محض ان کے پیارے وطن کی نہ تھی بلکہ وہ اسے دنیا کے محکوم اور مظلوم ملکوں کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان ایک کسوٹی ہے جس پر دنیا کی آئندہ پالیسی پرکھی جائے گی۔ اگر ہندوستان آزاد نہ ہوا تو سب محکوم قومیں بدستور غلام رہیں گی اور موجودہ جنگ کی ساری قربانیاں اکارت جائیں گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ جنگ کی اخلاقی بنیاد بدل جائے۔ یوں تو بری اور بحری فوجیں اور ہوائی طاقت اپنا اپنا کام کریں گی اور ممکن ہے کہ تشدد کے بہتر طریقوں کی مدد سے فتحیاب بھی ہوں لیکن اصلی فتح اخلاق کا کام ہے۔ اور سچ پوچھئے تو مسلح جنگ میں بھی اخلاقی قوت درکار ہوتی ہے۔ نپولین کا قول ہے "اخلاقی قوت جسمانی قوت سے تگنا اثر رکھتی ہے۔" اگر دنیا کے محکوم ملکوں کے کروڑوں باشندوں کو یقین ہو جائے کہ یہ جنگ ان کی آزادی کی خاطر لڑی جا رہی ہے تو جنگ کے محدود نقطۂ نظر سے بھی بہت مفید ہے اور آئندہ امن کے لئے تو بے حد اہمیت

رکھتا ہے۔ جنگ کے حالات کے نازک صورت اختیار کر لینے کی وجہ سے یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ برطانیہ اپنے نقطۂ نگاہ اور اپنی پالیسی میں تبدیلی کرے کروڑوں آدمیوں کو جو اس کے جنگی مقاصد کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اپنا پرجوش حامی اور مددگار بنا لے۔ اگر یہ معجزہ ہو جائے تو محوری طاقتوں کی تمام جنگی تیاریاں بیکار ہو کر رہ جائیں گی اور ان کی شکست یقینی ہو جائے گی۔ اور ممکن ہے کہ خود محوری ملکوں کے بہت سے باشندے بھی اس زبردست عالمگیر جذبے سے متاثر ہوں۔

یہ بہتر ہے کہ ہندوستان کے لوگوں میں جو جمود اور بے زاری پائی جاتی ہے اس کو مقاومت اور انحراف کے جذبے میں تبدیل کر دیا جائے۔ شروع میں یہ انحراف برطانوی افسروں کے من مانے احکام سے ہوگا لیکن آگے چل کر اسے حملہ آور فوج کی مقاومت کے لئے استعمال کیا جا سکے گا۔ برخلاف اس کے اگر آج برطانوی حکومت کے ساتھ غلامی اور اطاعت کی روش اختیار کی جائے تو کل دوسروں کے مقابلے میں یہی طرز رہے گا اور اس کا نتیجہ ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

ہم ان دلائل سے بخوبی واقف تھے۔ ہم ان کو صحیح سمجھتے تھے اور خود بھی بارہا استعمال کر چکے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ جو معجزہ ہم چاہتے تھے وہ برطانوی پالیسی نے نہیں ہونے دیا اور ہماری ساری کوششیں کہ ہندوستان کا مسئلہ دوران جنگ میں کم سے کم عارضی طور پر حل ہو جائے، بے سود ثابت ہوئیں۔ ہم نے حکومت برطانیہ سے بارہا درخواست کی کہ وہ اپنے جنگی مقاصد واضح طور پر بتلا دے لیکن ہر مرتبہ یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر اس قسم کی کوئی اور کوشش کی جائے تو اس کا بھی وہی نتیجہ ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ

ایسی صورت میں ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ ہم سوچتے تھے اگر ہم حکومت سے ٹکر لیتے ہیں تو خواہ ہمارا فعل اخلاقی اصول کے اور دوسری باتوں کے لحاظ سے کتنا ہی درست کیوں نہ ہو مگر اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ایسے وقت میں جب کہ ہندستان پر حملے کا شدید خطرہ ہے جنگی کوششوں میں بڑی رکاوٹ پڑ جائے گی ہم اس حقیقت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ مگر لطف تو یہ ہے کہ اس خطرے کے احساس ہی نے ہمارے دل میں عملی جد و جہد کا خیال پیدا کیا تھا۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم چپ چاپ بیٹھے دیکھتے رہیں۔ اور ہمارا ملک ان لوگوں کے ہاتھوں جن کو ہم نا اہل سمجھتے تھے تباہ ہو جائے۔ ان لوگوں میں اس کی مطلق قابلیت نہ تھی کہ وقت کے تقاضے کے مطابق قومی مدافعت کا جذبہ پیدا کر سکیں۔ ہمارا سارا دبا ہوا جوش اور ولولہ اظہار کے لئے بے چین تھا اور عمل کی راہ ڈھونڈھ رہا تھا۔

گاندھی جی اب بوڑھے ہو چلے تھے۔ ان کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ عمر بھر کی مسلسل جد و جہد اور سخت جسمانی اور دماغی مشقت نے ان کے جسم کو کمزور کر دیا تھا۔ لیکن اب بھی ان میں وہی دم خم تھا اور ان کا خیال تھا کہ اگر اس وقت وہ جھک گئے اور انھوں نے اپنے محبوب ترین مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو ان کی تمام عمر کی محنت اکارت جائے گی ہندستان اور دوسری محکوم قوموں کی آزادی کی محبت ان کے عدم تشدد کے عقیدے پر بھی غالب آ گئی۔ اس سے پہلے ایک موقعے پر انھوں نے بادل ناخواستہ یہ منظور کر لیا تھا کہ کانگریس ضرورت کے وقت ملکی دفاع اور حکومت کے نظم و نسق کے سلسلے میں تشدد کا استعمال کر سکتی ہے لیکن اپنے آپ کو اس سے بالکل الگ رکھا تھا۔ اب انھیں یہ محسوس ہوا کہ شاید معاملے میں ان کی بے دلی برطانیہ اور دوسری اتحادی طاقتوں سے سمجھوتے کے راستے میں رکاوٹ ڈالے۔ اس لئے

انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر کانگریس کے پلیٹ فارم سے خود ایک تجویز منظور کرائی جس کا مطلب یہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی عارضی حکومت آزادی کی جدوجہد میں جارحانہ حملوں کے خلاف اپنے تمام زبردست وسائل سے کام لے گی اور ہندوستان کے معاملے میں اپنی ساری قوتوں کے ساتھ جن میں فوجی قوت بھی شامل ہے اتحادی قوموں سے تعاون کرے گی۔ گاندھی جی کے لئے صاف الفاظ میں یہ بات کہہ دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اس تلخ گھونٹ کو پی گئے اس لئے کہ ان کو اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ برطانیہ سے سمجھوتا ہو جائے اور ہندوستان ایک آزاد قوم کی حیثیت سے حملہ آور دشمن کا مقابلہ کر سکے۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں کو گاندھی جی کے ساتھ جو نظری اور دوسرے قسم کے اختلافات تھے ان میں سے اکثر دور ہو گئے۔ مگر ایک بہت بڑی دقت اب بھی باقی تھی کہ اگر ہم نے کوئی عملی قدم اٹھایا تو جنگی کوششوں میں رکاوٹ پڑنا لازمی ہے۔ ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت تعجب ہوا کہ گاندھی جی اب تک یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی حکومت سے کوئی نہ کوئی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی پوری کوشش کریں گے۔ چنانچہ عملی تحریک پر اتنا زور دینے کے باوجود انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ تحریک کیا ہوگی اور کس طریقے پر چلائی جائے گی۔

ادھر ہم اس قیل و قال میں مصروف تھے اور ادھر ملک کا مزاج بدل گیا تھا۔ بے زاری اور بے دلی کی جگہ انتہائی جوش اور اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ واقعات اب کانگریس کے فیصلے کے منتظر نہیں تھے۔ گاندھی جی کی تقریروں سے شہ پاکر وہ آپ ہی آپ آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ

گاندھی جی کی رائے صحیح ہو یا غلط، مگر وہ اس کیفیت کی ترجمانی کر رہے تھے جو اس وقت قوم پر طاری تھی۔ یہ وہ جوشِ جذبات تھا جس میں آدمی جان پر کھیل جاتا ہے، جس کے سامنے منطق اور عقل اور نتائج پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی محض ثانوی حیثیت رہ جاتی ہے۔ ان نتائج کا لوگوں کو اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ خواہ انھیں کچھ ملے یا نہ ملے، بہرحال بڑی سخت تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں گی۔ لیکن موجودہ حالت میں جو روحانی اذیت ہر وقت برداشت کرنی پڑتی تھی وہ بھی کچھ کم نہ تھی اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ قسمت کے جور و ستم کو چپ چاپ سہنے سے تو یہی بہتر تھا کہ ہر چہ بادا باد کہہ کر اپنی کشتیٔ عمل کو بحرِ ناپیدکنار میں ڈال دیں۔ یہ سیاست داں کا نقطۂ نظر نہ تھا بلکہ ان عوام کا جو تنگ آ کر نتائج سے بے پروا ہو گئے۔ لیکن پھر بھی وہ عقل سے کام لے رہے تھے، مختلف جذبات میں ایک تناسب اور انسانی فطرت کے بنیادی تضاد میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بظاہر یہ دکھائی دیتا تھا کہ موجودہ جنگ ایک طویل جنگ ہوگی، اور ابھی کئی سال تک چلے گی، اس کی وجہ سے دنیا کو بہت سی تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا اور ابھی اور کرنا ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ وہ وحشیانہ جذبہ نہ مٹ جائے جن کی وجہ سے لڑائی شروع ہوتی ہے اور جو لڑائی کی وجہ سے تیز ہو جاتے ہیں۔ اس بار ادھوری کامیابی نہیں ہونی چاہئے جو عام طور پر ناکامی سے زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتی ہے۔ فی الحال لڑائی کا نقشہ میدانِ جنگ میں بھی اچھا نہ تھا اور وہ ان مقاصد سے بھی دور ہو جاتی تھی جن کے لئے، اتحادیوں کے دعوے کے مطابق، وہ شروع کی گئی تھی ہمارا خیال تھا کہ شاید ہماری تحریک کی وجہ سے اتحادی طاقتوں کو اپنی اس دوسری ناکامی کا

احساس ہو، اور لڑائی کا رخ پلٹ جائے۔ اور اگر اس وقت اس مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہو تو آگے چل کر ضرور ہوگی اور اس سے آئندہ فوجی کارروائیوں کو بڑی تقویت پہنچے گی۔ ادھر لوگوں کی برہمی بڑھتی گئی اور حکومت کا پارہ چڑھتا گیا۔ اس کے لئے کسی خاص جذباتی تحریک کی ضرورت تھی اس لئے کہ یہ قہر و غضب تو حکومت کی فطرت اور عادت میں داخل تھا۔ ایک بیرونی طاقت محکوم ملکوں پر اسی طرح حکومت کرتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ یہ بہت اچھا موقع ہے اس وقت ان سب عناصر کو جو اس کی مرضی کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت کرتے ہیں ہمیشہ کے لئے کچل ڈالنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے اس کی تیاریاں شروع کر دیں۔

واقعات کی رفتار تیز ہوتی جاتی تھی مگر عجیب بات ہے کہ اگرچہ گاندھی جی بار بار یہ کہہ چکے تھے کہ ہندوستان کی عزت رکھنے کے لئے، اور اس بات پر زور دینے کے لئے کہ اس کو آزادی کا ... ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جارحانہ حملوں کی مدافعت میں شریک ہونے کا پورا حق حاصل ہے، ہمیں عملی جدوجہد کرنی چاہیئے لیکن انھوں نے اس جدوجہد کی نوعیت کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہا تھا یہ تو ظاہر ہی تھا کہ یہ تحریک پرامن ہوگی مگر اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کی تشریح کرنے کے بجائے گاندھی جی [illegible] حکومت برطانیہ کے ساتھ سمجھوتے کے امکانات پر زور دیتے رہے تھے کہ وہ ایک مرتبہ پھر حکومت سے گفتگو کریں گے اور اس کی انتہائی کوشش کریں گے کہ مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں اپنی آخری تقریر میں انھوں نے پرجوش اپیل کی اور یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اس سلسلے میں وائسرائے سے ملیں گے جو تحریک ان کے ذہن میں تھی اس کی نوعیت انھوں نے نہ کسی نجی ملاقات کے دوران میں اور نہ کانگریس کمیٹی کے کسی جلسے میں ظاہر کی البتہ [illegible]

مرتبہ گفتگو میں یہ ضرور کہا کہ اگر سمجھوتے کی گفت وشنید ناکام رہی تو وہ ملک سے اپیل کریں گے کہ وہ حکومت کے ساتھ عدم تعاون کرے، اور قومی احتجاج کی علامت کے طور پر تمام ملک میں ایک دن سب کام بند رہیں یعنی ایک قسم کی عام ہڑتال منائی جائے۔ یہ محض ایک مبہم سا اشارہ تھا جس کی انھوں نے کوئی تشریح نہیں کی کیونکہ وہ اس وقت تک کوئی پروگرام بنانا نہیں چاہتے تھے چنانچہ نہ تو گاندھی جی نے اور نہ ورکنگ کمیٹی نے کسی قسم کی علانیہ یا خفیہ ہدایات جاری کیں البتہ عوام سے یہ ضرور کہا گیا کہ وہ ہر قسم کے واقعات کے لئے تیار رہیں اور ہر صورت میں عدم تشدد کی پالیسی پر کاربند رہیں۔

اگرچہ گاندھی جی کو ابھی تک یہ امید تھی کہ سمجھوتے کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکل آئے گی، لیکن بہت کم لوگ ان کے اس خیال سے متفق تھے۔ اب تک جو کچھ ہو چکا تھا اور واقعات کا جو رخ نظر آرہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ حکومت کے ساتھ ٹکر ہو کر رہے گی۔ جب ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو میانہ روی کا طریقہ کچھ کام نہیں دیتا بلکہ ہر مرد و عورت کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اسے حکومت کا ساتھ دینا ہے یا ملک کا۔ کانگریسی لوگوں اور ان کے ہمخیالوں کے لئے تو ان دونوں صورتوں میں انتخاب کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ایسی حالت میں جب کہ حکومت اپنی پوری قوت سے ہماری قوم کو کچلنا چاہتی تھی یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہم اس جنگ آزادی میں حصہ نہ لیں اور دور سے تماشا دیکھتے رہیں۔ ایسے لوگ بھی تھے جو انتہائی ہمدردی کے باوجود الگ رہے مگر ایک کانگریسی کے لئے یہ بڑی شرم اور ذلت کی بات تھی کہ اس چیز سے جو خود اس کے گذشتہ عمل کا نتیجہ ہے، بچنے کی کوشش کرے۔ اور پھر یوں بھی کانگریسیوں کے لئے اور کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ ہندوستان کی گذشتہ تاریخ، حال کی

مصیبتیں اور مستقبل کی امیدیں ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں اور انھیں آگے بڑھا رہی تھیں۔ ان کا ہر فعل انھیں قوتوں کے تابع تھا۔ برگسن نے اپنی کتاب "ارتقائے تخلیقی" میں لکھا ہے "حقیقت میں ماضی خود بہ خود محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ غالباً یہ پورا ذخیرہ ہر لحظہ ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے خیالات پر تو ماضی کے صرف ایک حصے کا اثر پڑتا ہے لیکن ہماری خواہش، ارادے اور عمل کے تعین میں یہ سارے کا سارا ماضی جس میں ہماری روح کا فطری رجحان بھی شامل ہے، کارفرما ہوتا ہے۔"

۷ اور ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کھلے اجلاس میں اس رزولیوشن پر غور اور بحث کی جو بعد میں "ہندوستان چھوڑ دو کا رزولیوشن" کہلایا یہ تجویز بہت جامع اور مفصل تھی، اور اس میں اس مسئلے پر مدلل بحث کی گئی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کو فوراً تسلیم کر لیا جائے اور یہاں برطانوی حکومت ختم کر دی جائے۔ "نہ صرف ہندوستان کی خاطر بلکہ متحدہ اقوام کی کامیابی کی خاطر۔ برطانوی حکومت ہندوستان کو کمزور اور ذلیل کر رہی ہے اور اس میں یہ صلاحیت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے کہ اپنی حفاظت کر سکے اور عالمگیر آزادی کے مقصد کو حاصل کرنے میں مدد دے سکے۔" "سلطنتوں کے بیرونی مقبوضات ان کے باعث تقویت ہونے کے بجائے لعنت اور مصیبت بن گئے ہیں ہندوستان جدید سامراج کا اصلی نمونہ ہے اور سب سے اہم مسئلہ اسی کا ہے کیونکہ ہندوستان کی آزادی سے برطانیہ اور اتحادی قوموں کی نیک نیتی کا اندازہ ہو جائے گا اور ایشیا اور افریقہ کی قوموں کے دل جوش اور امید سے معمور ہو جائیں گے۔" آگے چل کر اس قرارداد میں ایک عارضی قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ تھا جس میں ملک کی سب جماعتیں شامل ہوں اور جس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہو کہ اتحادی طاقتوں کے ساتھ

مل کر اپنی ساری فوجی طاقت اور عدم تشدد کی قوت کو ہندوستان کی حفاظت اور جارحانہ حملوں کی مقاومت کے لئے استعمال کرے" تجویز یہ تھی کہ حکومت ایک آئین ساز مجلس بنائے اور وہ ہندوستان کے لئے ایک ایسا آئین مرتب کرے جو سب فرقوں اور جماعتوں کے لئے قابل قبول ہو۔ یہ آئین ایک وفاقی طرز حکومت کا ہونا چاہیے جس میں صوبوں یا ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور "باقی اختیارات" حاصل ہوں۔ آزاد ہونے کے بعد ہندوستان دشمن کے حملے کا موثر طریقے پر مقابلہ کر سکتا ہے کیونکہ اس کی پشت پر عوام کا متحدہ ارادہ اور قوت ہوگی۔" رزولیوشن میں یہ بھی کہا گیا کہ ہندوستان کی آزادی اور سب ایشیائی قوموں کی آزادی کی علامت اور تمہید ہونی چاہیئے اور سب آزاد قوموں کا ایک عالمگیر وفاق قائم کرنا جس کی ابتدا متحدہ اقوام سے کی جا سکتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس کی وضاحت کردی کہ وہ "چین اور روس کی مدافعت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ (اس زمانے میں چین اور روس کے لئے سب سے زیادہ خطرہ تھا) ان کی آزادی ایک گراں قدر سرمایہ ہے جس کی حفاظت ضروری ہے۔ اسی طرح وہ دوسری اتحادی قوموں کی دفاعی قوت کو بھی کمزور کرنا نہیں چاہتی۔" "مگر ہندوستان اور اتحادی ملکوں کے لئے خطرات بڑھتے جاتے ہیں ایسے موقعے پر ہندوستان کا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور غیر ملکی حکومت کی اطاعت کرتے رہنا اس کو ذلیل و خوار اور اس کی قوت مدافعت کو کمزور کر رہا ہے۔ اس حالت میں وہ نہ تو ان بڑھتے ہوئے خطروں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ اتحادی قوموں کی خدمت کر سکتا ہے۔"

کمیٹی نے ایک بار پھر برطانیہ اور اتحادی ملکوں سے "عالمگیر آزادی کی خاطر" ہندوستان کی آزادی کی اپیل کی اور رزولیوشن کو ان چبھتے ہوئے فقروں پر ختم کیا

اُب کمیٹی کے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ قوم کو اس جابر حکومت کا مقابلہ کرنے سے روکے جو اس کے سر پر مسلط ہے اور اسے خود اپنے اور بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرنے دیتی۔ اس لئے کمیٹی اس کی اجازت دیتی ہے کہ ہندوستان کے لازمی حق آزادی کو ثابت کرنے کے لئے گاندھی جی کی قیادت میں ایک عام عملی جدوجہد شروع کی جائے" اس فیصلے پر اسی وقت عمل کیا جا سکتا تھا جب گاندھی جی مناسب سمجھیں۔ آخر میں یہ بھی کہہ دیا گیا "کمیٹی کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ وہ کانگریس کے لئے اقتدار حاصل کرے۔ حکومت کے اختیارات جب ملیں گے تو ساری قوم کو ملیں گے"

مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی نے خاتمے کی تقریروں میں بتایا کہ اب ان کا اگلا قدم یہ ہوگا کہ وہ وائسرائے سے بحیثیت سلطنت برطانیہ کے نمائندے کے ملیں گے اور بڑی بڑی اتحادی قوموں کے سرداروں سے ایک باعزت سمجھوتے کے لئے اپیل کریں گے جس کی رو سے ہندوستان کی آزادی تسلیم کر لی جائے، اس سے اتحادی قوموں کو محوری طاقتوں کے جارحانہ اقدام کا مقابلہ کرنے میں بہت بڑی مدد ملے گی۔

یہ تجویز ۸ اگست ۱۹۴۲ء کی رات کو آخری صورت میں منظور ہو گئی۔ اس کے چند ہی گھنٹے بعد ۹ اگست کی صبح تڑکے بمبئی میں اور سارے ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ اس طرح ہم قلعہ احمد نگر میں پہنچے

دسواں باب

۱۔ واقعات کی کڑی

قلعہ احمد نگر

احمد نگر قلعہ ۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۴ء ۔ آج ہمیں یہاں آئے ہوئے دو سال سے کچھ زیادہ ہوگئے ہیں۔ ان دو سالوں میں ہماری زندگی یہاں خواب کی طرح گذر گئی۔ ہر روز ہمارے ساتھ وہی محدود ماحول رہا، وہی چند ساتھی وہی روز مرہ کا بندھا ٹکا معمول۔ نہ معلوم کس دن ہم اس خواب سے جاگیں گے اور زندگی اور عمل کی وسیع تر دنیا میں پہنچیں گے جو ہمیں بدلی ہوئی ملے گی۔ لوگ اور چیزیں کچھ ان جانی سی لگیں گی۔ پھر رفتہ رفتہ ماضی کے واقعات کی یاد دماغ میں اُبھر آئے گی اور وہ چیزیں ہمیں دوبارہ یاد آنے لگیں گی۔ لیکن ہم اور وہ دونوں ہی اس دوران میں بہت کچھ بدل چکے ہوں گے اور ممکن ہے ان کے ساتھ نباہ کرنا ہمارے لئے مشکل ثابت ہو۔ ممکن ہے کبھی ہمیں یہ خیال آئے کہ روزمرہ کی معمولی زندگی کا یہ تجربہ بھی کہیں خواب تو نہیں جس سے ہم اچانک کسی دن جاگ اٹھیں گے۔ نہ معلوم

کون سی حقیقت ہے اور کون سا خواب، ایسا تو نہیں کہ دونوں ہی حقیقت ہوں کیونکہ ہم دونوں کو شدت سے محسوس کرتے ہیں یا پھر دونوں ہی غیر حقیقی اور خواب کے سے تجربے کی طرح تو نہیں جو اپنے پیچھے مبہم سی یاد چھوڑ جاتا ہے۔

جیل کی تنہائی اور بے کاری میں محبوب ترین مشغلہ غور و فکر ہوتا ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ زندگی کے خلا کو پرانی یادوں سے پر کیا جائے۔ ایسے میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں ہی کی یاد سے دل بہلتا ہے۔ میں نے پچھلے چار مہینوں میں اپنے دماغ کو ہندوستان کے پرانے کارناموں اور اس کے ماضی کے تجربوں کی یاد میں مشغول رکھا ہے اور اس اثنا میں جو سیکڑوں خیالات ذہن میں آئے ان میں سے بعض کو چن کر میں نے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا۔ اب تک جو کچھ لکھ چکا ہوں اس پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ سب بے ربط اور ناکافی معلوم ہوتا ہے جس میں کوئی وحدت خیال نہیں، بہت سے متضاد خیالات کا ایک معجون مرکب، جس میں ذاتی عنصر اتنا زیادہ نمایاں ہو گیا ہے کہ اس کا رنگ ان چیزوں میں بھی نظر آتا ہے جن کو میں بے لاگ طریقے پر بیان کرنا چاہتا تھا۔ یہ شخصی عنصر میری خواہش کے خلاف پیدا ہوا ہے۔ اکثر میں نے اس کی کوشش کی ہے کہ اسے قابو میں رکھوں۔ لیکن کہیں کہیں میں نے قلم کی باگ اس خیال سے چھوڑ دی ہے کہ وہ میرے دماغ کی آئینہ داری کرے۔

ماضی کا ذکر کر کے میں نے ماضی کے بوجھ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حال اپنی تمام پیچیدگیوں اور خلاف عقل باتوں کے ساتھ اور مستقبل تاریکی میں پوشیدہ ہمیشہ موجود رہتا ہے اور ان کا بوجھ ماضی کے بوجھ سے کچھ کم نہیں انسان کے آوارہ ذہن کو کوئی جائے پناہ نہیں ملتی اور وہ ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے جس سے خود اسے کوفت ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی۔ اسے ان مسعود

دماغوں پر کچھ رشک بھی آتا ہے جن پر فکر نے کبھی یورش نہیں کی، جن پر نہ کبھی شک کا سایہ پڑا ہے، نہ اس کی کوئی تحریر ثبت ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے زندگی کتنی سہل اور آسان ہے باوجود اپنے مصائب اور پریشانیوں کے۔

زندگی میں ہر روز نت نئے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی لامتناہی طور پر چلتا رہتا ہے جب ہم کسی ایک مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے اور واقعات سے الگ کر کے اس پر غور کرتے ہیں۔ گویا یہی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی اور اس کا سبب اس سے ذرا پہلے واقع ہونے والی بات ہے۔ حالانکہ اس کی ابتدا کا پتہ لگ نہیں سکتا کیونکہ ہر واقعہ ایک طویل سلسلے کی ایک کڑی ہوتا ہے جس سے قبل ہونے والی سبھی باتیں اس کا سبب ہوتی ہیں۔ ہر تاریخی واقعہ بے شمار انسانوں کی تمناؤں خواہشوں اور ارادوں کے آپس میں ملنے اور ٹکرانے کا نتیجہ ہوتا ہے یہ تمنائیں اور آرزوئیں خود ماضی کے تجربات اور حالات کی آئینہ دار ہوتی ہیں، اور پھر ان کے پیدا کئے ہوئے حالات مستقبل میں نئے مسائل کی تخلیق کا موجب بن جاتے ہیں۔ قوموں کے رہنما بلا شبہ ان حالات پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں لیکن وہ خود اس ماحول کی پیداوار ہیں جو ماضی کے حالات و واقعات کا نتیجہ ہے۔ یہی ماحول ان کی تشکیل کرتا ہے۔

۲- دوسپں منظر

برطانوی اور ہندی

ہندوستان میں اگست ۱۹۴۲ء میں جو کچھ ہوا وہ کوئی ناگہانی بات نہ تھی ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ ان واقعات کے متعلق سبھی طرح کی باتیں کی گئی ہیں۔ ان پر سخت

اعتراض کئے گئے ہیں ان میں حصہ لینے والوں کو برا بھلا کہا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی حمایت کی ہے۔ لیکن اس طرح کی تحریروں میں بالعموم اصل حقیقت نظرانداز کردی گئی ہے۔ یہ محض سیاسی واقعات نہ تھے اور اس لئے ان کی خالص سیاسی توضیحین قدرتاً ناکافی اور غیر تسلی بخش ہیں۔ اگست کے سیاسی ہنگاموں کا پس منظر یہ تھا کہ ہندوستان بیرونی غلامی سے بیزار ہوچکا تھا۔ عوام کے دل میں بس ایک ارادہ تھا، غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کا، ان کے دل میں صرف ایک لگن تھی کہ یہ بندھن کسی طرح ٹوٹ جائیں چاہے اس کے لئے جان اور مال کی بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے۔ انجام کے متعلق سوچنے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔ بس ایک بے پناہ جذبہ تھا یعنی کچھ بھی ہو، ہندوستان کو برطانوی اقتدار سے نجات مل جائے۔

غیر ملکی حکومت کے خلاف بے زاری کا یہ جذبہ کوئی نیا جذبہ نہ تھا، سالہا سال سے یہ نفرت دلوں میں پرورش پا رہی تھی۔ لیکن اب سے پہلے یہ آگ چپکے چپکے دلوں میں سلگتی رہی تھی۔ جنگ نے جہاں اس جذبے کو ہوا دی وہاں ساتھ ہی اس کو دبائے رکھنے کا انتظام کردیا۔ محوری طاقتوں کو ہم کسی طرح کی مدد دینا نہ چاہتے تھے اور نہ ان کی مخالفت کرنے والی طاقتوں کی راہ میں کوئی دقتیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس خواہش نے ہماری آزادیٔ عمل بڑی حد تک سلب کرلی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو نہ جانے ہم کیا کچھ کر گزرتے۔

لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا یہ بات واضح ہوتی گئی کہ مغربی جمہوریتیں پرانے نظام کو مٹانے کے لئے نہیں بلکہ اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے لڑ رہی تھیں۔ جنگ سے پہلے انھوں نے فسطائیت کی بھوک مٹانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا سبب محض یہی نہ تھا کہ وہ نتائج سے ڈرتی تھیں۔ بلکہ مغربی جمہوریتوں کو فسطائیت

کے تصور سے بھی یک گونہ ہمدردی تھی یا کم از کم فسطائیت کی تباہی پر جس طرح کے نظام کے قائم ہو جانے کا امکان تھا اس سے انھیں شدید نفرت تھی۔ نازیت اور فسطائیت کا عروج کوئی اچانک تاریخی حادثہ نہ تھا۔ شہنشاہیت، نسلی امتیازات قوموں کی جدوجہد تمام معاشی اقتدار کا سمٹ کر سماج کے ایک طبقہ کے ہاتھوں میں آجانا اور فنی ترقیاں جن سے پورا فائدہ اٹھانا سوسائٹی کے مروجہ معاشی نظام کے اندر ممکن نہ تھا، ان سب اسباب نے ان نئے تصورات کی تخلیق اور کامیابی میں مدد دی۔ لیکن ان سب سے زیادہ اہم جمہور کی آرزوؤں اور سماجی نظام کا باہم تصادم تھا۔ یورپ اور امریکہ میں سیاسی جمہوریت کے قیام نے جہاں قومی اور انفرادی ترقی کے امکانات پیدا کئے تھے وہاں اس کی آغوش میں ایسی طاقتوں اور ایسے تصورات نے بھی جنم لیا تھا جو معاشی مساوات کو اپنا مطمح نظر سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں تصادم ناگزیر تھا۔ یا تو سیاسی جمہوریت کے تصور کو وسعت دی جاتی یا پھر اسی وسعت کی خواہش کو دبانے اور مٹانے کی کوششیں ہوتیں۔ لیکن مسلسل مخالفتوں کے باوجود جمہوریت کا تصور وسیع ہوتا گیا اور اس کے اقتدار کا دائرہ جغرافیائی حیثیت سے بھی پھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ جمہوریت سیاسی تنظیم کا مقصد اعلیٰ قرار پا گئی۔ ایک وقت ایسا آیا جب مزید وسعت کی خواہش نے سماجی نظام کی بنیادوں کو خطرے میں ڈال دیا، تب اس نظام کے حامیوں نے تبدیلی کی مخالفت کرنے کے لئے اپنی جارحانہ تنظیم شروع کر دی۔ بعض ملکوں میں اندرونی حالات ایسے تھے کہ یہ کشمکش جلد پیدا ہو گئی اور ان ملکوں میں جمہوریت فنا کے گھاٹ اتار دی گئی، اور فسطائیت اور نازیت کا تسلط قائم ہو گیا امریکہ اور مغربی یورپ کی جمہوریتوں میں بھی یہ کشمکش موجود تھی لیکن بہت سے اور اسباب ایسے تھے جنھوں نے ان کو اس تصادم سے بچا لیا، غالباً انھیں اس ضمن میں اس بات

سے بھی مدد ملی کہ ان ملکوں میں مدتوں سے لوگ جمہوری طرزِ حکومت کے عادی ہو گئے تھے۔ ان جمہوریتوں میں سے بعض کے زیرِ اقتدار وسیع شہنشاہتیں تھیں جہاں جمہوریت کا نام بھی نہ تھا اور حکومت میں استبداد کی وہی شان نمایاں تھی جو فسطائیت کی امتیازی صفت ہے۔ فسطائیت کے زیرِ نگیں آجانے والے ملکوں کی طرح ان شہنشاہیتوں میں بھی حاکم طبقے نے رجعت پسند، ابن الوقت اور جاگیری نظام کے پس ماندہ نمائندوں سے تعاون کر لیا تاکہ آزادی کے مطالبے کو دبا دے۔ حکمران طبقے کی منطق بھی حکمرانی کی ضرورتوں کا ساتھ دیتی ہے۔ ان سامراجی طاقتوں کے نزدیک جمہوریت خود ان کے لئے تو بلاشبہ سیاسی تنظیم کا سب سے اچھا اصول تھی لیکن نوآبادیات اور محکوم ممالک کے مخصوص حالات میں اس کا نفاذ مناسب نہیں۔ ان حالات میں مغربی جمہوریتوں کے لئے یہ قدرتی بات تھی کہ وہ فسطائیت کے تصور سے ایک حد تک ہمدردی رکھیں گو یہ ممکن ہے کہ اس کے بعض وحشیانہ پہلوؤں سے انھیں نفرت رہی ہو۔

اور جب ان جمہوریتوں کو اپنی حفاظت کے لئے لڑنا پڑا ان کا مقصد اسی پرانے نظام کا احیا قرار پایا جو اس بری طرح ناکام ہو چکا تھا اور اس جنگ کو انھوں نے ایک دفاعی جنگ کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ بات ایک حد تک صحیح بھی تھی۔ لیکن اس جنگ کا ایک اخلاقی پہلو بھی تھا۔ یہ لڑائی محض جنگی فتوحات حاصل کرنے کے لئے نہ تھی بلکہ اس لئے لڑی جا رہی تھی کہ فسطائیت کا فلسفہ اور اس کا نظامِ حیات ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا جائے۔ یہ جنگ جیسا کہ کسی نے کہا ہے اس لئے لڑی جا رہی تھی کہ قوموں کی روحانیت کی حفاظت کی جائے۔ اس کا مقصد محض فسطائی ملکوں میں انقلاب پیدا کرنا نہ تھا بلکہ خود متحارب قوموں کو بھی ان کی آلودگیوں سے نجات دلانا تھا لیکن نام نہاد مغربی جمہوریتوں نے اس اخلاقی پہلو

کو پروپاگنڈے کے ذریعے بالکل پس پشت ڈال دیا اور ساری توجہ اور سارا زور اس کوشش میں صرف کر دیا کہ اپنے پرانے نظام کی حفاظت کریں اور اس کو قائم رکھنے کی تجویزیں سوچیں۔ کسی نئے مستقبل کی تشکیل متحدہ قوموں کا مطمح نظر نہ تھا۔ بلاشبہ مغرب میں بہت سے لوگ ایسے تھے جن کے نزدیک جنگ کا اہم ترین پہلو ایک نئے مستقبل کے تعمیر کی کوشش تھا۔ ان کی تمنا تھی کہ ایک ایسا نظام وجود میں آ جائے جو دنیا کو ان غلطیوں سے بچا سکے جنھوں نے اسے دوسری جنگ عظیم کی جہنم میں جھونک دیا تھا۔ ہر ملک میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد خصوصاً جنگ کے میدان میں جان دینے والوں کی ایک بھاری تعداد اس قسم کے انقلاب پر ایمان رکھتی تھی۔ اسی امید پر انھوں نے جنگ کے دیوتا کو اپنی زندگی کی بھینٹ پیش کی تھی۔ یورپ اور امریکہ اور خصوصاً ایشیا میں بسنے والے کروڑوں آدمی جن سے ان کے سارے حقوق چھین لئے گئے تھے اور جو مستقل طور پر استحصال اور نسلی امتیازات کا شکار تھے جنگ کو اپنی ماضی کی مصیبتوں اور حال کے دکھوں سے الگ کر کے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ توقع رکھتے تھے کہ جنگ ان کے غم کے اس بوجھ کو جو انھیں پیچھے ڈال رہا ہے کم کرنے کی کسی طرح ضرور ان کے سینے پر سے اٹھا لے گی۔

لیکن بدقسمتی سے متحدہ قوموں کے لیڈروں کی آنکھیں کسی اور طرف تھیں۔ ان کے سامنے جو ماضی کی تصویر تھی وہی ان کے مستقبل کا نقشہ تھا۔ کبھی کبھی وہ مستقبل کے بہت ہی دل خوش کن نقشے پیش کرتے تھے۔ لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عوام کی اس ذہنی بھوک کو تھوڑا سا کم کر دیا جائے ورنہ ان کے عمل کو ان عمدہ اصولوں سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ چرچل کے نزدیک یہ جنگ محض اس لئے لڑی جا رہی تھی تاکہ جس کے پاس جو کچھ تھا اسے واپس مل جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ انگلستان کا مروجہ سماجی نظام اور اس کی شہنشاہیت دونوں بہت معمولی سی تبدیلی کے ساتھ باقی رہیں۔ پریسیڈنٹ

روزویلٹ کی تقریریں زیادہ امید افزا ہوتی تھیں لیکن ان کی عملی پالیسی چرچل سے کچھ بہت مختلف نہ تھی، پھر بھی بہت سے لوگوں کی آنکھیں ان کی طرف تھیں اور ان کے تدبر اور بصیرت سے لوگوں کو بہت سی توقعات تھیں۔

لیکن ان حالات میں یہ اندیشہ بالکل جائز تھا کہ اگر برطانوی حاکموں کا بس چلا تو ہندوستان کا اور باقی دنیا کا مستقبل ان کے ماضی سے مختلف نہ ہوگا اور ظاہر ہے حال کی حکمت عملی پھر اسی ڈھرے پر چلتا تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مستقبل کی بنیادیں ابھی سے رکھی جا رہی تھیں۔ کرپس کی لائی ہوئی تجویزوں میں بظاہر کافی مراعات دی گئی تھیں لیکن ان کی وجہ سے بعض نئے اور انتہائی خطرناک مسائل بھی پیدا ہوتے تھے جن کی وجہ سے آگے چل کر آزادی کی راہ میں ناقابل حل دقتیں پیش آتیں۔ کسی حد تک تو یہ نتائج ہمارے سامنے آ بھی چکے ہیں۔ جنگ کے بہانے معمولی شہری حقوق اس طرح کچل دئے گئے تھے جس کی دوسری مثال ہمارے سامنے نہ تھی۔ یہ سب باتیں ہمیں ہماری غلامی اور ذلت کی بار بار یاد دلاتی تھیں۔ اور ان سے مستقبل میں ہونے والی باتوں کا بھی پتہ چلتا تھا کیونکہ آخر مستقبل اسی حال ہی کا تو نتیجہ ہوتا۔ اس ذلت کے سامنے دوسری تمام مصیبتیں ہیچ تھیں۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ ہندوستان سے باہر کتنے لوگ اس طرح سوچتے تھے خود ہندوستان میں غربت اور افلاس کی دردناک مصیبتوں نے عوام سے سوچنے کی صلاحیت چھین لی ہے، پھر عہدوں کی خواہش یا خاص حقوق کے لالچ نے بہتوں کی زبان بند کر دی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خاص حقوق کے طلبگار تھے لیکن اس کے باوجود یہ جذبہ بہت عام تھا، گو مختلف لوگوں میں اس کی شدت مختلف تھی اور کہیں کہیں اس میں دوسرے جذبات بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس حساس کے بہت سے مدارج تھے۔ کچھ لوگ ان حالات سے نجات حاصل کرنے کو اپنا ایمان

سمجھتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سبھی طرح کی قربانیاں دینے کو تیار تھے اور پھر لازماً عمل کرنے کے لئے بھی تیار تھے کچھ لوگ اس مقصد سے تو ہمدردی رکھتے تھے لیکن سلامتی کی خاطر کنارے پر ہی رہنا چاہتے تھے. مایوس طبیعت والے ان افسوسناک حالات میں محض دل ہی دل میں گھٹتے رہتے تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی زندگی محض دال روٹی میں ہے. اور جنھوں نے ان ناپسندیدہ حالات کے ساتھ نباہنے کی صلاحیت پیدا کرلی تھی۔

لیکن ہندوستان میں برطانوی حاکموں کا ذہنی ماحول اس سے بالکل مختلف تھا۔ برطانوی اور ہندوستانی نقطہائے نظر میں بڑا غیر معمولی فرق ہے اور خواہ ان میں سے کوئی حق بجانب ہو محض یہ تضاد اور اختلاف اس بات کا کامل ثبوت ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں حکمرانی کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی. کیونکہ ترقی کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حاکم و محکوم میں کم سے کم تھوڑی سی ہم آہنگی اور نقطۂ نظر میں تھوڑا سا اتفاق ہو. کیونکہ اس کے بغیر تصادم ناگزیر ہوجاتا ہے خواہ وہ آج ہو یا کل۔ ہندوستان میں آنے والے انگریز عموماً برطانیہ کے انتہائی قدامت پرست طبقے کے نمائندے ہوتے ہیں. ان کے خیالات خود انگلستان کی ترقی پسند روایتوں سے بھی بے تعلق ہوتے ہیں۔ اور ہندوستان میں ان کا قیام جتنا طویل ہوتا ہے اتنا ہی ان کا نقطۂ نظر تنگ ہوتا جاتا ہے اور جب یہ پنشنیں لے کر انگلستان واپس جاتے ہیں تو وہاں انھیں کو ماہرین کا منصب ملتا ہے جو ہندوستان کے مسائل پر صلاح و مشورے کے لئے یاد کئے جاتے ہیں. ستم یہ ہے کہ انھیں خود اپنی دیانت داری پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ضرورت اور اس کی دی ہوئی

برکتوں پر ایمان۔ اور یہ احساس کہ وہ ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کے اعلیٰ مقاصد کے نمائندے ہیں۔ اور چونکہ کانگریس نے جو قوم کی نمائندہ جماعت ہے اس سلطنت کی بنیاد ڈھا دینے کا عزم کر لیا ہے، اس لئے وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔ سر ریجنلڈ میکسویل سابق ہوم ممبر نے ۱۹۴۱ء میں ایک تقریر کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال کی بڑی اچھی نمائندگی کی تھی۔ حکومت پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ کانگریس کے ماننے والوں، اشتراکی اور اشتمالی جماعت کے پیروؤں کے ساتھ جن کو حکومت نے بغیر مقدمہ چلائے ہوئے جیلوں میں بند کر رکھا ہے اس کا برتاؤ انتہائی بے رحمانہ ہے۔ حکومت جرمن اور اطالوی جنگی قیدیوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک روا نہیں رکھتی۔ اس الزام کا جواب دیتے ہوئے ہوم ممبر نے فرمایا تھا کہ جرمن اور اطالوی سپاہی اپنے ملک کی خاطر جنگ کر رہے ہیں اور کم سے کم اس لئے وہ عزت کے لائق ہیں لیکن کانگریس کے پیرو تو سماج کے دشمن ہیں جو موجودہ نظام کا تختہ الٹ دینا چاہتے ہیں۔ سر ریجنلڈ کے نزدیک کسی ہندوستانی کا آزادی کی خواہش یا ملک کے معاشی نظام میں تبدیلی کی تمنا، دونوں گناہ کبیرہ تھے۔ ایسے ہندوستانیوں کے مقابلے میں ان کی ہمدردی تمام تر جرمن اور اطالوی دشمنوں کے ساتھ تھی اگرچہ اس وقت انگلستان ان کے ساتھ ایک خطرناک جنگ میں گرفتار تھا۔ یہ روس پر جرمن حملے سے پہلے کی باتیں ہیں جب سماجی نظام کی تبدیلی کی خواہش کو اس طرح آسانی سے کھلم کھلا برا بھلا کہا جا سکتا تھا۔ یہ جنگ سے پہلے تو فسطائیت کے گن اکثر گائے جاتے تھے۔ کیونکہ ہٹلر نے خود بھی "میری جدوجہد" میں اور اس کے بعد برطانوی شہنشاہیت کے دوام کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

بلاشبہ حکومت ہند محوری طاقتوں کے خلاف جنگ میں مدد دینے کے لئے

پوری طرح تیار تھی لیکن اس کے نزدیک ان ممالک پر فتح اس وقت تک نامکمل رہتی جب تک اسے ایک اور دشمن کے خلاف بھی پوری کامیابی نہ ہوجاتی۔ اور یہ دشمن ہندوستان کی قومی تحریک تھی جس کی روح رواں کانگریس تھی۔ کرپس کی گفت و شنید نے اسے پریشان اور مضطرب کر دیا تھا اور اس کی ناکامیابی سے اسے بے اندازہ مسرت ہوئی تھی۔ اور اب کانگریس اور اس کے حامیوں پر آخری حملہ کرنے کے لئے راستہ صاف تھا۔ موقع بھی بہت اچھا تھا کیونکہ اس سے پہلے کبھی صوبوں اور مرکزی حکومت، وائسرائے اور گورنروں کے ہاتھ میں اتنے غیر محدود اختیارات نہیں آئے تھے۔ جنگی صورت حالات نازک تھی اور یہ دلیل بہت وزنی تھی کہ ایسے حالات میں کسی قسم کی مخالفت کو برداشت کرنا ممکن نہیں۔ امریکہ اور انگلستان کے ترقی پسند حلقوں کو ہندوستان سے جو دلچسپی تھی، کرپس کی تجویزوں اور اس کے بعد کے پروپاگنڈے کی وجہ سے ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ انگریز تو اپنے کو ہندوستان کے مقابلے میں یونہی ہمیشہ حق پر سمجھتا ہے، مگر جنگ نے اس جذبے کو اور بھی فروغ دے دیا تھا۔ اور وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ ہندوستانی، یا کم سے کم ان کی اکثریت، کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہیں، وہ فساد پسند اور تنگ نظر ہیں۔ انھیں موقعے کی نزاکت کا احساس نہیں۔ اور غالباً انھیں جاپانیوں سے ہمدردی بھی ہے۔ چنانچہ یہ بھی کہا گیا کہ گاندھی جی کے مضامین اور بیانات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان سے سمجھوتا کرنا ناممکن ہے اس لئے اس تمام قضیے کو ختم کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ گاندھی اور کانگریس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

۹ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو ہندوستان کے طول و عرض میں لاتعداد گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ کئی ہفتوں کے بعد ہمیں ان کی تھوڑی تھوڑی بھنک ملی اور اب بھی ہمارے سامنے ان کی محض ایک دھندلی سی تصویر ہے۔

سارے سربرآوردہ لیڈر اچانک گرفتار کرلئے گئے تھے اور کسی کو اندازہ نہ تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ ہاں اتنا سب سمجھتے تھے کہ حکومت کی اس پالیسی کے خلاف احتجاج کرنا ضروری ہے اور چنانچہ خود بخود ایسے بہت سے مظاہرے ہوئے۔ ان جلوسوں کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے گولیاں چلائیں اور اشک آور گیس استعمال کی اور حکومت نے رائے عامہ کے اظہار کے معمولی ذرائع بند کردئے۔ تب جذبات کا سیلاب امنڈ آیا۔ شہروں اور دیہاتوں میں لوگ بہت بڑی تعداد میں اکٹھے ہوتے اور پھر پولیس اور فوج سے ان کا تصادم ہوتا۔ انھوں نے خاص طور پر تھانے، ڈاکخانے اور ریلوے اسٹیشن پر حملہ کیا کیونکہ ان کو یہی برطانوی اقتدار کی خاص نشانیاں معلوم ہوتی تھیں۔ تار اور ٹیلیفون کے تار بھی کاٹے گئے۔ ان نہتے اور بے سرے مجمعوں پر سرکاری بیانات کے مطابق ۵۳۸ مواقع پر پولیس اور فوج کی گولیوں کی بارش کی گئی۔ اور نیچے نیچے اڑتے ہوئے ہوائی جہازوں سے ان پر مشین گنیں بھی چلائی گئیں۔ دو تین مہینے تک یہ ہنگامے ملک کے مختلف حصوں میں ہوتے رہے اور پھر ان کا زور کم ہوگیا۔ اور ان کے بجائے کہیں کہیں غیر منظم طور پر ہنگامہ ہوجاتا تھا۔ مسٹر چرچل نے دارالعوام میں ایک تقریر میں کہا "حکومت کی پوری طاقت سے ان ہنگاموں کو دبا دیا گیا ہے" اور پھر انھوں نے "بہادر ہندوستانی پولیس کی وفاداری اور استقلال اور عام سرکاری عہدہ داروں کے طرز عمل کو سراہا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دارالعوام کو یہ اطلاع بھی دی "مزید امدادی فوجیں ہندوستان پہنچ گئی ہیں اور آج ہندوستان میں انگریزی فوجوں کی تعداد اتنی ہے جس قدر اس سے پہلے کبھی نہیں تھی" ان غیر ملکی فوجوں اور ہندوستانی پولیس نے اس سے پہلے بھی بارہا ہندوستان کے نہتے کسانوں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی تھی اور ان کی بغاوت کو کچلا تھا اور

برطانوی حکومت کے دوسرے ستون، یعنی حکومت ہند کی نوکر شاہی، نے بھی اس کام میں ہمیشہ کھلے بندوں یا چوری چھپے ان کی اعانت کی تھی۔

اس کا ردعمل ملک کے طول و عرض میں ہوا، اور اس میں شہر یا دیہات کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ حکومت کی امتناعی پابندیوں کے باوجود تقریباً ہر صوبہ اور بہت سی ہندوستانی ریاستوں میں مظاہرے ہوئے۔ ہڑتالیں ہوئیں، دوکانیں بند رہیں، عام کاروبار رک گیا، کہیں چند دنوں تک اور کہیں چند ہفتوں تک اور بعض جگہ ایک ماہ سے بھی زیادہ مزدوروں کی ہڑتالیں بھی ہوئیں چونکہ کارخانوں کے مزدور نسبتاً زیادہ منظم اور اس طرح کے اجتماعی مظاہروں کے عادی ہوتے ہیں اس لئے انھوں نے بھی بہت سے اہم صنعتی مرکزوں میں قومی لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے ہڑتالیں کیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال جمشید پور کے لوہے کے کارخانے کے مزدوروں کی ہڑتال تھی جہاں ہزاروں کام سیکھے مزدوروں نے جو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ ۱۵ دن کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے جب تک کارخانے کے منتظمین نے وعدہ نہیں کیا کہ وہ کانگریسی لیڈروں کی رہائی اور ایک قومی حکومت کے قیام کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ احمد آباد کے کپڑے کے تمام کارخانوں میں بھی اسی طرح بغیر ٹریڈ یونین کی کسی کوشش کے ہڑتالیں ہوئیں[1]

---

[1] حکومت کے بعض اونچے عہدہ داروں نے اس سلسلے میں ایک بات یہ کہی ہے کہ یہ اسٹرائکیں خصوصاً احمد آباد اور جمشید پور کی ہڑتال خود مل مالکوں کی ہمت افزائی کا نتیجہ تھی۔ دوسروں نے بھی یہ بات اکثر دہرائی ہے۔ مگر یہ قابل یقین نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ان اسٹرائکوں کی وجہ سے مل کے مالکوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ اور کم سے کم مجھے تو اب تک کوئی ایسا (اگلے صفحہ پر)

احمد آباد کی یہ عام اسٹرائک کوششوں کے باوجود تین مہینے تک پر امن طریقے پر جاری رہی۔

مزدوروں کی یہ اسٹرائک تمام تر سیاسی تھی جو انھوں نے بغیر کسی بیرونی ترغیب کے کی۔ اور اس میں انھیں بہت کافی نقصان پہنچا۔ کیونکہ اس وقت انھیں مقابلتاً زیادہ مزدوریاں مل رہی تھیں۔ اس طویل عرصے میں باہر سے انھیں کسی قسم کی مالی مدد نہ ملی۔ دوسری جگھوں پر اس طرح کی ہڑتالوں کی مدت بہت کم تھی۔ کہیں کہیں تو یہ ہڑتالیں چند دنوں ہی میں ختم ہوگئیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کانپور میں کوئی بڑی اسٹرائک نہیں ہوئی اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ یہاں کمیونسٹ لیڈروں نے اپنے اثرات سے کام لے کر اسٹرائک ہونے نہ دی۔ ریلوں میں بھی جو حکومت کی ملکیت ہیں کوئی عام یا بڑی ہڑتال نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ ملک میں

مل مالک نہیں ملا ہے جو اپنے نقصان کے لئے خود اس طرح کوشش کرے۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے سرمایہ دار ہندوستان کی جنگ آزادی سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ہندوستان کی آزادی کے خواہاں ہیں۔ لیکن قدرتاً ان کا ہندوستان کی آزادی کے متعلق جو تصور ہے وہ ایسا ہے جس میں خود ان کی حیثیت بالکل محفوظ ہو۔ انھیں انقلابی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ سماجی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلیاں نہیں چاہتے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ۱۹۴۲ء کے اگست اور ستمبر میں عوام کے جذبے کی شدت سے متاثر ہو کر انھوں نے پولیس کے ساتھ مل جل کر وہ جارحانہ اور انتقامی طریقے نہ اختیار کئے ہوں جو عام حالات میں استعمال ہوتے ہیں۔

ایک اور الزام جو برطانوی اخبارات بالکل صحیح سمجھتے رہے ہیں یہ ہے کہ کانگریس کو بڑے بڑے سرمایہ داروں سے بے شمار مالی مدد ملتی ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ میں کئی سال تک کانگریس کا جنرل سکرٹری اور صدر رہا ہوں اور میرا خیال ہے اس سلسلے میں مجھے کافی معلومات ہیں۔ (مسلسل)

عام ہنگاموں کی وجہ سے ریلوے کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔

صوبوں میں پنجاب نسبتاً سب سے کم متاثر ہوا۔ اگرچہ وہاں بھی اسٹرائک اور ہڑتالیں ہوئیں۔ صوبہ سرحد کی حیثیت جہاں کی آبادی تقریباً تمام مسلم ہے، سب سے جداگانہ تھی۔ شروع میں وہاں نہ تو عام گرفتاریاں ہوئیں اور نہ حکومت نے عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے وہ دوسری حرکتیں کیں جو اور صوبوں میں ہوئیں۔ اس کا ایک سبب تو غالباً یہ تھا کہ سرحدی پٹھان بہت جلد مشتعل ہونے والے سمجھے جاتے ہیں لیکن ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت یہ جتانا چاہتی تھی کہ مسلمان اس قومی تحریک سے الگ ہیں۔ لیکن جب دوسرے صوبوں کی خبریں سرحد پہنچیں تو وہاں بھی لاتعداد مظاہرے ہوئے اور کہیں کہیں برطانوی اقتدار کو کھلم کھلا چیلنج دیا گیا۔ ان مظاہرہ کرنے والوں پر گولیاں چلائی گئیں اور عوام

چند مل مالکوں نے وقتاً فوقتاً گاندھی جی اور کانگریس کی سماج سدھار تحریکوں مثلاً دیہی صنعتوں کی ترقی، چھوت چھات اور پست اقوام کی اصلاح اور بنیادی تعلیم وغیرہ کے لئے مدد دی ہے لیکن کانگریس کی سیاسی تحریکوں سے تو انھوں نے عام حالات میں بھی خود کو الگ رکھا ہے۔ اور حکومت سے تصادم کی صورت میں تو انھوں نے اور بھی زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ گا ہے گا ہے ان کی ہمدردی خواہ کسی کے بھی ساتھ رہی ہو لیکن بیشتر محتاط اور صاحب حیثیت افراد کی طرح ان کا تو سب سے پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام خطروں سے بچے رہیں۔ کانگریس کا کل کام اس کے بے شمار ممبروں کے چھوٹے چھوٹے چندوں اور عطیوں سے چلتا رہا ہے اس میں بہت سا کام لوگوں نے اپنی مرضی سے امداد مفت کیا ہے۔ کبھی کبھار شہروں میں تاجروں نے بھی کچھ مدد دی ہے۔ اس سلسلے میں ایک ہی موقع اس سے مستثنیٰ ہے جب ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں بعض مل مالکوں نے کانگریس کے مرکزی انتخابی فنڈ میں چندے دیئے تھے لیکن یہ چندے (مسلسل م

کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے حسب معمول پابندیاں لگائی گئیں ہزاروں آدمی گرفتار کئے گئے اور پٹھانوں کے مقتدر لیڈر بادشاہ خان کو (یہ خان عبد الغفار خاں کا مقبول عام نام ہے) پولیس کی ضربوں سے کافی چوٹیں آئیں یہ بہت ہی اشتعال دلانے والی حرکت تھی۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوجود وہ ڈسپلن قائم رہا جو خان عبد الغفار خاں نے اپنی قوم میں قائم کر دیا ہے اور وہاں ملک کے دوسرے حصوں کی طرح کا کوئی تشدد عوام کی طرف سے عمل میں نہیں آیا۔

عوام کے یہ مظاہرے جو اچانک اور خود بخود بغیر کسی تنظیم کے ہوتے تھے اور جن کا نتیجہ حکومت سے سخت تصادم اور تباہی ہوتا تھا۔ اور جو باوجود پولیس اور مسلح فوج کی زبردست طاقت کے بہت عرصے تک جاری رہتے تھے۔ عوام کے جذبات کی شدت کا پتہ دیتے ہیں۔ لیڈروں کی گرفتاری سے پہلے بھی یہ جذبات موجود تھے لیکن ان کی گرفتاریوں اور اس کے بعد کی متواتر گولی چلانے کی وجہ سے عوام کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی اور پھر انھوں نے وہی راستہ

بھی ہماری سرگرمیوں کی وسعت کے لحاظ سے بالکل ناقابل لحاظ تھا۔ یہ واقعی بڑی حیرت کی بات ہے اور شاید مغربی لوگوں کے لئے بالکل ناقابل یقین کہ ہم نے کتنی مختصر سی رقم سے ان ۲۵ سالوں میں اپنا کام چلایا ہے حالانکہ اس عرصے میں بار بار ہندوستان میں سیاسی ہنگامے اور ستیا گرہ کی تحریکیں چلتی رہیں۔ صوبہ متحدہ میں جو کانگریس کے بہت سرگرم اور منظم صوبوں میں سے ہے۔ اور جس کے متعلق مجھے واقفیت بھی اور جگہوں کی نسبت زیادہ ہے۔ ہم نے اپنا تقریباً کل کام اپنے ممبروں کے چار چار آنے کے چندے سے چلایا ہے۔

اختیار کیا جو ایک برانگیختہ مجمع اختیار کرتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو ایک طرح کا پس وپیش کا سا عالم رہا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ عوام کو کوئی ہدایتیں نہیں ملی تھیں اور نہ ان کے پاس کوئی پروگرام تھا۔ ان کی رہنمائی کرنے کو کوئی قابل ذکر لیڈر باقی نہیں رہ گیا تھا جو انھیں بتاتا کہ کیا کرنا چاہیئے لیکن ہیجان اور غصے کی وجہ سے عوام کا چپ ہوکر بیٹھ رہنا بھی ممکن نہ تھا۔ جیسا کہ ایسے حالات میں اکثر ہوتا ہے نئے مقامی لیڈر سامنے آئے اور عوام نے کچھ عرصے تک ان کی پیروی کی۔ لیکن ان سے جو ہدایتیں ملیں وہ بہت ناکافی تھیں۔ دراصل اگست کی یہ تحریک عوام کے اپنے ہی ہیجان کا نتیجہ تھی۔ سارے ہندوستان میں نوجوانوں خصوصاً یونیورسٹی کے طلبا نے ۱۹۴۲ء کی تشدد انگیز اور پر امن سرگرمیوں میں اہم حصہ لیا اور بعض یونیورسٹیوں کو بند کرنا پڑا۔ ان حالات میں بھی بعض مقامی لیڈروں نے احتجاج کے پر امن طریقوں پر عمل کرنے اور ستیا گرہ کی تحریک چلانے کی کوشش کی لیکن اس فضا میں جو حکومت کی جبری پالیسی کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی یہ کام بہت مشکل ہوگیا تھا۔ لوگ عدم تشدد کا سبق جو انھیں بیس سال سے دیا جا رہا تھا بھلا بیٹھے تھے۔ لیکن وہ موثر طور پر تشدد کرنے کے لئے ذہنی یا عملی حیثیت سے تیار نہ تھے۔ عدم تشدد کے طریقوں پر چلنے کی جو تلقین انھیں کی گئی تھی وہ خود ان کے دماغوں میں تامل اور پس وپیش کا باعث بن گئی اور اس طرح تشدد کرنے میں حارج ہوئی، اگر کانگریس نے کہیں اپنے اصولوں کو بھلا کر تشدد کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہوتا تو اس میں شبہ نہیں کہ جس قدر تشدد سے کام لیا گیا اس سے سو گنا زیادہ تشدد کیا جاتا۔

لیکن کانگریس نے اس طرح کا کوئی اشارہ بھی نہیں کیا۔ بلکہ کانگریس کے آخری پیام میں ایک بار پھر عدم تشدد کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ لیکن ایک بات

کا غالباً عوام کے دماغ پر خاصا اثر پڑا۔ اگر جیسا کہ ہم ان سے کہتے آئے تھے حملہ آور دشمن کے مقابلے میں مسلح ہو کر اپنے بچاؤ کی کوشش کرنا جائز اور مناسب ہے تو ان دشمنوں کے خلاف جنھوں نے ہماری آزادی ہم سے چھین لی تھی تشدد بری بات کیونکر ہو گئی؟ جب حملہ یا دفاع کے لئے تشدد سے کام لینے کی ممانعت ایک دفعہ دور ہو گئی تو اس سے خلاف توقع نتائج کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ بیشتر لوگ اس بارے میں باریک امتیازات نہ سمجھ سکتے تھے۔ پھر اس وقت ساری دنیا میں انتہائی تشدد کا دور دورہ تھا اور ان کی موافقت میں لگاتار پروپگنڈا کیا جا رہا تھا۔ لہذا ان حالات میں لوگوں کے لئے سوال محض مصلحت اور شدت جذبات کا رہ گیا تھا۔ علاوہ بریں کانگریس کے اندر اور باہر ایسے لوگ بھی تھے جو عدم تشدد کے قائل نہ تھے اور انھیں تشدد پر عمل کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں تھا۔

اشتعال کی حالت میں کم لوگ سوچنے کی اہلیت رکھتے ہیں اس وقت تو مدت کی دبی ہوئی خواہشیں عمل کی محرک بن جاتی ہیں اور انسان ان کی بتائی ہوئی راہ پر چل نکلتا ہے۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی عظیم الشان بغاوت کے بعد پہلی مرتبہ لاتعداد لوگ ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے کہ تشدد کے ذریعے (لیکن یہ تشدد بھی ہتھیاروں سے مسلح نہ تھا) ہندوستان سے برطانوی اقتدار کو مٹا دیں۔ یہ چیلنج غلط اور ناوقت تھا کیونکہ اس وقت منظم اور مسلح طاقت تمام تر دوسری طرف اور اتنی زیادہ تھی کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اور کسی مجمع کی تعداد خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اسے مسلح فوجوں کے مقابلے میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس کا ناکامیاب ہونا ناگزیر تھا سوائے اس کے کہ خود مسلح فوجیں اس کے ساتھ مل جاتیں۔ لیکن عوام نے نہ تو مقابلے کی تیاری کی تھی اور نہ اس کے لئے کوئی مناسب وقت ڈھونڈا تھا اس صورت حال نے انھیں ایک دم آلیا اور ان کا فوری ردعمل خواہ کتنا ہی غلط اور

بے راہ کیوں نہ ہو اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ انھیں اپنے ملک کی آزادی کس قدر عزیز اور بیرونی حکومت سے کس قدر نفرت تھی۔

گو عدم تشدد کی پالیسی کم سے کم وقتی طور پر مغلوب ہو گئی لیکن عوام کو یہ سبق سکھانے کا ایک بہت اچھا نتیجہ نکلا۔ باوجود اس کے کہ اس تحریک میں عوام انتہا سے زیادہ مشتعل ہو چکے تھے انھوں نے کسی نسلی نفرت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ کوشش یہ کی گئی کہ مخالفوں کو جسمانی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ ذرائع رسل و رسائل کو کافی نقصان پہنچا، اور حکومت کی عمارتوں وغیرہ پر بھی حملے ہوئے لیکن اس کے باوجود لوگوں نے جان لینے سے قصداً احتراز کیا۔ ظاہر ہے ایسا کرنا ہر حالت میں ممکن نہ تھا اور نہ ہر جگہ اس کی کوشش کی گئی خصوصاً پولیس اور فوج سے تصادم کی صورتوں میں۔ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں خود سرکاری رپورٹوں کے مطابق ان تمام ہنگاموں کے دوران میں سارے ہندوستان میں عوام کے ہاتھوں کوئی سو آدمی مارے گئے۔ ان ہنگاموں کی شدت اور وسعت اور پولیس کے ساتھ تصادم کے پیش نظر یہ تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ایک بڑا دردناک اور وحشیانہ واقعہ بہار میں کسی جگہ کینیڈا کے دو ہوابازوں کا قتل تھا، لیکن مجموعی حیثیت سے اس تمام ہنگامے میں نسلی نفرت کا فقدان بہت ہی قابل ذکر بات ہے[1]۔

سرکاری بیانات کے مطابق ۱۹۴۲ء کے ہنگامے میں پولیس اور فوج کی گولیوں سے ۱۰۲۸ آدمی ہلاک اور ۳۲۰۰ مجروح ہوئے لیکن یہ اعداد یقیناً حقیقت سے بہت کم ہیں۔ کیونکہ خود سرکاری بیانات کے مطابق عوام پر ۵۳۸ مواقع پر گولی چلائی گئی۔ اس کے علاوہ اکثر پولیس اور فوج نے چلتی

---

[1] اگلے صفحے پر دیکھئے۔

لاریوں پر سے عوام کو گولیوں کا نشانہ بنایا گو صحیح اعداد کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ لیکن لوگوں کا عام اندازہ یہ ہے کہ مقتولین کی تعداد ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ غالباً یہ بھی مبالغہ ہے۔ شاید دس ہزار کی تعداد زیادہ قرین قیاس ہے۔

اس سلسلے میں غیر معمولی بات یہ تھی کہ بہت سے دیہی اور شہری علاقوں میں حکومت کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اور ان جگھوں کو دوبارہ "فتح" کرنے میں کئی کئی دن اور بعض جگہ کئی ہفتے لگ گئے۔ ایسا خاص طور پر بہار، بنگال میں ضلع مدناپور اور صوبہ متحدہ کے جنوب مشرقی ضلعوں میں ہوا تھا۔ اور یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یوپی کے ضلع بلیا کے متعلق (جسے دوبارہ "فتح کرنے" کی ضرورت پڑی تھی) جہاں تک خاص عدالتوں کے مقدموں کی کارروائیوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے عوام کے خلاف یہ شکایت بھی نہیں ہے کہ انھوں نے جسمانی تکلیف

اس سلسلے میں کلائیو برینین کے خطوط جو "ہندوستان ایک برطانوی سپاہی کی نظر میں" کے نام سے چھپے ہیں ایک بڑی اچھی مثال ملتی ہے۔ برینین ارٹسٹ تھا اور کمیونسٹ، اسپین کی خانہ جنگی میں اس نے "بین الاقوامی بریگیڈ" میں شامل ہو کر جمہوری پارٹی کی طرف سے جنگ کی تھی ۱۹۴۱ء میں وہ شاہی مسلح دستہ" میں شریک ہو گیا تھا وہ اس دستے میں سرجنٹ تھا فروری ۱۹۴۴ء میں وہ اراکان میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں جب بمبئی اپنے رہنماؤں کے بعد غم و غصے سے ابل رہا تھا برینین بمبئی میں موجود تھا۔ برینین نے کہا ہے۔ "کتنا پاک ہے آپ کا جذبۂ قومیت۔ میں نے راہ چلنے والوں سے کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کا پتہ پوچھا۔ میں یونیفارم میں تھا۔ میرے ہی جیسے لوگ نہتے ہندوستانیوں کو گولیوں سے بھون رہے تھے۔ اور قدرتاً میں تھوڑا سا پریشان تھا اور ڈرتا تھا معلوم نہیں میرے ساتھ کیا برتاؤ ہو لیکن جس کسی سے بھی میں نے راستہ پوچھا اس نے میری مدد کرنے پر مستعدی ظاہر کی کسی نے بھی میری توہین کرنے کی یا مجھے غلط راستہ بتانے کی کوشش نہیں کی۔"

یا ایذا پہنچائی ہو۔ معمولی پولیس ان حالات کا مقابلہ کرنے میں ناکام ثابت ہوئی۔
اس لئے ۱۹۴۲ء کے شروع میں خاص طور پر مسلح کانسٹبل بھرتی کئے گئے تھے
اور انھیں عوام کے مظاہروں اور ہنگاموں کو دبانے کی خاص طور پر تربیت
دی گئی تھی اور اس نے عوام کو کچلنے میں نمایاں حصہ لیا۔ اس کی کارروائیوں
سے کبھی کبھی آئرلینڈ کے "بلیک اینڈ ٹین" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ عام طور پر
ہندوستانی فوج سے اس سلسلے میں زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ ہاں اس کی بعض
خاص جماعتوں اور طبقوں سے البتہ مدد لی گئی۔ لیکن زیادہ تر انگریزی اور گورکھا
فوجوں کو استعمال کیا گیا۔ بعض صورتوں میں ہندوستانی سپاہیوں اور اسپیشل
پولیس کو ملک کے دور دراز کے حصوں میں بھیجا گیا جہاں ان کی حیثیت اجنبیوں
کی سی تھی کیونکہ وہ ان کی زبان تک نہ جانتے تھے۔

جس طرح عوام کا ردعمل فطری تھا اسی طرح ان حالات میں برطانوی
حکومت نے جو کچھ کیا وہ بھی قدرتی بات تھی۔ عوام کے وقتی جوش اور ہیجان اور
دوسرے لوگوں کے پرامن مظاہروں کو کچلنا حکومت کے لئے ضروری تھا۔
اپنے بقا کی خاطر یہ بھی ناگزیر تھا کہ وہ ان سب لوگوں کو دبا دے جن کو وہ اپنا دشمن
سمجھتی تھی۔ اگر حکومت میں یہ صلاحیت اور خواہش ہوتی کہ وہ عوام کے پرزور
جذبات کو سمجھے تو یہ نازک صورت حال پیدا ہی نہ ہوتی اور ہندوستان کے
مسئلے کا حل زیادہ آسان ہوتا۔ لیکن حکومت نے تو اپنے اقتدار کے خلاف اس
احتجاج کو (اپنے زعم میں) ہمیشہ کے لئے مٹا دینے کی پوری تیاری کر لی تھی۔
حملہ کرنے میں ابتدا بھی حکومت نے کی تھی اور اس کا وقت بھی اس نے ہی چنا
تھا۔ ہزاروں مرد اور عورتیں جنھوں نے قومی تحریک، یا کسان اور مزدوروں کی
تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا تھا حکومت کے جیلوں میں بند کر دئے گئے تھے۔

ملک بھر میں جو زبردست ہنگامہ برپا ہوا جس کی وجہ سے حکومت کا جبر و تشدد کا انتظام بھی گڑبڑ ہو گیا۔ اس نئے حکومت کو بھی حیرانی اور پریشانی میں ڈال دیا مگر حکومت کے پاس بے اندازہ ذرائع تھے اور اس نے ان کے ذریعے بغاوت کے تشدد انگیز اور پر امن مظاہروں کو کچلنے کی پوری کوشش کی بہت سے دولت مند اور اعلیٰ طبقے کے افراد جو ڈرے دبے قوم پرست تھے اور کبھی کبھی حکومت پر نکتہ چینی بھی کر لیتے تھے۔ عوام کی عملی طاقت کے اس وسیع مظاہرے سے خوف زدہ ہو گئے کیونکہ عوام کی اس تحریک کو مفاد مخصوص کی پروا نہ تھی اور وہ نہ صرف سیاسی انقلاب چاہتی تھی بلکہ اس کے پیش نظر سماجی انقلاب بھی تھا۔ جب یہ ظاہر ہونے لگا کہ حکومت اس بغاوت کو کچل ڈالنے میں کامیاب ہو جائے گی تو منافق ابن الوقت لوگ کھلم کھلا گورنمنٹ کے ساتھ ہو گئے اور انھوں نے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے حکومت سے ٹکر لینے کی جرأت کی تھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ بغاوت کی ظاہری نشانیوں کو مٹا چکنے کے بعد حکومت کی ساری مشینری اس طرف متوجہ ہوئی کہ اس جذبے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور برطانوی اقتدار کی دھاک دوبارہ دلوں پر جما دے۔ وائسرائے ہر روز اپنے اختیار خاص سے نئے قانون بنا سکتے تھے لیکن اس سلسلے میں جو رسمی پابندیاں لگائی گئی تھیں ان کا خیال بھی ترک کر دیا گیا۔ ہائی کورٹ اور فیڈرل کورٹ خود برطانوی حکومت کی بنائی ہوئی عدالتیں اور اس کے اقتدار کی نشانیاں ہیں لیکن حکام نے ان کے فیصلوں کو نظر انداز کر دیا۔ ان فیصلوں کو رد کرنے کے لئے نئے آرڈیننس جاری کر دئے گئے۔ خاص عدالتیں (جن کو بعد میں عدالتوں نے غیر قانونی قرار دیا) جو شہادت وغیرہ کی عام پابندیوں سے آزاد تھیں قائم کی گئیں۔ اور ان عدالتوں نے ہزاروں کو طول طویل مدت کے لئے قید کی اور بہتوں کو موت تک کی سزائیں دیں۔ سارے اختیارات

پولیس (خصوصاً مسلح کانسٹبل کے دستوں اور خفیہ پولیس) کے ہاتھوں میں آ گئے اور یہی حکومت کے اہم ترین آلہ کار بن گئے جو ہر قسم کی خلاف قانون اور تشدد انگیز حرکتیں کر سکتے تھے ان کے خلاف نہ کوئی روک ٹوک تھی نہ داد و فریاد۔ ہر طرف رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ اسکولوں اور کالجوں کے سیکڑوں طلبا کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں اور ہزاروں نوجوانوں کو کوڑوں سے مارا گیا اور عوام کی سبھی سرگرمیوں پر جو حکومت کی موافقت میں نہ ہوں انتہائی پابندیاں لگا دی گئیں۔

لیکن سب سے زیادہ مصیبتوں کا سامنا سیدھے سادھے افلاس کے مارے دیہاتیوں کو کرنا پڑا۔ مدتوں سے اس طبقے کے نصیب میں مصیبت اور محرومی کے سوا کچھ نہ تھا، مگر ان بیچاروں نے اس موقع پر نئی امیدیں باندھنے اور اچھے دنوں کا خواب دیکھنے کی جرأت کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے عمل کے میدان میں بھی قدم رکھا تھا۔ غلط طریقے سے ہو یا صحیح ہندوستان کی آزادی کے لئے ان کے دلوں میں جو جذبہ تھا انھوں نے اس کا اظہار کیا تھا۔ اور وہ ناکام رہے تو اس ناکامی کا بار انھیں اپنے جھکے ہوئے شانوں اور شکستہ جسموں پر اٹھانا پڑا۔ بعض صورتوں میں گاؤں کے تمام بسنے والوں کو کوڑوں کی مار سے لے کر موت تک کی سزائیں دی گئیں۔ حکومت بنگال نے اعلان کیا تھا "گورنمنٹ نے ۱۹۴۲ء کے سائیکلون سے پہلے اور اس کے بعد تملوک اور کونٹائی کی تحصیلوں میں ۱۹۳ کانگریس کیمپ اور مکانات جلا دیئے" یہ بات قابل ذکر ہے کہ سائیکلون نے اس حصے کو بری طرح تباہ کر ڈالا تھا لیکن حکومت کو اس سے کیا؟

دیہاتوں پر بھاری تعزیری جرمانے لگائے گئے۔ دار العوام میں مسٹر

ایمری کے ایک بیان کے مطابق نوے لاکھ روپے کے مجموعی جرمانے عائد کئے گئے جس میں سے ۷۰۸۵۰۰۰ روپے وصول ہوئے۔ غربت اور افلاس کے مارے ہوئے ہندوستانیوں سے یہ گرانقدر رقم کیونکر وصول کی گئی یہ بجائے خود ایک مستقل داستان ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء یا اس کے بعد حکومت نے جو کچھ بھی کیا خواہ وہ گولیوں کی بوچھار ہو یا مکانوں کا جلانا، اس سے لوگوں کو اتنی شدید تکلیف نہیں اٹھانی پڑی جس قدر ان جرمانوں کی جبریہ وصولی سے۔ اس پر طرہ یہ کہ صرف اتنی ہی رقم وصول نہیں کی جاتی تھی جو جرمانے کے طور پر عائد کی جاتی تھی بلکہ اکثر اس سے زیادہ اور یہ فاضل رقم جرمانہ وصول کرنے والوں کے پیٹ چڑھتی تھی۔

وہ تمام حیلے جو عام طور پر حکومت کی ایسی کارروائیوں پر پردہ ڈالا کرتے ہیں یک قلم مسترد کر دیئے گئے اور حکومت کا تشدد ہی اس کی قوت اور اقتدار کی تنہا نشانی رہ گیا۔ اور اب حیلوں اور جواز کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ کم سے کم وقتی طور پر، حکومت نے ان تمام تشدد انگیز اور پر امن سرگرمیوں کو کامیابی سے کچل ڈالا تھا جن کا مقصد ملک میں ایک قومی حکومت قائم کرنا تھا۔ ہندوستان اس آخری امتحان میں ناکام رہا تھا جہاں کامیابی کا دارومدار محض طاقت اور قوت پر ہوتا ہے اور باقی تمام باتیں محض بے کار اور بے فائدہ باتیں ہوتی ہیں۔ اور اس ناکامی کا سبب محض برطانوی حکومت کی مسلح طاقت نہ تھی یا وہ ذہنی پریشانی جو لوگوں کے ذہن میں جنگ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی بلکہ اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ لوگ اس آخری قربانی کے لئے تیار نہ تھے جو آزادی کی راہ میں دینی ہوتی ہے۔ برطانوی حکومت یہ محسوس کرنے لگی کہ اس کا اقتدار دوبارہ جم چکا ہے اور اب کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی گرفت ڈھیلی کرے۔

۴۔ بیرونی ممالک میں ردعمل

ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا اس پر سنسر شپ کا پردہ ڈال دیا گیا۔ خود ہندوستانی اخبارات کو روزمرہ کے واقعات کی خبریں شائع کرنے کی اجازت نہ تھی اور بیرونی ممالک میں جانے والی خبروں پہ اس سے بھی زیادہ کڑی نگرانی ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے باہر سرکاری پروپاگنڈا شروع کر دیا گیا اور جھوٹی اور مسخ شدہ خبروں کی تشہیر کی جانے لگی۔ چونکہ امریکہ کی ہمدردی اور اس کی رائے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اس لئے اس تمام پروپاگنڈے کا سب سے بڑا مرکز امریکہ ہی کو قرار دیا گیا۔ اور سیکڑوں ہندوستانی اور انگریز مقرر وغیرہ وہاں ملک کا دورہ کرنے کے لئے بھیجے گئے۔

اگر یہ غلط پروپاگنڈا نہ بھی ہوتا تو بھی جنگ کی مصیبتوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے انگلستان میں ہندوستانیوں کے اور خصوصاً ان لوگوں کے خلاف جو ایک نازک وقت میں ان کی دقتوں کو بڑھا رہے تھے قدرتی طور پر ناراضگی کا جذبہ پیدا ہونا ضروری تھا۔ یک طرفہ پروپاگنڈے اور انگریزی کردار کی خصوصیت نے کہ انگریز اپنے کو ہمیشہ ٹھیک سمجھتا ہے اس جذبے کو اور بڑھایا۔ انگریزوں کی بڑی جیت ہی اس بات میں ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات اور احساسات سے ناواقف رہتے ہیں۔ اور اس ناواقفیت کی بنا پر وہ ہر اس بات کو جو ان کے نام پر ہندوستان میں کی جا رہی تھی جائز قرار دیتے اور اس کا الزام اپنے مخالفین کی ناانصافی پر دھرتے جو انگریزوں کی واضح خوبیوں کا اعتراف نہ کرتے تھے۔ برطانوی طاقت اور ہندوستانی پولیس کو جو کامیابی ان لوگوں کو دبانے میں ہوئی تھی جو ان اوصاف پر ایمان نہ رکھتے تھے اس نے از سر نو ان کو سند جواز دے دی

میں اور اپنے ملک کو دشمن سے پاک کرنے کی جدوجہد میں اتنے زیادہ مشغول تھے کہ ان مسائل پر جن کا ان سے کوئی فوری تعلق نہ تھا انھیں غور کرنے کی فرصت نہ تھی، لیکن روسیوں کی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ دور تک دیکھتے ہیں اور اس لئے یہ قرین قیاس نہیں کہ وہ ہندوستان کی طرف سے جس کی سرحدیں ایشیا میں ان کے ملک سے ملتی ہیں بالکل بے پروا ہوں گے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مستقبل میں ان کی سیاسی پالیسی کیا ہوگی، لیکن یہ یقین ہے کہ یہ اس وقت کے واقعات اور حالات پر مبنی ہوگی اور اس کا اہم ترین مقصد یہ ہوگا کہ سوویٹ روس کی سیاسی اور معاشی طاقت میں اضافہ ہو۔ روس کے ارباب حل وعقد نے ہندوستان کا ذکر کرنے سے جان بوجھ کر پرہیز کیا۔ لیکن نومبر ۱۹۴۲ء میں اسٹالن نے انقلاب روس کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر روسی پالیسی کے مقاصد کی حسب ذیل توضیح کی تھی، "نسلی تعصب کا مٹانا، قوموں کے مابین مساوات، ان کی مملکت کی حفاظت، غلام ملکوں کی آزادی، اور ان کے حقوق حکمرانی کا دوبارہ قیام، ہر ملک کو اس بات کا حق کہ وہ جس طرح چاہے اپنے ملک کا انتظام کرے، مصیبت زدہ ملکوں کی معاشی مدد تاکہ وہ دوبارہ مادی خوش حالی حاصل کرسکیں، جمہوری حقوق کی بحالی اور ہٹلر شاہی کا خاتمہ،" یہ تھے روسی پالیسی کے مقاصد۔

چین کے متعلق یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ خواہ ہمارے خاص خاص کاموں کی طرف سے ان کا کچھ بھی خیال ہو ان کی تمام تر ہمدردی ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہے۔ یہ ہمدردی بہت پرانی ہے۔ لیکن اس کا ایک اور اہم سبب یہ بھی تھا کہ چینی یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے بغیر خود ان کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ نہ صرف چین بلکہ سارے ایشیا، مصر اور مشرق قریب میں لوگ ہندوستان کی آزادی کے سوال کو بنیادی حیثیت ...

کی آزادی کی ایک علامت سمجھتے تھے اس کی آزادی حال کے لئے ایک کسوٹی اور مستقبل کے لئے ایک ناپ تھی۔ ونڈل ولکی نے اپنی کتاب "ایک دنیا" میں اس بات کا ذکر کیا ہے "افریقہ سے لے کر الاسکا تک میں نے جن لوگوں سے اس مسئلے پر گفتگو کی ان میں سے بیشتر نے مجھ سے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں سوالات پوچھے۔ در اصل یہ مسئلہ ایک علامتی مسئلہ بن گیا ہے۔ قاہرہ کے بعد تو مجھے ہر جگہ اس سوال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چین کے سب سے سمجھ دار آدمی نے مجھ سے کہا۔ ہندوستان کی آزادی کے سوال کو مستقبل بعید کے لئے اٹھا رکھنے سے عوام کی نظروں میں انگلستان کو نہیں بلکہ امریکہ کے وقار کو ٹھیس لگی"۔

بہر حال جنگ کی نازک حالت کے باوجود ہندوستان میں جو کچھ ہوا اس نے کم از کم وقتی طور پر دنیا کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور لوگ اس بات پر مجبور سے ہو گئے کہ مشرق کے بنیادی مسائل پر غور کریں۔ ایشیا کے تمام ملکوں میں لوگوں کے دل و دماغ پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اور اگرچہ وقتی طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی لوگ برطانوی حکومت کے چنگل میں بالکل بے بس ہیں لیکن انھوں نے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ایشیا اور ہندوستان میں اس وقت تک امن نہیں ہو سکتا جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جائے

۵ - ہندوستان میں ردِ عمل

کسی مہذب ملک پر غیر ملکی حکومت کے اقتدار میں بہت ہی نقائص ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ایسی حکومت کو گھٹیا قسم کے لوگوں

کا سہارا لینا پڑتا ہے عین پسند غیور حساس اور خوددار قسم کے لوگ جو آزادی کی قیمت پہچانتے ہیں اور ایک غیر ملکی حکومت کے آگے جبراً سر جھکانے کے ننگ کو برداشت نہیں کر سکتے یا تو الگ رہتے ہیں یا انھیں اس کے ساتھ ٹکر لینی پڑتی ہے۔ لہٰذا ایسی حکومت کے اہلکاروں میں ابن الوقتوں اور موقع پرستوں کی تعداد آزاد ملکوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ایک آزاد ملک میں بھی جہاں کی حکومت مطلق العنان ہوتی ہے، کتنے ہی حساس افراد حکومت کے کاروبار میں تعاون نہیں کرتے اور نئے لوگوں کی صلاحیتوں کو پھلنے اور پھولنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ ایک بیرونی حکومت جو لازماً استبدادی ہوتی ہے ان تمام خرابیوں کی حامل ہوتی ہے۔ بلکہ اس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ اسے ہمیشہ کش مکش اور جبر و تعدی کی فضا میں کام کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اور عوام دونوں کا سب سے بڑا محرک عمل خوف ہوتا ہے۔ اور پولیس اور دوسرے خفیہ شعبے ہی حکومت کے اہم ترین شعبے بن جاتے ہیں اور جب عوام اور حکومت میں ٹکر ہو جاتی ہے تو حکومت کی یہ پالیسی کہ وہ نامناسب قسم کے افراد پر بھروسا کرے اور ان کی ہمت افزائی کرے اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے ایماندار لوگ بھی حالات سے مجبور ہو کر حکومت کی مشنیری میں کام کرتے ہیں لیکن جو لوگ اس نظام میں چوٹی پر پہنچتے ہیں اور حکومت کی سب سے اہم خدمات انجام دیتے ہیں ان کا انتخاب اس خیال سے کیا جاتا ہے کہ وہ قومی تحریک کے خلاف ہیں، حکومت کی بے چون و چرا اطاعت کرتے ہیں اور خود اپنے ہم وطنوں کو ذلیل کرنے اور ان پر ظلم کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور وصف یہ ہے کہ وہ عوام کے جذبات اور احساسات کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو اکثر ذاتی رقابتوں اور مایوسیوں کا نتیجہ ہے۔ اس مسموم اور نامبارک

فضا میں نہ عین پسندی کے لئے کوئی جگہ ہوتی ہے نہ شریفانہ جذبات کے لئے لوگوں کے لئے زندگی کے سب سے بڑے انعام اونچی اونچی تنخواہیں اور بڑی بڑی نوکریاں قرار پاتی ہیں۔ اس صورت میں قدرتاً حکومت کے طرفداروں کی نااہلی اور اس سے بھی بڑے عیوب کو نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ اچھائی اور کامیابی کا معیار تو محض یہ رہ جاتا ہے کہ حکومت کو اپنے دشمنوں کے کچلنے میں کون سب سے زیادہ مدد دے سکتا ہے۔ لہٰذا حکومت عجیب و غریب طبقوں اور افراد کا سہارا ڈھونڈھتی ہے اور رشوت ستانی، ظلم اور بے رحمی کا دور دورہ ہو جاتا ہے اور عوام کے مفاد کی طرف سے یکسر لاپرواہی برتی جاتی ہے جس[1] سے قومی زندگی مسموم ہو جاتی ہے

---

[1] بنگال کے انتظامات کی تحقیقی کمیٹی نے جس کے صدر مسٹر آرچیبالڈ رولینڈز تھے اپنی رپورٹ میں جو مئی ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی ایک جگہ لکھا ہے "رشوت ستانی کا بازار اتنا گرم ہے اور اسے ختم کرنے کی طرف سے لوگ اتنے مایوس ہو چکے ہیں کہ اس خرابی کو جڑ سے مٹانے کے لئے جس نے حکومت کے ملازمین اور عوام کے اخلاق کو بالکل خراب کر دیا ہے۔ سخت سے سخت اقدامات کرنا ضروری ہے"۔ کمیٹی کو ایسی شہادتیں سن کر تعجب اور افسوس ہوا جن سے پتہ چلتا ہے کہ کتنے ہی سرکاری عہدہ دار عوام سے نامناسب برتاؤ کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کمیٹی سے کہا گیا ہے کہ سرکاری افسر اپنے آپ کو عام سطح سے بہت اونچا سمجھتے ہیں اور حکومت کی بے جان انتظامی مشین کی خالص دفتری کارروائیوں کی انجام دہی کو عوام کی بہبودی کے کاموں سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھنے کے بجائے ان کا آقا سمجھتے ہیں۔

بہت سی باتیں جو غیر ملکی حکومت کرتی ہے اس کے خلاف لوگوں کے دلوں میں قدرتاً شدید قسم کی بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان سے بھی زیادہ ناراضگی حکومت کے ان ہندوستانی حامیوں کے خلاف ہے جو وفاداری میں خود کو بادشاہ سے بھی زیادہ ظاہر کرتے ہیں۔ عام ہندوستانی ان کو ذلیل سمجھتے ہیں اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اس طرح غدار سمجھتے ہیں جیسے کروشی کے فرانسیسی عہدہ دار یا جرمن اور جاپانی حکومت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچنے والی حکومتوں کے عہدہ دار بیزاری اور نفرت کا جذبہ محض کانگریس والوں تک محدود نہیں بلکہ مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں کے بھی بہت سے ممبر ایسا ہی محسوس کرتے ہیں اور ہمارے بعض بہت اعتدال پسند لیڈر بھی اس قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں[1]

جنگ کی وجہ سے حکومت کو قومی تحریک کو کچلنے اور نئی نئی قسم کا پروپاگنڈا کرنے کا بہت اچھا موقع اور بہانہ ہاتھ آیا۔ برساتی کیڑوں کی طرح

---

[1] ہٹلر جو دوسروں کو اپنی مرضی کا تابع بنانے میں مہارت تامہ رکھتا تھا اپنی سوانح "میری جدوجہد" میں لکھتا ہے "ہمیں ان بے کردار لوگوں سے جنھوں نے بے چون وچرا تسلیم واطاعت کو اپنی خو بنا لیا ہو یہ امید نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ دفعتہً اپنے اعمال پر پچھتا کر عقل اور انسانی تجربے کی بنا پر اپنا طرز عمل بالکل بدل ڈالیں گے۔ اس کے برخلاف یہی لوگ اس طرح کے ہر سبق سے بچنا چاہیں گے۔ یہاں تک کہ یا تو قوم اپنی غلامی کے چہرے کی ہمیشہ کے لئے عادی ہو جائے گی یا پھر زیادہ اچھے لوگ آگے بڑھیں گے اور ان ذلیل لوگوں کے ہاتھ سے جو قومی کردار کو خراب کر رہے تھے اقتدار چھین لیں گے۔ پہلی صورت میں ان لوگوں کی بن آتی ہے کیونکہ اکثر فاتح ایسے لوگوں کو غلاموں کی نگرانی کے فرائض سونپ دیتے ہیں اور یہ بے کردار لوگ خود اپنے ہم قوموں پر اس اقتدار کو ایسی بے دردی سے استعمال کرتے ہیں کہ کوئی دشمن کا مقرر کیا ہوا غیر ملکی وحشی بھی ایسا نہ کرتا۔"

مزدوروں کی نئی انجمنیں وجود میں آئیں اور مزدوروں میں نظم قائم رکھنے کے لیئے انھیں مالی امداد دی گئی۔ گاندھی جی اور کانگریس پر رکیک حملے کرنے کے لیئے نئے نئے اخبارات جاری کئے گئے اور انھیں مالی امداد دی گئی حالانکہ کاغذ کی کمی سے دوسرے پرانے اخبارات کا جاری رہنا بھی بہت مشکل ہو گیا تھا۔ سرکاری اشتہارات بھی جنھیں مساعی جنگ کا ایک جز بتایا جاتا تھا۔ اسی مقصد کے لیئے استعمال کئے گئے۔ غیر ملکوں میں اطلاعات کے محکمے قائم کئے گئے تاکہ حکومت ہند کی طرف سے مسلسل پروپاگنڈا کرتے رہیں نہ جانے کتنے گمنام اور غیر معروف ہندوستانیوں کے وفد مرکزی اسمبلی کے احتجاج کے باوجود حکومت کی طرف سے دوسرے ملکوں اور خصوصًا امریکہ کو بھیجے گئے تاکہ یہ برطانوی حکومت کے ایجنٹ اور آلہ کار بن کر حکومت کا پروپاگنڈا کریں۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی جو اپنی آزاد رائے رکھتا یا حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کر سکتا تھا باہر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اسے نہ پاسپورٹ ملتا تھا نہ جہاز وغیرہ میں جگہ ملنے کا امکان تھا۔

پچھلے دو سالوں میں ملک میں اپنی پسند کے مطابق امن عامہ قائم کرنے کے لیئے حکومت نے اس قسم کی بہت سی دوسری ترکیبوں سے کام لیا۔ سیاسی اور پبلک زندگی معطل ہو گئی اور ایک ایسے ملک میں جہاں کم و بیش فوج کا قبضہ اور اس کا اقتدار کارفرما ہو ایسا ہونا قدرتی بات ہے۔ لیکن مرض کی علامتوں کو زبردستی دبانے سے مرض کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور ہندوستان عرصے سے بیمار چلا آتا ہے۔ بہت سے قدامت پرست افراد بھی جو ہمیشہ حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اس صورت حال سے پریشان ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کی حالت ایک آتش فشاں پہاڑ

کی سی ہے جس کا منہ وقتی طور پر بند کر دیا گیا ہے اور ان کا بیان ہے کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں نفرت کا اتنا شدید جذبہ اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ مجھے اندازہ نہیں اور میں لوگوں سے ملے جلے بغیر نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے عوام ان دو سالوں میں کس طرح بدلے ہیں اور ان کے دلوں میں کیا جذبات ہیں۔ لیکن اس میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ حال کے تجربات نے انھیں بہت کچھ بدل دیا ہے۔ ہاں وقتاً فوقتاً میں نے خود اپنے خیالات کا جائزہ لیا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ باہر والے واقعات کا میرے دل و دماغ پر کیا ردعمل ہوا ہے۔ اب سے پہلے مجھے ہمیشہ انگلستان جانے کا شوق رہا کیونکہ وہاں میرے بہت سے دوست ہیں، اور ماضی کی یادیں مجھے کھینچتی تھیں۔ لیکن اب مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ خواہش بالکل جاتی رہی ہے اور اس خیال سے بھی مجھے کوفت ہوتی ہے اب میں انگلستان سے جتنا دور ممکن ہو رہنا چاہتا تھا۔ اور ہندوستان کے مسائل پر کسی انگریز سے گفتگو کرنے کی بھی خواہش نہیں لیکن پھر مجھے بعض دوستوں کی یاد آئی اور اس شدت میں ایک حد تک کمی آگئی اور میں نے سوچا ایک پوری قوم کے خلاف اس طرح رائے قائم کرنا ٹھیک نہیں۔ میں نے ان شدید مصائب کا خیال کیا جو انگلستان نے اس جنگ کے دوران میں اٹھائی ہیں اور اس مسلسل جسمانی اور ذہنی تعب کا جو ان پر طاری رہا ہے اور ان عزیز جانوں کو جو انھوں نے اس جنگ میں گنوائی ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے میرے جذبات کی شدت میں کمی تو آگئی لیکن وہ بنیادی ردعمل باقی رہا۔ غالباً وقت گذرنے پر اس میں بھی کمی آجائے گی۔ اور میں اس تجربے کو ایک دوسری نظر سے دیکھنے لگوں گا لیکن اگر انگریزوں اور انگلستان سے گہرے تعلقات رکھنے کے باوجود میرے یہ جذبات ہو سکتے ہیں تو ان لوگوں کے جذبات کیا کچھ نہ ہوں گے

جن کو اس قسم کے تعلقات کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔

۶۔ ہندوستان کی بیماری۔ قحط

ہندوستان شدید روحانی آلام کے ساتھ ساتھ جسمانی مصیبتوں کا بھی شکار تھا۔ جنگ کے زمانے میں کچھ لوگوں کی خوش حالی میں اضافہ ہوا تھا۔ لیکن باقی لوگوں کی مصیبتوں کا بار ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ اس بات کی علامت وہ زبردست قحط تھا جس نے بنگال اور جنوبی، ومشرقی ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ برطانوی حکومت کے ۱۷۰ سالہ دور حکومت کا یہ سب سے تباہ کن قحط تھا اور اس سے ۱۷۶۶ء کے قحط بنگال اور ۱۷۷۰ء کے قحط بہار کی یاد تازہ ہوتی تھی جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا ابتدائی نتیجہ تھے۔ قحط کے بعد وباؤں کی خصوصاً ہیضہ اور ملیریا کی باری آئی جو بنگال سے پھیل کر دوسرے صوبوں تک پہنچیں اور آج بھی ہزاروں جانیں ان کی وجہ سے ضائع ہو رہی ہیں۔ ان قحط اور وباؤں سے لاکھوں جانیں ضائع ہو چکی ہیں لیکن اب بھی یہ بلا ہندوستان کے سر سے نہیں ٹلی ہے اور سیکڑوں جانیں اس کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔[1]

اس قحط نے ہندوستان کے چہرے سے اعلیٰ طبقوں کے تھوڑے سے آدمیوں کی فارغ البالی کا پردہ ہٹا کر اس کے بھیانک افلاس اور برطانوی نظام حکومت کی مکروہ تصویر آنکھوں کے سامنے پیش کر دی۔ یہ گویا ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تکمیل اور اس کا انتہائی کارنامہ تھا یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ

---

[1] اگلے صفحے پر دیکھئے

یہ قحط قدرت کی نازل کی ہوئی مصیبت نہ تھی، نہ موسمی حالات اس کے ذمہ دار تھے۔ نہ یہ جنگ کی کارروائیوں اور دشمن کی ناکہ بندی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ تقریباً تمام مہ سمجھدار لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اس قحط کی تمام ذمہ داری انسانوں کے سر ہے اس کا پہلے سے اندازہ کیا جاسکتا تھا اور اس کا تدارک ہو سکتا تھا۔ سب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ذمہ دار حکام نے اس بارے میں حیرت انگیز لاپروائی نااہلی اور نامناسب اطمینان کا مظاہرہ کیا۔ آخری وقت تک جب قحط سے ہر روز سڑکوں پر ہزاروں آدمی دم توڑ رہے تھے یہ عہدہ دار سرے سے قحط کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے اور سنسر اخبارات میں قحط کی خبروں کو دبانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کلکتے کے اخبار اسٹیٹسمین نے کلکتے کی سڑکوں پر بھوک سے بے دم ہو کر جان توڑتے ہوئے بچوں اور عورتوں کی دردناک تصویریں تک

۱؎ ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال میں کتنی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس بارے میں کئی بہت مختلف اندازے کئے گئے ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ Anthropology نے بعض قحط زدہ علاقوں کا وسیع پیمانے پر سائنٹیفک طور پر جائزہ لیا تھا۔ ان کے اندازے کے مطابق بنگال میں قحط سے موتوں کی تعداد چونتیس لاکھ کے قریب پہنچتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی پتہ لگایا کہ ۱۹۴۳ء میں بنگال کی ۴۶ فی صدی آبادی سخت قسم کی بیماریوں میں مبتلا رہی۔ حکومت بنگال کے سرکاری اندازوں کے مطابق جن کی بنیاد بیشتر گاؤں کے پٹواری اور چوکیدار کے بلا اعتماد اندازوں پر تھی، موتوں کی تعداد اس سے بہت کم تھی۔ سرکاری قحط کے تحقیقاتی کمیشن نے جس کے صدر سر جان ووڈ ہیڈ تھے۔ اندازہ لگایا کہ بنگال میں براہ راست قحط اور وبائی بیماریوں سے تقریباً ۱۵ لاکھ جانیں ضائع ہوئیں۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ اعداد صرف بنگال کے متعلق ہیں۔ لیکن ملک کے اور بہت سے حصوں کو بھی قحط اور اس کی بدولت وبائی بیماریوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

شائع کیں تو ایک سرکاری مقرر نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے واقعات کو اس طرح بڑھا چڑھا کر، ڈرامائی انداز میں پیش کرنے پر احتجاج کیا! ہندوستان میں ہزاروں کا بھوک سے دم توڑ دینا غالباً ان کے نزدیک ایک معمولی سی بات تھی۔ لیکن اس سلسلے میں عجیب بیانات شائع کرنے اور قحط کے وجود سے انکار کرنے میں وزیر ہند مسٹر ایمری نے خاص امتیاز حاصل کیا۔ جب قحط کی شدت بڑھ گئی تو اس کی موجودگی کا انکار کرنا یا اس پر پردہ ڈالے رکھنا ناممکن ہو گیا تو ذمہ دار حلقے ایک دوسرے کے سر الزام تھوپنے لگے۔ مرکزی حکومت نے صوبہ کی حکومت، گورنر اور سول سروس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی، مورد الزام ٹھہرایا۔ اس میں شبہ بھی نہیں کہ یہ الزام سب پر عائد ہوتا ہے لیکن سب سے زیادہ قصور اس مستبد حکومت کا تھا جس کی نمائندگی وائسرائے خود کرتے تھے اور جس کو اختیار حاصل تھا کہ ہندوستان میں جو کچھ چاہے کرے۔ اگر کسی جمہوری یا نیم جمہوری حکومت میں ملک پر اتنی زبردست مصیبت آتی تو ایسی حکومت کو فوراً نکال دیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں وہی لوگ آج تک برسر اقتدار ہیں۔

جنگ کے نقطۂ نظر سے بھی قحط ایک خطرناک چیز تھی۔ کیونکہ اس کا شکار ملک کا وہ حصہ ہوا تھا جو محاذ جنگ کے سب سے زیادہ قریب تھا اور دشمن کے حملے کا پہلا مرکز بھی وہی ہوتا۔ قحط اور معاشی زندگی کے درہم برہم ہونے سے حملے اور مدافعت کی طاقت پر برا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ لیکن حکومت ہند نے ہندوستان کی حفاظت اور جاپانی حملہ آوروں کے خلاف جنگ کرنے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو اس عجیب انداز میں پورا کیا۔ حکومت نے جو پالیسی اختیار کی اس کی علامت جنگ کے اس اہم علاقے میں کارخانوں اور ذرائع آمد و رفت وغیرہ کی تباہی نہ تھی بلکہ وہ لاکھوں لاشیں اور فاقہ زدہ لوگ تھے جو اس علاقے

میں بے بس پڑے تھے۔

سارے ملک میں غیر سرکاری ہندوستانی اداروں نے قحط زدوں کی امداد کرنے کے سلسلے میں بہت کام کیا۔ انگلستان کی مشہور انسان دوست اور مستعد جماعت، کویکرز نے بھی اس کام میں ہاتھ بٹایا اور آخر کار حکومت ہند اور صوبے کی حکومت بھی خواب سے جاگی۔ موقعے کی نزاکت کا احساس کر کے انھوں نے امداد رسانی کے لئے فوج سے بھی کام لیا۔ وقتی طور پر قحط کو قابو میں کرنے اور اس کے نتائج کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ افاقہ عارضی تھا اور قحط کے نتائج آج بھی موجود ہیں، اور ابھی نہیں معلوم کہ قحط کی مصیبت کب اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر نازل ہو جائے۔ بنگال کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور اس کا سماجی اور معاشی نظام تباہ ہو چکا ہے اور آنے والے زمانے کی مصیبتیں اٹھانے کے لئے بنگال میں ایک کمزور اور ضعیف نسل باقی رہ گئی ہے۔

لیکن جس وقت بنگال میں موت کا بازار اس زور شور سے گرم تھا اور کلکتے کی سڑکیں بھوک سے مرنے والوں کی لاشوں سے اٹی پڑی تھیں بنگال کی سوسائٹی کے طبقہ اعلیٰ کے دس ہزار افراد کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی میں رنگ رلیوں، ناچ گانے اور عیش و عشرت کی کارفرمائی تھی۔ وہاں راشننگ بھی اس کے بہت بعد شروع ہوئی۔ کلکتے کی گھوڑ دوڑ اس طرح جاری تھی اور وہاں فیشن ایبل لوگوں کی وجہ سے پہلے کی طرح چہل پہل تھی۔ غلے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے نقل و حمل کے ذرائع میسر نہ تھے لیکن گھوڑ دوڑ میں شریک ہونے کے لئے ملک کے دوسرے حصوں سے گھوڑے خاص ریلوں میں لائے جاتے تھے۔ ان رنگ رلیوں میں انگریز اور ہندوستانی دونوں

یکساں شریک تھے۔ کیونکہ جنگ نے دونوں کی خوش حالی میں اضافہ کیا تھا اور روپے کی ریل پیل تھی۔ ان میں بعض نے غلے کی خرید و فروخت ہی میں جس کی کمی سے روزانہ ہزاروں جانیں ضائع ہو رہی تھیں، سٹہ بازی کے ذریعے دولت پیدا کی تھی۔

ہندوستان کے متعلق اکثر کہا گیا ہے کہ یہ متضاد چیزوں کی سرزمین ہے جہاں بعض بے حد امیر ہیں اور بیشتر انتہائی نادار، جہاں بہ یک وقت تجدد اور قرون وسطیٰ کی نشانیاں پائی جاتی ہیں، جہاں حاکم اور محکوم، ہندوستانی اور انگریز اپنے تمام اختلافات کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن یہاں ۱۹۴۳ء کے نصف آخر میں جب قحط اپنی پوری شدت پر تھا کلکتے میں یہ تضاد اپنی انتہائی شکل میں نمایاں تھا۔ ان دو دنیاؤں کے بسنے والے جو عام طور پر ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ زندگی گذارتے تھے اچانک ایک دوسرے سے جسمانی طور پر نزدیک آ گئے۔ یہ تضاد حیرت انگیز تھا۔ لیکن اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ بہت سے لوگ اس ہولناک تضاد کا بے جوڑ پن اب بھی محسوس نہیں کرتے تھے اور ان کی زندگی پرانے ڈھرے پر چل رہی تھی۔ ان کے جذبات اور احساسات کا ہمیں علم نہیں۔ ہم ان کے عمل ہی سے ان کے متعلق رائے قائم کر سکتے ہیں۔ انگریزوں کے لئے ایسا کرنا مقابلتہً آسان تھا کیونکہ ان کی زندگی تو ہمیشہ ہندوستانیوں سے الگ تھلگ رہی تھی اور اپنی جماعت کی روایات کے خلاف وہ اپنی زندگی کے معمول کو بدل بھی نہیں سکتے تھے اگر ان میں سے بعض کو اس کی خواہش بھی ہوئی ہو لیکن ان ہندوستانیوں نے جو اس طرح اپنے ہم وطنوں سے الگ تھلگ رہے یہ بات واضح کر دی کہ ان کے اور ان کی قوم کے درمیان کی خلیج اتنی وسیع ہے کہ اسے شرافت اور انسانیت کے جذبات بھی نہیں پاٹ سکتے

ہر نازک موقعے کی طرح قحط نے بھی ہندوستانیوں کے کردار کے نیچے اور

برے دونوں ہی پہلو نمایاں کر دکھلائے۔ ان کی بڑی تعداد (جن میں بہت سے پرجوش اور باہمت لوگ شامل تھے) جیلوں میں بند تھی وہ قحط زدوں کی کسی طرح مدد نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم غیر سرکاری امدادی کام شروع کیا گیا اس میں ہر طبقہ کے مردوں اور عورتوں نے حصہ لیا اور انھوں نے ناموافق حالات کے باوجود بڑی محنت سے کام کیا اس میں باہمی امداد اور تعاون، ایثار اور ریاضت کا ثبوت دیا۔ اسی طرح ہماری سیرت کی کمزوریاں اس طرح نمایاں ہوئیں کہ بعض لوگ ادنیٰ قسم کی رقابتوں اور رشک و حسد کی وجہ سے مل جل کر کام نہ کر سکے یا بعض لوگوں پر ایسا جمود طاری تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور انھوں نے مصیبت زدوں کی مدد نہ کی اور بعض ایسے بھی تھے جو قومی اور انسانی جذبات سے بالکل عاری تھے اور ان کو مطلق پروا نہ تھی کہ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔

قحط بنگال جنگ کے پیدا کردہ حالات اور ارباب حل و عقد کی بے نیازی اور کوتاہ نظری کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ حکومت کی یہ لاپرواہی واقعی ناقابل فہم ہے کیونکہ ایک معمولی عقل و سمجھ کا آدمی بھی جو اس مسئلے پر ذرا سا غور کرتا اندازہ لگا سکتا تھا کہ صورت حال نازک ہو رہی ہے۔ ابتدائی سالوں میں اگر غذائی صورت حالات کو صحیح طور پر قابو میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہوتی تو قحط کا تدارک ممکن تھا۔ دوسرے تمام ملکوں میں جن کو جنگ سے سابقہ پڑا معیشت جنگ کے اس اہم مسئلے پر جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی کافی توجہ دی گئی تھی۔ لیکن ہندوستان میں حکومت نے غذا کا محکمہ اس وقت قائم کیا جب یورپ کی جنگ کو چھڑے ہوئے ۳ ½ سال اور جاپان کی جنگ کو ایک سال سے زیادہ ہو چکا تھا۔ حالانکہ یہ بات واضح تھی کہ برما پر جاپان کا قبضہ ہو جانے سے بنگال میں غذا کی فراہمی پر بہت برا اثر پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۹۴۳ء کے وسط تک، جب قحط کی

تباہ کاری شروع ہو چکی تھی حکومت ہند نے غذا کے متعلق کوئی واضح پالیسی طے نہیں کی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت ہند نے اپنے سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے علاوہ دوسرے تمام کاموں میں ہمیشہ غیر معمولی نااہلیت کا ثبوت دیتی ہے یا شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ حکومت کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس کی تمام تر توجہ اپنے بقا کی تدبیریں سوچنے میں لگی رہتی ہے۔ جب کوئی خاص طور پر نازک صورت حال پیدا ہو جاتی ہے تو اسے مجبوراً دوسرے مسئلوں پر غور کرنا پڑتا ہے لیکن چونکہ عوام کو حکومت کی صلاحیت اور اس کے خلوص پر بھروسہ نہیں اس لئے یہ باہمی بے اعتمادی نازک صورت حالات کو نازک تر بنا دیتی ہے۔[1]

---

[1] قحط کے تحقیقاتی کمیشن نے جس کے صدر سر جان ووڈ ہیڈ تھے (یہ اس کی رپورٹ مئی ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی) محتاط سرکاری زبان میں حکومت کی مسلسل غلطیوں اور افراد کے حرص اور زر پرستی کو، جو قحط بنگال کا باعث ہوئیں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں "قحط کے اسباب اور واقعات کی چھان بین سے ہمیں بڑا دکھ ہوا ہے۔ ہمیں برابر احساس رہا ہے کہ یہ ایک انتہائی المناک حادثہ تھا۔ بنگال کے مفلس اور نادار طبقے کے پندرہ لاکھ افراد ایسے حالات کا شکار ہو گئے جن کے پیدا کرنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ ورسوسائٹی، وہ اس کے تمام اجتماعی ادارے اپنے کمزور افراد کی حفاظت کرنے میں یکسر ناکام رہے۔ در اصل اس زمانے میں محض انتظامی مشنیری ہی درہم برہم نہیں ہوئی بلکہ سارا سماجی اور اخلاقی نظام بھی درہم برہم ہو گیا تھا۔ اسباب کی بحث کے سلسلے میں انھوں نے صوبے کی معاشی زبوں حالی میں صنعتی ترقی کے نہ ہونے کی وجہ سے زمین پر بڑھتی ہوئی آبادی کے روز افزوں بوجھ کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ نیم فاقہ کشی کی حالت میں زندگی گذار رہا تھا جس کی وجہ سے (مسلسل)

اگرچہ قحط جنگ کے حالات کا نتیجہ تھا اور مناسب تدبیروں سے اس کی تباہ کاری کم کی جا سکتی تھی لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا بنیادی سبب حکومت ہند کی وہ پالیسی ہے جس نے ہندوستان کو اس حد تک مفلس اور نادار بنا دیا ہے کہ کروڑوں آدمی ہر دم نیم فاقہ کشی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ اس سلسلے میں ایک ذمہ دار برطانوی افسر کی شہادت بہت عبرت آموز ہے۔ ۱۹۳۳ء میں سرجان میگا نے جو ہندوستانی طبی سروس کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ ہندوستان کی صحت کے بارے میں ایک رپورٹ کے دوران میں لکھا تھا "ڈاکٹروں کا اندازہ ہے کہ سارے ہندوستان میں مجموعی طور پر ۳۹ فی صدی آبادی کو صحت بخش غذا ملتی ہے ۴۱ فی صدی کو ناکافی غذا اور ۲۰ فی صدی کو بالکل ہی خراب اور ناقابل اطمینان غذا ملتی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک رپورٹیں بنگال کے ڈاکٹروں کی ہیں۔

کسی مزید بوجھ کو برداشت کرنے کی ان میں صلاحیت نہ رہی تھی۔ عام طور پر لوگوں کی صحت بہت ہی کمزور تھی اور انھیں ناکافی اور غیر مناسب غذا ملتی تھی اور صحت اور دولت کے اعتبار سے ان کی حالت اس درجے خراب تھی کہ وہ کسی مزید بار کو اٹھا ہی نہ سکتے تھے قحط کے فوری اسباب کے سلسلے میں انھوں نے حسب ذیل امور کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فصل کی خرابی برما کے فتح ہو جانے کی وجہ سے چاول کی درآمد کا موقوف ہو جانا حکومت کی انکاری پالیسی جس سے بعض بہت ہی غریب طبقے تباہ ہو گئے، غذا اور ذرائع نقل و حمل میں فوجوں کی ضرورتوں کا مقدم قرار دیا جانا اور حکومت کی طرف سے بے اعتمادی کمیشن نے اس بات پر سخت تنقید کی ہے کہ حکومت بنگال اور حکومت ہند کے سامنے یا تو کوئی غذائی پالیسی ہی نہیں، یا اگر تھی تو وہ غلط تھی۔ ان میں دور اندیشی کی صلاحیت نہ تھی اور وہ آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار نہ تھے جب قحط ان کے سر پر آ پہنچا اس وقت بھی (مسلسل)

ان کا خیال ہے کہ بنگال میں محض ۲۲ فی صدی کو صحت بخش غذا ملتی ہے اور ۳۱ فی صدی کو بالکل خراب اور ناکافی غذا ملتی ہے۔"

بنگال کا یہ المناک حادثہ اور اڑلیسہ، مالابار اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جو قحط پڑا وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ناکامی پر آخری فیصلے کی نوعیت رکھتے ہیں۔ انگریز ہندوستان کو چھوڑنے پر ضرور مجبور ہوں گے اور ان کی حکومت ماضی کی ایک یاد بن کر رہ جائے گی۔ لیکن جب وہ رخصت ہوں گے تو وہ اپنے پیچھے انسانی پستی اور رنج و مصیبت کا کتنا بڑا ذخیرہ چھوڑ جائیں گے؟

تین سال ہوئے ٹیگور نے اپنی موت کے وقت اس صورت حال کا صحیح اندازہ کیا تھا۔ وہ اپنے پیچھے کس قسم کا ہندوستان چھوڑیں گے کتنی دردناک بے چارگی اور مصیبت! جب صدیوں بعد ان کی حکومت اور انتظام کا سرچشمہ خشک ہو جائے گا تو اس کے نیچے سے کس قدر کیچڑ اور گندگی کا بیابان نکلے گا۔"

انھوں نے اس کے وجود سے انکار کیا اور تدارک کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں وہ بھی بالکل ناکافی تھیں۔ ایک جگہ کمیشن نے لکھا ہے: "لیکن تمام حالات کو سامنے رکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حکومت بنگال نے اگر وقت پر سوچ سمجھ کر اور جرأت اور عزم کے ساتھ مناسب تدابیر اختیار کی ہوتیں تو کم سے کم قحط کی شدت میں بڑی حد تک کمی ہو جاتی۔ انھوں نے حکومت ہند کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ مرکزی حکومت نے بھی وقت پر غلے کی نقل و حرکت کو منظم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" مارچ ۱۹۴۳ء میں غلے پر کنٹرول ہٹانے کی ذمہ داری حکومت بنگال اور مرکزی حکومت دونوں کے سر ہے ... ہندوستان کے بیشتر حصوں میں آزاد تجارت پر عمل کرنے کی تجویز جو حکومت ہند نے بعد میں پیش کی قطعی نامناسب تھی اور اسے ہرگز پیش نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بہت سے صوبوں اور ریاستوں نے اس پالیسی پر عمل کرنے کی (مسلسل)

۷۔ ہندوستان میں نمو کی صلاحیت

قحط، اور جنگ کے باوجود زندگی کا چشمہ رواں رہتا ہے۔ اس میں بہت سے تضاد پنہاں ہیں لیکن اس میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ وہ انھیں متضاد چیزوں اور ان کی وجہ سے پیدا شدہ مصیبتوں ہی سے اپنے لئے سامان حیات فراہم کر لیتی ہے۔ قدرت نئی زندگی حاصل کرتی رہتی ہے اور کل جو زمین خون سے لالہ زار ہو گئی تھی اس کو پھول اور ہری ہری گھاس ڈھانپ لیتی ہے اور انسان کا خون زمین کو نئی غذا مہیا کر دیتا ہے اور ایک نئی زندگی کو طاقت اور رنگ و بو بخشتا ہے۔ انسان جسے قدرت نے حافظے کی غیر معمولی طاقت عطا فرمائی ہے گذری ہوئی

کامیابی سے مخالفت کی لیکن اگر اس پر عمل درآمد ہو جاتا تو ہندوستان کے مختلف حصوں کو اور بھی سخت تباہی کا سامنا کرنا پڑتا۔ مرکزی اور صوبجاتی حکومت کی بدانتظامی اور بے پروائی کا ذکر کرنے کے بعد کمیشن نے کہا ہے " بنگال کی پبلک یا کم سے کم اس کے بعض طبقوں پر بھی قحط کی ذمہ داری ایک حد تک عائد ہوتی ہے، ہم نے اوپر لالچ اور خوف کی عام فضا کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے غلے پر کنٹرول نہ ہونے کی صورت میں قیمتوں میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس مصیبت سے بھی بعض لوگوں نے بے اندازہ نفع کمایا لیکن ظاہر ہے کہ ان حالات میں ایک شخص کے ناجائز نفع کمانے کا نتیجہ دوسروں کی موت ہونا تھا۔ بہت سے لوگ فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے اور باقی لوگ فاقوں سے مر رہے تھے لیکن ان کی مصیبتوں کی طرف سے کافی بے اعتنائی برتی گئی پورے صوبے میں اور بعض طبقوں میں رشوت ستانی کا بازار خوب گرم تھا" اندازہ لگایا گیا ہے کہ فاقہ کشی کے اس بیوپار میں لوگوں نے ڈیڑھ سو کروڑ روپے بنائے۔ اگر قحط سے مرنے والوں کی تعداد پندرہ لاکھ مان لی جائے تو فی موت ایک ہزار روپیہ زیادہ نفع کمایا گیا!۔

باتوں اور افسانوں کے خیال میں مست رہتا ہے اور ہر روز نئی ہوجانے والی دنیا میں حال تک نہیں پہنچ پاتا اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا اور پھر یہ حال ماضی میں جا ملتا ہے۔ آج، جو کل کے بطن سے پیدا ہوا ہے، آنے والی کل کے لئے، جو اس کی اولاد ہے جگہ خالی کر دیتا ہے۔ فلک پیما کامیابی کا انجام محض خاک و خون ہوتا ہے۔ اور ظاہری شکست کی ہمت شکن مصیبتوں سے انسان کی روح کو نئی قوت اور نئی نظر کی دولت مل جاتی ہے۔ کم ہمت لوگ ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور خارج ہوجاتے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ شمع کو روشن رکھتے ہیں اور اسے کل کے علم برداروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

قحط کی وجہ سے لوگوں کو اس بات کا احساس پیدا ہوا کہ ہندوستان تباہی کے کس قدر قریب ہے اور اس کے اہم مسائل کا فوری حل تلاش کرنا کس قدر ضروری ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انگلستان میں عام لوگوں پر اس تباہی کا کیا ردعمل ہوا۔ لیکن بعض نے اپنی عادت کے مطابق اس تباہی کی ساری ذمہ داری ہندوستانیوں اور اس کے باشندوں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اس ملک میں غذا کی کمی ہے، ڈاکٹروں کی کمی ہے، طبی مدد اور صفائی کی کمی ہے، ذرائع آمدورفت کی کمی ہے۔ غرض یہاں آدمیوں کے علاوہ ہر چیز کی قلت ہے اور ملک کی آبادی بے حد بڑھ گئی ہے اور بڑھتی جاتی ہے۔ یہ کوتاہ اندیش قوم بغیر کسی اطلاع یا تنبیہہ کے اپنی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کرلی رہتی ہے۔ اور ایک ہمدرد حکومت کی تجویزوں منصوبوں (یا ان کے فقدان) کو درہم و برہم کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں سارا الزام ہندوستانیوں ہی پر ہے۔ لہذا معاشی مسائل نے اچانک ایک نئی اہمیت حاصل کرلی اور ہمیں یہ تلقین کی جانے لگی کہ اس نازک موقع پر سیاست اور سیاسی جھگڑوں کو ہمیں ملتوی رکھنا چاہئے گویا سیاست کا اس کے علاوہ کوئی اور کام ہے کہ وہ حال کے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کی

کوشش کرے اور حکومت ہند نے جو دنیا میں آزاد مقابلے کی روایات کے چند علم برداروں میں سے تھی "منصوبہ بندی" کا راگ الاپنا شروع کیا حالانکہ اسے یہ خبر بھی نہ تھی کہ منظم منصوبہ بندی کیا چیز ہے۔ اور موجودہ نظام معاشرت کو، اور اپنے اور اپنے حلیفوں کے مخصوص مفاد کے تحفظ کے علاوہ اب بھی اسے کسی چیز کا خیال نہ تھا۔

لیکن خود ہندوستان میں اس قحط کا ردعمل بہت گہرا تھا گو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی بے شمار دفعوں کی وجہ سے اس کا واضح طور پر اظہار نہیں ہو سکا۔ بنگال کا معاشی نظام قطعی طور پر تباہ ہو گیا تھا اور قحط نے کروڑوں کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ لیکن بنگال میں جو کچھ ہوا وہی ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ہو رہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ بنگال میں یہ چیز اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب پرانے نظام کی طرف لوٹنا ناممکن ہے۔ سرمایہ دار بھی جنھوں نے جنگ کے دوران میں خوب روپیہ کمایا تھا گھبرا اٹھے۔ اور انھوں نے بھی مجبوراً مستقبل کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ وہ خود ٹھوس حقیقت پرست تھے اور اس وجہ سے بعض سیاسی لیڈروں کی عین پسندی سے خائف بھی۔ لیکن اس کی حقیقت شناسی نے انھیں دور رس نتائج تک پہنچنے پر مجبور کر دیا۔ بمبئی کے کئی بڑے کاروباری آدمیوں نے جن میں سے بیشتر ٹاٹا گروپ سے تعلق رکھتے ہیں ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے ایک پندرہ سالہ منصوبہ مرتب کیا۔ یہ خاکہ اب بھی مکمل نہیں ہو ہے اور اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ قدرتی طور پر اس میں بڑے بڑے کارخانہ داروں کے ذہنی پس منظر کی جھلک نمایاں ہے۔ اور انھوں نے حتی الامکان انقلابی تبدیلیوں سے بچنے کی کوشش کی ہے لیکن واقعات کی بے پناہ یورش نے انھیں وسعت نظر کے ساتھ سوچنے پر اور فکر و خیال کے پرانے راستوں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے انقلابی تبدیلیاں ناگزیر ہیں، گو ممکن ہے خود اس کے مصنف بہت سی ان تبدیلیوں کو پسند نہ کریں۔ اس کے

مصنف قومی تنظیمی کمیٹی کے ممبر رہ چکے تھے اور انھوں نے اس کے کام سے ایک حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔ اس منصوبے میں لازماً بہت سی تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ بہت سے اضافوں کی ضرورت ہوگی اور بہت سی تفصیلیں سامنے رکھنی ہوں گی لیکن ایک قدامت پسند طبقے کی طرف سے اس قسم کے منصوبے کی تیاری بہت خوش آیند ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں ہندوستان کو کس طرف قدم اٹھانا ہے۔ اس منصوبے کی بنیاد ایک آزاد ہندوستان اور اس کے سیاسی اور معاشی اتحاد پر رکھی گئی ہے۔ زر کے متعلق قدامت پرست بینکر کے نظریے کو پس پشت ڈال کر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ملک کا اصلی سرمایہ اس کے معاشی ذرائع اور اس کے افراد پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کی یا اس طرح کے کسی اور منصوبے کی کامیابی کا انحصار محض پیداوار میں اضافے پر نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قومی دولت کی تقسیم مناسب اور منصفانہ طور پر کی جائے۔ کامیابی کی ایک اور بنیادی شرط یہ ہے کہ زرعی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

منصوبہ بندی اور منصوبہ بند معاشی زندگی کا تصور تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اب ساری دنیا نے مان لیا ہے۔ لیکن منصوبہ بندی بذات خود کوئی معنی نہیں رکھتی اور ضروری نہیں کہ اس سے لازمی طور پر اچھے نتائج برآمد ہوں۔ اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ حکومت کیسی ہے۔ منصوبہ بندی میں کن مقاصد کو سامنے رکھا گیا ہے اور منصوبے کو چلانے اور منظم کرنے والے کون اور کس قسم کے لوگ ہیں۔ کیا منصوبے کا واقعی مقصد یہ ہے کہ سارے ملک کی بھلائی اور ترقی ہو اور تمام افراد کے لئے نئی نئی راہیں نکل جائیں اور آزادی اور مل جل کر کام کرنے اور تنظیم عمل کے نئے طریقوں سے کام لیا جائے۔ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہو تو بلاشبہ منصوبہ بندی سے عام فلاح و بہبود کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ملک کی پیداوار میں اضافہ بلاشبہ ضروری ہے لیکن محض اس اضافے سے

ہمارے مسائل حل نہیں ہوجاتے بلکہ ممکن ہے اس اضافے سے ان مسائل کی پیچیدگیاں بڑھ جائیں اگر پرانی مراعات اور مفاد مخصوص کی کوشش کی جائے گی تو منصوبہ بندی کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ حقیقی منصوبہ بندی کا تقاضہ ہے کہ جماعتوں اور افراد کے مخصوص مفاد کو عام مفاد کی راہ میں حارج نہ ہونے دیا جائے۔ صوبوں کی کانگریسی حکومتوں کے تجربے سے اس سلسلے میں ہم کافی سبق سیکھ سکتے ہیں جن کو قدم قدم پر رکاوٹوں اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مرکزی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کی رو سے انھیں اس قسم کے بیشتر مفاد مخصوص کو چھونے تک کی اجازت نہ تھی۔ جب انھوں نے زمین کی ملکیت وغیرہ کے قوانین میں ترمیم کرنے اور زرعی آمدنی پر ٹیکس لگانے کی کوشش کی تو اس کے خلاف بھی عدالتوں میں چارہ جوئی کی گئی تھی۔

اس طرح اگر منصوبوں کو چلانے کا انتظام ...... ہی سے افسروں اور سرمایہ داروں کو ہوا تو وہ انھیں اسی نظام کے اندر ڈھالیں گے جس کے تحت یہ بڑے لوگ کام کرنے کے عادی ہوچکے ہیں اور اس کی بنیاد سرمایہ دارانہ سماج کے نفع کمانے کے جذبے پر ہوگی۔ ان کے ارادے خواہ کتنے ہی نیک ہوں اور اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض بہت اچھے ارادے رکھتے ہیں، ان کے لئے بالکل نیا انداز فکر اختیار کرنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کی ایک مثال اس بات سے مل جاتی ہے کہ جب یہ لوگ صنعتوں پر حکومت کی نگرانی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر حکومت کی وہی شکل ہوتی ہے جو اس وقت ہے۔

ایک بڑی دلچسپ بات آج کل کبھی کبھی یہ سننے میں آتی ہے کہ چونکہ حکومت ہند نے ریلوں کو اپنی ملکیت اور نگرانی میں لے لیا ہے اور صنعت و حرفت، مالیات اور زندگی کے دوسرے بہت سے شعبوں پر اپنی نگرانی اور نظم قائم کر رہی ہے اس لئے وہ اشتراکیت کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن قطع نظر اس سے کہ یہ تصور غلط ہے، اس کی نوعیت

جمہوری ریاست کی نگرانی سے بالکل مختلف ہے اس کی وجہ سے بعض سرمایہ دارانہ کاروبار پر کچھ پابندیاں ضرور عائد کی گئی ہیں لیکن دراصل اس کی بنیاد خاص خاص مفاد کے تحفظ ہی پر رکھی گئی ہے. نوآبادیات کے پرانے استبدادی نظام کے تحت معاشی مسائل پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی سوائے بعض خاص افراد یا جماعتوں کے مفاد کے تحفظ کے. لیکن جب یہ نظام پرانے آزاد مقابلے کے اصولوں پر چل کر نئی زندگی کے مسائل کو حل نہیں کر سکتا اور اس کے ساتھ ہی اپنی پرانی مستبدانہ نوعیت قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہ فسطائی طریقہ عمل اختیار کرے. وہ فسطائی اصولوں کے مطابق معاشی کاروبار پر پابندیاں لگاتا ہے. شہری آزادی کو سلب کر لیتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت کے مطلق العنان طریقوں اور سرمایہ دارانہ نظام میں تھوڑا بہت ردوبدل کر کے اس کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے فسطائی ملکوں کی طرح کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک یک سنگی ریاست کی تعمیر کی جائے جس کی بنیادیں تو پرانے اصولوں ہی پر ہوں لیکن اسے صنعت اور قومی زندگی کی تشکیل پر کافی اختیار حاصل ہو اور اقتصادی کاروبار کی آزادی پر پابندیاں لگانے کا حق ہو. اور یہ اشتراکیت سے ایک بالکل مختلف چیز ہے. سچ تو یہ ہے کہ ایک محکوم ملک میں اشتراکیت کا ذکر ہی بالکل بے معنی چیز ہے. ایسی کوشش کی عارضی کامیابی بھی مشتبہ ہی سی ہے. کیونکہ اس طرح پرانے مسائل کی دقتیں اور بڑھ جاتی ہیں. لیکن جنگ کے زمانے میں اس طرح کی کوشش کے لئے فضا ضرور سازگار ہو جاتی ہے مگر جمہوری حکومت کی غیر موجودگی میں اگر صنعتوں کو پوری طرح قومی ملکیت بھی بنا دیا جائے اس کا نتیجہ بھی محض استحصال اور لوٹ کھسوٹ ہی ہوگا گو اس کی شکل قدرے مختلف ہو. کیونکہ ایسی صورت میں اگر صنعتیں حکومت کی ملکیت ہو جائیں گی لیکن خود حکومت تو عوام کی ملکیت نہ ہوگی!

ہندوستان میں ہماری سب سے بڑی مشکلات کا سبب یہ ہے کہ اپنے تمام معاشی، معاشرتی، صنعتی زرعی مسائل اور فرقہ وارانہ کشمکش اور ریاستوں کے معاملات کو موجودہ حالات کو برقرار رکھتے ہوئے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اس نظام کی موجودگی میں اور ان خاص مراعات اور مراتب کو باقی رکھ کر جو اس کا ایک لازمی جزو ہیں انھیں حل کرنا ناممکن ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر اگر کوئی وقتی، انمل بے جوڑ سا حل ڈھونڈھ بھی لیا جائے تو یہ مستقل ثابت نہیں ہو سکتا۔ پرانے مسائل اپنی جگہ باقی رہتے ہیں اور نئے مسائل یا پرانے مسائل کے نئے پہلو پیدا ہوتے رہتے ہیں ان مسائل کے حل کے متعلق ہمارا یہ طرزِ عمل کچھ پرانی روایتوں اور عادتوں پر مبنی ہے لیکن اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس فرسودہ نظام کو برطانوی حکومت کی قوت سہارا دے کر قائم رکھتی ہے۔

جنگ نے ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تضاد کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ سیاسی حیثیت سے ہندوستان میں آج آزادی اور خودمختاری کا بڑا شور سننے میں آتا ہے۔ لیکن اپنی طویل تاریخ میں ہندوستان کو شاید اس قدر استبداد اور ظلم کا پہلے کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا ہے جس قدر آج اور ہمارا مستقبل اسی حال کا نتیجہ ہوگا۔ معاشی حیثیت سے بھی ہندوستان پر برطانوی اقتدار جوں کا توں قائم ہے لیکن ہندوستان کی معاشی زندگی کی توسیعی رجحانات ہر لمحے اقتدار کے لئے ایک خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف ملک میں قحط اور افلاس کا دور دورہ ہے۔ دوسری طرف بعض لوگوں کے ہاتھ میں بے اندازہ سرمایہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ اس طرح ملک میں بہ یک وقت غربت اور دولت، زوال اور تعمیر، اتحاد و انتشار، پرانے اور نئے خیالات دوش بدوش ہیں لیکن ان تمام افسوسناک حالات کے ساتھ ساتھ ایک اندرونی جوشِ حیات بھی کارفرما ہے جس کو دبایا نہیں جا سکتا۔ ظاہراً طور پر جنگ سے ہندوستان کی

صنعتی ترقی اور پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ اس ترقی میں کتنا حصہ نئی صنعتوں کے قیام کا ہے اور کتنا پرانی صنعتوں کی وسعت یا ان میں ترمیم ہے۔ جنگ کے دوران میں صنعتی کاروبار کے انڈکس کا اپنی جگہ پر قائم رہنا تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی بنیادی معاشی ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ بعض باخبر حلقوں کا تو یہ خیال ہے کہ جنگ اور حکومت ہند کی معاشی پالیسی نے مل کر ہندوستان کی صنعتی ترقی کی راہ میں دقتیں پیدا کردی ہیں۔ مشہور ماہر معاشیات ڈاکٹر متھائی نے جو ٹاٹا کمپنی کے ایک ڈائرکٹر ہیں ایک بیان میں کہا ہے: "یہ عام یقین کہ جنگ نے ہندوستان کی صنعتی ترقی کی رفتار تیز کردی ہے ایک ایسی بات ہے جسے ثابت کرنا بہت مشکل ہے، یہ تو صحیح ہے کہ جنگ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بعض پرانی صنعتوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے لیکن بہت سی نئی صنعتوں کے قیام کے منصوبے جو لوگوں نے جنگ کے پہلے سے باندھ رکھے تھے جنگ کے حالات کی وجہ سے یا تو ترک کردیئے گئے ہیں یا تکمیل کو نہیں پہنچ سکے۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر تمام حالات پر نظر رکھی جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ برخلاف کینیڈا اور آسٹریلیا کے جنگ نے ہندوستان کی معاشی ترقی کو تیز کرنے کے بجائے اس میں رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ ہاں مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ ہندوستان اپنی بنیادی صنعتی ضروریات کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے" اور معاشی کاروبار کے متعلق جو کچھ بھی اعداد و شمار موجود ہیں ان سے اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ پتہ لگتا ہے کہ اگر جنگ سے پہلی کی رفتار باقی رہی ہوتی تو اب تک نہ صرف نئی صنعتیں وجود میں آجاتیں بلکہ مجموعی پیداوار میں بھی نمایاں اضافہ ہوتا۔[1]

ہاں لڑائی نے اس بات کو قطعی طور پر ثابت کردیا ہے کہ اگر ہندوستان کو موقع ملے تو وہ اپنے صنعتی امکانات کو بہت تیزی کے ساتھ بروئے کار لا سکتا ہے۔ تمام

---

[1] اگلے صفحے پر دیکھئے

دقتوں کے باوجود اس نے گذشتہ پانچ سال میں کافی سرمایہ جمع کرلیا ہے۔ یہ سرمایہ فی الحال اسٹرلنگ فاضلات کی شکل میں لگا ہوا ہے جس سے فی الحال کام نہیں لیا جاسکتا اور کہا جاتا ہے کہ مستقبل میں بھی ہم اسے اپنی حسب منشا جس طرح چاہیں استعمال کرسکیں گے۔ حکومت ہند نے برطانوی اور امریکن حکومتوں کی طرف سے جو مصارف کئے ہیں یہ اسٹرلنگ فاضلات اس کا نتیجہ ہیں۔ ہندوستان نے بھوک، قحط، وبا، صحت کی خرابی، بیماری اور فاقہ کشی کی جو مصیبتیں اٹھائی ہیں

سلسلہ نمبر ۴۴ ۳۰ مئی ۱۹۴۵ء کو انگلستان میں ایک تقریر کے دوران میں مسٹر جے آر ڈی ٹاٹا نے بھی اس بات سے انکار کیا کہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کی صنعتوں میں بہت ترقی ہوئی یا ہماری صنعتی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ ممکن ہے کہیں کہیں کچھ اضافہ ہوا ہو لیکن مجموعی طور پر اگر اسلحہ کے کارخانوں اور اس طرح کے دوسرے کارخانوں کو جو جنگی ضروریات کے لئے وجود میں آئے تھے الگ کرکے دیکھا جائے تو ترقی کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ جنگ نہ ہوتی تو بہت سی نئی اسکیموں پر عمل ہوا ہوتا۔ میں اپنے ذاتی تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں انجنوں اور لوہا اور مشینوں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی اسکیمیں ترک کرنی پڑیں۔ جو لوگ ہندوستان میں معاشی اور صنعتی ترقی کا ذکر کرتے ہیں وہ درحقیقت صحیح حالات سے واقف نہیں ہیں۔ ایک جگہ اور انھوں نے کہا "مجھے ایک غلط بات کی تردید کرنی ہے کہ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان میں کوئی مادی ترقی ہوئی ہے یا اسے کوئی ترقی پہنچا ہے۔ مختلف وجوہات سے ہندوستان میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی بلکہ ترقی معکوس ہوئی ہے۔ دراصل صورت یہ ہے کہ جنگ کی وجہ سے اور اس میں ہندوستان کو جو امداد دینی پڑی بنگال کے کئی لاکھ انسان قحط کا شکار ہوئے، غذا کے قحط کے ساتھ ساتھ ملک کو کپڑے کے قحط کا سامنا کرنا پڑا اور کسی قسم کی معاشی ترقی نہیں ہوسکی۔"

وہ سب ہی اس سرمایے کی فراہمی میں شامل ہیں۔

ان فاضلات کے جمع ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان نے انگلستان کا بھاری قرض چکا دیا ہے اور اب خود انگلستان ہمارا مقروض ہو گیا ہے اگرچہ مجرمانہ لاپروائی اور بدانتظامی کی وجہ سے لوگوں کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ ہندوستان اتنا کثیر سرمایہ تھوڑی سی مدت میں جمع کر سکتا ہے۔ ہندوستان نے گذشتہ پانچ سال میں جنگ پر جو رقم خرچ کی ہے وہ اس سرمائے سے کہیں زیادہ ہے جو برطانیہ نے گذشتہ سو سالوں میں ہندوستان میں لگایا تھا۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے گذشتہ سو برس میں حکومت برطانیہ کے تحت میں کس قدر کم ترقی کی ہے حالانکہ اس ضمن میں ہم ریلوں، آبپاشی اور اس طرح کے دوسرے کاموں کا بہت کچھ ذکر سنتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان تیزی کے ساتھ ہر لحاظ سے ترقی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر ناموافق حالات اور ایک غیر ملکی حکومت کی ماتحتی میں جو ہندوستان کی صنعتی ترقی کو پسندیدگی کی نظر نہیں دیکھتی۔ اتنی زبردست کوشش کی جا سکتی ہے تو ظاہر ہے ایک آزاد قومی حکومت کے ماتحت منظم طور پر منصوبہ بندی کے ذریعے چند سال میں ہندوستان کا نقشہ یکسر بدلا جا سکتا ہے۔

انگریزوں کی ایک عجیب و غریب عادت یہ ہے کہ وہ موجودہ ہندوستان میں اپنے معاشی اور معاشرتی کارناموں کا اندازہ کرنے کے لئے معیار یہ انتخاب کرتے ہیں کہ یہاں یا کسی دوسرے ملک میں ماضی بعید میں کیا سماجی حالات تھے۔ وہ بہت خوش فہمی کے ساتھ اپنے کارناموں کا مقابلہ ان تبدیلیوں سے کرتے ہیں جو آج سے سیکڑوں برس پہلے کی گئی تھیں، صنعتی انقلاب، اور خصوصاً پچھلے ۵ سالوں

کی غیر معمولی فنی ترقی نے زندگی کی رفتار کو بالکل بدل ڈالا ہے لیکن جب وہ ہندوستان کا ذکر کرتے ہیں تو اس حقیقت کو سراسر فراموش کر دیتے ہیں، مدح خوانوں کو اس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جب انھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو ہندوستان کوئی غیر مہذب وحشی اور بنجر ملک نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب قوم کا وطن تھا جبکی ترقی عارضی طور پر رک گئی تھی اور صنعت وحرفت وغیرہ میں پیچھے رہ گیا تھا۔

لیکن پھر اس طرح کے باہمی تقابل میں ہمیں کون سا معیار اور قدریں سامنے رکھنی چاہیں۔ جاپانیوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے منچوکو کو ۹ سال میں صنعتی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ مثلاً وہاں کوئلے کی پیداوار اس مدت میں اس سے کہیں زیادہ بڑھ گئی جتنی ہندوستان میں برطانوی کوشش سے سو سال میں ہو سکی تھی۔ اسی طرح کوریا کی مادی ترقی کے لئے جاپانیوں نے جو کچھ کیا وہ نوآبادیات کے حکمراں ملکوں کے مقابلے میں کسی سے کم نہیں[لہ] لیکن ان کارناموں کے پس پشت غلامی، ظلم و تعدی، ذلت استحصال اور عوام کی روح کو کچل ڈالنے کی ناپاک سعی کارفرما تھی۔ محکوم ملکوں اور نسلوں پر ظلم کرنے اور انھیں کچلنے میں نازی اور جاپانی سب لوگوں سے آگے بڑھ گئے تھے اور ہمیں یہ بات اکثر یاد دلائی جاتی ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کا سلوک کبھی اتنا برا نہیں ہوا، تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ سیاسی سلوک پر رائے لگانے اور مقابلہ کرنے کے لئے آئندہ یہ معیار استعمال کیا جائے گا؟

آج ہندوستان میں قنوطیت چھائی ہوئی ہے اور لوگوں میں شکست کا عام احساس ہے۔ ان دونوں کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے کیونکہ ہماری قوم نے بڑی

لہ اگلے صفحے پر دیکھئے۔

مصیبتیں اٹھائی ہیں اور مستقبل بھی کچھ بہت روشن نظر نہیں آتا۔ لیکن سطح کے نیچے زندگی کے نئے آثار اور نیا عزم، آگے بڑھنے کی نئی امنگ اور ولولہ موجود ہیں اور بہت سی ان جانی قوتیں اندر ہی اندر کام کر رہی ہیں۔ تحریک کی سرکردگی تو لیڈر ہی کرتے ہیں لیکن حقیقتاً ان کی سیاست کے رخ کا تعین ان کی بیدار ہونے والی قوم کی غیر محسوس اور غیر شعوری خواہش ہی کرتی ہے۔ یہ قوم جو اب اپنے ماضی کے بوجھ سے آزاد ہوتی جا رہی ہے۔

نیہ ص۴۴۷ ہیلٹ ابنڈ نے، جو مشرق بعید میں کئی سال تک نیویارک کے اخبار ٹائمز کا نامہ نگار رہا تھا، اپنی کتاب پیسینگ چارٹر میں لکھتا ہے "انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ جہاں تک مختلف مادی ترقی کا تعلق ہے جاپانیوں نے کوریا میں بڑا نمایاں کام انجام دیا ہے جب انھوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو عوام کی صحت اور افلاس کے اعتبار سے ملک کی حالت بہت ابتر تھی، پہاڑوں کے جنگلوں کا صفایا ہو چکا تھا، وادیاں بار بار سیلاب کا شکار ہوتی رہتی تھیں، اچھی سڑکیں ناپید تھیں، جہالت کا دور دورہ تھا اور تپ محرقہ، چیچک، ہیضہ اور طاعون وغیرہ بیماریاں ہر سال ان پر نازل ہوتی رہتی تھیں۔ آج پہاڑوں پر دوبارہ سے بہت جنگل کھڑے ہیں۔ ہسپتالوں، شفاخانوں اور ڈاکٹروں اور عوام کی صحت کی دیکھ بھال کا بہت اچھا انتظام ہے۔ بہت سی اچھی سڑکیں بن گئی ہیں۔ سیلاب کی روک تھام ہو گیا ہے۔ آبپاشی سے غذا کی پیداوار کی مقدار میں بہت سا اضافہ ہوا ہے اور بہت سی عمدہ بندرگاہیں بنا کر ان کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔ ملک کی خوش حالی اور صحت میں اتنا نمایاں فرق ہو گیا کہ ۱۹۰۵ء کے مقابلے میں آبادی ایک کروڑ دس لاکھ پر مشتمل تھی اب اس کی تعداد دو کروڑ چالیس لاکھ پر پہنچ گئی ہے اور ان کا معیار زندگی اس صدی کے ابتدائی ایام کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر بلند ہو گیا ہے۔" لیکن ابنڈ نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ جاپانیوں نے یہ سب کچھ کوریا کے عوام کے لئے نہیں کیا ہے بلکہ اس لئے کہ خود جاپانیوں کو کوریا سے زیادہ نفع حاصل کرنے کا موقع ملے

۸۔ ہندوستان کی ترقی میں رکاوٹیں

افراد کی طرح ایک قوم کی بھی جداگانہ شخصیتیں ہوتی ہیں اور زندگی کی جانب مختلف نقطہ نظر ہوتے ہیں اگر ان مختلف شخصیتوں میں گہرا اور منظم تعلق ہو تو نتائج اچھے ہوتے ہیں۔ ورنہ انتشار اور دشتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ عام حالات میں باہمی ہم آہنگی کا عمل خود بخود جاری رہتا ہے اور ایک قسم کا توازن قائم ہو جاتا ہے۔ اگر اس طبعی نشوونما کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں یا تبدیلی کی رفتار اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اسے سہولت سے قبول نہیں کیا جا سکتا تو ان مختلف شخصیتوں کے تصادم کی وجہ سے معاشرے میں کش مکش پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کی سطحی کش مکش اور فرقہ بندیوں کو الگ کر کے اگر ہم غور کریں تو پتہ چلے گا کہ بہت عرصے تک ترقی کے بند رہنے کی وجہ سے یہاں بھی یہی بنیادی کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ سماج کو مستحکم رہنے اور ترقی پسند ہونے کے لئے دو چیزوں کی یکساں ضرورت ہوتی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ معاشرے کی بنیاد چند کم و بیش اٹل اصولوں پر رکھی جائے اور دوسری طرف اس میں حرکت کی صلاحیت اور جذبہ ہو۔ اگر اس میں حرکت اور تبدیلی کی صلاحیت نہ ہوگی تو جمود اور زوال کا اندیشہ ہے اور اگر اس میں بعض اٹل اصول نہ ہوں گے تو انتشار اور تباہی کا اندیشہ ہے۔

ہندوستان میں قدیم زمانے سے ہی اس طرح کے بنیادی اصولوں کی جو دائمی، مطلق اور عالمگیر ہوں تلاش رہی ہے۔ لیکن اس میں حرکت کی صلاحیت اور زندگی اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا اعتراف بھی موجود تھا۔ ان دو بنیادوں پر ایک مستحکم اور ترقی پسند معاشرے کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ گو یہ تسلیم کرنا

بڑے گا کہ زیادہ تر زور ہمیشہ استقلال امن اور بقائے نسل ہی پر دیا جاتا تھا۔ کچھ
عرصے کے بعد حرکت کی یہ صلاحیت کم ہو گئی اور روائتی اصولوں کے نام پر سماجی
نظام کو بے لوچ اور ساکن بنا دیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ نظام بالکل ہی جامد نہیں
ہوا اور اس میں آہستہ آہستہ اور مسلسل تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں۔
لیکن اس نظام کے تصور اور اس کے طریق کار میں کوئی خاص تبدیلی نہیں
ہوئی۔ جماعتی تصور جس کی نمائندگی کم و بیش الگ الگ ذاتیں کرتی تھیں، مشترکہ
خاندان اور دیہاتوں کی مشترک قومی اختیاری زندگی یہ اس نظام کی بنیادی چیزیں
تھیں اور یہ سب بہت عرصے تک اس لئے قائم رہیں کہ اپنی کمزوریوں کے
باوجود ان سے انسانی فطرت اور سوسائٹی کی بعض اہم ضرورتیں پوری ہوتی
تھیں۔ ان کے طفیل ہر جماعت کو اطمینان اور سکون نصیب تھا اور ایک طرح
کا جماعتی آزادی کا احساس۔ ذات پات کا نظام اس لئے قائم رہا کہ وہ سوسائٹی
میں قوت کی تقسیم کی نمائندگی کرتا تھا اور طبقہ وارانہ مراعات اور خاص حقوق
محض اس لئے نہیں بچے رہے کہ اس زمانے کا معاشرتی تصور ہی یہ تھا بلکہ
اس لئے کہ ان حقوق کے پیچھے طاقت، ذہانت، لیاقت اور خود کو قربان کر دینے
کا جذبہ موجود تھا۔ اس تصور کی بنیاد مفاد کے کسی تضاد پر نہیں، بلکہ اس بات پر
تھی کہ ہر فرد کے دوسرے انسانوں کی طرف کچھ فرائض ہیں جن کو مناسب طور پر
سرانجام دینا ضروری ہے اور جماعت کے مختلف افراد میں اور مختلف جماعتوں
میں باہم تعاون اور اشتراک عمل ہونا چاہئے اور ان سب کا مقصد جنگ نہیں بلکہ
امن قائم کرنا تھا۔ اگرچہ سماجی نظام جامد تھا لیکن دماغی آزادی پر کوئی پابندی نہیں
لگائی گئی تھی۔

ہندوستانی تہذیب کے پیش نظر جو مقاصد تھے ان میں سے بیشتر اس

نے حاصل کئے لیکن اس دوران میں زندگی کی نبض سست پڑ گئی کیونکہ زندگی حرکت اور نمو چاہتی ہے ایک نہ بدلنے والے نظام کی پابندیوں میں گرفتار نہیں رہ سکتی۔ یہاں تک کہ ان بنیادی تصورات کو بھی جنھیں دائمی سمجھا جاتا ہے اگر بے چون وچرا تسلیم کر لیا جائے اور ان کی تلاش جاری نہ رہے تو ان کی واقعیت اور تازگی ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقت، حسن اور آزادی کے تصورات کمزور پڑ جاتے ہیں اور ہماری حیثیت ایک قیدی کی سی ہو جاتی ہے جو ایک بے جان معمول کا غلام ہوتا ہے۔

ہندوستان میں جس چیز کی کمی تھی وہی مغرب جدید میں بدرجۂ اتم موجود تھی اس میں حرکت اور نمو کی قوت اور خواہش تھی۔ وہ اپنی بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ اسے ایسے اساسی اصولوں کی تلاش کی فکر نہ تھی جو دائمی اور عالمگیر ہوں۔ مغرب انسان کے فرائض اور ذمہ داریوں سے زیادہ اس کے حقوق پر زور دیتا ہے۔ وہ جارحانہ حد تک مستعد اور سرگرم ہے۔ اور طاقت اور حکومت حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس کی تمام تر توجہ حال پر مرکوز ہے اور اس بات کی فکر نہیں کہ مستقبل پر ان اعمال کا کیا اثر پڑے گا۔ حرکت اور نمو کی صلاحیت کی وجہ سے اس میں زندگی اور ترقی کا ولولہ ہے لیکن اس زندگی میں بخار کا سا ہیجان ہے اور یہ بخار بڑھتا جاتا ہے۔ اگر ہندوستانی تہذیب اس لئے کمزور ہو گئی کہ اس میں جمود، خود بینی اور خود پرستی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ تو موجودہ مغربی تہذیب نے بھی اپنے بہت سے کارناموں کے باوجود کچھ بہت نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی اور وہ بھی زندگی کے بنیادی مسائل کو حل نہیں کر سکی۔ اس کی فطرت میں کش مکش کا مادہ ہے اور اس کی وجہ سے وہ بار بار کچھ وقفے سے ایک بڑے پیمانے پر جنگ کی تباہی میں گرفتار

ہوجاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کو استحکام بخشنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ کچھ ایسے بنیادی اصولوں کی جو زندگی کو بامعنی بنا دیں۔ یہ اصول کیا ہیں مجھے خود پتہ نہیں۔ لیکن مغرب کی تہذیب کے لئے اب بھی امید ہے کیونکہ اس میں قوت عمل، زندگی اور تجسس کا مادہ موجود ہے۔

ہندوستان اور چین کو مغرب سے ضرور سبق سیکھنا چاہئے کیونکہ مغرب ہمیں کچھ سکھا سکتا ہے اور وہ آج عہد حاضر کی روح کا نمائندہ ہے۔ لیکن مغرب کو بھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اور محض فنی ترقیاں اسکو سکون اور اطمینان کی دولت نہیں بخش سکتیں جب تک وہ زندگی کی بعض گہری حقیقتیں نہ سیکھیں جن کی تلاش میں ہر ملک اور ہر زمانے کے مفکرین لگے رہے ہیں۔

ہندوستان پر جمود ضرور طاری تھا۔ لیکن یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ یہاں بالکل کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مکمل جمود موت کی نشانی ہے۔ ایک مہذب قوم کی حیثیت سے ہندوستان کا باقی رہ جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کی تھوڑی بہت کوشش ضرور ہوتی رہی ہے۔ جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمایا، ہندوستان فنی حیثیت سے تو بلاشبہ کچھ پیچھے تھا۔ لیکن اس وقت بھی اس کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ تجارتی ممالک میں ہوتا تھا۔ یہ فنی تبدیلیاں بلاشبہ ہندوستان میں بھی وقت آنے پر ہو جاتیں اور ان سے ہندوستان اسی طرح اثر پذیر ہوتا جیسے دوسرے مغربی ممالک ہوئے تھے۔ لیکن برطانوی اقتدار نے ہندوستان کی طبعی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈال دی۔ صنعتی ترقی روک دی گئی اور نتیجے کے طور پر معاشرتی ترقی بھی رک گئی۔ سوسائٹی کی با اقتدار جماعتیں نئے حالات کے مطابق نہ اپنے کو ڈھال سکیں نہ کوئی صحیح توازن قائم ہو سکا کیونکہ اصل اقتدار ان

کے ہاتھ سے نکل کر بیرونی حکمرانوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا اور اس اقتدار کی بنیاد طاقت پر تھی اور یہ ان جماعتوں اور طبقوں کی ہمت افزائی کرتا تھا جو اپنی حقیقی اہمیت کھو چلے تھے۔ روز بروز ہندوستانی زندگی زیادہ مصنوعی ہوتی گئی۔ وہ افراد اور جماعتیں جو بظاہر بہت ہی اہم فرائض کی انجام دہی میں مشغول نظر آتی تھیں دراصل کوئی حقیقی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ اور ان کا وجود تمام تر اس بات پر منحصر تھا کہ غیر ملکی حکومت نے ان کو اہمیت دی تھی۔ تاریخی حیثیت سے اب ان کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی اور اگر انھیں ایک بیرونی حکومت کا سہارا نہ مل جاتا تو وہ فنا ہو جاتے اور ان کی جگہ نئی طاقتیں وجود میں آجاتیں۔ وہ محض برطانوی اقتدار کی کھوکھلی نشانی اور اس کے پٹھو بن کر رہ گئے تھے اور اس طرح قومی زندگی کے دھارے سے الگ ہوتے جارہے تھے۔ عام حالات میں انقلاب یا جمہوریت کے اثرات یا تو انھیں فنا کر دیتے یا انھیں مناسب فرائض کی انجام دہی میں لگا دیتے۔ لیکن ایک بیرونی استبدادی حکومت کے زیر نگیں ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ غرض مٹے ہوئے ماضی کی ان نشانیوں نے ہندوستان کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دیں اور وہ حقیقی تبدیلیاں جو اس وقت ہو رہی تھیں اس مصنوعی پردے کی آڑ میں چھپ گئیں۔ ان حالات میں نہ کوئی صحیح سماجی توازن قائم ہو سکتا تھا اور نہ سماج میں نئی طاقتیں فروغ پا سکتی تھیں۔ لیکن غیر حقیقی مسائل کی اہمیت میں ضرور اضافہ ہو گیا۔

آج ہمارے سامنے جو مسائل ہیں ان میں سے بیشتر کا سبب یہ ہے کہ برطانوی اقتدار نے ہندوستان کی ترقی اور ناگزیر تبدیلیوں کو ایک دوسرے سے روک دیا ہے۔ اگر اس بیرونی عنصر کو علیحدہ کر دیا جائے تو ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ یہاں اقلیتوں کا مسئلہ دنیا کی اقلیتوں کے

مسئلے سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ بلکہ دراصل یہ اقلیتوں کا مسئلہ ہی نہیں ہے اس کے بہت سے پہلو ہیں اور بلاشبہ اس الزام کی ذمہ داری ہمارے سر تھی اور اب بھی ہے۔ لیکن اس مسئلے اور دوسرے بہت سے اور مسائل کی پشت پناہ دراصل برطانوی حکومت کی یہ خواہش ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو موجودہ معاشی اور سیاسی نظام کو حتی الامکان محفوظ رکھا جائے۔ اور اسی مقصد کے پیش نظر سماجی لحاظ سے پس ماندہ طبقوں کو ان کی موجودہ حالت میں قائم رکھا جائے۔ اور ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ سیاسی اور ترقی کو نہ صرف براہ راست روکا گیا ہے بلکہ اب اس کے لئے یہ شرط لازم قرار دی گئی ہے کہ رجعت پسند جماعتیں اور غرض مند افراد اس کے ساتھ اتفاق کریں اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ان کی موجودہ مراعات اور خاص حقوق کو برقرار رکھا جائے یا انھیں مستقبل کے نظام کی تشکیل میں فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں اور اس طرح اہم حقیقی تبدیلیوں اور ترقی کا ہونا ناممکن ہو جائے۔ نئے دستور کے موثر اور مستحکم ہونے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ عوام کی اکثریت کی خواہشات کے مطابق ہو بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں موجودہ سماجی طاقتوں کے باہمی تعلق اور طاقت کی تقسیم کا لحاظ بھی رکھا جائے۔ ہماری بڑی مشکل یہ ہے کہ برطانوی حکومت کے مجوزہ قانونی انتظامات میں اور بعض ہندوستانی تجویزوں میں بھی موجودہ سماجی طاقتوں کو اور اس سے زیادہ ان کو جو سالہا سال سے دبی ہوئی تھیں اور اب ابھرنے کی کوشش کر رہی ہیں قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ ایک ایسے نظام کو ہندوستان کے سر مضبوطی کے ساتھ منڈھ دیا جائے۔ جس کی بنیاد میں ماضی کی ان ضرورتوں اور تعلقات پر ہیں جو اب روز بروز اپنی اہمیت کھوتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان میں سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ یہاں برطانوی فوجی اقتدار قائم ہے اور اسی کی پالیسی چلتی ہے۔ اس پالیسی کے مقاصد کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے اور اس کے لئے اکثر مبہم اور غیر واضح الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن اب ایک سپاہی وائسرائے کے دور حکومت میں اس کو بالکل واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے یعنی جب تک ممکن ہوگا برطانوی حکومت اپنے فوجی قبضے کو باقی رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن طاقت کے استعمال کی بعض حدود بھی ہیں کیونکہ اس سے نہ صرف مخالفت کرنے والی جماعتیں وجود میں آتی ہیں بلکہ اور بھی بہت سے ایسے نتائج نکلتے ہیں جو طاقت کا استعمال کرنے والوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہوتے۔

ہندوستان کی ترقی کو روکنے اور دبانے کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت بالکل بے نتیجہ ہے اور وہ محض اس کی بڑھتی ہوئی زندگی کے لئے ایک رکاوٹ بن گئی ہے۔ ایک بیرونی حکومت ناگزیر طور پر محکوم عوام کی تخلیقی قوتوں کے تعاون سے محروم رہتی ہے۔ اور جب اس بیرونی حکومت کا معاشی اور تہذیبی مرکز محکوم ملک سے بہت دور ہو اور اس میں نسلی امتیاز کا تصور کارفرما ہو تو یہ بے تعلقی بہت بڑھ جاتی ہے اور محکوم قوم روحانی اور تہذیبی غذا سے محروم ہو جاتی ہے قوم کی تخلیقی قوتوں کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے یعنی یہ کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے لیکن یہ میدان عمل بھی بہت محدود ہے اور اس کی بدولت نظر تنگ اور یک طرفہ ہو جاتی ہے۔ یہ مخالفت نئی اور بڑھتی ہوئی طاقتوں کی اس شعوری یا غیر شعوری خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے کہ کسی طرح ان بندھنوں کو جو اسے جکڑے ہوئے ہیں توڑ پھینکے۔ اس لحاظ سے یہ مخالفت ایک ناگزیر اور ترقی پذیر اقدام

ہے۔ لیکن یہ خواہش ایک منفی اور محدود یک طرفہ خواہش ہے اور اس کی وجہ سے زندگی کے اور بہت سے حقیقی پہلو ہماری نظر سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ اور یہ دلوں میں تعصب اور نفرت اور مختلف قسم کی گتھیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو دماغ کو تاریک بنا دیتی ہیں قوم اور جماعتیں ذہنی طور پر بعض بتوں کی تعمیر کر لیتی ہیں اور زندگی کے مسائل پر غور و فکر اور تجسس کرنے کے بجائے لوگ چند بلند بانگ نعروں اور بندھے ٹکے فتووں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ ایک بے فیض بیرونی حکومت کی موجودگی میں کسی مسئلہ کا موثر حل تلاش کرنا ناممکن ہے اور چونکہ قومی مسائل کا کوئی حل نہیں ملتا اس لئے وہ اور بھی پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ ہم اب ایک ایسی منزل پر آپہنچے ہیں جہاں معمولی سی تدابیر سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوسکتے اور زندگی کے کسی ایک شعبے میں قدم بڑھانا کسی طرح کافی نہیں۔ ہمیں آگے کی طرف ایک جست لگانا ہوگا اور زندگی کے ہر گوشے میں نئی راہیں اختیار کرنی ہوں گی ورنہ بہت ہی بڑی تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ساری دنیا کی طرح ہندوستان میں بھی پر امن تعمیری کوششوں اور انتشار اور تباہی کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے اور ہر نئی تباہی گزشتہ تباہیوں سے زیادہ سخت ثابت ہوتی ہے۔ ہم اس صورت حالات پر اپنی ذہنی تربیت اور رجحانات کے مطابق مایوسی کی نظر ڈال سکتے ہیں یا امید کی۔ ہم میں سے وہ لوگ جو خوش قسمتی سے اس کے قائل ہیں کہ قدرت کے نظام کی عمارت اخلاقی بنیادوں پر قائم ہے اور بالآخر حق اور سچائی کی فتح ہونا لازم ہے تماشہ بینوں کی سی زندگی گذار سکتے ہیں یا اس میں بحیثیت مددگار کے شریک ہوکر انجام کی ذمہ داری خدا پر ڈال سکتے ہیں۔ لیکن جو ایسا نہیں کرسکتے انھیں اس ذمہ داری کے بار گراں کو اپنے ہی ناتواں کندھوں پر اٹھانا ہوگا۔ اس امید کے ساتھ کہ انجام اچھا ہوگا لیکن اس بات کے تئے

تیار کر شاید سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑے۔

۹ - مذہب، فلسفہ اور سائنس

ہندوستان کو اپنے ماضی کی بہت سی باتوں سے ناتہ توڑنا ہوگا اور یہ احتیاط کرنی ہوگی کہ وہ حال پر مسلط نہ ہوجائیں۔ ہماری زندگی ماضی کی بہت سی بیکار باتوں کے بوجھ سے گراں بار ہو رہی ہے۔ اور اب ان سب چیزوں کو جو غیر ضروری ہو چکی ہیں ترک کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا یہ منشا نہیں کہ ہمیں ماضی کی حیات بخش روایات کو بھی بھلانا یا نظر انداز کر دینا چاہئے۔ ہماری قوم نے جن مقاصد کی پرستش کی ہے، ہم نے مختلف زمانوں میں جو خواب دیکھے ہیں، عہد قدیم کے لوگوں کی دانائی اور فراست، اپنے آبا و اجداد کی اولوالعزمی، فطرت اور زندگی سے ان کی محبت، ان کا ذہنی تجسس ان کے تخیل کی بلندی، ادب، آرٹ اور تمدن کی دنیا میں ان کے کارہائے نمایاں، حسن سچائی اور آزادی سے ان کا لگاؤ، ان کی بنائی ہوئی زندگی کی بنیادی قدریں، زندگی کے رازہائے سربستہ سے ان کی واقفیت، اپنے سے مختلف خیالات رکھنے والوں کے ساتھ ان کی رواداری، دوسری قوموں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت اور ان کے تمدنی کارناموں کو اپنے تمدن میں سمو کر ایک نئے کلچر کی پرورش کا حوصلہ ہم ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ ہم ان بے شمار تجربات کو بھلا دیں جنھوں نے ہماری پرانی تہذیب کی تعمیر میں مدد دی ہے اور جو آج بھی ہمارے تحت الشعور کا حصہ ہیں۔ ہم انھیں کبھی نہیں بھولیں گے، اور ماضی کی اس شاندار وراثت پر ہمیں ہمیشہ فخر رہے گا۔ ہندوستان نے اگر انھیں بھلا دیا تو پھر ہندوستان ہندوستان نہیں رہے گا اور آج ہم جن باتوں پر فخر اور مسرت کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی

باتیں ہم کھو بیٹھیں گے۔

ہمیں ان باتوں سے نہیں بلکہ زمانے کے اس گرد و غبار سے نجات حاصل کرنی ہے جس نے ہندوستان کے اصل حسن کو اور اہمیت کو ڈھک لیا ہے۔ اور ان آلائشوں اور غلط کاریوں سے جس نے اس کی روح کو مسخ کر دیا ہے، اس کی آزادی سلب کر لی ہے اور اس کے ارتقا کو روک دیا ہے۔ ہمیں ان حشو و زوائد کو چھانٹ کر اپنے پیش رووں کی فراست اور ان کے علم کے خزانوں کو از سر نو دریافت کرنا ہے اور اس کو موجودہ کے ماحول کے مطابق بنانا ہے ہمیں فکر و عمل کی روایتی پابندیوں سے آزادی حاصل کرنا ہے جنھوں نے ہمیں ماضی میں یقیناً بہت سا نفع پہنچایا تھا لیکن وہ زمانہ حال میں ان کی افادیت باقی نہیں رہی۔ ہمیں بنی نوع انسان کے تمام کارناموں کو اپنا لینا ہے اور پھر دوسروں کے ساتھ تسخیر فطرت کی اس عظیم الشان مہم میں شریک ہونا ہے جس کا بیڑا انسان نے اٹھایا ہے اور جو اس زمانے میں ماضی کی نسبت کہیں زیادہ ولولہ انگیز ہو گئی ہے کیونکہ اب یہ جد و جہد قومی سرحدوں اور جغرافیہ کی پرانی تقسیموں سے آزاد ہو کر سارے عالم کے بسنے والے انسانوں کی مشترک جد و جہد بن چکی ہے۔ ہمیں سچائی، حسن اور آزادی کے اس جذبے کو پھر سے بیدار کرنا ہے جو زندگی میں معنی پیدا کرتا ہے اور پھر دوبارہ اپنے اندر قوت عمل اور اولوالعزمی پیدا کرتی ہے جو گذرے ہوئے زمانے میں ہماری نسل کے ان ممتاز پیش رووں کی خصوصیت تھی جنھوں نے ان مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر ہماری تہذیب کی عمارت تعمیر کی تھی۔ ہمارا ایک بہت بڑا نسل سے تعلق ہے اور انسانی تاریخ اور انسانی جد و جہد کے آغاز کی پرانی داستانیں ابھی تک ہماری یادوں میں محفوظ ہیں لیکن ہمیں زمانہ حال کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک بار پھر جوان ہونا ہے۔ اپنے

اس شان کے ساتھ کہ ہم میں شباب کا وہ احساس فتح مندی ہو جو حال سے مسرت حاصل کرتا ہے اور مستقبل کے بارے میں ایک غیر متزلزل ایمان رکھتا ہے۔

اگر دنیا میں سچائی کا بحیثیت ابدی حقیقت کے کوئی وجود ہے تو اس حقیقت کو دائمی، لازوال اور کبھی نہ بدلنے والی حقیقت ہونا چاہئے۔ لیکن انسان کے محدود دماغ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس لامحدود، دائمی اور غیر فانی حقیقت کا پورا پورا احاطہ کرے۔ انسان تو زیادہ سے زیادہ اس کے کسی ایک پہلو کو سمجھ سکتا ہے اور یہ واقفیت بھی زمان و مکان کے حدود اور اس خاص زمانے میں انسان کی ذہنی ارتقا اور اس عہد کے مخصوص تصورات کی پابند ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ذہنی طاقت بڑھتی ہے اور انسانی دماغ کی غور و فکر کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور پرانے تصورات بدلتے ہیں اس حقیقت کا اظہار نئی علامتوں کے ذریعے کیا جاتا ہے اور اس کے نئے پہلو بھی نظر کے سامنے آتے ہیں خواہ اس کی بنیادی حقیقت وہی رہے لہٰذا حق کی تلاش ہمیشہ جاری رکھنی ہوتی ہے، اس کو ہمیشہ از سر نو دریافت کرنا ہوتا ہے، اس میں ترمیم اور ترقی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عام انسانی ذہن میں اس کا جو تصور قائم ہو وہ اس کے فکر اور اس کی زندگی کے ارتقا سے ہم آہنگ ہو۔ تب یہ حقیقت انسانیت کے لئے زندہ صداقت بن جاتی ہے اور اس کی اہم ترین ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور حال اور استقبال میں ہماری رہنمائی کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔

لیکن اگر اس صداقت کے کسی ایک پہلو کو ایک اٹل عقیدے کا رتبہ دے کر اسے پتھر کی طرح جامد بنا دیا جائے تو اس میں ارتقا کا امکان باقی نہیں رہتا لہٰذا یہ صداقت انسانیت کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اس کے دوسرے پہلو پوشیدہ رہتے ہیں، اور وہ آنے والی نسلوں کے ضروری سوالات کا

کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ ایسی حالت میں اس سچائی میں حرکت اور تبدیلی کے بجائے جمود آجاتا ہے، اس میں کوئی حیات بخش عنصر باقی نہیں رہتا بلکہ وہ ایک بے جان اور رسمی سی چیز بن کر رہ جاتی ہے جو انسانیت اور انسانی ذہن دونوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ بلکہ اب لوگ اسے اس حد تک بھی نہیں سمجھ پاتے جس طرح پچھلے لوگ اسے سمجھتے تھے جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا اور اسے اس عہد کی مخصوص زبان اور اصطلاحات میں پہلے پہل ظاہر کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں ماحول بدل چکتا ہے ذہنی فضا مختلف ہو جاتی ہے، نئی سماجی عادتیں اور نئے رسوم رواج پا جاتے ہیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں پرانی تحریروں کا مفہوم سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ان کی روح کا پتہ لگانا اور بات ہے۔
پھر جیسا کہ آروبندو گھوش نے کہا ہے۔ ہر حقیقت خواہ اس میں کتنی ہی سچائی ہو دوسری حقیقتوں سے الگ ہو کر جو بہ یک وقت اس کا دائرہ محدود اور اس کی تکمیل بھی کرتی ہیں انسان کے ذہن کو پابند کر دینے کے لئے ایک جال اور ایک گمراہ کن عقیدہ بن کر رہ جاتی ہے کیونکہ دراصل ان تمام حقائق سے مل کر ایک مکمل حقیقت تیار ہوتی ہے اور اس بناوٹ کا ایک تاگہ بھی الگ کرنا مناسب نہیں۔
مذاہب نے انسانی زندگی کے ارتقا میں بہت مدد دی ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کی اخلاقی قدریں اور معیار متعین کئے ہیں اور انسانی زندگی کی رہنمائی کے لئے اصول وضع کئے ہیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ مذاہب نے سچائی کو بعض خاص شکلوں اور عقیدوں کے اندر مقید کر دینے کی کوشش کی ہے اور ایسے رسوم اور اعمال کی سرپرستی کی ہے جو جلد اپنی اہمیت کو کھو بیٹھتے اور محض ایک معمول بن کر رہ جاتے ہیں۔ مذہب نے انسان کے دل میں زندگی کے رازہائے سربستہ کا خوف بٹھا کر نہ صرف اسے ان جانی چیزوں کو

سمجھنے کی کوشش سے باز رکھا ہے بلکہ ان دقتوں کو بھی حل کرنے سے روکا ہے۔
جو سماجی جدوجہد کی راہ میں حائل ہیں۔ ذہنی تجسس اور غور و فکر کا ملکہ پیدا
کرنے کے بجائے مذہب نے فطرت، مروجہ مذہبی عقائد اور موجودہ سماجی نظام
غرض ہر اس چیز کے سامنے سر جھکا دینے کی تلقین کی ہے جو رائج ہے ایک ایسی
مافوق الفطرت قوت کے وجود پر ایمان رکھنے کی وجہ سے جو ہر چیز پر حکمراں ہے سماجی
فرائض کی ذمہ داری کی طرف سے ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پیدا ہو گیا ہے اور اس
طرح جذبات اور جذباتیت نے دلیل و حجت اور تحقیق و تفتیش کی جگہ لے لی ہے۔
اگرچہ مذہب نے بے شمار آدمیوں کے دل کو سکون بخشا ہے اور اس طرح مذہبی
قدروں کی وجہ سے سماجی نظام میں استحکام پیدا ہوا ہے لیکن اس نے تغیر اور انقلاب
کے ان رجحانات کی مزاحمت بھی کی ہے۔ جو انسانی نظام کا ایک لازمی عنصر ہیں۔
فلسفے نے ان میں سے بہت سی کمزوریوں سے اپنا دامن بچا کر رکھا ہے اور
تحقیق و تجسس کی ہمت افزائی کی ہے۔ لیکن فلسفی عموماً انسانی زندگی سے الگ تھلگ اپنے
ایک گوشۂ عافیت میں مست رہتے ہیں۔ ان کی تمام تر توجہ اساسی قدروں پر
لگی ہوتی ہے۔ وہ انھیں انسانی زندگی سے ربط دینے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔
منطق اور حجت اس کے رہنما تھے اور ان کی مدد سے اس نے بڑی ترقی کی ہے۔
لیکن یہ منطق تمام تر ذہن کی پیداوار ہوتی تھی۔ اسے زندگی کے حقائق سے لگاؤ
نہ ہوتا تھا۔

سائنس نے انسانی زندگی کے اساسی مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنی نظر
بعض حقائق پر جما دی۔ اس نے دنیا کو بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع
بہم دیا۔ ایک نظر کو خیرہ کرنے والے تمدن کی تعمیر کی، علم کی نئی راہیں کھولیں اور
انسان کی طاقت میں اتنا اضافہ کیا کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسے یہ احساس پیدا ہوا

کہ وہ اپنے طبعی ماحول کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتا ہے اور اس کو حسب مرضی شکل دے سکتا ہے۔ انسان نے گویا ایک ارضیاتی طاقت کی حیثیت اختیار کر لی جو زمین کو کیمیاوی طبیعی اور دوسرے طریقوں سے بدلتی رہتی ہے۔ لیکن جب زندگی کا کل کارخانہ بظاہر اس کے قبضۂ قدرت میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی حسب خواہش ترمیم و تعمیر کرے تو اس وقت یہ احساس ہوا کہ سائنس میں کوئی زبردست کمی ہے اور اس میں سے کوئی اہم عنصر مفقود ہے۔ سائنس کو اس کا کچھ علم نہ تھا کہ زندگی کا بنیادی مقصد کیا ہے، یا اس کے فوری مقاصد ہی کی کیا نوعیت ہے کیونکہ سائنس سے ہمیں زندگی کے مقصد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ انسان جس کا اقتدار فطرت کے عناصر پر اتنا بڑھ چکا تھا خود اپنے اوپر قابو حاصل نہ کر سکا اور اس نے جو دیو بنایا تھا وہ اس کے قابو سے باہر ہو گیا۔ حیاتیات، نفسیات اور اس طرح کے دوسرے علوم میں مزید تحقیقات اور حیاتیات اور طبعیات کی نئی تفسیر سے انسان کو خود کے سمجھنے اور خود پر قابو رکھنے میں مدد ملے یا ممکن ہے کہ قبل اس کے کہ اس طرح کی ترقی انسانی زندگی پر کافی اثر ڈال سکے وہ اپنی بنائی ہوئی تہذیب اور تمدن کو تباہ برباد کر ڈالے اور پھر ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالے۔

اگر سائنس کو ترقی کا موقع دیا جائے تو وہ بے اندازہ ترقی کر سکتی ہے لیکن سائنس کا طریق کار یعنی مشاہدہ ہر طرح کے انسانی تجربے کی تفسیر میں کام نہیں دے سکتا اور نہ اس دریائے ناپید اکنار کو عبور کر سکتا ہے جو آج ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ شاید فلسفے کی مدد سے ممکن ہے سائنس کچھ اور آگے بڑھ سکے اور ان رازہائے سربستہ سے بھی بحث کرنے کی جرأت کرے۔ اور جب فلسفہ اور سائنس دونوں کام نہ آسکیں تو پھر ہمیں فہم و ادراک کی ان دوسری طاقتوں پر

بھروسہ کرنا ہوگا جو ہمیں فطرت کی طرف سے ملی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دماغ کی ساخت ایسی ہے کہ عقل ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک فرانسیسی مفکر پیسکل کا قول ہے کہ "عقل کی انتہائی رسائی اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ دنیا میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو اس کی دسترس سے بلند ہیں۔ اگر یہ اس مقام تک بھی نہ پہنچے تو بہت ناقص ہے۔"

لیکن عقل اور سائنس کے منہاج کے محدود ہونے کے اس احساس کے باوجود ہمیں ان کو پوری طرح سے اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیئے کیونکہ ان کی ٹھوس بنیاد اور پس منظر کے بغیر کسی قسم کی سچائی یا حقیقت کا ادراک ممکن نہیں۔ سچائی کے کے ایک حصے کو سمجھ لینا اور اس سے اپنی زندگی میں کام لینا اس سے کہیں اچھا ہے کہ ہم کچھ نہ سمجھیں اور زندگی کے رازہائے سربستہ کو حل کرنے کی لاحاصل سعی میں بیکار غوطے لگاتے رہیں۔ آج کل دنیا کے تمام ملکوں اور تمام قوموں کے لئے سائنس سے کام لینا ناگزیر اور ضروری ہے۔ لیکن محض سائنس سے عملی فائدہ اٹھانا کافی نہیں۔ مسائل کو سائنٹیفک طور پر جانچنا سائنس کے تنقیدی اور معرکہ پسند مزاج کی شناخت، نئے علوم اور نئے حقائق کی تلاش، تجربے اور مشاہدے کے بغیر کسی چیز کو تسلیم نہ کرنا نئی شہادت کے پیش نظر پرانے نتائج کو ترک کر دینے کی صلاحیت خود ساختہ نظریات کے بجائے مشاہدہ کئے ہوئے واقعات پر بھروسا کرنا، ذہن و دماغ کی مکمل تربیت یہ سب باتیں بھی ضروری ہیں، محض سائنس کے عملی اطلاق کے لئے نہیں بلکہ خود زندگی اور اس کے سیکڑوں مسائل کو حل کرنے کے لئے۔ آج بہت سے سائنس داں جو سائنس کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں اپنے مخصوص دائرے سے باہر نکل کر یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ علمی مزاج اور مسائل زندگی کی جانب ایک بے لاگ سائنٹیفک رویہ اختیار کرنے سے سائنس دانوں میں زندگی کا ایک خاص

ڈھنگ، سوچنے کا ایک خاص انداز اور ساتھی انسانوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ایک خاص طرز عمل بن جانا چاہیئے۔ یہ ایک بہت بڑا مطالبہ ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو کسی حد تک بھی اس کو پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض تو فلسفہ اور مذہب کے بتائے ہوئے تمام قوانین پر بھی اتنا ہی یا اس سے بھی زیادہ صادق آتا ہے۔ ایک سائنٹیفک ذہن اس راستے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس پر انسان کو چلنا چاہیئے۔ یہ ایک آزاد انسان کا مزاج ہے ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم ایک سائنٹیفک دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن نہ تو عوام میں، نہ ان کے لیڈروں میں مجھے اس مزاج کا وجود نظر آتا ہے جو سائنس کا تقاضہ ہے

سائنس خود تو مثبت علم کی مملکت سے تعلق رکھتی ہے لیکن سائنس جس طرح کے ذہن اور دماغ کی متقاضی ہے اس سے ان حدود سے آگے بھی کام لیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے بنیادی مقاصد علم حاصل کرنا، سچ کی تلاش اور حسن اور نیکی کی قدر پہچاننا ہے۔ سائنس کے معروضی طریق کار کا ان مسائل پر اطلاق نہیں ہو سکتا اور زندگی اور بھی بہت سے اہم گوشے اس کی قلمرو سے باہر نظر آتے ہیں۔ مثلاً آرٹ اور شعر کے حسن کا احساس، یا حسن کو دیکھ کر جو جذبات دل میں ابھرتے ہیں، یا نیکی کا اندرونی احساس۔ ممکن ہے کہ علم نباتیات اور حیوانیات کے ایک ماہر کو فطرت کے حسن اور دل کشی کا کبھی احساس ہی نہ ہو اور عمرانیات کا ماہر انسانیت کی محبت کے جذبے سے یکسر عاری ہو۔ لیکن اگر ہم اس اقلیم میں بھی جائیں جہاں سائنس کا طریق کار کام نہیں دیتا، اور ان دشوار گذار اور بلند ذہنی منزلوں تک پہنچیں جہاں فلسفے کی حکمرانی ہے جہاں ہمارے دل اعلیٰ جذبات سے لبریز ہوتے ہیں، یا جہاں ہم ماورا ئے حیات بے پایانیوں پر نظر ڈالتے ہیں

تب بھی ان سب مسائل کیلئے سائنس کا نقطۂ نظر، اور سائنٹفک مزاج دونوں ضروری ہیں۔

مذہب کا طریق کار اس سے بالکل مختلف ہے۔ چونکہ اس کے پیش نظر زیادہ تر زندگی کے وہ گوشے ہیں جن میں معروضی تفتیش کا طریق کار کام نہیں دیتا اس لئے اس کا دار و مدار زیادہ تر جذبات اور وجدان پر ہے۔ اور پھر مذہب ان ہی سے زندگی کے ہر مسئلے میں یہاں تک کہ ان سوالات کے حل کرنے میں بھی جو ذہنی تفتیش اور مشاہدے کے لئے موزوں ہیں کام لیتا ہے۔ منظم مذہب دینیات کا سہارا لے کر بعض اوقات روحانی مسائل کی نسبت اپنے خاص مفاد کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے اور ایسا ذہنی ماحول پیدا کر دیتا ہے جو سائنس کے مزاج کے بالکل منافی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے تنگ نظری اور تعصب، اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی، جذباتیت اور
غیر عقلیت پیدا کر دیتا ہے۔ انسان کا ذہن تنگ اور محدود ہو جاتا ہے اور فرد میں آزادی اور خود اعتمادی باقی نہیں رہتی۔

ایک فرانسیسی مفکر والٹیر نے کہا تھا اگر خدا کا وجود نہ ہوتا تو بھی ہمیں ایک معبود بنانا پڑتا۔" شاید یہ بات صحیح ہے۔ انسانی دماغ نے ہمیشہ اس طرح کی ایک ذہنی تصویر یا تصور بنانے کی کوشش کی ہے جو ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ خود بھی بدلتا رہتا تھا۔ لیکن اس سے بالکل مختلف ایک بات بھی کہی گئی ہے جس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ یعنی خدا ہو بھی تو اس کا بہت زیادہ دست نگر ہونا اور بہت زیادہ بھروسہ نہ کرنا چاہئے۔ ایک مافوق الفطری طاقت پر بہت زیادہ انحصار کرنے سے انسان کی خود اعتمادی کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور پہنچا ہے اور اس کی وجہ سے انسان کی صلاحیتیں اور تخلیقی قوت کند ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی

بعض ایسی روحانی باتوں پر اعتماد ضروری معلوم ہوتا ہے ورنہ انسان کی مثال ایک بے بادبان کشتی کی سی ہو جاتی ہے اور زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا۔ خدا پر ہمیں ایمان ہو یا نہ ہو لیکن ایک چیز پر ایمان رکھنا ناگزیر ہے خواہ ہم اسے ایک تخلیقی حیات بخش قوت کا نام دیں یا اسے مادے کی وہ قوت سمجھیں جو اس کو از خود حرکت، تبدیلی اور ارتقا کی صلاحیت بخشتی ہے یا کوئی اور نام دیں۔ ایسی کسی چیز کا وجود اتنا ہی حقیقی ہے جتنی موت کے مقابلے میں زندگی حقیقی ہے اگرچہ وہ بہت مبہم اور گریز پا بھی ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم سب کسی ان دیکھے دیوتا کی عبادت ضرور کرتے ہیں اور اس کے سامنے قربانیاں پیش کرتے ہیں، خواہ یہ معبود تصوری ہو یا ذاتی یا قومی یا بین الاقوامی۔ یا کوئی دور دراز مقصد جو ہمیں اپنی طرف بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ یا کسی مکمل انسان اور کسی بہتر دنیا کا مبہم سا تصور ہو۔ شاید ہم کبھی کمال تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن ہمارے اندر ایسی کوئی طاقت کوئی جذبہ ضرور ہے جو ہمیں آگے بڑھنے پر مجبور کرتا ہے اور ہم نسلاً بعد نسلٍ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ جوں جوں علم ترقی کرتا ہے محدود معنی میں مذہب کا دائرہ گھٹتا جاتا ہے۔ زندگی اور فطرت کے متعلق جس قدر ہماری واقفیت بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی ہم فوق فطری اسباب کی کم تلاش کرتے ہیں کیونکہ ہم جس چیز کو سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر قابو پا لیتے ہیں وہ ہمارے لئے راز نہیں رہ جاتی۔ ایک زمانے میں زراعت کے مشاغل، ہماری غذا، ہمارا لباس، ہمارے سماجی تعلقات سب مذہب اور مذہبی رہنماؤں کے زیر نگیں تھے۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں مذہب کے اقتدار سے باہر نکل گئیں اور اب علمی مطالعے کا موضوع بن چکی ہیں۔ لیکن اب بھی مذہبی اعتقادات اور اوہام ان میں سے بہت سی باتوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اور زندگی کے بنیادی راز اب

بھی انسانی دماغ کی سطح سے بلند ہیں اور شاید ہمیشہ رہیں گے۔ لیکن زندگی کے کتنے ہی راز ایسے ہیں جو حل ہو سکتے ہیں اور جنھیں حل کرنا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں زندگی کے بنیادی راز کو حل کرنے کی خواہش کا دماغ پر ہر وقت مسلط رہنا نہ ضروری معلوم ہوتا ہے اور نہ مناسب۔ زندگی میں اب بھی نہ صرف دنیا کا حسن ہمیں دعوت نظارہ دیتا ہے بلکہ اس میں ہر روز نت نئی دریافتوں کا ولولہ انگیز امکان بھی ہے۔ نئے نئے مرقع اور زندگی بسر کرنے کے نئے ڈھنگ نظر کے سامنے آتے جاتے ہیں جن سے زندگی میں زیادہ گہرائی پیدا ہوتی ہے اور وہ زیادہ دلچسپ اور مکمل بنتی جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی بسر کرنے میں سائنس کے مزاج اور اس کے مخصوص نقطہ نظر سے کام لیں لیکن اس کے ساتھ فلسفے کا امتزاج بھی ہو اور ان تمام چیزوں کا احترام جو ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ اس طرح شاید ہم زندگی کا ایک ایسا مکمل تصور بنا سکیں جس کی وسعت میں ماضی اور حال دونوں کے لئے گنجائش ہو اور جو زندگی کی بلندیوں اور گہرائیوں کا احاطہ کر سکے۔ اور مستقبل کی طرف اطمینان کامل کے ساتھ دیکھ سکے۔ زندگی میں گہرائیاں موجود ہیں جنھیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور جہاں اس میں حسن اور خوبصورتی کا وجود ہے وہاں دکھ درد اور مصیبتیں بھی اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ انسانی زندگی رنج و مسرت کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ لیکن انسان ان ہی کے سہارے نئے سبق سیکھ سکتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے۔ روح کی کلفت ایک بڑی المناک چیز ہے جس میں انسان بالکل تنہا ہوتا ہے۔ بے شک بیرونی واقعات اور ان کے نتائج ہم پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں لیکن سب سے زیادہ دھچکہ ہماری طبیعت کو اپنے اندرونی خوف اور ذہنی کشمکش سے لگتا ہے۔ جہاں ہمیں مادی دنیا میں ترقی کرنا ضروری ہے کیونکہ اس پر ہمارے بقا کا دارومدار ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے دلوں میں شانتی ہو اور ہم

اپنے ماحول کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کریں ایک ایسی ہم آہنگی جو نہ صرف ہماری جسمانی اور مادی ضرورتوں کو پورا کر سکے بلکہ ساتھ ہی ان اندرونی تخیلی خواہشات کی تکمیل کا بھی سامان فراہم کرے جو اس وقت سے انسان کے لئے باعث امتیاز رہی ہیں جب سے اس نے فکر و عمل کی وادی میں اپنا سفر شروع کیا ہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس سفر کا کوئی آخری مقصد ہے یا نہیں، لیکن اس سفر کی کلفتوں کا بدل بھی ہے اور اس میں بہت سے ایسے قریب کے مقاصد بھی نظر کے سامنے آجاتے ہیں جنھیں ہم جلد حاصل کر سکتے ہیں اور جو بعد میں آگے بڑھنے کے لئے ایک نقطۂ آغاز بنتے ہیں۔

مغرب میں سائنس کی حکمرانی ہے اور ہر آدمی سائنس کا کلمہ پڑھتا ہے۔ لیکن وہ ابھی تک سائنس کا حقیقی مزاج اپنے اندر پیدا نہیں کر سکا۔ اسے ابھی مادہ اور روح کے مطالبات میں تخلیقی ہم آہنگی پیدا کرنی ہے۔ ہندوستانیوں کو ابھی بعض باتوں میں بہت دور جانا ہے۔ لیکن ہمارے سفر میں شاید بڑی بڑی رکاوٹیں کم ہوں گی۔ کیونکہ ہندوستانی فلسفے کی بنیاد (آخری دور کے مظاہر کو چھوڑ کر) سیکڑوں برس سے ایسی رہی ہے کہ وہ سائنس کے اس مزاج اور نقطہ نظر اور بین الاقوامیت کے موجودہ تصور کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس کی بنیاد سچ کی بے باکانہ تلاش، تمام انسانوں کی یک جہتی، تمام جانداروں کے احترام اور فرد اور جماعت کی آزاد اور مشترک ترقی پر رکھی گئی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ آزادی اور ترقی حاصل کر سکیں۔

۱۰ - قومی تصور کی اہمیت

ہندوستان میں ضروری تبدیلیاں

ماضی کی اندھا دھند پرستش کا جذبہ ایک غلط جذبہ ہے، اسی طرح ماضی کی ہر چیز کی طرف سے حقارت کا جذبہ بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کسی پر بھی مستقبل کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ حال اور استقبال ماضی کی سرزمین سے پیدا ہوتے ہیں اور ان پر ماضی کا نقش ثبت ہوتا ہے۔ اس بات کو بھلا دینا بے بنیاد عمارت کھڑا کرنے یا قومی ارتقا کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کے مرادف ہے۔ اور قوموں پر اثر ڈالنے والی طاقتوں میں سے ایک زبردست طاقت کو نظر انداز کر دینا ہے۔ بنیادی طور پر قومیت ماضی کے کارناموں، روایتوں اور تجربوں کی جماعتی یاد کا نام ہے اور قوم پرستی کا جذبہ آج ہمیشہ سے زیادہ طاقتور ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ جذبہ قومیت کے دن ختم ہو گئے ہیں اور اسے عہد حاضر کی بین الاقوامیت کے بڑھتے ہوئے رجحان کے لئے جگہ خالی کرنی ہوگی۔ اشتراکیت جس کا پس منظر پرولتاری ہے۔ قومی تمدن کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی اور اسے زوال پذیر متوسط طبقے کی خصوصیت سمجھتی تھی۔ سرمایہ داری خود کارٹلوں اور بڑی بڑی تجارتی انجمنوں کی شکل میں روز بروز قومی حدود کو پیچھے چھوڑ کر زیادہ بین الاقوامی ہوتی جا رہی تھی۔ تجارت اور لین دین، آمد و رفت کے آسان ذرائع نقل و حمل کی سہولتیں۔ ریڈیو اور سنیما سب کی ایک بین الاقوامی فضا پیدا ہو رہی تھی اور انہی سے اس غلط خیال کی بنیاد پڑی کہ قومیت کے دن بیت گئے ہیں۔

لیکن جب کبھی بھی کوئی نازک موقع آیا ہے جذبہ قومیت میں از سر نو جان سی

پڑگئی ہے اور ہر طرف اس کا دور دورہ ہوگیا اور لوگوں نے ماضی کی روایتوں ہی سے امید اور طاقت حاصل کی ہے۔ عصرِ حاضر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زمانہ ماضی اور قومیت کی بازیافت کا جذبہ دوبارہ ابھر آیا ہے۔ قومی روایات سے یہ شغف مزدور اور پرولتاری طبقے میں جو بین الاقوامیت کے سب سے بڑے علمبردار سمجھے جاتے ہیں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ جنگ اور اس قسم کے دوسرے مواقع پر ان کی بین الاقوامیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ دوسری جماعتوں سے بھی زیادہ قومی منافرت اور خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال سویٹ روس کی موجودہ صورت حال ہے۔ اپنے سماجی اور معاشی نظام کو ترک کئے بغیر روس میں سب سے زیادہ قوم پرستی کا دور دورہ ہے اور مادر وطن کے نام کی اپیلیں عالمگیر پرولتاریہ کے نام سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوئی ہیں۔ قومی تاریخ کے مشہور افراد کی یاد پھر سے تازہ کی گئی ہے اور انھیں پھر قومی ہیرو کی حیثیت دی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس جنگ میں روس کے حیرت انگیز کارناموں اور اس کے باہمی اتحاد اور قوت کا بڑا سبب وہ سماجی اور معاشی نظام ہے جس کی وجہ سے روس نے زندگی کے ہر گوشے میں ترقی کی ہے، پیداوار اور صرف دولت کی وہ منظم پالیسی ہے جو اس نے اختیار کی ہے، اور وہ ترقیاں ہیں جو اس نے سائنس اور اس کے عملی استعمال میں کی ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں صلاحیت اور قیادت کے نئے امکانات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ان کو بہترین رہبری نصیب ہوئی۔ لیکن شاید اس میں ایک حصہ ماضی کی یادگاروں اور ماضی کی روایتوں کے دوبارہ احیا کا اور ماضی کے ایک نئے احساس کا بھی ہے جس نے یہ بتایا کہ حال بھی ماضی کے ہی سلسلے میں منسلک ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ روس کے اس جذبۂ قومیت کی نوعیت وہی ہے جو ماضی میں تھی۔

یقیناً ایسا نہیں ہے۔ انقلاب اور اس کے بعد کے عظیم الشان تجربات کسی طرح بھلائے نہیں جا سکتے اور اس کی وجہ سے سماجی نظام اور ذہنی پس منظر میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ بھی باقی رہیں گی۔ اس سماجی نظام کی وجہ سے ایک بین الاقوامی نقطہ نظر پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ پھر بھی قوم پرستی کا جذبہ اس انداز سے ابھر آیا ہے کہ وہ نئے ماحول سے ہم آہنگ بھی ہے اور قوم کی طاقت میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

سویٹ روس کی ریاست کے ارتقا کا دوسرے ملکوں کی اشتمالی تحریکوں کے عروج وزوال سے مقابلہ کرنا بہت سبق آموز ہے۔ سویٹ روس کے انقلاب کے فوراً بعد بہت سے دوسرے ملکوں خصوصاً مزدور طبقے میں جوش اور ولولے کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی اور اس جوش سے کمونسٹ جماعتوں اور تحریکوں کی بنیاد پڑی۔ پھر ان تحریکوں اور قومی مزدور جماعتوں میں تصادم ہوا۔ سویٹ روس کے پنج سالہ پروگراموں کے دور میں ایک بار پھر یہ دلچسپی اور ولولہ پیدا ہوا اور اس بار متوسط طبقے کے روشن خیال افراد مزدوروں سے بھی زیادہ متاثر ہوئے۔ لیکن جب سویٹ روس سے سیاسی مخالفوں کا اخراج شروع ہوا تو اشتمالیت کے خلاف ایک ردعمل ہونے لگا۔ بعض ملکوں میں کمونسٹ جماعتیں دبادی گئیں۔ لیکن بعض ملکوں میں وہ پھیلیں اور بڑھیں۔ لیکن تقریباً ہر جگہ قومی مزدور تحریکوں کے ساتھ ان کا تصادم ضرور ہوا۔ اس ردعمل کا ایک سبب تو مزدور طبقے کی قدامت پرستی تھی، لیکن اس سے زیادہ اہم سبب یہ عام احساس تھا کہ کمونسٹ ایک غیر ملکی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی پالیسی سویٹ روس کی حکمت عملی کے مطابق ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ مزدور جماعت اپنے قوم پرستی کے جذبے کی وجہ سے کمونسٹ جماعت کے ساتھ اشتراک عمل پر

تیار نہیں ہوئی حالانکہ وہ اشتمالیت کی طرف مائل تھے۔ سویٹ روس کی حکمت عملی کی تبدیلیاں روس کے سلسلے میں تو سمجھ میں آجاتی تھیں لیکن جب دوسرے ملکوں کی کمونسٹ پارٹیاں بھی وہی پالیسی اختیار کرتی تھیں تو یہ بات بالکل ناقابل فہم ہو جاتی تھی۔ انھیں صحیح سمجھنا صرف اس عجیب اصول پر ممکن تھا کہ جو کچھ روس کے لئے اچھا ہے وہی لازمًا باقی دنیا کے لئے بھی اچھا ہے۔ یہ کمونسٹ تحریکیں عوام کے قومی جذبات اور احساسات سے بے تعلق ہو کر کمزور پڑ گئیں حالانکہ ان میں بہت سے قابل اور سنجیدہ کارکن شامل تھے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ عین اس وقت جب سویٹ روس میں ماضی سے ربط پیدا کرنے کی نئی کوششیں ہو رہی تھیں تو دوسرے ملکوں کی اشتمالی جماعتیں اپنی قومی روایات سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔

میں دوسرے ملکوں سے متعلق زیادہ واقف نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں کمونسٹ پارٹی ہندوستان کی قومی روایات سے، جو ہمارے عوام کے دل و دماغ پر محیط ہیں بالکل بے تعلق اور ناواقف ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اشتمالیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ماضی کو حقیر سمجھا جائے۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ نومبر ۱۹۱۷ء سے شروع ہوتی ہے اور اس سے پہلے جو کچھ بھی ہوا وہ صرف اس کے لئے زمین تیار کرنے کے لئے تھا تاکہ ایک خاص نتیجہ پیدا ہو سکے۔ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں لوگوں کی بہت بڑی تعداد نیم فاقہ کشی کی زندگی گذار رہی ہے، اور جہاں کا معاشی نظام درہم برہم ہو رہا ہے اشتمالیت کی اپیل بہت ہی وسیع ہوتی ایک معنی میں اشتمالیت کی موافقت کا ایک مبہم سا جذبہ موجود بھی ہے لیکن کمونسٹ پارٹی اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی

کیونکہ اس نے اپنے آپ کو قومی جذبات کے سرچشمہ سے الگ کر لیا ہے
اور وہ ایک ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جو عوام کے دلوں کے تار کو نہیں
چھیڑتی۔ مختصر یہ کہ کمونسٹ پارٹی پر جوش افراد کی ایک مختصر سی جماعت ہے
جس کی جڑیں قومی زندگی میں گہری نہیں ہیں۔

اس حیثیت سے ہندوستان کی کمونسٹ پارٹی ہی ناکام نہیں رہی
ہے بلکہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو تجدد عہد جدید کی روح اور مغربی کلچر کی حقیقت
کے متعلق بڑی باتیں بناتے ہیں لیکن خود انھیں اپنے کلچر کا پتہ تک نہیں۔
کمونسٹوں کے برخلاف، ان کے سامنے مرئی تصور نہیں نہ کوئی ایسا جذبہ ہے
جو انھیں آگے بڑھنے پر اکسائے۔ وہ مغربی تہذیب کی خارجی شکلوں اور اس کے
ظاہری ٹھاٹ کو اختیار کر لیتے ہیں (اور ان میں سے بھی اکثر اس
کے بعض ناگوار پہلوؤں کو) اور سمجھتے ہیں کہ وہ ایک ترقی پذیر تمدن کے ہراول
ہیں۔ یہ سطحی اور سادہ لوح لوگ، جو انتہائی خود بیں بھی ہوتے ہیں زیادہ تر بڑے
بڑے شہروں میں رہتے ہیں اور ان کی زندگی یکسر مصنوعی ہے جس کا مغرب یا
مشرق کے کلچر سے کوئی حقیقی رشتہ نہیں۔ لہذا قومی ترقی نہ تو ماضی کا اعادہ کرنے
سے حاصل ہوتی ہے نہ اسے ترک کرنے سے نئے قابل تقلید نمونوں کو ضرور اختیار
کرنا چاہیئے لیکن انھیں پرانے نمونوں سے مربوط کرنا چاہیئے۔ کبھی کبھی جدید باتیں
قدیم نمونوں کی ملتی جلتی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، خواہ دراصل بالکل مختلف ہوں
اور اس مشابہت کی وجہ سے یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ ایک مسلسل ارتقا
ہے اور انسانی تاریخ کی طول طویل زنجیر محض ایک کڑی ہے۔ ہندوستان کی
تاریخ میں نئی نئی تبدیلیوں کو اس طرح رواج دینے کی بہت سی مثالیں پائی جاتی
ہیں یعنی کس طرح پرانے تصورات کو بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ اور پرانے

نمونوں کو نئے نمونوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا۔ اس وجہ سے ہماری تاریخ میں کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ تہذیبی ارتقا کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے اور بار بار کی تبدیلیوں کے باوجود موہنجو داڑو کے زمانے سے لے کر اور ہمارے اپنے عہد کی تہذیب تک ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں جہاں ماضی اور ماضی کی روایتوں کی عزت اور احترام کا جذبہ ملتا ہے وہاں آزادی اور ذہنی لچک اور رواداری بھی موجود ہے۔ اس طرح گو ظاہری شکلیں اکثر برقرار رہیں لیکن ان کی اندرونی روح بدلتی رہی۔ اس کے بغیر یہ سوسائٹی ہزار ہا سال تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک نامی اور بیدار ذہن ہی روایتی پابندیوں کی سختی کا مقابلہ کر سکتا تھا اور یہی روایتیں ہیں جو سوسائٹی کو تسلسل اور استحکام دے سکتی تھیں۔

لیکن یہ توازن بہت نازک ہوتا ہے اور ممکن ہے ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب آ جائے اسے پس پشت ڈال دے۔ ہندوستان میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ یہاں ذہن کی غیر معمولی آزادی سماجی رسوم کی سختی کے ساتھ دوش بدوش موجود تھی۔ ان رسوم نے بالآخر دماغ کی آزادی کو متاثر کیا اور اگر نظری طور پر نہیں، تو کم از کم عملاً، اسے زیادہ محدود اور پابند بنا دیا۔ مغربی یورپ میں اس وقت اس ذہنی آزادی کا وجود نہ تھا لیکن ساتھ ہی سماجی رسوم میں اتنی سختی بھی نہ تھی۔ یورپ کو عرصے تک ذہنی آزادی کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی پڑی اور اس کی بدولت بعد میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔

چین میں دماغی آزادی ہندوستان سے بھی زیادہ تھی اور باوجود اس امر کے کہ اہل چین کو اپنی روایتوں سے بہت لگاؤ ہے، ان کی ذہنی لچک اور رواداری میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ان روایات کی وجہ سے تبدیلیوں کے نفاذ میں کبھی کبھی دیر ہوئی اور اگرچہ پرانے سماجی طریقے برقرار رہے لیکن چینی دماغ تبدیلی سے ڈرتا نہ تھا

ہندوستان سے بھی زیادہ چینی سوسائٹی میں ایک ایسا توازن اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی جو ہزاروں سال کی تبدیلیوں کے باوجود ہزار ہا سال قائم رہی۔ چین کو دوسرے ملکوں کے مقابلے میں سب سے بڑی فضیلت یہ حاصل رہی ہے کہ چینی مذہبی عقائد کی سختی سے اور مذہبی نقطۂ نظر کی تنگی سے ہمیشہ آزاد رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ عقل اور سمجھ داری پر بھروسا کیا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے چین کی طرح تہذیب کی بنیاد مذہب پر اس قدر کم اور اخلاقی اصولوں اور زندگی کی بوقلمونی کے اعتراف پر اس قدر زیادہ نہیں رکھی۔

چونکہ ہندوستان میں دماغ کی آزادی اصولاً تسلیم کی گئی ہے خواہ عملاً اس پر کتنی ہی پابندیاں عائد ہوں، اس لئے نئے تصورات پر کوئی روک نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں جہاں زندگی کے متعلق نقطۂ نظر میں ایک اٹل عقیدے کی سی سختی ہوتی ہے ہندوستان میں ان پر زیادہ غور ہوتا ہے اور انھیں قبول کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے بنیادی اصول کافی وسیع ہیں اور انھیں بھی ماحول سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ سائنس اور مذہب کی وہ شدید کشمکش جو انیسویں صدی کے یورپ میں اس قدر ہنگامے کا باعث بنی۔ ہندوستان کے لئے ایک بے حقیقت سی چیز ہوگی اور سائنس کے عملی استعمال کی وجہ سے جو تبدیلیاں ظہور میں آئیں گی ان کا بھی ان سے کوئی تصادم نہ ہوگا۔ بلاشبہ اس قسم کی تبدیلیوں سے دماغوں میں ایک ہلچل سی پیدا ہو رہی ہے اور ہوگی لیکن ان تبدیلیوں کی مخالفت یا انھیں رد کرنے کے بجائے ہندوستانی دماغ کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ اپنے ذہنی نقطۂ نظر کے مطابق ان کا جواز ثابت کرے اور ان کو ملک کے ذہنی پس منظر سے ہم آہنگ کرے۔ ممکن ہے اس ردعمل کے دوران میں پرانے نقطۂ نظر میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں لیکن یہ ان کی نوعیت ایسی نہ ہوگی گویا وہ باہر سے ہم پر

عائد کی گئی ہیں بلکہ وہ ہندوستان کے تہذیبی پس منظر کا قدرتی نتیجہ معلوم ہوں گی۔ یہ ضرور ہے کہ آج کل ایسا ہونا معمول سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ ایک تو بہت عرصے سے ہماری ترقی رکی ہوئی ہے اور دوسری طرف بہت بڑی بڑی اور بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

لیکن ان بنیادی تصورات کے اردگرد جو ڈھانچہ آج کھڑا ہوا ہے اور جو ہندوستان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے اس کے ساتھ تصادم ناگزیر ہے۔ اس ڈھانچے کو دور کرنا ضروری ہے کیونکہ اس میں بہت سی خراب باتیں ہیں اور وہ زمانے کے تقاضے کے منافی ہے۔ جو لوگ اسے باقی رکھنے کے خواہاں ہیں وہ ہندوستانی تہذیب کے بنیادی اصولوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں کیونکہ اچھی اور بری چیزوں کو گڈمڈ کر دینے سے اچھی چیزیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان اچھی اور بری باتوں میں تمیز کرنا اور ان میں ایک حد فاصل قائم کرنا آسان نہیں ہے اور اس میں اختلاف رائے کی بڑی گنجائش ہے لیکن اس قسم کی کوئی نظری یا منطقی حد فاصل قائم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضے اور رفتہ رفتہ ایک رفتار زمانہ خود بخود ایسی حد فاصل قائم کر دیں گے۔ ہر طرح کی ترقی کے لئے خواہ وہ عمل کی یا علم کی زندگی، سماجی ضرورتوں اور دنیا کی زندہ تحریکوں سے تعلق ناگزیر ہے۔ اگر اس قسم کا تعلق قائم نہ ہو تو ترقی بند ہو جاتی ہے۔ اور قوت اور تخلیقی صلاحیتیں افسردہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ تعلق باقی رکھیں اور اس کا اثر قبول کریں تو بغیر ان اہم خصوصیات کو ترک کئے جن کی ہم قدر کرتے ہیں، ہم زندگی کی رفتار کے ساتھ چل سکیں گے۔

زمانہ ماضی میں علم کو ہم ایک ترکیبی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے لیکن ہماری نظر ہندوستان تک محدود تھی۔ یہ قید تو باقی رہی لیکن رفتہ رفتہ ہم نے اس نقطۂ نظر کے

بجائے تحلیل کا نقطہ نظر اختیار کر لیا۔ لیکن اب ہمیں دوبارہ "ترکیب" پر زور دینا ہوگا اور ساری دنیا کو مطالعے کا موضوع بنانا پڑے گا۔ یہ بات تمام افراد اور قوموں کے لئے لازم ہے اگر وہ فکر و عمل کی اس تنگ وادی سے نکلنا چاہتے ہیں جس میں انھوں نے اتنی مدت تک اپنی زندگی بسر کی ہے۔ سائنس کی ترقی اور سائنس کے استعمال نے ہمارے لئے اس کا امکان پیدا کر دیا ہے لیکن نئے علوم کی کثرت نے اس کام میں دقتیں بھی بڑھا دی ہیں۔ تخصیص نے فرد کی زندگی کو ایک تنگ گھیرے میں مقید کر دیا ہے اور کسی صنعت میں اس کا کام مکمل پیداوار کے کسی ایک نہایت چھوٹے سے حصے کے بنانے تک محدود ہو گیا ہے۔ علم اور عمل میں تخصیص کو باقی رکھنا ہوگا لیکن یہ بات پہلے سے بھی زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کو ایک مربوط کل کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ اس تصور میں ماضی، حال دونوں ہی کا لحاظ رکھنا ہوگا اور اس میں تمام ملک اور دنیا کی تمام قومیں شامل ہوں گی۔ شاید اس طرح ہم اپنے قومی پس منظر اور قومی کلچر کی ترقی کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کی تہذیب کی قدر پہچان سکیں اور ان سے اشتراک عمل کر سکیں اور اس طرح شاید ہم آج یک طرفہ اور غیر متوازن شخصیتوں کے بجائے ایک حد تک مکمل شخصیتوں کی تعمیر کر سکیں، اور افلاطون کے الفاظ میں "تمام زمانوں اور تمام مخلوقات کے تماشہ بیں" بن سکیں۔ اور انسانیت نے تہذیب کے جو قیمتی خزانے جمع کئے ہیں ان سے مستفید ہو سکیں، ان میں اضافہ کر سکیں اور ان سے مستقبل کی تعمیر میں کام لے سکیں۔

یہ بات بڑی عجیب اور بہت اہم ہے کہ عہد حاضر کی ساری علمی ترقی اور بین الاقوامیت کا چرچا ہونے کے باوجود ثنلیت اور انسان کو منقسم کرنے والی دوسری طاقتوں کا آج بھی پہلے سے اگر زیادہ نہیں تو اتنا ہی دور دورہ ہے۔ ایسی

ترقی میں یقیناً کوئی بڑا نقص ہے کہ اس سے نہ قوموں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نہ انسان کی روح کو سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ شاید اگر ہم ترکیبی نقطہ نظر سے زیادہ کام لیں اور ماضی نے جو عقل وشعور ورثے میں چھوڑا ہے اور جو انسانی نسل کے تجربات کا اندوختہ ہے، اس کا زیادہ احترام کریں، تو ہمارا نقطۂ نظر زیادہ ٹھیک ہو جائے گا اور ہم زیادہ ہم آہنگی حاصل کر سکیں گے۔ ایسا خصوصیت سے ان قوموں کے لئے اور بھی ضروری ہے جو ماضی کو بھلا کر حال میں اس درجے منہمک ہو گئی ہیں کہ زندگی پر ایک ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ لیکن ہندوستان جیسے ملکوں کے لئے زیادہ زور ایک اور بات پر دینا چاہئے کیونکہ ہم پر ماضی ضرورت سے زیادہ مسلط ہے اور ہم نے حال کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمیں مذہب کی تنگ نظری سے مافوق الفطرت اور مابعد الطبعیاتی جھمیلوں کے چکر سے اور مذہبی رسوم اور متصوفانہ جذباتیت سے نجات حاصل کرنی ہے جو ہمیں اپنے آپ اور اپنی دنیا کو اچھی طرح سمجھنے نہیں دیتے۔ ہمیں حال کے مسائل سے، اس زندگی سے، اس دنیا سے، فطرت کی اس بوقلمونی سے جو ہمارے چاروں طرف نظر آتی ہے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ بعض ہندو ویدوں کے عہد کو واپس لانا چاہتے ہیں، بعض مسلمانوں کی تمنا ہے کاش اسلام کی مذہبی ریاست کے دن پھر سے لوٹ آئیں۔ دونوں ہی غلطی پر ہیں کیونکہ ماضی کی طرف لوٹ جانا اگر اچھا بھی ہوتا تو ناممکن تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر ایک ہی سمت میں سفر کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کو اپنی مذہبیت میں کمی کر کے سائنس کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اس کو اپنے فکر اور سماجی عمل کی خلوت پسندی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے جنھوں اس کی روح کو مقید کر کے اس کی ترقی روک دی ہے۔

رسمی طہارت کے تصور نے سماجی میل ملاپ کی راہ میں دقتیں حائل کردی ہیں اور سماجی عمل کی حدود کو تنگ بنا دیا ہے۔ ایک راسخ العقیدہ ہندو کا روزمرہ کا مذہب روحانی قدروں سے زیادہ ان سوالات کو اہمیت دیتا ہے کہ کیا کھانا چاہیئے، کیا نہیں کھانا چاہیئے، کس کے ساتھ کھانا چاہیئے اور کن سے دور رہنا چاہیئے۔ باورچی خانے کے قیود اور قواعد اس کی سماجی زندگی پر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے مسلمان ان قیود سے آزاد ہے لیکن خود اس کے ہاں بھی اپنے تنگ اور محدود رسوم اور قوانین ہیں اور روزمرہ کا ایک معمول ہے جس پر وہ سختی سے عمل کرتا ہے اور خود اپنے مذہب کے سکھائے ہوئے اخوت کے سبق کو بھلا بیٹھا ہے۔ شاید مسلمانوں کا نظریہ زندگی ہندوؤں سے زیادہ تنگ اور بے جان ہے اگرچہ آج کل ہندو بھی اپنے تصور حیات کی بہت ہی ناقص نمائندگی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے روایتی آزادی خیال اور اس پس منظر کو ترک کر بیٹھا ہے جو زندگی کو مختلف طریقوں سے مالا مال کرتا ہے۔

ذات پات کا بندھن ہندوؤں کے اس الگ تھلگ رہنے کی سب سے بڑی علامت ہے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ذات پات کے بنیادی تصور کو باقی رکھنا چاہیئے لیکن اس میں جو نقصان دہ تبدیلیاں بعد میں ہوئیں اور ان سے جو نتائج نکلے انھیں مٹا دینا چاہیئے اور اس کا بنیادی اصول پیدائش کے بجائے ذاتی لیاقت ہونی چاہیئے۔ مسئلے کو اس طرح دیکھنے کی کوشش بالکل بے محل ہے اور اس سے محض غلط بحث پیدا ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ذات پات کے ارتقا کا مطالعہ ایک حد تک مفید ہے لیکن ہم کسی طرح اس دور کو واپس نہیں جا سکتے جس میں ذات پات کے تصور نے جنم لیا تھا۔ آج کی سماجی تنظیم میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر لیاقت یا صلاحیت ہی کو معیار تصور

کر لیا جائے اور ہر شخص کو ترقی کا موقع حاصل ہو تو ذات پات کے جو امتیازی پہلو آج نظر آتے ہیں وہ سب غائب ہو جائیں بلکہ یہ نظام ہی ختم ہو جائے۔ ماضی میں ذات پات کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس سے بعض جماعتوں کے دبانے کا کام لیا گیا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے نظری علوم اور دستکاریاں بالکل الگ الگ ہو گئیں اور فلسفے کو روزمرہ کی زندگی اور اس کے مسائل سے بے تعلق بنا دیا گیا۔ ذات پات کا نظریہ دراصل سماج کا ایک اشرافی تصور تھا اور اس کی بنیاد روایت پرستی پر قائم تھی۔ اس نقطۂ نظر کو بالکل بدلنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ حال کے ماحول اور جمہوری تصور کے یکسر مخالف ہے۔ ممکن ہے ہندوستان میں سماجی جماعتوں کی پیشہ ورانہ تقسیم باقی رہے لیکن اس میں بھی بہت سی تبدیلیاں ضروری ہوں گی کیونکہ موجودہ صنعتی نظام کی وجہ سے نئے نئے کام پیدا ہوتے ہیں اور پرانے کاموں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ آج ہر طرف رجحان یہ ہے کہ سوسائٹی کی تنظیم کام کے لحاظ سے ہو اور فرائض کا تصور مجرد حقوق کے تصور کی جگہ لے رہا ہے اور یہ بات قدیم ہندوستانی تصور سے ہم آہنگ ہے۔

مساوات عہد حاضر کا تقاضہ ہے۔ گو عمل ہر طرف اس کے خلاف ہو رہا ہے ہم نے ایک انتہائی محدود معنی میں غلامی کے اس تصور سے چھٹکارا پا لیا کہ ایک آدمی کسی دوسرے آدمی کی ملکیت ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک نئی قسم کی غلامی نے جو بعض لحاظ سے پرانی غلامی سے بھی بدتر ہے اس کی جگہ لے لی ہے۔ انفرادی آزادی کے نام پر سماجی اور سیاسی نظام انسانوں کو بے دھڑک لوٹتے ہیں اور ان کے ساتھ انسانوں کا سا نہیں بلکہ بازار میں بکنے والی چیزوں کا سلوک کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اگرچہ فرد تو کسی اور فرد کا غلام نہیں ہو سکتا لیکن ایک ملک یا قوم دوسرے ملک یا قوم کی ملکیت اب بھی بن سکتی ہے اور اس طرح گویا ہم جماعتی غلامی کو آج بھی برداشت

کر لیتے ہیں۔ نسل پرستی بھی ہمارے عہد کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اور آج دنیا میں نہ صرف "مالک قومیں" موجود ہیں بلکہ ایسی نسلیں بھی ہیں جو خود کو دوسروں کا مالک اور ان سے برتر سمجھتی ہیں۔

لیکن زمانے کا تقاضہ پورا ہو کر رہے گا۔ کم سے کم ہندوستان میں ہمارے پیش نظر مساوات کا تصور ہی ہونا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص جسمانی، ذہنی یا روحانی حیثیت سے برابر ہے یا برابر بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ ہر شخص کو ترقی کے لئے یکساں موقع ملنا چاہئے اور کسی شخص یا جماعت کی راہ میں کسی طرح کی سیاسی، معاشی یا سماجی رکاوٹیں نہیں ہونی چاہئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم انسانیت کے مستقبل پر بھروسہ رکھیں اور ہمیں یقین ہو کہ کوئی نسل یا جماعت ایسی نہیں جو موقع ملنے پر بطور خود ترقی نہیں کر سکتی۔ اور ہمیں اس حقیقت کا احساس ہونا چاہئے کہ کسی جماعت کی پستی اور پس ماندگی اس وجہ سے نہیں کہ اس میں فطرتاً کوئی ایسی کمزوریاں ہیں جو اس کو بڑھنے نہیں دیتیں بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ اس کو ترقی کے مواقع نہیں ملے اور اسے دوسری جماعتوں نے مدت تک دبا کر رکھا ہے۔ ہمیں آج کی دنیا کی نوعیت کو بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ یہاں ہر طرح کی ترقی خواہ قومی ہو یا بین الاقوامی، بڑی حد تک مشترک کوشش کا نتیجہ ہے اور ایک بھی پس ماندہ جماعت ہو تو وہ دوسری جماعتوں کو پیچھے گھسیٹ لے گی۔ لہٰذا یہ کافی نہیں کہ سب کے لئے برابر مواقع فراہم کئے جائیں بلکہ پس ماندہ جماعتوں کے لئے تعلیمی، معاشی اور تہذیبی ترقی کے مواقع خاص طور پر فراہم کرنے چاہئیں تاکہ یہ جماعتیں اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ جماعتوں کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ اس طرح اگر ہندوستان میں سب کے لئے ترقی کے مواقع فراہم کئے جائیں تو بے اندازہ قابلیت اور صلاحیتیں ظہور میں آئیں گی اور بڑی

تیزی کے ساتھ نقشہ بدل جائے گا۔

لیکن اگر عہد حاضر کا تقاضہ مساوات ہے تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے جو اس تقاضے سے ہم آہنگ ہو اور اس کی تائید کرے۔ ہندوستان میں آج جو لوآبادیاتی نظام رائج ہے وہ اس کے بالکل مخالف ہے۔ استبدادی حکومت کی نہ صرف بنیاد عدم مساوات پر ہے بلکہ وہ زندگی کے ہر گوشے میں عدم مساوات کو قائم کرتی ہے۔ یہ قوم کی تخلیقی اور حیات بخش طاقتوں کو دبا دیتی ہے، قابلیت اور صلاحیت پر مہر لگا دیتی ہے اور ذمہ داری کے احساس کو کمزور کرتی ہے۔ جو لوگ اس طرح کے نظام کا شکار ہوتے ہیں وہ خود اعتمادی اور عزت نفس کھو بیٹھتے ہیں۔ ہندوستان کے مسائل بظاہر پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں لیکن اس پیچیدگی کا اصلی سبب یہی ہے کہ ہم سیاسی اور سماجی نظام کو جوں کا توں قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں سیاسی ترقی کو اس نظام کے اور خاص جماعتوں کے مفاد کے قیام کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے اور یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔

سیاسی تبدیلیوں کا ہونا ضروری ہے لیکن معاشی تبدیلیاں بھی اتنی ہی اہم ہیں۔ ان تبدیلیوں کا رجحان یہ ہوگا کہ یہاں ایک ایسی اجتماعیت کو رواج دیا جائے جس کی نگرانی جمہور کے ہاتھ میں ہو کیونکہ جیسا کہ آر۔ ایچ ٹانی نے کہا ہے "آج کی دنیا میں ہمارے سامنے یہ سوال نہیں کہ آزاد مقابلے کو پسند کیا جائے یا اجارہ داری کو۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ غیر ذمہ دار اور انفرادی اجارہ داری کو پسند کریں یا پبلک اجارہ داری کمپنیوں کو تو سرمایہ دار ملکوں میں بھی فروغ ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن ان دونوں تصورات میں جو پبلک اور انفرادی اجاروں کی پشت پر کارفرما ہیں اس وقت تک کشمکش باقی رہے گی جب تک موخر الذکر فنا نہ ہو جائے۔ یہ

ضروری نہیں کہ جمہوری اجتماعیت انفرادی ملکیت کا بالکل خاتمہ کر دے۔ ہاں یہ ناگزیر ہے کہ اہم اور بنیادی صنعتوں پر سماجی اقتدار اور نگرانی قائم ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زمین اجتماعی یا مشترکہ ملکیت ہوگی۔ ہندوستان میں یہ بھی ضروری ہوگا کہ بڑی بڑی صنعتوں کے ساتھ ساتھ امدادِ باہمی کے اصولوں پر چھوٹے پیمانے کی دیہی صنعتیں قائم کی جائیں۔ اس طرح کے جمہوری اجتماعی نظام کے لئے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کرنی ہوگی اور اسے بدلتی ہوئی ضرورتوں سے ہم آہنگ رکھنے کی مسلسل کوشش کرنی ہوگی ہمارا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ قومی پیداوار کی صلاحیت میں ہر ممکن طور پر اضافہ ہو اور ساتھ ہی ملک کی ساری کارکن آبادی کے لئے کوئی نہ کوئی کام نکل سکے تاکہ انھیں بے روزگاری سے بچایا جا سکے۔ جہاں تک ممکن ہو ہر شخص کو اپنے پیشے کے انتخاب کی آزادی ہونی چاہئے۔ ان سب اصلاحات سے سب کی آمدنیاں برابر نہیں ہو جائیں گی لیکن دولت کی تقسیم اب کے مقابلے میں زیادہ قرینِ انصاف ہو جائے گی اور دن بدن افراد کی آمدنیوں کا فرق کم ہو جائے گا۔ کم سے کم جو زبردست فرق آج کل اس بارے میں پایا جاتا ہے وہ بالکل ختم ہو جائے گا اور طبقہ وارانہ امتیازات جو درحقیقت آمدنی کے فرق کا نتیجہ ہیں آہستہ آہستہ دور ہو جائیں گے۔

اس طرح کی تبدیلی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری موجودہ سوسائٹی جس کی بنیاد لوٹ کھسوٹ اور نفع کے جذبے پر قائم ہے درہم برہم ہو جائے گی۔ ممکن ہے ایک حد تک یہ جذبہ باقی رہے۔ لیکن افراد کے لئے یہ سب سے اہم محرکِ عمل نہ ہوگا اور نہ اس کا میدان ہی اتنا وسیع ہوگا۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ نفع کمانے کا جذبہ بالعموم ہندوستانیوں پر اثر نہیں کرتا لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ

ہندوستان میں اس جذبے کو اس قدر عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جتنا مغربی ممالک میں۔ دولت مند کی قسمت پر لوگ رشک تو کرتے ہیں لیکن اس کی خاص طور پر عزت یا تعریف نہیں کرتے۔ عزت اور تعریف آج بھی ان مردوں اور عورتوں کی ہوتی ہے جو عقل مند اور نیک سمجھے جاتے ہیں اور خاص طور پر ان کی جو عام مفاد کے لئے خود کو اور اپنے مال و دولت کو قربان کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی نظر میں، عوام تک میں، لوٹ کھسوٹ کی ذہنیت کو کبھی اچھا نہیں سمجھا گیا۔

اجتماعیت کے نظام میں جماعتی ذمہ داری اور مل جل کر کام کرنا ضروری ہے۔ اور یہ بات بھی ہندوستان کے پرانے سماجی تصورات سے جو سب کے سب جماعتی تصور پر مبنی تھے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ برطانوی حکومت کی ماتحتی میں اس جماعتی نظام کے زوال اور خصوصاً دیہی خود اختیاری کے خاتمے سے عوام کو گہرا نقصان پہنچا ہے جو معاشی سے بھی زیادہ نفسیاتی تھا۔ اس کی جگہ پر کوئی مثبت تصور ان کے سامنے نہ آیا اور وہ اپنی روح آزادی، اپنی ذمہ داری کا احساس اور مشترک مقاصد کے لئے مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت کو کھو بیٹھے۔ گاؤں جو سماجی نظام کا ایک منظم اور اہم ادارہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک ویران رقبے کا نام رہ گیا جہاں کچھ لوگ ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہتے ہیں۔ لیکن آج بھی دیہات والے ایک غیر محسوس رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور پرانی یادیں تازہ ہوتی رہتی ہیں۔ ان قدیم روایات سے فائدہ اٹھانا اور ان کی مدد سے جماعتی اور مشترک زمینداریاں یا چھوٹے پیمانے کے صنعتی کاروبار جاری کرنا مشکل کام نہیں۔ دیہات اب ایک مکمل یا خود کفالتی معاشی ادارہ تو نہیں ہو سکتا (گو اس کا کسی اجتماعی یا مشترک فارم سے تعلق ہو سکتا ہے) لیکن یہ بڑی آسانی سے ایک حکومتی اور انتخابی حلقہ ہو سکتا ہے اور اس طرح کا ہر حلقہ ملک کے وسیع تر سیاسی

نظام میں ایک خود مختار جماعت بن سکتا ہے جو دیہات کی اہم ضرورتوں کی نگرانی کے فرائض انجام دے۔ اگر دیہات کو ایک انتخابی حلقہ بنا دیا جائے تو اس سے کل ہند اور صوبجاتی انتخابات میں بالواسطہ ووٹ دینے والوں کی تعداد گھٹ جانے کی وجہ سے بڑی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی۔ دیہات کی کونسل جو تمام گاؤں کے بالغ مردوں اور عورتوں کی منتخب کی ہوئی ہوگی ان بڑے انتخابات کے لئے رائے دہندگی کا فرض انجام دے سکتی ہے۔ بلاواسطہ انتخابات میں ممکن ہے کچھ خرابیاں ہوں، لیکن ہندوستان کے سماجی پس منظر کا خیال کرتے ہوئے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دیہات کو ایک الگ ادارہ بنا دینا ضروری ہے۔ اس طرح زیادہ صحیح اور زیادہ ذمہ دارانہ نمائندگی حاصل ہو سکے گی۔

اس رقبہ جاتی نمائندگی کے علاوہ اجتماعی اور مشترک کھیتوں اور کاروبار کی بھی براہ راست نمائندگی ضروری ہے۔ اس طرح ریاست کی جمہوری تنظیم میں پیشوں اور جغرافیائی نمائندوں دونوں کے لئے گنجایش ہوگی اور اس کی بنیاد مقامی خود مختاری پر ہوگی۔ اس طرح کا انتظام ہندوستان کی ماضی سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہوگا اور اس کی حال کی ضرورتوں کو بھی پورا کرے گا۔ ہمیں یہ احساس نہیں ہوگا کہ ماضی سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے (سوائے انگریزی حکومت کے پیدا کئے ہوئے حالات سے) بلکہ عوام اس کو ماضی ہی کا تتمہ سمجھ کر قبول کرلیں گے جیسے وہ آج بھی یاد کرتے ہیں اور عزیز رکھتے ہیں

ہندوستان میں اس طرح کے کسی نظام کا قیام سیاسی اور معاشی بین الاقوامیت کے بھی مطابق ہوگا۔ اس کی وجہ سے دوسرے ملکوں سے کوئی کشمکش یا تصادم نہ ہوگا اور اس سے ایشیا یا دنیا بھر میں امن قائم کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ اس سے ہمیں دنیا کی وحدت کے اس تصور تک پہنچنے

میں مدد ملے گی جس کی طرف ہم ناگزیر طور پر بڑھ رہے ہیں خواہ ہمارے جذبات ہمیں گمراہ کریں۔ اور ہمارا دماغ اس کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ ظلم اور مایوسی کے احساس سے نجات پاکر ہندوستانی پھر عروج حاصل کریں گے اور ان کی تنگ قومیت اور علیحدگی کی ذہنیت جاتی رہے گی وہ اپنی قومی میراث پر فخر کے ساتھ ساتھ اپنے دل اور دماغ کے دروازے دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کے لئے کھول دیں گے اور اس وسیع اور دل کش دنیا کے شہری بن جائیں گے اور علم و عرفان کی اس پرانی تلاش میں جس میں ہمارے آباؤ اجداد پیش پیش تھے دوسروں کے دوش بدوش آگے قدم بڑھائیں گے۔

ہندوستانی —— تقسیم، ایک مضبوط قومی حکومت یا ایک مافوق قومی سیاست کا مرکز؟) اپنی امیدوں اور اندیشوں کے مابین صحیح توازن معلوم کرنا اور اپنی خواہشات کو اپنے خیالات پر اثر انداز ہونے سے بچانا بہت ہی وقت طلب بات ہے۔ ہماری خواہشات اپنے لئے تائیدی اسباب ڈھونڈ نکالتی ہیں اور ہم ان حقائق اور دلیلوں کی طرف آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو ان کے خلاف پڑتے ہوں۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں ان کے درمیان صحیح توازن قائم کروں تاکہ سامنے آنے والے مسائل کے متعلق ٹھیک رائے قائم ہو سکے اور عمل کے لئے کوئی ٹھیک بنیاد مل جائے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اس معاملے میں کامیابی سے کتنا دور ہوں اور کس طرح خیالات اور جذبات کے اس ہجوم سے، جن سے میری طبیعت کی تعمیر ہوئی ہے، چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ میرے گرد ایک حلقہ ڈالے ہوئے ہیں اور میں ان کی نہ دکھائی دینے والی سلاخوں میں مقید ہوں۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی غلطیاں کر سکتے ہیں ہندوستان اور دنیا میں اس کی حیثیت کے متعلق ایک انگریز اور ہندوستانی کا نقطہ نظر

لازماً مختلف ہوگا کیونکہ ان کی ذہنی تعمیر ایک مختلف انفرادی اور قومی ماحول میں ہوئی ہے۔ فرد اور جماعتیں اپنے اعمال سے اپنی قسمت بناتے ہیں۔ اور ماضی کے یہ اعمال حال کی تعمیر کرتے ہیں اور آج کے عمال مستقبل کی بنیاد بنتے ہیں۔ ہندوستان میں اسے کرم کا نام دیا گیا ہے، جسے دوسرے الفاظ میں نتیجے کا قانون یا قسمت بھی کہہ سکتے ہیں جس کو ہمارے ماضی کے اعمال نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ یہ قسمت ایسی نہیں جو بدلی نہ جا سکے دوسرے بہت سے عناصر بھی اس کی تعمیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور خود انسان کا ارادہ بھی اس میں کارفرما ہوتا ہے۔ اگر ہمیں ماضی کے کاموں کے نتائج کو بدلنے کی آزادی حاصل نہ ہوتی تو ہماری حیثیت ایک کٹھ پتلی کی ہوتی جو ایک اٹل تقدیر کے ہاتھ میں بے بس ہو فرد اور قوم دونوں کی تعمیر میں ماضی کو بہت بڑا دخل ہے اور خود جذبہ قوم پرستی بھی اپنی تمام اچھی اور بری باتوں کے ساتھ محض ماضی کی ایک پرچھائیں ہے۔

ماضی کی یہ وراثت شاید افراد سے بھی زیادہ قومی جماعتوں پر اثر انداز ہوتی ہے، کیونکہ عوام کا انبوہ غیر شعوری اور غیر شخصی اثرات سے بہ نسبت فرد کے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور انھیں ان کے راستے سے ہٹانا زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اخلاقی تصورات فرد کی زندگی پر اثر ڈال سکتے ہیں لیکن جماعتی ذہن پر ان کا اثر مقابلتہً بہت کم ہوتا ہے اور جماعت جتنی زیادہ بڑی ہوتی ہے اس پر ان کا اثر اتنا ہی کم ہوتا ہے۔ اور موجودہ زمانے میں پروپاگنڈے کے ذریعے سے جماعت پر بہت زیادہ اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساری جماعت کی جماعت اخلاقی عمل کا کمال دکھاتی ہے جس کے اثر سے افراد اپنی تنگ دلی اور خود غرضی کی عادتوں کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن عموماً جماعت کا عمل فرد کے معیار عمل سے کم تر ہوتا ہے۔

جنگ دونوں طرح کا ردِ عمل پیدا کرتی ہے۔ لیکن اہم تر رجحان یہ ہوتا ہے کہ لوگ اخلاقی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد تصور کرنے لگتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے وہ معیار جو انسان نے مدتوں کی کاوش کے بعد قائم کئے ہیں تباہ ہو جاتے ہیں۔ اگر فوج کشی اور جنگ میں کامیابی حاصل ہو تو اس کی وجہ سے یہ پالیسی جائز سمجھ کر جاری رکھی جاتی ہے اور اس کی بدولت سامراجی تصرف اور یک برتر نسل کے تصورات نشو و نما پاتے ہیں۔ برخلاف اس کے شکست یاسیت اور انتقام کے جذبات کی پرورش کرتی ہے۔ دونوں صورتوں میں تشدد کی عادت اور نفرت کی نشو و نما ہوتی ہے اور اس طرح کی درندگی، اور ظلم شعاری پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ مخالف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش تک نہیں کرتے۔ پھر یہی حالات مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں جس کی وجہ سے اور زیادہ کش مکش اور جنگ کے امکانات پیدا ہوتے ہیں اور ان کی بدولت بے شمار خراب نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

پچھلے دو سو سال سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو جبری تعلقات رہے ہیں ان کی وجہ سے دونوں کے کرم یا قسمت کا اسی طرح تعین ہو گیا ہے اور وہی ان کے باہمی مراسم پر مسلط ہے۔ چونکہ ہم اس کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اس لئے اس پرانے ورثے سے نجات پانے کی ساری کوششیں بیکار رہی ہیں اور ہم اپنی زندگی کو نئی بنیادوں پر نہیں ڈھال سکے جنگ کے پچھلے پانچ سالوں نے ماضی کے اس کرم میں اور اضافہ کر دیا ہے اور مصالحت اور خوش گوار تعلقات کا پیدا ہونا اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ ۲۰۰ سالوں کا یہ تجربہ، دنیا کی اور چیزوں کی طرح اپنے اندر اچھے اور برے دونوں پہلو رکھتا ہے۔ انگریزوں کے نزدیک اچھا پہلو برے پہلو پر پوری طرح حاوی ہے اور ہندوستانیوں کے نزدیک برائیاں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی وجہ سے سارا دور سیاہ نظر آتا

ہے۔ لیکن بہرحال اچھائیاں زیادہ ہوں یا برائیاں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی بھی رشتہ جو زبردستی سر منڈھ دیا جائے نفرت اور سخت منافرت پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے اور ان جذبات سے برے نتائج ہی مترتب ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان میں بنیادی سیاسی اور معاشی تبدیلیاں نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔ جنگ شروع ہونے کے کچھ بعد یعنی ۱۹۳۹ء میں اور پھر اپریل ۱۹۴۲ء میں اس بات کا تھوڑا سا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ اس طرح کی تبدیلیاں ہندوستان اور انگلستان کی باہمی رضامندی سے ہوں۔ یہ امکانات اور یہ مواقع ہاتھ سے نکل گئے کیونکہ انگریز ہر بنیادی تبدیلی سے خائف تھے۔ یہ تبدیلیاں ہو کر رہیں گی۔ تو کیا باہمی رضامندی سے ان کے حصول کا امکان اب ختم ہو چکا ہے؟ مشترک خطرات کی موجودگی میں ماضی کی اہمیت ایک حد تک کم ہو جاتی ہے اور لوگ حال کے مسائل پر مستقبل کے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں۔ اب ماضی کی تلخ یادیں پھر ابھر آئی ہیں اور ان کی تلخی پچھلے چند سالوں کے تجربے نے اور بڑھا دی ہے قبولیت کا رجحان کم ہو کر لوگوں میں سختی اور تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ جلد یا بدیر مزید کشمکش کے بعد یا اس کے بغیر کوئی نہ کوئی سمجھوتہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن اب اس کا امکان بہت ہی کم ہے کہ اس طرح کا کوئی سمجھوتہ حقیقتاً پرخلوص ہو گا اور ہندوستان اور انگلستان کے اشتراک عمل پر مبنی ہو۔ غالباً اب سمجھوتے کی شکل یہ ہو گی کہ دونوں حالات سے مجبور ہو کر بے دلی سے کچھ معاملہ کر لیں گے۔ اور عدم اعتماد اور نفرت کی آگ سلگتی رہے گی۔ لیکن اس بات کا مطلق کوئی امکان نہیں کہ مستقبل میں ہندوستان کو برطانوی حکومت کا جز بنائے رکھنے کی کسی تجویز کو قبول کیا جائے۔ اسی طرح کوئی سمجھوتہ جو ہندوستان میں قرون وسطیٰ کی دور ازکار یادگاروں کو باقی رکھنا چاہے دیرپا نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان میں انسانی زندگی بے حد سستی ہے۔ اور ایسی صورت میں وہ قدرتاً بے معنی، خالی اور گھٹیا ہو جاتی ہے اور افلاس کے تمام نفرت انگیز نتائج زندگی کو گھیر لیتے ہیں۔ مختلف وجوہ سے، جن میں سے بعض داخلی ہیں اور بعض خارجی۔ ہندوستان پر سستی اور جمود کی فضا مسلط ہے لیکن بنیادی طور پر یہ غربت اور افلاس کا نتیجہ ہے۔ ہمارا معیار زندگی بے انتہا پست ہے اور شرح اموات بہت اونچی ہے۔ جو ملک دولت مند ہیں اور صنعت کے اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں وہ پس ماندہ اور غریب ملکوں کو کچھ اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح ایک امیر آدمی ایک بیچارے غریب آدمی کو۔ امیر آدمی اپنی وافر دولت اور ذرائع کی فراوانی کی بدولت ایک اعلیٰ معیار زندگی کا عادی ہے اور مذاق میں نفاست پسند بن جاتا ہے اور غریبوں کو ان کی عادتوں اور ان کے غیر مہذب ہونے پر لعنت ملامت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اول تو وہ انھیں اپنی حالت کو بہتر بنانے کے مواقع سے محروم کرتا ہے اور پھر اس محرومی، افلاس اور اس کی لائی ہوئی بدنصیبیوں کو مزید محرومی کی وجہ جواز بنا لیتا ہے۔

ہندوستان غریب ملک نہیں۔ اسے قدرت نے وہ تمام چیزیں بہتات کے ساتھ عطا کی ہیں، جو قوموں کو مال دار بناتی ہیں۔ لیکن اس کے بسنے والے بے انتہا نادار اور مفلس ہیں۔ اس کے پاس ماضی کی شاندار تہذیبی میراث ہے اور اس کی تہذیبی ترقی کے امکانات بہت وافر ہیں۔ لیکن وہ ترقی کی بہت سی نئی راہوں اور تہذیب کے بعض ضروری لوازم سے محروم ہے۔ یہ کمی بہت سے اسباب کا نتیجہ ہے لیکن اس میں سب سے بڑا حصہ جان بوجھ کر اسے ان مواقع سے محروم رکھنے کا ہے۔ ایسی صورت میں قدرتاً قوم کا فرض ہے کہ ہمت کر کے راہ کی دقتوں کو ہٹائے اور اس کمی کو پورا کرنا چاہئے۔ اور آج

ہندوستان میں یہی ہو بھی رہا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے ہندوستان کے پاس تیز رفتاری سے آگے بڑھنے کے ذرائع اور اس کے لئے ذہانت، لیاقت اور صلاحیت کا سرمایہ بھی موجود ہے۔ اس کے پاس صدیوں تک کا اندوختہ روحانی اور تہذیبی تجربہ ہے۔ وہ نظری سائنس میں ترقی کر سکتا ہے اور سائنس کو کام میں لاکر ایک زبردست صنعتی قوم بن سکتا ہے۔ باوجود بہت سی پابندیوں اور نوجوانوں کے لئے مواقع کی کمی کے سائنس کے میدان میں اس کے کارنامے قابل فخر ہیں ملک کی وسعت اور اس کے امکانات کے پیش نظر یہ کچھ زیادہ نہیں لیکن ان سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ جب قوم کی قوت عمل بندھنوں آزاد ہو کر کام کر سکے گی۔ اور جب اس قوت عمل کے نئے مواقع فراہم ہو جائیں گے تو ہندوستان کتنی ترقی کر سکے گا۔

اس راہ میں دو ہی دقتیں حائل ہو سکتی ہیں۔ ایک تو بین الاقوامی واقعات ہندوستان پر کوئی بیرونی دباؤ دوسرے ملک کے اندر اشتراک مقاصد کی عدم موجودگی۔ در اصل موخر الذکر کا اثر ہی آخر میں سب سے اہم ثابت ہوگا۔ اگر ہندوستان دو یا دو سے زیادہ حصوں میں اس طرح منقسم ہو گیا کہ سیاسی اور معاشی حیثیت سے اس کی وحدت ختم ہو جائے تو اس کی ترقی کی راہ میں شدید مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس کا براہ راست تو یہ اثر ہوگا کہ ہندوستان کمزور ہو جائے گا لیکن اس سے زیادہ شدید نقصان دہ وہ اندرونی نفسیاتی کش مکش ہوگی جس میں ایک طرف وہ لوگ ہوں گے جو ہندوستان کو پھر سے متحد دیکھنے کے آرزومند ہوں گے اور دوسری طرف اس کے مخالفین نئے مفاد مخصوص تبدیلی اور ترقی کی راہ میں حارج ہوں گے اور ایک نئی بد قسمتی مستقبل کے لئے ہمارے پیچھے لگ جائے گی۔ ایک غلطی کی وجہ سے

ہمیشہ دوسری غلطی کرنی پڑتی ہے۔ ماضی میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور شاید مستقبل میں ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ پھر بھی کبھی غلط اقدام کرنا ہی پڑتا ہے تاکہ اس سے زیادہ سخت خطرات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ سیاست کا یہ عجیب تضاد ہے۔ اور پھر کوئی شخص بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر آج کی غلطی نتیجے کے لحاظ سے آنے والے امکانی خطرے سے بہتر اور قابل ترجیح ثابت ہوگی یا نہیں۔ اتحاد ہمیشہ عدم اتحاد سے بہتر چیز ہے لیکن جبری اتحاد ایک خطرناک دھوکا ہے جس میں نقصان کے بہت تباہ کن امکانات چھپے ہوئے ہو سکتے ہیں۔ اصل اتحاد دل و دماغ کا اتحاد ہے یہ احساس کہ ہم سب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور اگر کوئی مخالف طاقت اس کو توڑنے کی کوشش کرے گی تو ہم اس کا مل جل کر مقابلہ کریں گے۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ ہندوستان میں یہ بنیادی اتحاد موجود ہے۔ لیکن اس پر کسی حد تک دوسرے اثرات نے ایک غلاف سا ڈال دیا ہے، ممکن ہے یہ اثرات عارضی اور مصنوعی ہوں اور دھیرے دھیرے مٹ جائیں لیکن آج وہ بہت اہم ہیں اور ہم انھیں نظرانداز نہیں کر سکتے۔

یہ بلاشبہ ہمارا قصور ہے اور ہمیں اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا لیکن میں انگریزوں کو جان بوجھ کر ہندوستان میں اختلاف اور انتشار پیدا کرنے کی ذمہ داری سے نہ بری کر سکتا ہوں نہ اس گناہ کے لئے انھیں معاف کر سکتا ہوں۔ انھوں نے ہندوستان کو جو بھی نقصان پہنچائے ہیں ان سب کی تلافی ہو جائے گی لیکن یہ مصیبت بہت طویل مدت تک ہندوستان کے سر پر ایک لعنت کی طرح مسلط رہے گی۔ ہندوستان کے متعلق جب میں سوچتا ہوں تو مجھے اکثر چین اور آئرلینڈ کی تاریخ یاد آتی ہے۔ ان دونوں ملکوں

کے ماضی اور حال کے مسائل ہندوستان سے اور آپس میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں ان میں بہت سی باتیں ملتی جلتی بھی ہیں۔ کیا مستقبل میں ہمیں ان ہی کے نقش قدم پر چلنا ہوگا؟ جم فیلن نے اپنی کتاب "جیل کا سفر" میں انسانی کردار پر جیل کی زندگی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے اور جن لوگوں کو جیل کا تجربہ ہے وہ یقیناً اس رائے کی تصدیق کریں گے "جیل انسانی کردار کے لئے خورد بین کا کام دیتا ہے۔ جیل کی زندگی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں بڑھا کر اور زیادہ واضح کرکے دکھاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مجرم ایک انسان ہے جس میں بعض کمزوریاں ہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے محض کمزوریاں ہیں جنھوں نے مجرم کے کپڑے پہن لئے ہیں۔" غیر ملکی حکومت قومی کردار پر کچھ اسی قسم کا اثر ڈالتی ہے۔ یہ ضرور ہے بیرونی حکومت کا صرف یہی اثر نہیں ہوتا کیونکہ بعض بہتر صفات بھی نشوونما پاتی ہیں اور مقاومت کی بدولت رفتہ رفتہ طاقت آجاتی ہے۔ لیکن بیرونی حاکم خراب باتوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اچھے اوصاف کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جس طرح جیلوں میں اپنے ساتھی مجرموں کے خلاف جاسوسی کرنے کے انعام میں بعض مجرموں کو نگہبان بنا دیتے ہیں اسی طرح ایک محکوم ملک میں خوشامدی اور چاپلوس لوگوں کی کمی نہیں ہوتی جو حکومت کی وردی پہن کر اس کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو شعوری طور پر یہ غلامانہ طرز عمل اختیار نہیں کرتے لیکن پھر بھی حکومت کی سازشوں اور اس کی حکمت عملی کا ان پر اثر پڑتا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کا اصول مان لینے سے یا یوں کہئے یہ تسلیم کر لینے کی وجہ سے کہ جبری اتحاد پر اصرار نہیں کرنا چاہئے ممکن ہے لوگ صبر و سکون اور غیر جانبداری کے ساتھ تقسیم کے نتائج پر غور کرنا شروع کر دیں اور پھر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ

اتحاد سب کے لئے ہی مفید ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ اندیشہ بھی موجود ہے کہ ایک بار یہ غلط اقدام کرنے کے بعد اسی طرح کی دوسری غلطیاں لازمی نہ بن جائیں۔ ایک سوال کو غلط طریقے پر حل کرنے کی کوشش سے ممکن ہے دوسرے نئے سوالات پیدا ہو جائیں۔ اگر ہندوستان کے دو یا اس سے زیادہ ٹکڑے کر دئے گئے تو بڑی بڑی ہندوستانی ریاستوں کو ہندوستان کے ساتھ ملا دینے کی کوششیں اور بھی مشکل ہو جائینگی کیونکہ تب تو ان ریاستوں کو الگ رہنے اور اپنے استبدادی نظام کے باقی رکھنے کی ایک اور دلیل مل جائے گی جو شاید ویسے نہ ملتی ہے

لہ اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ہندوستانی ریاستیں اندرونی خودمختاری کی تو آرزومند ہیں لیکن ہندوستان میں ایک مضبوط وفاق کے قیام کی بھی اتنی ہی خواہش رکھتی ہیں۔ وہ اس وفاق میں برابر کے شریک کی حیثیت سے شامل ہونے کو تیار ہیں ریاستوں کے بعض ممتاز وزرا اور مدبروں نے ہندوستان کی تقسیم کی تجویزوں کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ انھوں نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ تقسیم کی صورت میں ریاستیں اپنی الگ زندگی گذارنا پسند کریں گی۔ وہ ہندوستان کے کسی بھی ٹکڑے کے ساتھ وابستہ ہونے کے لئے تیار نہ ہوں گی۔ سرسی۔پی۔ راما سوامی آیر جو ٹراونکور کے دیوان ہیں اور ہندوستانی ریاستوں کے بہت لائق اور تجربہ کار وزیروں میں سے ہیں (گو انھیں اس سلسلے میں بھی بڑی شہرت حاصل ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کے کچل دینے کے لئے مطلق العنانہ طریق کار اختیار کرنے میں بہت آگے ہیں) ریاستوں کی اندرونی آزادی کے بہت زبردست حامی ہیں۔ ساتھ ہی وہ پاکستان اور تقسیم کی دوسری تجویزوں کی مستقل اور پرزور مخالفت کر رہے ہیں۔ انڈین کونسل آف ورلڈ افیرس کی بمبئی کی شاخ کے ایک مجمع کے سامنے ۲ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا " ریاستوں کو ایک ایسی اسکیم میں ضرور رد مسلسل

مسلم لیگ کے مطالبے کے بموجب ہندوستان کو ہندو اور مسلم دو حصوں میں تقسیم کر دینے سے ان دونوں مذہبی جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ سارے ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ان رقبوں کو الگ بھی کر دیا جائے جہاں دونوں جماعتیں اکثریت میں ہیں تو

شامل ہو جانا چاہئے جس کے تحت ہندوستان کے مختلف سیاسی اور انتظامی علاقوں کو اندرونی معاملات میں تو پوری آزادی حاصل ہوگی لیکن مرکزی قانونی انجمنوں اور عاملہ کی تشکیل اور کارکردگی میں وہ ایک دوسرے سے اشتراک عمل کریں گی۔ اور میرا خیال ہے ریاستیں یہی کریں گی۔ اس طرح کے ادارے ہندوستان اور ہندوستان کے باہر قومی اور نمائندہ جماعتوں کی حیثیت سے فرائض انجام دیں گے۔ ملک کے اندر مختلف حلقوں کے باہمی تعلقات مساویانہ ہوں گے اور ان کے درمیان اقتدار اعلیٰ کا کوئی سوال نہ ہوگا گو مرکز کے اختیارات کا واضح تعین اور موثر استعمال کی شکلیں پیدا کرنا ضروری ہوگا۔" آگے چل کر اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا " میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خواہ برطانوی معاہدوں کے ذریعے انھیں کوئی حقوق بھی حاصل ہوں کسی ہندوستانی ریاست کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہونا چاہئے جو ایک ایسی اسکیم میں شرکت کے لئے تیار نہ ہو جس کے تحت ریاستوں اور برطانوی ہند کے مشترک مسائل کی نگرانی اور انتظام کے لئے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جائے۔ اسی طرح ان ریاستوں کو بھی باقی نہیں رہنے دینا چاہئے جو ان تمام سیاسی انتظامات کی اور ان تمام تصورات کی، جو برابر کے نمائندوں کے باہمی آزادانہ غور وخوض کے بعد وضع کئے گئے ہوں، وفادارانہ پابندی کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔" "میں اس بات پر خاص طور سے زور دینا چاہتا ہوں گو مجھے اندیشہ ہے اس سلسلے میں بہت سے لوگ میری رائے کی مخالفت کریں گے کہ کسی بھی ہندوستانی ریاست (مسلسل)

بھی دونوں کے علاقوں میں دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد باقی رہے گی۔ اس طرح بجائے اقلیت کے مسئلے کو حل کرنے کے ایک مسئلے کے بجائے بہت سے اور دقت طلب مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے مثلاً سکھ اس انتظام کے ماتحت اپنی مرضی کے خلاف حصوں بخروں میں بٹ جائیں گے اور دو ریاستوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ ایک جماعت کو الگ ہونے کا حق دے کر دوسری جماعتوں کو جو اگرچہ اقلیت میں ہیں اس آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے اور انھیں اپنی پر زور گہری خواہش کے خلاف سارے ہندوستان سے الگ تھلگ ہو جانے پر مجبور۔ اور اگر یہ کیا جائے کہ جہاں تک الگ ہونے کا سوال ہے اس مذہبی جماعت کی رائے ناطق سمجھی جانی چاہئے جو کسی علاقے میں اکثریت رکھتی ہو تو

کو جو عوام کی بہبود کے معاملے میں اگر برطانوی ہند سے آگے نہیں تو دوش بدوش نہ ہو زندہ رہنے کا حق نہیں ہونا چاہئے"

راما سوامی ایر نے اس حقیقت پر بھی زور دیا ہے کہ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہندوستان کی ۶۰۱ ریاستوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنا ناممکن ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کے نئے دستور میں ان ریاستوں کی تعداد گھٹا کر ۱۵۔۲۰ تک کم کر دینا ہو گا۔ اور باقی ریاستوں کو بڑی بڑی ریاستوں یا صوبوں میں مدغم کر دینا ہو گا۔

بظاہر راما سوامی ایر کے نزدیک ریاستوں کی اس اندرونی سیاسی ترقی کو کچھ بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یا کم سے کم ان کے نزدیک یہ ثانوی مسائل ہیں لیکن درحقیقت اسی چیز کی کمی کی وجہ سے خصوصاً ان ریاستوں میں جو دوسری حیثیتوں سے ترقی یافتہ ہیں عوام اور ریاستی اہلکاروں کے درمیان مستقل کشمکش کا راستہ کھل جاتا ہے۔

پھر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ سارے ہندوستان میں اکثریت کا فیصلہ کریں نہ ناطق تسلیم کیا جائے یا پھر یہ ہو کہ ہر چھوٹے چھوٹے علاقے کو اپنی جداگانہ حیثیت متعین کرنے کا حق دے دیا جائے تاکہ ہندوستان کے طول وعرض میں بے شمار چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں جنم پا جائیں۔ یہ ایک بالکل بعید از قیاس اور عجیب وغریب بات ہوگی۔ لیکن ایسا کرنا بھی منطق کی رو سے ممکن نہیں کیونکہ ملک بھر میں دونوں مذہبی جماعتیں آپس میں ملی جلی بسی ہوئی ہیں۔

جہاں الگ الگ قومیں بھی ہوں وہاں بھی اس طرح کے مسائل کو علیحدگی کے ذریعے حل کرنے کی کوشش بذاتہ بہت مشکل کام ہے۔ لیکن جہاں معیار مذہب ہو وہاں تو ایسے مسئلے کو منطقی بنیادوں پر حل کرنا تو بالکل ناممکن ہے۔ ایسا کرنا قرون وسطیٰ کے تصور کی طرف لوٹنے کے مرادف ہے جو آج کی دنیا کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

علیحدگی کے معاشی پہلو کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجموعی طور پر ہندوستان ایک طاقتور اور کم وبیش خود کفالتی ملک ہے۔ تقسیم ناگزیر طور پر ہندوستان کو کمزور بنا دے گی اور ایک حصے کا دارومدار دوسرے حصے پر ہوگا۔ اگر تقسیم اس طرح ہو کہ مسلم اور ہندو اکثریت کے علاقوں کو بالکل الگ الگ کر دیا جائے تو ہندوستان کے معدنی ذخیروں کا بیشتر حصہ اور صنعتی جگہیں ہندو علاقے کے ہاتھ میں آجائیں گی۔ اس حیثیت سے ہندو علاقے کو کچھ شدید نقصان نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف مسلم علاقے بیشتر پس ماندہ اور اکثر مالی حیثیت سے بہت ہی نادار ہیں اور ان کے لئے بہت ہی بیرونی امداد کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس طرح یہ عجیب صورت حال پیدا ہوتی ہے کہ جو لوگ علیحدگی یا تقسیم ہند کا مطالبہ کر رہے ہیں انھیں ہی اس سے سب سے

زیادہ نقصان پہنچے گا۔ اس بات کا شاید تھوڑا ایسا احساس پیدا ہو گیا ہے اور اس احساس کی بنا پر اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ ان کے حصے میں ایک ایسا علاقہ آئے جس کی معاشی زندگی متوازن ہو سکے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایسا ہونا کسی طرح ممکن بھی ہے یا نہیں لیکن مجھے اس میں بہت شبہ ہے بہرحال ایسا کرنے کی کوئی بھی کوشش کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو یا سکھ اکثریت کے بڑے بڑے، وسیع علاقوں کو زبردستی اس علیحدہ حصے میں شامل کرنا ہوگا۔ یہ حق خود اختیاری کے اطلاق کی عجیب و غریب مثال ہوگی۔ مجھے اس پر اس آدمی کی کہانی یاد آجاتی ہے جس نے اپنے باپ اور ماں کو قتل کر ڈالا تھا اور پھر عدالت سے یتیم ہونے کی بنا پر رحم کی درخواست کی تھی۔

اس مطالبے میں ایک حیرت انگیز تضاد موجود ہے۔ جو لوگ خود اختیاری کا سہارا لیتے ہیں وہ اس حق کا فیصلہ کرنے کے لئے رائے عامہ سے استصواب کرنے کو تیار نہیں ہیں، یا اگر تیار ہیں تو اس بات کے لئے کہ اس مسئلے پر رائے دینے کا حق صرف مسلمانوں تک محدود رہے۔ بنگال اور پنجاب میں مسلم آبادی ۵۴ فی صدی یا اس سے کم ہے۔ تقسیم کے حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ علیحدگی کے مسئلے پر اگر رائے لی جائے تو محض ان ۵۴ فی صدی کو ووٹ دینے اور باقی ۴۶ فی صدی کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ہونا چاہئے اور ان باقی لوگوں کو اس سلسلے میں کچھ کہنے سننے کا حق نہ ہوگا۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ محض ۲۸ فی صدی آبادی کو بقیہ ۷۲ فی صدی آبادی کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق مل جائے۔

یہ بات بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی معقول آدمی ان اصولوں کو کیسے پیش کر سکتا ہے اور پھر یہ امید کیسے کر سکتا ہے کہ لوگ اسے تسلیم بھی کر لیں گے مجھے نہیں معلوم اور جب تک اس مسئلے پر رائے نہ لی جائے یہ کہنا مشکل ہے کہ

متعلقہ علاقوں میں کتنے مسلمان تقسیم کی موافقت کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی بڑی تعداد، ممکن ہے، ان کی اکثریت، اس کی مخالفت میں رائے دے۔ مسلمانوں کی بہت سی جماعتیں اس کے خلاف ہیں ہر غیر مسلم خواہ وہ ہندو ہو یا سکھ پارسی ہو یا عیسائی اس کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر علیحدگی کا یہ جذبہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا ہے۔ اور یہ علاقے بہرحال میں ہندوستان کا جز رہیں گے۔ مسلم اکثریت کے صوبے اس جذبے سے کم متاثر ہوئے ہیں۔ اور یہ قدرتی بات ہے۔ کیونکہ وہ اپنے پیروں پر خود کھڑے ہو سکتے ہیں اور انھیں دوسری جماعتوں سے ڈرنے کا کوئی سبب نہیں۔ اس کا سب سے کم اثر سرحد میں نظر آتا ہے (جہاں ۹۵ فی صدی مسلم آبادی ہے) جہاں بہادر اور خود پر اعتماد کرنے والے پٹھانوں کی آبادی ہے جو کسی طرح کے ڈر سے واقف نہیں۔ پس عجیب بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کا مطالبۂ تقسیم ہند ان علاقوں میں جنھیں ہندوستان سے علیحدہ کیا جائے گا مسلم اقلیت کے صوبوں سے جنھیں بہرحال ہندوستان کا حصہ رہنا ہے کم مقبول ہے۔ پھر بھی یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی ایک کافی تعداد کو جذباتی طور پر علیحدگی کے اس تصور سے انسیت ہے انھوں نے اس کے نتائج کے متعلق غور نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آج تک اس مسئلے کو واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا اور بار بار کی درخواستوں کے باوجود اس کی تعریف نہیں کی گئی ہے۔

میرا خیال ہے یہ جذبہ مصنوعی طور پر ابھارا گیا ہے اور مسلم دماغوں میں اس کی جڑیں کچھ بہت گہری نہیں ہیں۔ لیکن ایک عارضی جذبہ بھی اتنا طاقت ور ہو سکتا ہے کہ واقعات پر اثر ڈال سکے اور ایک نئی صورت حال پیدا کر دے۔ اگر معمولی حالات ہوتے تو وقتاً فوقتاً ضروری ردو بدل ہوتا رہتا، لیکن آج کے مخصوص حالات میں جس میں سارا اقتدار غیر ملکی حاکموں کے ہاتھ میں ہے جو کچھ

بھی نہ ہو جائے کم ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ حقیقی سمجھوتے کی بنیاد مختلف اجزاء کی باہمی رضامندی اور تمام جماعتوں کی اس خواہش پر رکھنا چاہئے کہ وہ ایک مشترک مقصد کے لئے باہم اشتراک عمل کریں گی۔ یہ چیز حاصل کرنے کے لئے ہر معقول قربانی کرنی جائز ہے۔ ہر جماعت کو نہ صرف نظری اور عملی طور پر آزاد ہونا چاہئے اور ترقی کے لئے برابر کے مواقع حاصل ہونے چاہئیں بلکہ انھیں اس آزادی اور مساوات کا پورا پورا احساس ہونا چاہئے۔ اگر جذباتی ہیجان اور بے سمجھی کے جذبات کو الگ کر دیا جائے تو اس طرح کی آزادی کے لئے ایسی کوئی اسکیم بنانا مشکل نہیں جس میں صوبوں اور ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں اور ساتھ ہی ایک مضبوط مرکزی رشتہ بھی قائم رہے۔ سوویٹ روس کی طرح بڑے بڑے صوبوں اور بڑی بڑی ریاستوں کے اندر بھی اس طرح کے خود مختار علاقے بنائے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہر قسم کے ممکن تحفظات دستور کا جزو بنائے جا سکتے ہیں۔

یہ سب کچھ کیا جا سکتا ہے، لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ بہت سے غیر متعین اثرات اور عناصر کی موجودگی میں جن میں سب سے زیادہ اہم برطانوی پالیسی ہے، مستقبل کا نقشہ کیسا ہوگا۔ ممکن ہے ہندوستان کو زبردستی کسی طرح تقسیم کر دیا جائے اور منقسم حصوں کے درمیان کوئی کمزور سا رشتہ بھی قائم کر دیا جائے اگر ایسا ہوا بھی تو مجھے بھروسہ ہے کہ اتحاد کا بنیادی جذبہ اور دنیا کے جدید حالات ان منقسم حصوں کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب لائیں گے اور پھر ان میں ایک حقیقی اتحاد قائم ہو جائے گا۔

ہندوستان کے اتحاد کا تانا بانا اس کی تاریخ جغرافیہ مشترک تہذیب

اور بعض دوسرے اسباب سے مل کر بنا ہے۔ لیکن اس کے حق میں سب سے زیادہ اہم عنصر موجودہ دنیا کے واقعات کا رجحان ہے۔ ہم میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان ایک قوم ہے۔ مسٹر جناح نے دو قوموں کا نظریہ پیش کیا ہے اور حال ہی اپنے اس نظریے میں اور سیاسیات کی لغت میں ملک کی دوسری مذہبی جماعتوں کو چھوٹی چھوٹی قوموں کا رتبہ دے کر ایک نئی بات پیدا کی ہے۔ ان کے نزدیک قومیت مذہب پر مبنی ہے۔ عام طور پر آج کل لوگ ایسا نہیں سمجھتے لیکن یہ سوال دراصل اہم بھی نہیں کہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے یا دو یا اس سے زیادہ۔ کیونکہ قومیت کا موجودہ تصور ریاست کے تصور سے قطعی بے تعلق ہے۔ قومی ریاست کا تصور نئے حالات میں بہت تنگ اور محدود ثابت ہوا ہے اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں الگ الگ زندگی نہیں گذار سکتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کی دنیا میں تو یہ بات بھی مشتبہ ہے کہ بہت سی بڑی بڑی قومی ریاستیں بھی حقیقی طور پر آزاد ہیں یا نہیں اس طرح قومی ریاست کے بجائے آہستہ آہستہ بہت سی قوموں کی ملی ہوئی وفاقی ریاستیں قائم ہو رہی ہیں سویٹ یونین اس رجحان کی ایک مثال ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی حقیقتاً کئی قوموں کی ملی جلی ریاست ہے۔ اگرچہ اس میں مضبوط قومی رشتوں کی کارفرمائی ہے۔ یورپ پر ہٹلر کے قبضہ جمانے کی خواہش محض نازیوں کی حکمرانی کے جذبے کی تسکین کے لئے نہ تھی۔ بلکہ یورپ میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مٹا دینے کے لئے نئے اثرات کام کر رہے تھے۔ ہٹلر کی فوجیں اب تیزی سے پیچھے بھگائی جا رہی ہیں یا تباہ ہو رہی ہیں لیکن وسیع وفاقوں کا تصور اب بھی باقی ہے اور رہے گا۔

ایچ۔ جی ولز اپنے مخصوص پرجوش پیغمبرانہ انداز میں دنیا کو مدت سے یہ بات بتاتے رہے ہیں کہ انسانیت کا ایک دور اب ختم ہو گیا ہے۔ وہ دور جس میں انسانیت

کے مسائل کا انتظام ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہوا کرتا تھا جب کہ سیاسی حیثیت سے خود مختار ریاستیں ایک دوسرے سے بالکل آزاد رہ کر کام کرتی تھیں اور معاشیات کے میدان میں مختلف کاروباری ادارے نفع کمانے کے لئے بغیر کسی پابندی اور اصول کے جدوجہد کرتے تھے۔ ان کا خیال ہے دنیا کی اصلی بیماری قومی انفرادیت اور اس کا غیر مربوط معاشی نظام ہے۔ ہمیں قومی ریاست کو ختم کرنا ہوگا اور ایک ایسے اجتماعی نظام کی بنیاد ڈالنی ہوگی جو نہ انسان کو غلام بنائے اور نہ اسے ذلیل کرے۔ لیکن پیغمبروں کی رہنمائی کو انسان نے اکثر نظر انداز کیا ہے اور ان کے اپنے عہد والوں نے ان پر خشت باری بھی کی ہے۔ اسی طرح آج مسٹر ولز اور ان کی طرح کے اور بہت سے لوگوں کی آواز ارباب حل وعقد کے نزدیک صدائے صحرا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن پھر بھی وہ بعض ناگزیر رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔ ان رجحانات کو بروئے کار لانے میں جلدی کی جا سکتی ہے یا اس میں دیر ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارباب اقتدار کے اندھے پن کی وجہ سے وہ اس وقت تک بروئے کار نہ آئیں جب تک دنیا ایک اور زیادہ تباہ کن مصیبت میں گرفتار نہ ہو لے۔

دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ہم بڑی حد تک ان نعروں اور فقروں کے غلام ہیں جو ماضی کے واقعات اور تصورات کے سانچے میں ڈھلے ہیں اور آج کی دنیا سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ ہمیں جذبات سے الگ ہو کر عقل کی روشنی میں موجودہ حالات پر غور نہ کرنے دیں۔ پھر ہمیں ان مجرد تصورات اور مبہم مقاصد کا بھی بڑا شوق ہے جو جذبات کو متاثر کرتے ہیں، اور بجائے خود مفید ہیں مگر اکثر ذہن کو دھندلا اور حقیقت سے دور کر دیتے ہیں۔ پچھلے چند سال میں ہندوستان کے مستقبل خصوصاً وحدت ہند اور

تقسیم ہند کے مسئلے پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور لکھا گیا لیکن عجیب بات ہے کہ
پاکستان کے حامی کسی طرح اس پر تیار نہیں ہوتے کہ اپنے مقصد کی وضاحت
کریں اور یہ بتائیں کہ ہندوستان کی تقسیم کس طرح اور کس شکل میں ہوگی۔ یہ لوگ
جذبات کی دنیا میں رہتے ہیں اور ان کے اکثر مخالفوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ وہ
دنیا ہے جہاں تخیل کا اور مبہم خواہشات کا دور دورہ ہے جن کی تہ میں فرضی مفاد
کا تصور پنہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو جذباتی اور خیالی نقطہ ہائے نظر میں مصالحت
کا کوئی امکان نہیں۔ دونوں ایک دوسرے پر پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان
کے نعروں کی بوچھار کر رہے ہیں۔ یقیناً جماعت کے جذبات اور اس کی شعوری یا غیر شعوری
خواہشات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں اور ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے لیکن یہ بات
بھی اتنی ہی یقینی ہے کہ اگر ہم حقائق اور واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں یا
اُن پر جذبات کا پردہ ڈال دیں تو اس سے وہ معدوم نہیں ہو جاتے بلکہ ہمیشہ یہ
اندیشہ رہتا ہے کہ نہ جانے کس موقع پر اور کس طرح پردے سے باہر آجائیں۔ جو
فیصلے کئے جاتے ہیں وہ عموماً غلط ہوتے ہیں اور خطرناک نتائج پیدا کرتے ہیں۔ ظاہر
ہے کہ خواہ ہندوستان کا مستقبل کچھ بھی ہو، یہاں تک کہ اگر ملک کی باقاعدہ تقسیم
ہو جائے تب بھی اس کے مختلف حصوں کو سیکڑوں معاملات میں ایک دوسرے
سے تعاون اور اشتراک عمل کرنا ہوگا۔ آزاد ملکوں کو بھی باہم تعاون کرنا پڑتا ہے اور
ہندوستان کے مختلف حصوں کو تو اس کی اور بھی زیادہ ضرورت پڑے گی ان میں
باہم گہرا رشتہ ہے اور انھیں مل جل کر رہنا ہے ورنہ پھر منتشر ہو کر پستی کے غار میں
گر جائیں گے اور انھیں اپنی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ایسی صورت میں سب
سے پہلا سوال جو عملاً نہایت ہی اہم ہے یہ ہے: وہ کون سے مشترک رشتے ہیں
جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں کو مربوط ہونا چاہئے، جن کے بغیر کل ملک

کی اور اس کے الگ الگ حصوں کی آزادی کا قائم رہنا اور ان کا ترقی کرنا مشکل ہے۔ اس کی ایک واضح اور نمایاں مثال دفاع ہے۔ دفاع کے سلسلے میں وہ صنعتیں آجاتی ہیں جو اسلحہ مہیا کرتی ہیں، اور ان کے علاوہ رسل ورسائل نقل وحمل اور تھوڑی بہت معاشی منصوبہ بندی بھی۔ اسی طرح چنگی، نظام زر، اور مبادلے کا اشتراک اور سارے ہندوستان میں اندرونی تجارت کی آزادی بھی ضروری ہے کیونکہ اندرونی ملک میں اشیا کی لین دین اور خرید و فروخت پر پابندی ملک کی ترقی کے لئے بیحد مضر ہوگی اسی طرح اور بھی بہت سے معاملات ہیں جن کو سارے ملک کے اور ملک کے مختلف حصوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر مشترک اور ایک مرکز کی نگرانی میں رکھنا ناگزیر ہوگا۔ ان ضرورتوں کو ہم، خواہ ہم پاکستان کے موافق ہوں یا مخالف، صرف اسی صورت میں نظر انداز کر سکتے ہیں کہ وقتی جذبات کے سوا اور سب چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ ہوائی جہاز کا سفر اب اتنے وسیع پیمانے پر ہونے لگا ہے کہ لوگ ان اداروں کو جو اس کا انتظام کرتے ہیں بین الاقوامی بنانے کا یا کم سے کم ان کی بین الاقوامی نگرانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں۔ مختلف ملکوں کو اتنی عقل آئے گی یا نہیں کہ وہ اس مطالبے کو تسلیم کرلیں، لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ ہندوستان میں ہوائی سفر کی ترقی صرف مشترک بنیاد ہی پر ہو سکتی ہے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ تقسیم ہند کے بعد ہر حصے میں اس کا جداگانہ انتظام کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہی حال بہت سی چیزوں کا ہے جو ملکی حدود کے اندر بھی نہیں سماتیں۔ پورا ہندوستان تو ان کی نشو و نما کے لئے کافی ہو سکتا ہے مگر منقسم ہندوستان نہیں ہو سکتا۔

ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد ہم لازماً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خواہ پاکستان قائم ہو یا نہ ہو، اگر ہندوستان کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے زندہ رہنا اور ترقی کرنا ہے تو ریاست کے بعض اہم اور بنیادی فرائض کا مشترک بنیاد پر انجام

پانا ناگزیر ہے۔ ورنہ پھر جمود انحطاط اور انتشار کا دور دورہ ہوگا اور سارے ملک کو سیاسی اور معاشی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ایک مشہور اور باخبر مفکر نے کہا ہے " وقت کی ناگزیر منطق ملک کے سامنے دو الگ الگ راستے پیش کر رہی ہے ایک اتحاد اور آزادی کا راستہ ہے دوسرا انتشار اور غلامی کا" اس اتحاد کی شکل کیا ہوگی اور اس کا نام کیا ہوگا یہ کوئی ایسا اہم سوال نہیں اگرچہ صحیح ہے کہ ناموں کی بھی ایک اہمیت اور نفسیاتی قدر ہوتی ہے۔ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ متعدد فرائض کو اچھی طرح ادا کرنے کے لئے کل ہندوستان کو مشترک طور پر کام کرنا ضروری ہے۔ شاید ان میں سے بہت سی چیزیں کچھ عرصے کے بعد بین الاقوامی اداروں کے سپرد کر دی جائیں گی دنیا روز بروز سکڑ رہی ہے اور مختلف ملکوں کے مسائل کے دائرے آپس میں مل رہے ہیں۔ آج ہوائی جہاز کے ذریعہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنے میں تین دن سے بھی کم صرف ہوتے ہیں۔ اور جب جہاز سات میل سے اوپر کی فضا میں اڑنے لگیں گے تو اس سے بھی کم مدت درکار ہوگی۔ ہندوستان یقیناً دنیا میں ہوائی جہازوں کا ایک بڑا مرکز ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ ریلوں کے ذریعے ایک طرف مغربی ایشیا اور یورپ کے ملکوں سے اور دوسری طرف چین اور برما سے منسلک ہو جائے گا۔ ہمالہ کے اس پار ہندوستان سے بہت قریب سوویٹ ایشیا کے ترقی یافتہ صنعتی علاقے ہیں جن کی آئندہ ترقی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان ان سب ملکوں سے مختلف طریقوں پر متاثر ہوگا۔

ہمیں متحدہ ہندوستان اور پاکستان کے مسئلے کو محض خیالی اور جذباتی طور پر نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ اس پر عملی پہلو سے آج کل کے حالات کو پیش نظر رکھ کر غور کرنا چاہئے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم اس صریحی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بعض اہم فرائض

کی انجام دہی کے لئے ہندوستان کے مختلف حصوں کو باہم مربوط ہونا چاہئے۔ دوسری چیزوں میں ہر حصّے کو پوری پوری آزادی دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہئے ان دونوں کے درمیان ایک ایسا دائرہ بھی ہو سکتا ہے جس میں بعض کام مل کر اور بعض الگ الگ کئے جائیں۔ ان مختلف دائروں کی حدبندی کے متعلق اختلاف رائے ہو سکتا ہے، لیکن ان اختلافات پر عملی پہلو سے غور کیا جائے تو یہ بڑی آسانی سے دور ہو سکتے ہیں۔

اس سارے انتظام کی بنیاد اس تدبر پر ہونی چاہئے کہ اشتراک عمل خوشی سے کیا جائے، جبر کا احساس نہ ہو بلکہ ہر حصہ اور ہر فرد اپنے آپ کو آزاد محسوس کرے، پرانے مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کو مٹانا ناگزیر ہے اور یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ اس قسم کے نئے طبقے نہ پیدا کئے جائیں۔ بعض تجویزیں جو جماعتوں کے مابعد الطبیعی تصورات پر مبنی ہوتی ہیں اور افراد کو نظر انداز کرتی ہیں، ایک آدمی کو سیاسی حیثیت سے دو یا تین آدمیوں کے برابر قرار دے دیتی ہیں۔ اسی طرح نئے مستقل حقوق رکھنے والے طبقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان پر عمل ہوا تو لوگوں میں سخت بے چینی پھیلے گی اور ملک کی حالت ڈانواں ڈول رہے گی۔

ہندوستانی وفاق یا یونین سے مستقل آئینی حیثیت رکھنے والے علاقوں کے الگ ہونے کے حق کا اکثر مطالبہ کیا گیا ہے اور اس مطالبے کی تائید میں روس کی مثال دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ دلیل ہندوستان کے حالات پر بالکل ہی منطبق نہیں ہوتی روس کے حالات بالکل مختلف ہیں اور وہاں اس حق کی عملاً کوئی اہمیت نہیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کی موجودہ جذباتی فضا میں مستقبل کے لئے حق علیحدگی کا تسلیم کر لینا مناسب ہو تاکہ لوگوں کو یہ احساس

رہے کہ ان کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی جا رہی ہے۔ کانگریس نے دراصل اس حق کو مان لیا ہے لیکن اس کے استعمال کرتے وقت بھی تمام مشترک مسائل پر جن کا اوپر ذکر ہوا ہے غور کرنا ضروری ہے۔ اور پھر اگر شروع ہی سے تقسیم اور علیحدگی کا امکان ہوا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ آزادی کا ننھا سا پودا پہلے ہی دن جھلس جائے گا اور ایک آزاد قومی ریاست کی تشکیل ناممکن ہو جائے گی۔ اس کی وجہ سے ناقابل حل دقتیں پیدا ہو جائیں گی اور سارے حقیقی مسائل اور بھی پیچیدہ ہو جائیں گے۔ انتشار کا دور دورہ ہوگا اور وہ جماعتیں بھی جو ویسے مشترک اور متحدہ طور پر زندگی گذارنے کے لئے تیار ہیں اپنے لئے جداگانہ ریاستوں کا مطالبہ کرنے لگیں گی یا خاص مراعات کا مطالبہ کریں گی جس سے دوسروں کے حقوق میں دست اندازی ہوگی۔ ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جائے گا اور ریاستوں کے موجودہ نظام کو نئے سرے سے زندگی مل جائے گی ملک کے سماجی اور معاشی مسائل کا حل کرنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح کے طوفان بے تمیزی میں کسی آزاد ریاست کا وجود ممکن نظر نہیں آتا۔ اور اگر کوئی ریاست بن بھی گئی تو وہ ایک مضحکہ خیز چیز ہوگی۔ متضاد عناصر اور ناقابل حل مسائل کا مجموعہ۔

حق علیحدگی کے استعمال کئے جانے سے پہلے ہندوستان کا آزاد ہونا اور اس میں ایک معقول نظام حکومت کا جاری ہونا ضروری ہے۔ اس وقت جب بیرونی اقتدار کا خاتمہ ہو چکا ہوگا اور ملک کو حقیقی مسائل کا سامنا کرنا ہوگا تو ممکن ہے اس طرح کے مسائل پر معروضی حیثیت سے جذبات سے الگ ہو کر غور کیا جا سکے۔ آج کی جذباتی فضا سے تو برے نتائج ہی پیدا ہو سکتے ہیں جن پر ہمیں آگے چل کر پچھتانا پڑے گا۔ اس لئے شاید یہ مناسب ہوگا کہ چند سال کی ایک

مدت معین کر دی جائے مثلاً ہندوستان میں ایک آزاد حکومت کے قیام کے دس سال بعد ہندوستان کے مختلف اجزا کو اپنے باشندوں کی مرضی کے مطابق جو واضح طور پر ظاہر کی گئی ہو آئینی طریقے پر یونین سے الگ ہونے کا حق حاصل ہو گا۔ ہم میں بہت سے لوگ ہندوستان کی موجودہ حالت سے عاجز آ چکے ہیں اور ان کی دل وجان سے یہ خواہش ہے کہ اس سے نجات پانے کی کوئی صورت نکلے۔ بعض تو اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ کہیں سے کوئی تنکا بہتا ہوا آجائے تو اسی کا سہارا لے لیں اس موہوم امید پر کہ شاید اس نظام سے جو مدتوں سے ہمارا گلا گھونٹ رہا ہے تھوڑی دیر کے لئے چھٹکارا مل جائے یہ ایک فطرتی بات ہے۔ لیکن ایسے اہم مسائل کو جن پر کروڑوں افراد کی فلاح و بہبود اور دنیا کے آئندہ امن کا دارومدار ہے اس طرح اعصابی ہیجان کی حالت میں یا قسمت آزمائی کے انداز میں طے کرنا بہت خطرناک ہے۔ ہندوستان میں ہر وقت مصیبت ہمارے سر پر منڈلاتی رہتی ہے اور کبھی کبھی ہم پر نازل ہو کر ہمیں تباہ کر دیتی ہے جیسا کہ پچھلے سال بنگال میں اور دوسرے مقامات پر ہوا۔ بنگال کا قحط اور اس کے ہولناک نتائج شاذونادر حالات نہ تھے۔ جو غیر معمولی یا غیر متوقع اسباب سے پیدا ہوئے ہوں۔ یہ ہندوستان کی موجودہ حالت کی ایک خوفناک اور واضح تصویر تھی۔ اس کی مثال ایک مریض کی ہے جس کے سارے جسم میں کسی مہلک بیماری سے گھن لگ گیا ہو۔

اگر ہم نے اس مرض کے استیصال اور علاج کی متفقہ کوشش نہ کی تو یہ روز بروز زیادہ خطرناک شکلیں اختیار کرتا جائے گا۔ ہندوستان کے حصے بکھرے ہو جانا اور حصے کا دوسرے سے تعاون یا اس کی پروا کئے بغیر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا اس بیماری کی شدت میں اضافہ کر دے گا اور ہم ایسی مصیبت

میں مبتلا ہو کر رہ جائیں گے جس سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ یوں بھی کافی دیر ہو چکی ہے اور ہمیں کھوئے ہوئے وقت کی تلافی کرنا ہے۔ آخر کیا بنگال کے قحط سے بھی ہم کوئی سبق نہیں سیکھیں گے؟ اب بھی بہت سے لوگ ہیں جو اس کے سوا اور کوئی بات سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے کہ ان کی نمائندگی کا تناسب اور وزن مزید کیا ہو، پارٹیوں کی طاقت میں کس طرح توازن پیدا کیا جائے، جماعتوں کے مخصوص حقوق کی حفاظت کا کیا انتظام ہو اور نئی نئی جماعتوں کو خاص حقوق اور مراعات کیسے دلائے جائیں۔ وہ دوسروں کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ خود آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا نہیں بڑھ سکتے۔ وہ اپنے مستقل حقوق کو قائم رکھنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور اہم سماجی اور معاشی تبدیلیوں سے بچنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہندوستان کا یہی موجودہ نقشہ تھوڑی بہت سطحی تبدیلیوں کے ساتھ باقی رہے۔ اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے۔

وقتی مسائل ہمیں بہت اہم معلوم ہوتے ہیں اور ہماری تمام تر توجہ ان پر مرکوز ہے۔ لیکن شاید مستقبل کے نقطۂ نظر سے یہ اتنی اہمیت نہ رکھتے ہوں اور سطحی واقعات کی تہ میں بہت بڑی قوتیں کارفرما ہوں۔ حال کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر کے اگر ہم مستقبل پر نظر ڈالیں تو ہمارے سامنے ایک مضبوط، اور متحدہ ریاست کی تصویر آتی ہے جو آزاد اجزا کا ایک وفاق ہوگی ا اپنے پڑوسی ممالک سے گہرے تعلقات رکھے گی اور دنیا کے مسائل کے حل کرنے میں بہت اہم حصہ لے گی۔ ہندوستان ان چند ملکوں میں سے ہے جو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے ضروری معاشی وسائل اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ دنیا میں آج ایسے ملک غالباً دو ہی ہیں روس اور ریاستہائے متحدہ

امریکہ۔ برطانیہ عظمیٰ اس زمرے میں اسی صورت میں آسکتا ہے جب اس کے وسائل میں اس کی وسیع سلطنت کے وسائل بھی شامل کر لئے جائیں۔ لیکن پھر بھی چونکہ یہ سلطنت بہت پھیلی ہوئی ہے اور اس کے ارکان غیر مطمئن ہیں اس لئے برطانیہ کی حالت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ البتہ چین اور ہندوستان خود کفیل ملکوں کی صف میں ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دونوں ایک مسلسل اور ہم آہنگ رقبے پر مشتمل ہیں، قدرتی دولت سے مالامال ہیں، دونوں کی آبادی بہت بڑی ہے اور دونوں کے پاس لیاقت اور صلاحیت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ بلکہ ہندوستان کے امکانی صنعتی وسائل چین سے زیادہ وسیع اور متنوع ہیں اور اس کے پاس ایسی چیزوں کی بھی نسبتاً بڑی مقدار موجود ہے جو وہ دوسرے ملکوں کو بھیج کر ان کے بدلے میں اپنی ضرورت کی چیزیں درآمد کر سکتا ہے۔ ان چار ملکوں کے علاوہ کوئی اور ملک بجائے خود بالفعل یا بالقوۃ اس زمرے میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ یورپ میں یا دوسرے براعظموں میں بڑے بڑے وفاق بن جائیں اور کئی قوموں کی متحدہ ریاستیں قائم ہو جائیں۔

قیاس یہ ہے کہ مستقبل میں بحر اوقیانوس کے بجائے بحر الکاہل دنیا کا سب سے اہم مرکزی سمندر بن جائے گا۔ ہندوستان خود بحر الکاہل کے ملکوں میں سے نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس علاقے میں لازمی طور پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوگا۔ بحر ہند میں بھی ہندوستان سیاسی اور معاشی سرگرمی کا مرکز ہوگا۔ جنوبی مشرقی ایشیا اور مشرق وسطیٰ تک اس کا اثر محسوس کیا جائے گا۔ ہندوستان کا جغرافی محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ آسے دنیا کے اس خاص علاقے میں جو مستقبل میں تیزی سے ترقی کرنے والا ہے بڑی معاشی اور فوجی

اہمیت حاصل ہوگی۔ اور بحر ہند کے اردگرد بسنے والے ملک ایران، عراق، افغانستان، ہندوستان، سیلون، برما، ملایا، سیام اور جاوا وغیرہ ایک نظام میں شامل ہو گئے تو ہمارا موجودہ مسئلہ اقلیت بالکل ختم ہو جائے گا یا کم سے کم اس کی نوعیت بالکل بدل جائے گی۔

مسٹر جی۔ ڈی۔ ایچ کول کا خیال ہے کہ ہندوستان خود ایسا علاقہ ہے جو قومیت سے بالاتر ہے، اور ان کا خیال ہے کہ ایک وقت آئے گا جب وہ ایک عظیم الشان ماورائے قوم سلطنت کا مرکز ہوگا جو سارے مشرق وسطیٰ کا احاطہ کئے ہوگی۔ اس کے ایک طرف چینی جاپانی اشتمالی جمہوریت ہوگی، دوسری طرف ایک نئی ریاست جو مصر، عرب اور ترکی پر مشتمل ہوگی اور تیسری طرف یعنی شمال میں سوویٹ یونین۔ ظاہر ہے یہ سب محض قیاس آرائیاں ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ہوگا یا نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں دنیا کے چند عظیم الشان ماورائے قوم سیاسی نظاموں میں بٹ جانے کے خیال کو پسند نہیں کرتا۔ البتہ اگر یہ سب ایک عالمگیر رشتے میں منسلک ہوں تو اور بات ہے۔ لیکن اگر لوگ اپنی حماقت سے عالمگیر اتحاد اور عالمگیر سیاسی نظام بنانے پر راضی نہ ہوں تو غالباً ایسی بڑی بڑی ماورائے قوم ریاستیں بن جائیں گی جن میں مختلف اجزا کو اندرونی خود مختاری حاصل ہوگی کیونکہ چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں کے دن ختم ہو چکے ہیں ان کا تہذیبی حیثیت سے خود مختار علاقوں کے طور پر باقی رہنا تو ممکن ہے لیکن جداگانہ سیاسی وحدتوں کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتیں۔

بہرحال مستقبل کا نقشہ خواہ کچھ ہو دنیا کی بہتری اس میں ہے کہ ہندوستان اس قابل ہو جائے کہ اس پر اپنا اثر ڈال سکے۔ کیونکہ ہندوستان ہمیشہ امن اور تعاون کی حمایت اور جارحانہ اقدام کی مخالفت کرے گا۔

۱۲۔ مصلحت پرستی اور جغرافی سیاسیات، فتح عالم یا اتحاد عالم

امریکہ اور روس

یورپ کی جنگ اب اپنے آخری دور میں پہنچ چکی ہے اور مشرق اور مغرب سے بڑھتی ہوئی اتحادی فوجیں نازی طاقت کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ پیرس کا وہ خوبصورت اور دلفریب شہر جو آزادی کی جدوجہد کا گہوارہ تھا اب پھر آزاد ہو چکا ہے۔ اور امن کے مسائل جو جنگ کے مسائل سے بھی زیادہ مشکل ہیں پھر سے لوگوں کے دماغ کو پریشان کر رہے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم کے بعد مغربی سیاست جس طرح ناکام رہی تھی اس کا خیال انھیں ستا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ایسا پھر کبھی نہیں ہوگا۔ ۱۹۱۸ء میں بھی یہی کہا گیا تھا۔

۱۵ سال پہلے ۱۹۲۹ء میں مسٹر چرچل نے کہا تھا "یہ ایک کہانی ہے۔ جس سے ہم آئندہ کے لئے ضروری سبق سیکھ سکتے ہیں۔ قومیں کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے لڑ پڑتی ہیں اور یہ جنگیں کتنی زیادہ تباہ کن ہوتی ہیں۔ جنگ کے میدان میں جرأت اور شجاعت کے جو شاندار کارنامے دکھائے جاتے ہیں ان کا صلہ کتنا حقیر ہوتا ہے، فتح کی خوشی کتنی عارضی ہوتی ہے۔ قومی زندگی کی از سر نو تعمیر کتنی طویل مدت میں آہستہ آہستہ ہو پاتی ہے، جنگ میں کتنے عظیم الشان خطرات کتنی جفاکشی سے جھیلے جاتے ہیں اور کس طرح ہم محض حسن اتفاق سے تباہی سے بال بال بچتے ہیں۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانیت کی ساری کوشش دوسری جنگ عظیم کو روکنے میں صرف ہونی چاہئے۔"

مسٹر چرچل سے زیادہ ان مسائل سے اور کون واقف ہوگا۔ انھوں نے

جنگ اور امن دونوں میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ایک انتہائی خطرناک دور میں انھوں نے
جرأت اور پامردی کے ساتھ اپنی قوم کی رہنمائی کے فرائض انجام دئے تھے اور
کامیاب ہو کر ملک کے مستقبل کے متعلق سب کچھ امیدیں باندھی تھیں۔ پہلی
جنگ عظیم کے بعد برطانوی فوجیں ہندوستان کی سرحد سے لے کر ایران، عراق،
فلسطین اور شام کو لئے ہوئے قسطنطنیہ تک سارے مغربی ایشیا پر قابض تھیں۔
اس وقت مسٹر چرچل نے مشرق وسطی میں ایک نئی برطانوی سلطنت کا خواب
دیکھا۔ لیکن تقدیر نے یہ نہ ہونے دیا۔ اب نہ جانے مستقبل کے متعلق ان کے دل
میں کیا امیدیں ہیں؟ میرے ایک بہادر اور معزز رفیق نے جو اس وقت جیل
میں ہیں ایک جگہ لکھا ہے "لڑائی ایک عجیب کیمیا گر ہے۔ اس کے پوشیدہ عمل
میں ایسے ایسے مرکبات تیار ہوتے ہیں جو فاتح اور مفتوح دونوں ہی کے منصوبوں
کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم کے بعد کسی کی کانفرنس نے یہ طے نہیں
کیا تھا کہ یورپ اور ایشیا کہ چار بڑی سامراجی طاقتیں فنا ہو جائیں۔ پھر بھی جرمن،
روسی، آسٹروی اور ترکی سامراج خاک میں مل گئے۔ اور اسی طرح روسی، جرمن اور
ترکی انقلابات کے لئے لائڈ جارج کلیمنشو یا ولسن نے احکامات صادر نہیں
فرمائے تھے"۔

فاتح قوموں کے رہنما جنگ میں کامیابی حاصل کر چکنے کے بعد آپس میں
مل کر کیا فیصلے کریں گے؟ ان کے ذہن میں مستقبل کا کیا خاکہ بن رہا ہے، اور ان
میں آپس میں کن باتوں پر اتفاق رائے ہے اور کن باتوں میں اختلاف ہے؟ جب
جنگ کے جذبات کا ہیجان دب جائے گا اور لوگ پھر امن و آشتی کی زندگی کی طرف
لوٹیں گے تو ان کے دلوں پر اور کیا اثرات کارفرما ہوں گے؟ ہٹلر کے خلاف یورپ
میں جو زمین دوز تحریکیں اٹھی تھیں اور جنھوں نے نئی قوتوں کو ابھارا تھا ان کا کیا

حشر ہوگا۔ جنگ کے مصائب برداشت کرنے والے ان لاکھوں سپاہیوں کے جنھوں نے جنگ کے میدانوں میں نئے تجربات حاصل کئے ہیں کیا خیالات ہوں گے اور وہ کیا کرنا چاہیں گے۔ واپس ہونے پر وہ اپنے ملک کی زندگی میں جس میں ان کے پیچھے بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں کس طرح کھپ سکیں گے۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تباہ شدہ ملکوں کا کیا حشر ہوگا؟ ایشیا کے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں "آزادی کی تمنا کا وہ بے پناہ طوفان" جس کا ذکر ونڈل ولکی نے کیا ہے کیا رنگ لائے گا؟ یہ سب اور دوسرے پیچیدہ مسائل کس طرح حل ہوں گے اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ تقدیر جس طرح ہمارے لیڈروں کے بنے بنائے منصوبوں کو بگاڑ دیتی ہے اس کا کیا علاج ہے۔

جوں جوں لڑائی کا رنگ بدل رہا ہے اور فسطائی طاقتوں کی کامیابی کے امکانات کم ہو رہے ہیں اتحادی قوموں کی قدامت پسندی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چہار گونہ آزادی کا تصور جو یوں بھی مبہم سا تھا اور اٹلانٹک چارٹر جس کے اطلاق کا دائرہ یوں بھی بہت محدود تھا اب پس پشت ڈال دئے گئے اور مستقبل محض اس نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا کہ اس میں ماضی کی ہر چیز جوں کی توں رہے۔ اب محض فوجی کشمکش رہ گئی ہے جس میں دو مادی طاقتوں کا مقابلہ ہے۔ نازی اور فسطائی فلسفے کے استیصال کا مقصد پیش نظر نہیں رہا۔ جنرل فرانکو اور چھوٹے چھوٹے استبداد پسند لیڈروں کی ہمت افزائی ہونے لگی۔ مسٹر چرچل اب تک شہنشاہیت کے تصور پر نازاں ہیں۔ حال ہی میں جارج برنارڈ شا نے کہا ہے "تسلط کا جذبہ جس شدت سے برطانوی شہنشاہیت کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے دنیا کی اور کسی طاقت میں نظر نہیں آتا۔ کامن ویلتھ کا لفظ بھی مسٹر چرچل کے حلق میں اٹکتا ہے[1]"

[1] اگلے صفحے پر دیکھئے

انگلستان، امریکہ اور دوسرے ممالک میں بہت سے لوگ مستقبل کو ماضی سے مختلف دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اندیشہ ہے کہ ایسا نہ ہو سکا تو دوسری جنگ عظیم کے بعد اس سے بڑے پیمانے پر لڑائی اور تباہی ناگزیر

لہ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ برطانوی حکمراں طبقے شہنشاہیت کے دور کو ختم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں زیادہ سے زیادہ وہ اپنے نوآبادیاتی نظام کو کسی حد تک حال کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوآبادیات کا ہونا عظمت اور دولت کے لئے ضروری ہے۔ لندن کے مشہور ہفتہ وار اخبار اکانومسٹ نے جو برطانوی بااثر حلقوں کا نمائندہ ہے اپنی ۶ ستمبر ۱۹۴۴ء کی اشاعت میں لکھا "شہنشاہیت کے خواہ وہ برطانوی ہو، فرانسیسی یا ڈچ ـــ تصور کے خلاف امریکہ میں تعصب ہے اس کی وجہ سے مستقبل کے نئے منصوبے بنانے والوں میں سے لوگوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جنوبی مشرقی ایشیا میں پرانے حکمراں واپس نہ ہوں گے اور مغربی قوموں کے اقتدار کی جگہ یا تو بین الاقوامی نگرانی کا کوئی نظام لے لے گا یا پھر اقتدار مقامی قوموں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے گا۔ چونکہ یہ رجحان موجود ہے اور امریکہ کے بہت سے کثیر اشاعت اخبارات اور رسائل اس نقطۂ نظر کی حمایت کر رہے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ برطانوی فرانسیسی اور ڈچ حکومتیں اپنے مستقبل کے ارادوں کی پوری طرح اور صاف صاف وضاحت کر دیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی نوآبادیاتی حکومت کو چھوڑ دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے نزدیک جاپان نے "مشترک خوش حالی کے دائرے" کا جو منصوبہ باندھا تھا اس کے توڑنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ برطانیہ کو ملایا واپس مل جائے، مشرقی جزائر پر ڈچ اقتدار دوبارہ قائم ہو جائے اور فرانس کو ہند چینی لوٹا دیا جائے۔ ان حالات میں اگر ان تینوں قوموں نے اپنے حلیف امریکہ کے دل میں اس معاملے میں کوئی شبہہ باقی رہنے دیا تو افسوسناک غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں گی بلکہ ان تینوں پر بدعہدی کا الزام عائد ہو گا۔"

ہوجائے گی۔ لیکن ارباب اقتدار اس طرزِ فکر سے کچھ بہت زیادہ متاثر نہیں نظر آتے، یا خود وہ ایسے اثرات کی گرفت میں ہیں جو ان کے قابو سے باہر ہیں۔ انگلستان، امریکہ اور روس کی موجودہ کشمکش میں طاقت و اقتدار حاصل کرنے کی پرانی کشمکش کے آثار ظاہر ہیں۔ اور پہلے سے کہیں بڑے پیمانے پر۔ اسے مصلحت پرستی اور عملی سیاست سمجھا جاتا ہے۔ پروفیسر این۔ جے۔ اسپائک مین (N. J. Spykeman) نے جو امریکہ میں جغرافی سیاسیات کے مستند ماہر سمجھے جاتے ہیں اپنی ایک تازہ تصنیف میں لکھا ہے "وہ مدبر جس کے ذمہ ملک کی خارجی سیاست چلانے کی ذمہ داری ہو عدل و انصاف، اور رواداری کی قدروں سے صرف اس حد تک متاثر ہو سکتا ہے جہاں تک یہ قدریں طاقت کے حصول میں جو اصل مقصد ہے مدد دیں یا کم سے کم رکاوٹ نہ ڈالیں۔ انھیں طاقت کے حصول کے لئے آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے اور ان سے اس مقصد کے اخلاقی جواز کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن جب ان کا استعمال کمزوری کا باعث ہو تو ان کا ترک کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ طاقت کی تلاش اخلاقی قدروں کے حصول کے لئے نہیں ہوتی، اخلاقی قدریں طاقت کے حصول کو آسان بنانے کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں*۔"

ممکن ہے یہ رائے کل امریکن قوم کے خیالات کی ترجمان نہ ہو۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک با اثر حلقے کی رائے ہے۔ مثلاً مسٹر والٹر لپمین دنیا کو تین یا چار بڑے حلقہائے اثر میں منقسم دیکھنا چاہتے ہیں ایک طلانٹک کی قوموں کا علاقہ دوسرا روسی تیسرا چینی آگے انھوں نے ایک اور حلقے کا اضافہ کیا ہے یعنی ہندو مسلم حلقہ اثر جنوبی ایشیا میں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حصول قوت کی سیاسی کشمکش

---

* America's strategy in world Politics.

اور زیادہ وسیع پیمانے پر جاری رہے گی اگر دنیا اس طرح بٹ گئی تو دنیا میں امن کیونکر قائم رہے گا اور قوموں میں باہم تعاون اور اشتراک عمل کیسے باقی رہے گا۔ امریکی ذہن ٹھوس مصلحت پرستی ایک مبہم سی عینیت اور حب انسانی کے جذبے کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ مستقبل میں ان میں سے کون سا رجحان زیادہ اہم ہوگا؟ باہم سمو دینے سے کیا نتیجہ نکلے گا۔ عوام کے خیالات کچھ بھی ہوں خارجی پالیسی بیرونی سیاست کے ماہرین کے ہاتھوں میں رہے گی اور یہ لوگ عام طور پر پرانی روایتوں کے لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں۔ انھیں نئی باتوں سے ڈر لگتا رہتا ہے کہ کہیں ان سے ان کے ملک کو کوئی نیا خطرہ نہ لاحق ہو جائے، اس میں شک نہیں کہ مصلحت بینی ضروری ہے اس لئے کہ کوئی ملک بھی محض نیک نیتی اور تخیل کی پرواز پر اپنی داخلی یا خارجی پالیسی کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔ لیکن وہ مصلحت بینی بھی عجیب ہے جو ماضی کے کھوکھلے خول سے چمٹی رہے اور حال کی تلخ سیاسی اور معاشی حقیقتوں کو نظر انداز کر دے یا ان کو سمجھنے سے انکار کر دے اور لا تعداد افراد کے جذبات اور احساسات سے متاثر نہ ہو ایسی مصلحت بینی دراصل بہت سے لوگوں کی "عینیت" سے زیادہ خیالی اور آج اور کل کے مسائل سے بے تعلق ہوتی ہے۔ جغرافی سیاسیات آج کل مصلحت پرستوں کی فکر کا مرکز بن گئی ہے ان کے نزدیک "صدر اقلیم" اور "اطراف اقلیم" وغیرہ کی اصطلاحوں سے قوموں کے عروج و زوال کا معما حل ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کی پیدائش انگلستان میں (یا اسکاٹ لینڈ؟) میں ہوئی نازیوں نے اپنے اپنے لئے شمع راہ بنایا۔ ان کے جہانبانی کے خواب اور آرزو اس فضا میں پلتے رہے اور بالآخر نازیت تباہ و برباد ہو گئی۔ جزوی سچائی بعض اوقات جھوٹ سے زیادہ نقصان رساں ہوتی ہے اور ایسی بات جو کبھی سچ رہ چکی ہو لوگوں کو موجودہ حقیقتوں کی طرف سے

اندھا بنا دیتی ہے۔ ایچ۔ جے میکنڈر کا نظریہ سیاسیات جغرافی جسے جرمنی میں نشو ونما ملی اس تاریخی حقیقت پر مبنی تھا کہ (ایشیا اور یورپ کے) براعظموں میں تہذیب و تمدن نے سمندر کے کنارے کے علاقوں میں نشو ونما پائی جن پر "صدر اقلیم" سے حملہ آوروں کی یورش رہتی تھی۔ اس "صدر اقلیم" کو یوریشیا کے براعظم کا مرکز قرار دیا گیا تھا۔ اس پر اقتدار گویا ساری دنیا پر اقتدار کا ضامن تھا۔ لیکن اب تہذیب سمندر کے کنارے کے ملکوں تک محدود نہیں سارے عالم پر محیط ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ کی ترقی بھی اس تصور سے ہم آہنگ نہیں ہے کہ یوریشیا کا کوئی "صدر اقلیم" دنیا پر تسلط قائم کر سکتا ہے اور ہوائی طاقت کی نشو ونما نے ایک نیا عنصر پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے بحری اور بری طاقت کا توازن درہم برہم ہو گیا ہے۔

جرمنی جو دنیا کو مسخر کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا ہر لمحے اس اندیشے میں مبتلا رہتا تھا کہ اس کے دشمن اسے محصور نہ کر لیں، سوویٹ روس کو اپنے دشمنوں کے مل کر متحدہ محاذ بنانے کا خوف تھا۔ انگلستان کی خارجی سیاست سالہا سال سے یورپ میں توازن قوت کے قائم رکھنے اور بڑھتی ہوئی طاقت کی مخالفت پر مبنی تھی۔ غرض ہمیشہ ہر ملک کو کسی نہ کسی کا خوف لگا رہتا تھا اور اس خوف کا نتیجہ جنگوں اور خطرناک سازشوں کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ موجودہ جنگ کے بعد صورت حال بالکل ہی بدلی ہوئی ہو گی دنیا میں دو زبردست طاقتیں ہوں گی روس اور امریکہ۔ دوسرے ملک ان کے مقابلے میں بہت کمزور ہوں گے البتہ اگر وہ سب مل کر ایک وفاق کی شکل اختیار کر لیں تو اور بات ہے۔ لیکن اب امریکہ کو بھی پروفیسر اسپائکمین یہ سبق سکھا رہے ہیں کہ اس کے محصور ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ امریکہ کسی اطراف اقلیم میں رہنے والی قوم سے اتحاد کرے

یا کم سے کم صدر اقلیم کو (جس سے آج کل سوویٹ روس مراد ہے) اطراف اقلیم سے نہ ملنے دے

یہ سب باتیں دانشمندی اور مصلحت پرستی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں مگر درصل بالکل مہمل ہیں کیونکہ انکا دارومدار توسیع، سامراج اور توازن قوت کے ان ہی پرانے تصورات پر ہے جو لازمی طور پر کشمکش اور لڑائی کا باعث ہوتے ہیں۔ دنیا گول ہے اور اس لئے ہر ملک دوسرے ملکوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس حصار سے نکلنے کے لئے قوت کی سیاست کے مطابق آپ کے لئے کچھ ملکوں کے ساتھ کچھ اور ملکوں کے خلاف اتحاد کرنا یا خود اپنے اقتدار کی توسیع، اور دوسروں پر تسلط حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ طاقت کا ایسا توازن قائم ہو جائے کہ آپ کے ملک کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ لیکن کسی ملک کی سلطنت یا اس کے اثر و اقتدار کا حلقہ خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے اسے ہمیشہ ان ملکوں سے گھر جانے کا اندیشہ باقی رہتا ہے جو اس حلقے سے باہر رہ گئے ہیں۔ اور ادھر یہ ملک بھی اپنی مخالف طاقت کی اس غیر معمولی توسیع سے گھبرا جاتے ہیں۔ اس خطرے سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ساری دنیا کو مفتوح کر لیا جائے اور دوسرے ممالک جن کی مخالفت کا کوئی امکان ہو فنا کر دیا جائے۔ آج دنیا کو اس طرح فتح کر لینے کی ایک خواب کی تعبیر ہمارے سامنے ہے۔ ہم جرمنی کی اس ناکامیابی سے سبق لیں گے۔ یا ابھی اور ملک بھی نسل یا طاقت کے گھمنڈ سے سرشار ہو کر اس خطرناک میدان میں قسمت آزمائی کرینگے؟ اب دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کوئی ایک طاقت ساری دنیا کو فتح کر لے یا پھر، ساری دنیا میں تعاون ہو۔ ان دونوں کے بیچ کی کوئی تیسری راہ نظر نہیں آتی ملکوں کی پرانی حد بندی اور اقتدار کی جد و جہد آج کی دنیا میں کوئی معنی نہیں رکھتی اور ہمارے موجودہ ماحول کے لئے مناسب نہیں۔ پھر بھی وہ بدستور چلی جا رہی ہے۔ آج ریاستہائے

کا مفاد، ان کی حکمت عملی کے اثرات قومی سرحدوں تک ہی محدود نہیں رہتے
بلکہ ساری دنیا ان سے متاثر ہوتی ہے۔ کوئی قوم بھی اپنے کو الگ تھلگ نہیں رکھ
سکتی اور دوسری قوموں کی معاشی اور سیاسی قسمت سے بے پروائی نہیں برت سکتی۔
اگر ملکوں کے مابین اشتراک عمل اور تعاون نہ ہو سکا تو پھر قدرتاً کشمکش پیدا ہوگی
اور اس کا اثر ساری دنیا پر پڑے گا۔ اشتراک عمل اور تعاون محض مساوات اور
فلاح عامہ کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ پس ماندہ
ممالک اور اقوام کو تہذیبی ترقی اور بہبود کے ایک مشترک معیار تک پہنچایا جائے
اور نسل پرستی اور سامراج کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کوئی ملک یا قوم بھی اب دوسرے
ملک کی حکومت اور استحصال برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا خواہ اس
کا کتنا ہی خوش گوار نام کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اور نہ یہ ملک اب اپنی غربت اور
افلاس پر قانع رہیں گے درآں حالے کہ دنیا کے دوسرے ملک اس قدر خوش حال
ہیں یہ تو صرف اسی وقت تک ممکن تھا جب تک دنیا کے ایک حصے کے حالات
سے دوسرے حصوں کے لوگ بے خبر رہتے تھے۔

یہ سب باتیں بالکل صریحی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ماضی کا طول طویل
تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کا دماغ بدلتے ہوئے حالات سے کہیں پیچھے رہتا
ہے اور اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنانے میں بہت وقت
لگتا ہے۔ ہر قوم کے اپنے ذاتی مفاد کا تقاضہ ہے کہ وہ اس وسیع اشتراک عمل
کے لئے کوشش کرے تاکہ مستقبل کی تباہی سے محفوظ رہے دوسروں کی آزادی
کی بنیاد پر خود اپنی آزادی کی عمارت تعمیر کر سکے۔ لیکن مصلحت پرستوں کی خود غرضی
ماضی کے عقائد اور روایات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص
عہد کے تصورات اور سماجی اداروں کو انسانی فطرت اور سماج کے غیر تغیر پذیر عناصر

سمجھنے لگتی ہے وہ یہ بھول جاتی ہو کہ انسانی فطرت اور سوسائٹی سے زیادہ تغیر پذیر کوئی چیز نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے مذہبی تصورات اور رسم ورواج اٹل بن جاتے ہیں، سماجی ادارے جامد ہوکر رہ جاتے ہیں، جنگ ایک حیاتی ضرورت قرار پاتی ہے، سامراج اور توسیع مقبوضات جاندار اور ترقی پذیر قوموں کا حق سمجھی جاتی ہے، نفع کی خواہش انسانی تعلقات کی بنیاد تسلیم کی جاتی ہے، نسل پرستی ایک مذہبی عقیدے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے خواہ وہ ظاہر نہ کی جائے بلکہ دل ہی دل میں رہے۔ اس میں سے بعض تصورات مشرق اور مغرب دونوں کی تہذیب میں مشترک ہیں لیکن ان میں سے بیشتر آج کی مغربی تہذیب کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتے اسی تہذیب نے فسطائیت اور نازیت کو جنم دیا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے ان میں اور فسطائی فلسفے میں کچھ بہت فرق نہیں ہے گو یہ صحیح ہے کہ فسطائی فلسفہ انسانیت اور انسانی زندگی کو اور بھی زیادہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ "انسانیت" کی روایات جو یورپ کے طرز فکر پر بہت عرصے تک حاوی رہی ہیں، اب مٹتی جارہی ہیں اور یورپ کی سیاسی اور معاشی فضا فسطائیت کے فروغ پانے کے لئے سازگار ہے جب تک ماضی کے اس تصور سے رہائی حاصل نہ کرلی جائے جنگ میں فتح پانے سے کچھ بہت زیادہ تبدیلیوں کی امید نہیں کی جاسکتی۔ وہی پرانے خرافات اور اوہام باقی رہیں گے اور ہم پھر اسی شیطانی چکر میں پڑے رہیں گے۔

جنگ سے جو دو باتیں نمایاں طور پر سامنے آگئی ہیں وہ روس اور امریکہ کی طاقت اور دولت میں غیر معمولی اضافہ اور اضافے کے امکانات ہیں۔ روس غالباً آج جنگ سے پہلے کے مقابلے میں نسبتاً غریب ہوگیا ہے۔ لیکن اس کی دولت میں اضافے کے امکانات بہت زیادہ ہیں اور وہ بہت جلد نہ صرف اپنے نقصانات

کے بعد چند سال تک یورپ، چین اور ہندوستان میں مشینوں اور مشین سے بنی ہوئی چیزوں کی بڑی مانگ ہوگی اور یہ بات امریکہ کے لئے اپنی فاضل پیداوار کے بیچنے میں بہت معاون ہوگی۔ لیکن ہر ملک جلد ہی اپنی ضرورت کی بیشتر چیزوں کے بنانے کی صلاحیت پیدا کرے گا اور امریکہ کی برآمد صرف ان خاص چیزوں پر محدود ہو کر رہ جائے گی جو دوسرے ملک میں نہ بن سکتی ہوں۔ لوگوں کی صرف دولت کی قوت کا دارومدار عوام کی قوت خرید پر ہوگا اور قوت خرید میں اضافے کے لئے بنیادی معاشی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ قیاس یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کے معیار زندگی میں نمایاں تبدیلی ہوئی تو بین الاقوامی تجارت کو فروغ ہوگا اور اشیاء کی لین دین میں اضافہ لیکن خود معیار زندگی کو بلند تر بنانے کے لئے نوآبادیات اور پس ماندہ ملکوں میں دولت کی پیداوار اور تقسیم پر سے بہت سی سیاسی اور معاشی پابندیوں کا ہٹانا ضروری ہوگا۔ اور ان بندھنوں کو توڑنے کے لئے قدرتاً بہت بڑی بڑی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی جو لازماً پرانے نظام کو درہم برہم کرکے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالنے کا باعث ہوں گی۔

ماضی میں انگلستان کی معاشی زندگی کی بنیاد اس پر قائم تھی کہ اس کی برآمد تجارت بہت زیادہ تھی، اس نے دوسرے ملکوں میں بہت بڑا سرمایہ لگا رکھا تھا، لندن کے ساہوکارے کو مالیات میں دنیا کی قیادت حاصل تھی اور بحری تجارت کی باربرداری کا کاروبار زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ سے پہلے انگلستان اپنی غذا کا ۵۰ فی صدی حصہ دوسرے ملکوں سے درآمد کرتا تھا لیکن غذا کی پیداوار میں اضافے کی غیر معمولی کوششوں کی وجہ سے غالباً اب وہ اس حد تک دوسروں کا محتاج نہ ہوگا۔ غذا اور خام پیداوار کی قیمتوں کی

ادائیگی صنعتی چیزوں کی برآمد، دوسرے ملکوں میں سرمایہ لگانے بحری باربرداری اور ساہوکارے کے کام "غیر محسوس" برآمد کے ذریعے کی جاتی تھی۔ بیرونی تجارت اور خصوصاً بڑے پیمانے پر اشیاء کی برآمد انگلستان کی معاشی زندگی کا اہم اور ضروری جزو تھی۔ یہ معاشی زندگی نوآبادیاتی علاقوں میں اجارہ دارانہ اقتدار پر مبنی تھی اور سلطنت کے اندر خاص انتظامات کی ضرورت پڑتی تھی تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ اجارہ دارانہ نگرانی اور انتظامات نوآبادیات اور محکوم ممالک کے لئے بہت نقصان کا باعث تھے اور آئندہ انھیں ان کی پرانی شکلوں میں باقی رکھنا بہت مشکل ہوگا۔ دوسرے ملکوں میں برطانیہ کا جو سرمایہ لگا ہوا تھا وہ سب اب ختم ہو چکا ہے اور اس کے بدلے اب انگلستان دوسرے ملکوں کا بہت زیادہ مقروض ہو گیا ہے۔ لندن کی مالی قیادت بھی ختم ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے بعد برطانیہ کو اپنی برآمد تجارت اور باربرداری پر بہت زیادہ بھروسہ کرنا پڑ گیا۔ لیکن برآمد تجارت میں اضافے کے بلکہ اسے پرانی سطح پر قائم رکھنے کے امکانات بھی بہت محدود ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ کی مجموعی درآمد تجارت کی مالیت (اس مال کی قیمت منہا کر کے جو درآمد کے بعد پھر برآمد کیا جاتا تھا) جنگ سے پہلے ۱۹۳۶-۳۸ء میں اوسطاً ۸۶۶,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ تھی۔ اس کی ادائیگی کے لئے ذیل کی مختلف شکلوں سے رقمیں حاصل کی جاتی تھیں۔

برآمد	۴۷۸	ملین	پونڈ
بیرونی سرمایے کی آمدنی	۲۰۳	"	"
جہازرانی	۲۰۵	"	"
ساہوکارے	۴۰	"	"

گھاٹا ۴۰ ملین پونڈ۔

۸۶۶ ملین پونڈ

اب بیرونی ملکوں میں لگے ہوئے سرمایے کی معقول آمدنی کے بجائے بیرونی قرض کے ایک بھاری بوجھ کا سامنا کرنا پڑے گا جو ہندوستان، مصر، ارجنٹائن اور دوسرے ممالک سے سامان اور خدمات حاصل کرنے کی وجہ سے انگلستان کے ذمہ عائد ہو گیا ہے امریکہ نے ادھار پٹے کے قانون کے تحت جو مدد دی ہے وہ بالکل الگ ہے۔ اور لارڈ کینیس نے اندازہ لگایا ہے کہ جنگ کے بعد اس مستقل اسٹرلنگ قرضے کی مقدار ۳۰۰۰ ملین پونڈ تک پہنچے گی۔ ۵ فی صدی کے حساب سے اس کا سود ۱۵۰ ملین پونڈ ہوتا ہے۔ جنگ سے پہلے کے اوسط کا لحاظ رکھا جائے تو انگلستان کو سالانہ ۳۰۰ ملین پونڈ کا گھاٹا ہوگا۔ اگر یہ کمی برآمدیں اور مختلف خدمات کی آمدنی میں اضافے سے پوری نہ ہوسکے تو اس کے معیار زندگی پر نمایاں اثر پڑے گا۔

برطانیہ کی بعد جنگ پالیسی کے تعین میں یہ ایک اہم عنصر ہوگا۔ وہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ اگر اسے اپنا موجودہ معاشی نظام باقی رکھنا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ نوآبادیات پر اس کا اقتدار بدستور باقی رہے البتہ کچھ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں جو بالکل ناگزیر ہوں کر دی جائیں۔ انگلستان دنیا کی سیاست میں محض اسی صورت میں نمایاں حصہ لے سکتا ہے اور امریکہ اور روس کی عظیم الشان طاقتوں کا معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہم پلہ ہوسکتا ہے جب وہ ملکوں کے ایک گروپ میں جن میں سے بعض نوآبادیاں ہوں شریک غالب کی حیثیت رکھتا ہو۔ سلطنت کو قائم سابق مقبوضات کو نہ چھوڑنے اور اپنے حلقۂ اقتدار کو نئے ملکوں (مثلاً سیام) تک وسعت دینے کی خواہش دراصل اسی آرزو کی مظہر ہے۔ اسی لئے برطانوی

حکومت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف نوآبادیات سے اور مغربی یورپ کی چھوٹی قوموں سے اس کے اور زیادہ قریبی تعلقات قائم ہوجائیں۔ نوآبادیات اور محکوم ممالک کے متعلق فرانسیسی اور ڈچ پالیسی عام طور پر برطانوی پالیسی کی حمایت کرتی ہے۔ بلکہ ڈچ شہنشاہیت تو برطانوی سامراج کا محض ایک عکس ہے۔ برطانوی سلطنت کے بغیر ڈچ سامراج کا باقی رہنا ناممکن تھا

برطانوی سیاست کے ان رجحانات کا سمجھنا آسان ہے کیونکہ اس کی بنیاد ماضی کے تصورات اور معیاروں پر ہے اور اس کی تعمیر ایسے لوگوں نے کی ہے جو ان تصورات پارینہ میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن انیسویں صدی کے معاشی نظام کے اس پرانے نقشے کے اندر برطانیہ کے لئے بڑی زبردست مشکلات ہیں۔ دراصل برطانیہ کی پوزیشن بہت کمزور ہے اس کا معاشی نظام موجودہ حالات سے مطابقت نہیں رکھتا، اس کے معاشی ذرائع بہت محدود ہیں، اور اس کی فوجی اور صنعتی طاقت پرانی سطح پر باقی نہیں رکھی جاسکتی۔ پرانے نظام معاشیات کو قائم رکھنے کے لئے جو طریقے تجویز کئے گئے ہیں وہ بنیادی طور پر بہت کمزور ہیں۔ کیونکہ ان سے ایک دائمی کشاکش پیدا ہوگی، ہر ملک کی سلامتی خطرے میں پڑجائے گی اور محکوم ممالک اور نوآبادیات میں اور بھی زیادہ بیزاری پھیلے گی۔ جس سے شاید برطانیہ کا مستقبل اور خطرناک ہوجائے گا۔ انگریزوں کی اس جائز خواہش کی تکمیل کہ وہ اپنا پرانا معیار زندگی برقرار رکھیں بلکہ اسے اور بھی بہتر بنا سکیں اس پر منحصر ہے کہ برطانوی مال کی برآمد کے لئے محفوظ بازار ملیں، اور نوآبادیاتی اور دوسرے محکوم علاقوں پر برطانوی اقتدار باقی رہے تاکہ خام پیداوار اور سستی غذا میسر آسکے یعنی برطانوی معیار زندگی کو بلند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے بسنے والے کروروں انسانوں کو محض انتہی

روٹی پر جس سے سانس چلتا رہے یا اس سے بھی کم پر قانع رکھا جائے، برطانوی معیار زندگی کو گھٹانے کی کسی کو خواہش نہیں لیکن یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے بسنے والے اس نوآبادیاتی نظام کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے جو انھیں انسانیت سے گری ہوئی زندگی گذارنے پر مجبور کرتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جنگ سے پہلے انگلستان میں ایک فرد کی سالانہ آمدنی ۹۷ پونڈ تھی (امریکہ کی فی کس آمدنی اس سے کہیں زیادہ تھی) لیکن ہندوستان کی فی کس آمدنی ۶ پونڈ سالانہ سے زیادہ نہ تھی یہ غیر معمولی تفاوت اب برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ خود حاکم ملک کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے اس لئے کہ نوآبادیاتی معاشی نظام سے جو منافع حاصل ہوتا تھا وہ کم ہوتا جاتا ہے۔ امریکہ کو اس بات کا پورا احساس ہے اسی لئے وہ نوآبادیوں کو آزاد کر کے اور ان میں صنعت کو ترقی دے کر ان کی قوت خرید میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ خود برطانیہ میں ہندوستان کی صنعتی ترقی کی ضرورت کا ایک حد تک احساس پیدا ہو گیا ہے اور بنگال کے قحط نے بہت سے لوگوں کو اس بات کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن برطانوی حکومت کی خواہش یہ ہے کہ ہندوستان کی ترقی برطانوی نگرانی میں ہو اور برطانوی صنعتوں کو خاص مراعات حاصل رہیں ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اور ملکوں کی طرح صنعتی ترقی تو ہو ہی رہی ہے سوال صرف اس کی رفتار کا ہے۔ لیکن یہ بات مشتبہ ہے کہ یہ ترقی نوآبادیاتی معاشی نظام کے ماتحت ایک غیر ملکی طاقت کی نگرانی میں ہو سکتی ہے۔

برطانوی شہنشاہیت اپنی موجودہ شکل میں کوئی جغرافی وحدت نہیں ہے۔ اور نہ وہ کوئی مؤثر تہذیبی یا معاشی وحدت ہے۔ اس کی بنیاد تاریخی اور جذباتی

ہے۔ جذبات اور پرانے رشتے بھی اہمیت رکھتے ہیں لیکن آخر میں وہ دوسری مصلحتوں پر جو ان سے کہیں زیادہ اہم ہیں غالب نہیں آ سکتے۔ پھر یہ جذباتی رابطہ بھی صرف بعض ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ جہاں برطانوی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ ہندوستان میں یا دوسری محکوم نوآبادیات کو انگلستان سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ افریقہ میں بوئروں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انگلستان سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ بڑی بڑی نوآبادیوں میں دھیرے دھیرے ایسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جو برطانیہ کے ساتھ اس روایتی رشتے کو کمزور بنا رہی ہیں۔ مثلاً کینیڈا جس نے صنعتی حیثیت سے دوران جنگ میں بڑی ترقی کی ہے۔ اب ایک اہم طاقت بن چکا ہے اور اس کے امریکہ سے گہرے تعلقات ہیں۔ اس کا معاشی نظام وسیع ہوتا جاتا ہے اور یہ چیز ایک حد تک برطانوی صنعت کی راہ میں مشکلات پیدا کرے گی آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی جن کی معاشی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی جگہ برطانیہ عظمٰی کے یورپی دائرے میں نہیں ہے بلکہ بحرالکاہل کے دائرے میں ہے جو ایشیا سے امریکہ تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں امریکہ کا سب سے زیادہ اثر ہوگا۔ تہذیبی حیثیت سے بھی کینیڈا اور آسٹریلیا دونوں ہی روز بروز امریکہ سے زیادہ قریب ہوتے جا رہے ہیں۔

نوآبادیات کا برطانوی نظریہ امریکن حکمت عملی اور امریکہ کی معاشی زندگی کے توسیعی رجحانات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ امریکہ کھلے بازار چاہتا ہے تاکہ اس کی برآمد تجارت کو فروغ ہو سکے اور وہ دوسری طاقتوں کی کوششوں کو جو بازاروں کو محدود کرنا یا اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ ایشیا کی آبادی تیزی سے صنعتی ترقی کرے اور

اس کا معیارِ زندگی بلند ہو اس میں جذبات کو دخل نہیں بلکہ امریکہ کو اپنی فاضل پیداوار کے کھپانے کے لئے بازار کی فکر ہے۔ اس کے اور برطانیہ کے درمیان برآمد کے کاروبار اور بحری تجارت کے میدان میں تصادم ناگزیر نظر آتا ہے۔ اسی طرح امریکہ کی یہ خواہش کہ وہ ہوائی طاقت میں برتری حاصل کرے، جس کے لئے اس کے پاس کافی وسائل موجود ہیں انگلستان میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ امریکہ غالباً سیام کی آزادی کا حامی ہے لیکن انگلستان اسے ایک نیم نوآبادیاتی ملک بنا دینا زیادہ پسند کرے گا نقطۂ نظر کا یہ اختلاف جو دونوں کی معاشی پالیسی کے فرق پر مبنی ہے سارے نوآبادیاتی مسائل میں پایا جاتا ہے۔

آج برطانیہ کو جن غیر معمولی حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اس کے پیشِ نظر برطانوی پالیسی کا یہ مقصد کہ سلطنت اور کامن ویلتھ کے مختلف ارکان میں آپس میں زیادہ سے زیادہ گہرے تعلقات [illegible] پیدا کئے جائیں آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن واقعات کی رو، دنیا کے رجحانات، نوآبادیوں میں جذبہ قوم پرستی کا فروغ، اور نوآبادیاتی سلطنت میں انتشار کے آثار یہ سب چیزیں اس مقصد کی تکمیل میں حائل ہیں پرانی بنیادوں پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کرنا، گئے گذرے زمانے کے خیالات میں مگن رہنا، اس زمانے میں سلطنت کا ذکر کرنا اور اس کی بقا کا خواب دیکھنا اور دنیا بھر میں اپنا اجارہ قائم رکھنے کی آرزو کرنا خاص طور پر برطانیہ کے لئے بڑی حماقت کی بات ہے کیونکہ وہ اسباب جنھوں نے برطانیہ کو سیاسی، صنعتی اور مالی حیثیت سے ایک طاقتور قوم بنا دیا تھا اب سب مٹ چکے ہیں۔ تاہم برطانوی قوم میں بعض نمایاں خصوصیات تھیں اور اب بھی ہیں یعنی جرأت اور ہمت، مل جل کر کام کی خواہش، سائنٹیفک اور تعمیری

قابلیت اور اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لینے کی صلاحیت اور ان کے علاوہ دوسرے اوصاف جو اس میں موجود ہیں کسی ملک کو عظمت حاصل کرنے اور راہ ترقی کی مشکلات اور خطرات پر غالب آنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے برطانیہ اپنے اہم اور بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنے معاشی زندگی کو بدل کر کوئی اور متوازن نظام قائم کرلے۔ لیکن اگر پہلے کی طرح برطانیہ نے اپنے پیچھے سلطنت کا دم چھلا لگائے رکھنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس کا بوجھ اٹھاتی رہے تو کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہے کہ امریکہ اور روس کی پالیسی کیا ہوگی اور ان میں اور برطانیہ میں کس حد تک تعاون یا تصادم ہوگا ہر شخص دنیا کے امن اور اشتراک عمل کی خاطر "تین بڑی طاقتوں" کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیتا نظر آتا ہے۔ لیکن جنگ کے دوران میں بھی ان کے باہمی اختلافات ظاہر ہو رہے ہیں۔ مستقبل میں اور جو کچھ بھی ہو، یہ بات بالکل واضح ہے کہ جنگ کے بعد امریکہ کی معاشی زندگی کے رجحانات توسیعی ہوں گے اور اس کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اندیشہ یہ ہے کہ شاید ایک نئی قسم کا سامراج وجود میں آ رہا ہے ایسا ہوا تو بڑی افسوسناک بات ہوگی کیونکہ امریکہ کو آج اس کا موقع حاصل ہے کہ وہ مستقبل کے لئے ایک مثال قائم کردے۔

روس کی آئندہ پالیسی اب تک ایک سربستہ راز ہے لیکن اس کے بعض پہلو سامنے آ چکے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ہمسایہ ملکوں میں سے جتنوں کو اپنا دوست اور ماتحت یا دست نگر بنا سکے بنالے۔ روس دوسرے ملکوں سے مل کر ایک عالم گیر نظام کی تعمیر میں حصہ تو ضرور لے رہا ہے، لیکن زیادہ بھروسا اسے اس بات پر ہے کہ وہ خود اپنی طاقت کو اتنا بڑھالے گا کہ کوئی ملک اس پر حملہ نہ کرسکے گا۔ غالباً دوسرے ملک بھی جہاں تک ان سے ہو سکتا ہے اسی کی کوشش کر رہے

ہیں یہ عالمگیر اشتراکِ عمل اور تعاون کے لئے کچھ اچھی فال نہیں ہے۔ روس اور دوسرے ملکوں کے درمیان بیرونی بازاروں کے لئے وہ کشمکش نہیں ہے جو امریکہ اور برطانیہ کے درمیان پائی جاتی ہے مگر اس کے باوجود ان کے اختلافات زیادہ گہرے ہیں، ان کے نقطہائے نظر میں زیادہ بعد ہے اور جنگ کی مشترک کوششیں ان شبہات کو، جو وہ ایک دوسرے کی نسبت رکھتے ہیں، دور نہیں کر سکی ہیں۔ اگر یہ اختلافات بڑھے تو امریکہ اور برطانیہ روس اور اس کے ساتھی ملکوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں انسانوں کا مستقبل میں کیا حصہ ہوگا؟ ایک طرف ان میں اپنی ہستی کا اور اپنی آئندہ اہمیت کا احساس بڑھ گیا ہے اور دوسری طرف عالمگیر مسائل کا احساس پیدا ہوگیا ہے ان ملکوں کے لوگ دنیا کے واقعات کو دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ قدرتاً ہر نئے اقدام، ہر واقعے کو وہ اس معیار پر پرکھتے ہیں کہ کیا وہ ان کی آزادی میں ممد و معاون ہوگا؟ کیا اس سے ایک ملک کا دوسرے ملک پر اقتدار ہٹ جائے گا؟ کیا اس کی بدولت انھیں اس کا موقع ملے گا کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر جس طرح چاہیں زندگی بسر کر سکیں؟ کیا اس کی وجہ سے مختلف قوموں میں اور ہر قوم کے مختلف طبقوں میں مساوات قائم کی جائے گی اور انھیں ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے؟ کیا اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ دنیا میں افلاس اور جہالت جلد ختم ہو جائے گی اور لوگوں کی حالت بہتر ہو جائے گی؟ ان ممالک میں قوم پرستی کا جذبہ موجود ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دوسروں پر تسلط قائم کرنا یا ان کے معاملات میں دخل دینا چاہتے ہیں۔ وہ عالمگیر تعاون اور ایک بین الاقوامی نظام کے قیام کی ہر کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن انھیں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہ بلند آہنگ دعوے پرانے

اقتدار کو باقی رکھنے کی نئی چالیں نہ ہوں۔ ایشیا اور افریقہ کی بہت بڑی آبادی بیدار ہو چکی ہے اس کے اندر بے چینی اور ہیجان کی کیفیت ہے اور وہ اب موجودہ حالات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ایشیا کے مختلف ملکوں کے حالات اور مسائل مختلف ہیں مگر پھر بھی چین ہندوستان جنوبی مشرقی ایشیا، مغربی ایشیا اور عرب ممالک میں اس سرے سے اس سرے تک ایک مشترک جذبہ موجود ہے اور یہ ان ملکوں کے درمیان ایک غیر مرئی رشتۂ اتحاد کا کام دیتا ہے۔ کوئی ہزار بارہ سو سال تک جب یورپ پس ماندگی کی زندگی بسر کر رہا تھا، اور تاریکی میں گھرا ہوا تھا ایشیا نے انسان کی روحی ترقی کی نمائندگی کی ہے۔ اس دوران میں ایشیائی ملکوں میں تمدن کے اعلیٰ ترین نمونے پیدا ہوئے طاقت اور تہذیب کے بڑے بڑے مرکز قائم ہوئے۔ آج سے کوئی ۵۰۰ سال قبل یورپ میں نئی زندگی شروع ہوئی اور اس کا اقتدار مشرق اور مغرب میں پھیلنے لگا۔ چند صدیاں گذری تھیں کہ یورپ طاقت دولت اور تہذیب کے اعتبار سے دنیا کا سب سے ممتاز بر اعظم بن گیا۔ کیا قوموں کی تاریخ میں پستی کے بعد بلندی اور عروج کے بعد زوال کے دور آتے رہتے ہیں؟ کیا اب ایک چکر ختم ہو چکا اور دوسرا شروع ہو رہا ہے؟ کیا یورپ کے زوال کے دن آ رہے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ طاقت اور اقتدار کا مرکز اب مغرب بعید میں امریکہ اور یورپ میں مشرقی حصہ بن گیا ہے جو در اصل اب تک اس کے تہذیبی ورثے میں شریک نہ تھا۔ ایشیا میں بھی سائبیریا میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے اور دوسرے ممالک بھی معرض تغیر میں ہیں اور تیزی سے ترقی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ نہ جانے مشرق اور مغرب میں آئندہ تصادم ہونے والا ہے یا کوئی نیا توازن قائم ہو جائے گا۔

اس کا فیصلہ مستقبل بعید ہی کرے گا اور اس کا اندازہ ابھی سے کرنا بالکل بے کار

ہے۔ بالفعل تو ہمیں حال کا بوجھ اٹھانا اور ان مسائل سے نپٹنا ہے جو ہمارے
سامنے ہیں۔ ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں ان مسائل کی تہ میں اصل
سوال یہ ہے کہ نہ صرف اس قسم کی جمہوریت قائم ہو جیسی یورپ میں انیسویں صدی
میں قائم ہوئی بلکہ ایک ہمہ گیر سماجی انقلاب بھی واقع ہو۔ خود جمہوریت کا تصور
اس ناگزیر انقلاب کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے اسی لئے وہ لوگ جو سماجی تبدیلیوں
سے ڈرتے ہیں جمہوریت کے قابل عمل ہونے میں شبہ ظاہر کرتے ہیں یا اس
کی مخالفت کرتے ہیں چنانچہ ان میں فسطائی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں اور ان
کا نقطہ نظر بدستور سامراجی ہے۔ ہندوستان میں آج جتنے مسائل ہمارے سامنے
ہیں فرقہ وارانہ اقلیتوں کا مسئلہ، ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ، بڑے بڑے
زمینداروں اور مذہبی جماعتوں کے خاص حقوق و مراعات کا مسئلہ، برطانوی
اقتدار اور برطانوی صنعتوں کے مفاد کا مسئلہ۔ ان سب کی بنیاد سماجی تبدیلیوں
کی مخالفت پر قائم ہے۔ اور چونکہ حقیقی جمہوریت کے قیام کے بعد یہ تبدیلیاں
ناگزیر ہیں اس لئے ہندوستان میں خود جمہوریت کے نفاذ کی مخالفت کی
جاتی ہے اور اسے ہندوستان کے مخصوص حالات کے لئے ناموزوں قرار
دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مسائل اگرچہ دیکھنے میں دوسرے ملکوں کے
مسائل سے مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل اسی قسم کے ہیں جیسے چین یا
اسپین، یا اور بہت سے ملکوں میں جنگ کے حالات کی وجہ سے سامنے آگئے
ہیں۔ یورپ کی بہت سی زمین دوز دفاعی تحریکیں اس کشمکش کا پتہ دیتی ہیں۔ ساری
دنیا میں سماجی طاقتوں کا توازن درہم برہم ہو گیا ہے اور جب تک نیا توازن قائم نہ ہو جائے فساد اور
کشمکش کا جاری رہنا ناگزیر ہے۔ ان مسائل پر نظر ڈالنے پر قدرتاً ہمارے زمانے کا مرکزی مسئلہ
سامنے آجاتا ہے کہ جمہوریت اور اشتراکیت کو کس طرح سمویا جائے؟ انفرادی

آزادی اور ایج کو قائم رکھتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی معیشت میں مرکزی تنظیم اور منصوبہ بندی کو عمل میں لانے کی کیا صورت ہو؟

آزادی اور سامراج

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کے معاملات میں سویٹ یونین اور امریکہ بہت نمایاں اور اہم حصہ لیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں جتنے کوئی دو ترقی یافتہ ملک ہو سکتے ہیں اور ان خوبیاں اور خامیاں بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف قسم کی ہیں۔ ایک خالص سیاسی جمہوریت میں جو خرابیاں ہو سکتی ہیں وہ سب امریکہ میں موجود ہیں۔ اور سیاسی جمہوریت کا فقدان جو جمہوریت پیدا کرتا ہے وہ روس میں نمایاں ہیں۔ پھر بھی ان ملکوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں دونوں ملکوں میں عمل کا جوش اور ترقی کا ولولہ ہے۔ دونوں کے پاس قدرتی وسائل کی فراوانی ہے۔ سماجی حیثیت سے دونوں ملکوں میں ایک طرح کی لچک ہے۔ دونوں عہد وسطیٰ کی روایات سے آزاد ہو چکے ہیں اور دونوں اور اس کے استعمال پر ایمان رکھتے ہیں عوام میں زیادہ سے زیادہ تعلیم پھیلانا چاہتے ہیں اور ان کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ مختلف لوگوں کی آمدنی میں زمین آسمان کا فرق ہونے کے باوجود معاشرہ دوسرے ملکوں کی طرح جدا جدا طبقات میں منقسم نہیں ہے لوگوں میں مساوات کا احساس ہے۔ روس میں پچھلے بیس سال کا سب سے نمایاں واقعہ یہ ہے کہ تعلیم میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اور عوام کے لئے ہر قسم کے مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ اس طرح دونوں ملکوں میں ترقی پسند جمہوری ریاست بننے کے لئے کل بنیادی شرائط موجود ہیں کیونکہ ایک ترقی پذیر سوسائٹی کی بنیاد اس چیز پر قائم نہیں ہو سکتی کہ معدودے چند تعلیم یافتہ ایک جاہل اور بے حس قوم پر حکومت کرتے ہوں۔ اور اگر قوم تعلیمی اور تہذیبی حیثیت سے

ترقی یافتہ ہو تو اس پر چند آدمیوں کی حکومت زیادہ دن چل ہی نہیں سکتی۔ اب سے کوئی سو سال پہلے ڈی ٹوکول نے اپنے زمانے کے امریکہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اگرچہ جمہوریت لوگوں کو اس کا شوق تو نہیں دلاتی کہ علم کو محض علم کی خاطر حاصل کریں لیکن وہ انھیں بہت بڑی تعداد میں حصول علم پہ آمادہ ضرور کرتی ہے۔ جس سوسائٹی میں دائمی عدم مساوات ہو وہاں محقق مجرد حقائق کی تلاش میں الجھے رہتے ہیں برخلاف اس کے جمہوری سماجی نظام اور جمہوری ادارے انھیں علوم کے عملی اور افادی پہلو کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ رجحان قدرتی ہے اور ناگزیر یہ اب تک امریکہ میں بہت کچھ تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے۔ امریکہ وہ بہت سی نسلوں کا معجون مرکب بن گیا ہے۔ پھر بھی اس کی بنیادی خصوصیات باقی ہیں۔

روس اور امریکہ کی ایک مشترک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان پر ماضی کا وہ بوجھ نہیں ہے۔ جس نے ایشیا اور یورپ کو دبا رکھا ہے اور بہت بڑی حد تک، ان کی سرگرمیوں پہ اثر ڈالا ہے اور ان میں باہمی کش مکش پیدا کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ملک بھی خود اپنے عہد کی ذمہ داریوں سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن جہاں تک دوسری قوموں سے تعلقات قائم کرنے کا سوال ہے ان کو گذشتہ روایات کی مقابلتاً کم پابندی کرنی پڑتی ہے، اور چونکہ ان کا بوجھ ہلکا ہے اس لئے وہ مستقبل کی راہ میں زیادہ آسانی سے قدم بڑھا سکتے ہیں۔

اس وجہ سے یہ ملک دوسروں سے ربط ضبط پیدا کرنے میں باہمی عدم اعتماد کے اس جذبے سے آزاد ہیں جو سامراجی طاقتوں کے بیرونی تعلقات میں ہمیشہ پایا جاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا ماضی بالکل بے داغ اور ہر قسم کے شبہات سے پاک ہے۔ امریکہ میں حبشیوں کا مسئلہ اس کے جمہوریت اور مساوات کے دعووں کو باطل کرتا ہے۔ اسی طرح روس کو مشرقی یورپ میں پرانی عداوتوں

اور نفرتوں کو مٹانا ہے۔ اس جنگ نے ان میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن اس
کے باوجود امریکی دوسرے ملک کے لوگوں سے بہت جلد دوستی کر لیتے ہیں
اور وہ نسلی تعصبات سے یکسر پاک ہیں۔

یورپ کی اکثر قوموں کے دل ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبے
اور پرانے جھگڑوں اور بدسلوکیوں کی یاد سے معمور ہیں۔ سامراجی طاقتوں نے
اس نفرت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے محکوم ممالک ان سے سخت بیزار ہیں۔
اور چونکہ برطانوی سلطنت کے اقتدار کا زمانہ سب سے زیادہ طویل رہا ہے
اس لئے اس پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یا تو اس وجہ سے یا
نسلی خصوصیات کی وجہ سے انگریز بہت کم آمیز اور بیگانہ وش ہوتا ہے اور دوسروں
سے اس کی دوستی آسانی سے نہیں ہوتی۔ بدقسمتی سے انگریزی قوم کے متعلق دوسرے
ملکوں کے لوگ اس کے سرکاری عہدہ داروں کو دیکھ کر رائے قائم کرتے ہیں
اور یہ لوگ عام طور پر انگریزی حریت پسندی یا تہذیب کے علم بردار نہیں ہوتے
بلکہ ان میں ظاہری پرہیزگاری کے ساتھ ایک طبقاتی غرور ہوتا ہے۔ ان عہدہ داروں
کو خواہ مخواہ دوسروں کو اپنا مخالف بنانے میں کمال حاصل ہے۔ ابھی چند
مہینوں کی بات ہے حکومت ہند کے ایک سیکرٹری نے گاندھی جی کو جو ان دنوں
نظر بند تھے سرکاری طور پر ایک خط لکھا تھا جس میں جان بوجھ کر انتہائی بدتمیزی
سے کام لیا تھا۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس نے قصداً ہندوستانی
قوم کی توہین کی۔ کیونکہ گاندھی جی قوم کی نشانی ہیں۔

معلوم نہیں مستقبل اپنے ساتھ سامراج کا ایک اور دور لائے گا، یا بین
الاقوامی تعاون، یا عالمگیر دولت مشترکہ کا دور؟ آج تو اول الذکر کا پلہ بھاری
نظر آتا ہے اور پرانی دلیلیں پھر سے دہرائی جا رہی ہیں اگرچہ اب اس قدر صاف گوئی

سے کام نہیں لیا جاتا۔ انسانیت کے اخلاقی محرکات اور انسانی قربانیوں کو پست مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حکمراں طبقے انسان کی نیکی اور شرافت کو غلط راہ پر لگا رہے ہیں اور لوگوں کے خوف اور نفرت کے جذبات اور بیجا حوصلوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ قدیم زمانے میں لوگ سامراج کے متعلق زیادہ صاف گوئی سے کام لیتے تھے۔ ایتھنس کی سلطنت کا ذکر کرتے ہوئے تھوسی ڈائڈلیس نے لکھا ہے "ہم یہ شاندار دعوے نہیں کرتے کہ ہمیں اپنی سلطنت قائم کرنے کا حق اس وجہ سے ہے کہ ہم نے تنہا وحشیوں کو شکست دی یا اپنے محکوموں کی یا تہذیب وتمدن کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ افراد کی طرح ریاستوں کو بھی اپنے تحفظ کا مناسب انتظام کرنے پر انھیں موردالزام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آج اگر ہم سسلی پر حکمراں ہیں تو محض اپنے تحفظ کی خاطر..... ہمیں خوف مجبور کرتا ہے کہ ہم یونان میں اپنی سلطنت کو دانتوں سے پکڑے رہیں، خوف ہی کی وجہ سے ہم یہاں آئے ہیں تاکہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سسلی کا انتظام کریں" اور پھر ایتھنس کی نوآبادیات کے خراج کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا "ممکن ہے ان کا فتح کرنا ظلم رہا ہو لیکن انھیں آزاد کر دینا یقیناً حماقت ہوگی"۔

ایتھنس کی تاریخ ایسی عبرت انگیز مثالوں سے بھری پڑی ہے جن سے یہ باتِ بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جمہوریت اور سامراج دو بالکل متضاد تصورات ہیں۔ اس تاریخ سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ کس طرح جمہوری ریاستیں اپنی نوآبادیات پر مظالم کرتی ہیں اور پھر کتنی تیزی سے وہ سلطنت کمزور اور زوال پذیر ہوجاتی ہے، سامراج اور آزادی کی حمایت میں جس خوبی اور زور بیان کے ساتھ

اپنا نقطۂ نظر تھوسی ڈائڈیس نے پیش کیا ہے آج کوئی نہیں کرسکتا: "ہم تہذیب کے رہنما ہیں اور انسانی نسل کے ہراول۔ ہماری صحبت سب سے بڑی نعمت ہے جو انسان کے اختیار میں ہے۔ ہمارے حلقۂ اثر میں ہونا محکومی نہیں بلکہ عزت ہے۔ مشرق کی ساری دولت ان نعمتوں کا بدلہ نہیں ہوسکتی جو ہم لوگوں کو بخشتے ہیں۔ اس طرح ہم شوق سے اس تمام مال و دولت کو جو ہمیں ہاتھ آتی ہے استعمال کر سکتے ہیں اور مطمئن رہ سکتے ہیں کہ مشرق کتنی ہی کوشش کرے ہمارے قرض سے سبک دوش نہیں ہوسکتا۔ کوششیں کرکے، تکلیفیں اٹھاکر اور میدان جنگ میں ٹھوکریں کھاکر ہم نے انسانی طاقت کا راز دریافت کرلیا ہے اور وہی انسانی مسرت کا بھی راز ہے۔ انسان نے اس راز کو معلوم کرنے کی بہت سی کوششیں کی ہیں اور اس کے بہت سے نام رکھے۔ لیکن صرف ہم ہی نے اسے دریافت کیا ہے اور اپنے شہر میں عام کردیا ہے ہم اسے آزادی کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ اس نے ہمیں سکھایا ہے کہ خدمت ہی حقیقی آزادی ہے۔ پھر بھی کیا تمھیں تعجب ہے کہ بنی نوع انسان میں صرف ہم ہی ایسے ہیں جو دوسروں کو بے غرضی سے فائدہ پہنچاتے ہیں اس بھروسے پر کہ ہم آزاد ہیں اور آزاد رہیں گے۔"

آج جب آزادی اور جمہوریت کا عام اعلان کرنے کے باوجود اسے چند قوموں تک محدود کردیا گیا ہے یہ آواز جانی پہچانی سی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں سچائی بھی ہے اور سچائی سے انکار بھی۔ تھوسی ڈائڈس کی نظر بحر روم کے ممالک تک محدود تھی اور اسے دوسری قوموں سے واقفیت نہ تھی اپنے مشہور و معروف شہر کی آزادی پر فخر کرنے، اور آزادی کو انسان کی راحت اور قوت کی بنیاد سمجھنے کے باوجود وہ یہ محسوس نہ کرسکا کہ دوسرے بھی اس آزادی کو حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ آزادی کے شیدائی ایتھنز نے میلوس کو تباہ و برباد کر ڈالا، ہائے

گھاٹ اتار دیا۔ بچوں اور عورتوں کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ عین اس وقت جب تھوسی ڈائڈس کے سلطنت کے اور ایتھنس کی آزادی کے گیت گا رہا تھا وہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی اور آزادی کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔

آزادی اور غلامی زیادہ عرصے تک ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی۔ ان میں سے ایک دوسرے پر غالب آجاتا ہے سلطنت کے عروج وزوال کے درمیان وقفہ بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ آج کل آزادی پہلے سے بھی زیادہ ناقابل تقسیم ہو چکی ہے جب پیریکلس نے اپنے محبوب شہر کی شاندار تعریف کی تھی تو اس کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ شہر فتح ہو گیا اور اسپارٹا کی فوج ایکروپولس پر قابض ہو گئی لیکن اس کے الفاظ جو عقل، آزادی اور شجاعت کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ آج بھی ہمارے دلوں کو متاثر کرتے ہیں لیکن یہ صرف اس کے عہد کے ایتھنس کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے ہیں۔ "ہم حسن کے پرستار ہیں لیکن بے اعتدالی سے نہیں۔ عقل کے پیرو ہیں لیکن بزدل نہیں۔ ہمارے لئے دولت محض نمود و نمائش کی چیز نہیں بلکہ بڑے بڑے کام انجام دینے کا ذریعہ ہے اور افلاس کا اعتراف کرنے میں کوئی ذلت نہیں مگر یہ بڑی ذلت کی بات ہے کہ اسے دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں اپنی قوت اور حوصلے کو بڑھانے کے لئے ان فرسودہ فقروں سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ کہ میدان جنگ میں بہادری دکھانا ایسا ہے اور ویسا ہے بلکہ اپنے اس عظیم الشان شہر کی روزمرہ کی زندگی کو جو ہر وقت ہمارے سامنے ہے قدر اور محبت کی نظر سے دیکھنا چاہیئے اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے شہر کی یہ ساری عظمت ان افراد کے طفیل حاصل ہوئی ہے جن میں سپاہیوں کی بہادری

دانشمندوں کی فرض شناسی اور نیکوں کا حسن عمل اور ضبط نفس تھا۔ وہ ایسے لوگ تھے کہ اگر کسی امتحان میں ناکام رہتے تب بھی قوم کو اپنی خدمات سے محروم نہ کرتے بلکہ اپنی جانیں اس کی نذر کر دیتے اس طرح انھوں نے اپنے جسموں کو ملک پر قربان کرکے ابدی شہرت اور نیک نامی حاصل کر لی انھیں بڑے شاندار مزار نصیب ہوئے، مٹی کے تودوں میں نہیں جہاں ان کی ہڈیاں دفن ہیں بلکہ انسانوں کے دلوں میں، جہاں ان کی عظمت کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی اور حسب موقع لوگوں کو تقریر اور عمل پر ابھارتی رہے گی۔ اس لئے کہ ساری دنیا مردان اولوالعزم کا مقبرہ ہے۔ ان کے سوانح صرف اپنے ملک میں پتھر پر کندہ نہیں بلکہ دور دور تک غیر مرئی شکل میں انسانی زندگی کے تار و پود میں شامل ہوگئے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ ان کے کارناموں کی ریس کرو اور یہ جان لو کہ مسرت کا راز آزادی میں پنہاں ہے۔ آزادی کا راز یہ ہے کہ انسان جرأت اور ہمت سے کام لے اور دشمن کے حملے کے انتظار میں ہاتھ پیر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہے"۔

۱۴۔ مسئلہ آبادی

تنزل پذیر شرح پیدائش اور قومی انحطاط

جنگ کے پانچ سال میں ملکوں کی آبادی میں اتنی زبردست تبدیلیاں ہوئیں کہ دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ ہوئی ہوں گی کروڑوں آدمی جو چین روس، پولینڈ، اور جرمنی میں جنگ کے دیوتا کی بھینٹ چڑھ گئے اور

ان کے علاوہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد اپنا گھر بار چھوڑ کر دیس بہ دیس کی خاک چھاننے پر مجبور کر دی گئی بہت سے فوجی ضروریات مزدوروں کی بھرتی اور جبری تخلیے کے سلسلے میں ہٹائے گئے۔ اور بے شمار آدمیوں کو اپنے گھر چھوڑنے پڑے۔

جنگ سے پہلے بھی نازیوں کی یہودی دشمن پالیسی کی بنا پر بے خانماں پناہ گزینوں کا مسئلہ یورپ میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن لڑائی کے زمانہ میں جو کچھ ہوا اس کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ جنگ کے بلاواسطہ اثرات سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو یورپ میں یہ تبدیلیاں بڑی حد تک نازیوں کی بالقصد پالیسی کا نتیجہ تھیں۔ بظاہر انھوں نے لاکھوں یہودیوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے مقبوضہ ملکوں میں سے اکثر یہودی آبادی کو منتشر کر دیا روس میں لاکھوں وروں آدمی مشرق کی طرف ہجرت کرے تاکہ یورال کے اس پار نئی بستیاں بسائیں۔ اور غالباً اب یہ مستقل حیثیت اختیار کریں گی چین کے متعلق اندازہ کیا گیا ہے کہ وہاں پانچ کروڑ آدمی بے گھر ہو گئے۔

جنگ کے بعد جو لوگ بچ رہیں گے انھیں ان کے وطن واپس پہنچانے اور پھر سے بسانے کی کوششیں ضرور کی جائیں گی مگر یہ ایک نہایت مشکل اور پیچیدہ کام ہوگا۔ بہت سے اپنے گھروں کو واپس جائیں گے مگر بہت سے نہ جائیں گے۔ اپنے نئے ماحول میں ہی رہیں گے اور پھر یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یورپ کی سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے اور لوگوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑے گا اور آبادیوں کا مزید مبادلہ ہو۔

لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم اور نتیجہ کے لحاظ سے دور رس
اور تبدیلیاں ہیں جن کی وجہ سے دنیا کی آبادی تیزی سے بدل رہی ہے
صنعتی انقلاب اور جدید طرز صنعت کے رواج سے یورپ اور خصوصاً
شمالی مغربی اور مشرقی یورپ کی آبادی میں زبردست اضافہ ہوا تھا
اب یہ صنعت مشرق میں سوویٹ یونین تک پہونچ گئی ہے اور اس
نئے معاشی نظام اور کچھ اور اسباب کے ساتھ مل کر اس علاقے کی
آبادی میں اور بھی زیادہ حیرت انگیز اضافہ کر دیا ہے۔ جدید صنعت
مشرق کی طرف اور آگے تک پھیلتی جا رہی ہے۔ تعلیم اور صحت و
صفائی کے اصولوں کی واقفیت بھی بڑھ رہی ہے اور اس سے
ایشیا کے بہت سے ممالک متاثر ہوں گے۔ ان میں سے بعض ممالک
مثلاً ہندوستان کو آبادی میں مزید اضافہ کی ضرورت نہیں۔ ان
کے لئے تو یہ بہتر ہے کہ ان کی آبادی کچھ کم ہو جائے۔

لیکن اس اثنا میں مغربی یورپ میں اس کے برعکس عمل شروع
ہو چکا ہے وہاں آبادی گھٹ رہی ہے اور تنزل پذیر شرح پیدائش
کا مسئلہ روز بروز اہم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ رجحان بہت عام ہے اور
دنیا کے بیشتر ممالک اس سے متاثر ہو چکے ہیں۔ مستثنیات میں ہندوستان
چین، جاوا، اور روس کا نام لیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ نمایاں یہ رجحان
ان ملکوں میں ہے جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ہیں۔ فرانس کی آبادی
میں اضافہ مدت ہوئی بند ہو چکا۔ اب اس کی آبادی آہستہ آہستہ
گھٹ رہی ہے۔ انگلستان میں پیدائش کی شرح ۱۸۸۰ء ہی سے کم ہونی
شروع ہو گئی تھی اور آج فرانس کو چھوڑ کر یورپ کے سب ملکوں سے

کم ہو چکی ہے۔ جرمنی اور اٹلی میں اضافہ آبادی کی جو کوششیں ہٹلر اور مسولینی نے کیں انھیں صرف عارضی کامیابی نصیب ہوئی۔ شمالی، مغربی اور وسطی یورپ میں یہ کمی جنوبی اور مشرقی یورپ (جس میں روس شامل نہیں) کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن کمی کا رجحان سب کہیں پایا جاتا ہے۔ روس کو الگ کر کے دیکھا جائے تو یورپ کی آبادی موجودہ رجحانات کے مطابق ۱۹۶۰ء کے قریب نقطۂ عروج کو پہونچے گی اور اس کے بعد گھٹنی شروع ہو جائے گی اس کمی کو جنگ کے نقصانات سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کو شامل کر لیا جائے تو انحطاط آبادی کا رجحان قوی تر ہو جائے گا۔

برخلاف اس کے سوویٹ روس کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور قیاس یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء میں ۲۵ کروڑ تک پہونچ جائے گی۔ اس میں وہ اضافہ شامل نہیں جو جنگ کے دوران میں اس کی حدود کی تبدیلی سے ہوا ہے۔ آبادی کا یہ اضافہ اور صنعتی اور دوسری ترقیاں مل کر روس کو یورپ اور ایشیا کا سب سے طاقتور ملک بنا دیں گی۔ ایشیا میں بہت کچھ ہندوستان اور چین کی صنعتی ترقی پر منحصر ہے۔ ان ملکوں کی بے شمار آبادی ان کے لیے ایک بار گراں اور کمزوری کا باعث ہے تا وقتیکہ وہ مناسب طور پر منظم کر کے بار آور بنائی جائے۔ یورپ کی بڑی بڑی نوآبادیاتی طاقتیں توسیعی اور جارحانہ دور سے گذر چکی ہیں۔ ممکن ہے کہ اپنی سیاسی اور معاشی تنظیم اور اپنی قومی قابلیت کی بدولت وہ اب بھی دنیا کے معاملات میں اہم مقام حاصل کر سکیں لیکن اگر انھوں نے مل کر ایک وفاق کی شکل اختیار نہ کی تو رفتہ رفتہ وہ بڑی طاقتوں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گی۔" اب اس

کا امکان نظر نہیں آتا کہ شمالِ مغربی یورپ کی کوئی قوم دنیا کو پھر دعوت مبارزت دے گی۔ جرمنی اپنے مغربی پڑوسیوں کی طرح اب اس دور سے گذر چکا ہے جب وہ دنیا کی ایک اہم طاقت بن سکتا تھا۔ صنعتی تہذیب کے ان ملکوں میں پہنچ جانے کی وجہ سے جہاں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے یہ ناممکن ہو گیا ہے۔[۵]

صنعتی ترقی نے بہت سے مغربی ممالک اور مغربی اقوام کو طاقتور بنا دیا تھا۔ لیکن یہ قرین قیاس نہیں کہ طاقت کا یہ وسیلہ زیادہ دن تک چند ملکوں کا اجارہ رہ سکے گا۔ دنیا کے بہت بڑے حصے پر یورپ کا سیاسی اور معاشی اقتدار اب ناگزیر طور پر کم ہوتا جائے گا۔ اور وہ یوریشیا اور افریقہ کا مرکز ثقل نہ رہے گا۔ اسی بنیادی وجہ کی بنا پر یورپی اب امن کی طرف زیادہ مائل ہوں گے اور عملاً بین الاقوامی اشتراک عمل کے لئے کوشاں رہیں گے جہاں تک ہو سکے گا وہ جنگ سے پرہیز کریں گے کیونکہ جب جارحانہ حملہ کا یقینی نتیجہ تباہی ہو تو اس میں کوئی دلکشی نہیں رہتی لیکن ان عالمی طاقتوں کے لئے جنھیں اب بھی اقتدار حاصل ہے دوسروں سے اشتراک عمل کا کوئی خاص محرک نہیں سوا اخلاقی محرک کے جو طاقت کے ساتھ بہت کم پایا جاتا ہے۔ شرح پیدائش میں کمی کے اس عالمگیر رجحان کا کیا سبب ہے؟ ممکن ہے کہ ضبط تولید کے روز افزوں رواج اور بال بچوں کی تعداد کو محدود رکھنے

---

[۵] ملاحظہ ہو امریکن رسالہ "فارن افیرس" میں اپریل ۱۹۴۵ء میں فرینک ڈبلو نوٹیسٹین کا مضمون "جنگ کے بعد یورپ کی آبادی اور اقتدار" انٹرنیشنل لیبر آفس نے نقل مکان پر ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ جس کو ای۔ ایم کلینشر نے مرتب کیا ہے۔

کی خواہش کو بھی اس میں کچھ دخل ہو لیکن یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اس سے کچھ بہت زیادہ فرق نہیں پڑا ہے۔ مثلاً آئرلینڈ کو لیجئے۔ آئرلینڈ کے لوگ کیتھولک ہیں وہاں ضبط تولید کے طریقوں پر غالباً کم عمل ہوتا ہے لیکن وہاں شرح پیدائش میں دوسرے سب ملکوں سے پہلے گھٹنی شروع ہوئی۔ مغرب میں دیر میں شادی کرنے کا رواج غالباً اس انحطاط کا ایک سبب ہے" شاید معاشی عناصر کا کچھ اثر پڑا ہو لیکن یہ بھی زیادہ قابل لحاظ نہیں۔ سب جانتے ہیں غریبوں کے ہاں امیروں سے زیادہ بچے ہوتے ہیں اور دیہی علاقوں میں شرح پیدائش شہروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک چھوٹی جماعت نسبتاً اعلیٰ تر معیار زندگی قائم رکھ سکتی ہے اور جذبۂ انفرادیت کے فروغ نے جماعت اور نسل کی اہمیت ختم کر دی ہے۔ پروفیسر جے۔ بی۔ ایس ہالڈین کہتے ہیں کہ بہت سی مہذب قوموں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جو اپنی قوم میں برتر سمجھے جاتے ہیں ان کے ہاں عوام کے مقابلے میں بچے کم ہوتے ہیں اس طرح کی قوم حیاتیات کے نقطہ سے کمزور ہوتی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بڑے خاندانوں میں ذہانت کا معیار پست ہوتا ہے۔ معاشی تو تی بھی حیاتی ترقی کے منافی سمجھی جاتی ہے۔

شرح پیدائش کے انحطاط کے بنیادی اسباب کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہے ثانوی اسباب البتہ بہت سے بتائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے اس کی تہ میں کچھ عضویاتی اور حیاتی اسباب ہوں جو صنعتی ممالک کے طرز زندگی اور ان کے مخصوص ماحول کا نتیجہ ہوں۔ ناکافی غذا، شراب نوشی۔ ضعف اعصاب اور عام جسمانی اور دماغی صحت کی کمزوری ان سب کا قوت تولید پر اثر پڑتا ہے اس کے باوجود ہندوستان کی سی بھوکی اور بیمار قوموں

میں شرح پیدائش بہت زیادہ ہے شاید جدید زندگی کی جدوجہد کا بوجھ مسلسل مقابلہ اور تفکرات انسان کی قوت تولید کو کم کر دیتے ہیں ممکن ہے حیات بخش زمین سے بے تعلقی ایک اہم عنصر ہو۔ امریکہ میں کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی قوت تولید پیشہ ور طبقوں کے مقابلہ میں دگنی سے زیادہ ہوتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تہذیب جس نے سب سے پہلے مغرب میں نشو ونما پائی اور پھر اور ملکوں میں پھیل گئی خصوصاً بڑے شہروں کی زندگی جو اس تہذیب کا خاص جزہے معاشرے کو کمزور کر دیتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنی قوت حیات کو کھو بیٹھتا ہے زندگی بہت سے میدانوں میں ترقی کرتی لیکن اس کی جڑیں کمزور ہو جاتی ہیں وہ مصنوعی ہوتی جاتی ہے اور اس کی تازگی اور شادابی گھٹتی جاتی ہے۔ محرک چیزوں کی ضرورت روز بروز زیادہ محسوس ہوتی ہے نشہ آور اور دوسرے قدرتی وظائف کی انجام دہی کے لئے دواؤں سے مدد کی جاتی ہے۔ کھانے پینے میں ایسی چیزیں استعمال کی جاتی ہیں جن سے نظام جسمانی کو نقصان پہنچتا ہے مگر تھوڑی دیر کے لئے لطف آجاتا ہے اور طرح طرح کی ترکیبوں سے فرحت اور سرور کی ایک عارضی کیفیت پیدا کی جاتی ہے اس کے بعد ردعمل شروع ہوتا ہے اور طبیعت بے کیف ہو جاتی ہے۔ ہم نے ایک ایسی تہذیب کی تخلیق کی ہے جو اپنے شاندار کارناموں کے باوجود نقلی معلوم ہوتی ہے ہم مصنوعی غذا کھاتے ہیں جو مصنوعی کھاد سے پیدا کی جاتی ہے ہمارے

جذبات مصنوعی ہیں - اور ہمارے باہمی تعلقات محض سطحی - ہمارے
عہد کی ایک نشانی اشتہار بازی ہے جو ہمیں مسلسل فریب دیتی
ہے ہماری قوت ادراک کو کند کر دیتی ہے اور ہمیں غیر ضروری بلکہ
نقصان دہ چیزوں کے خریدنے کی ترغیب دلاتی ہے۔ میں ان حالات
کے لئے دوسروں کو الزام نہیں دے رہا ہوں۔ ہم سب اس
عہد کی پیداوار ہیں اور اس کے رنگ میں رنگے ہوئے موجود
ہیں اور اس لئے ہم سب مساوی طور پر مذمت یا تعریف کے مستحق
ہیں اوروں کی طرح میں خود بھی اس تہذیب کا جس کی میں تعریف
بھی کرتا ہوں اور تنقید بھی ایک جزو ہوں اور میری عادتیں اور میرے
خیالات اس کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ہمارے دل میں یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ تہذیب میں وہ کون سی خرابی ہے جو
قوت تولید کی کمی اور نسلی انحطاط کا اصل سبب ہے یہ کوئی نئی بات
نہیں ہے اس سے پہلے بھی قومیں تباہ ہوئی ہیں اور تاریخ ان کی مثالوں
سے بھری پڑی ہے۔ سلطنت روما کے زوال کے وقت روم کی
حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ کیا یہ اندرونی انحطاط عروج
زوال کے کسی قدرتی سلسلہ کا نتیجہ ہے؟ کیا ان اسباب کا پتہ لگایا جا سکتا
ہے۔ اور انھیں دور کیا جا سکتا ہے صرف موجودہ صنعتی ترقی اور سوسائٹی
کا سرمایہ دارانہ نظام اس کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے
پہلے ایسی تہذیبیں بھی مٹ چکی ہیں جن میں یہ باتیں مفقود تھیں - ہاں یہ
ممکن ہے کہ یہ عناصر اپنی موجودہ شکل میں ایک ایسا ماحول، ذاتی
ذہنی اور جسمانی فضا تیار کر دیتے ہوں جو اسباب انحطاط کی

کارفرمائی کے لیے سازگار ہو۔ اگر دنیا دی سبب کوئی روحانی عنصر
ہے جو صرف انسان کی روح اور ذہن پر اثر کرتا ہے تو اس کا
ادراک مشکل ہوگا گو ہم اسے سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں یا وجدانی
طور پر اس کا احساس کر سکتے ہیں۔ مگر ایک بات بالکل صاف ہے
زمین سے یکسر بے تعلقی فرد اور نسل دونوں کے لیے نقصان دہ ہے
زمین اور سورج زندگی کے دو سرچشمے ہیں اور اگر ہم ان سے بہت
دنوں تک علیحدہ رہیں تو زندگی کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے عہد حاضر
کی صنعتی قومیں زمین سے تعلق کھو چکی ہیں۔ انھیں قدرت کی مہیا کی
ہوئی مسرتیں نصیب نہیں اور نہ ان کے چہروں پر صحت اور تندرستی
کی وہ آب و تاب نظر آتی ہے جو دھرتی ماتا کے قرب سے حاصل
ہو سکتی ہے وہ حسن فطرت کے گن گاتے ہیں اور کبھی کبھی تعطیل کے دن
اس کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اس طرح دیہی علاقوں کو اپنی مصنوعی
زندگی کی پیداوار سے آلودہ کرتے ہیں لیکن وہ فطرت کے محرم
نہیں ہو سکتے اور یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ وہ اس کا ایک جزو ہیں وہ
ان کے نزدیک اس لیے ہے کہ آدمی دوسروں کے کہنے سے اسے
جا کر دیکھے اس کی تعریف کرے اور پھر اطمینان کا سانس لے کر اپنے
گھر لوٹ آئے جیسے آدمی کسی کلاسیکل مصنف یا شاعر کے کلام کو سمجھنے
اور اس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اکتا کر
دلچسپ بیہودہ ناول یا سراغ رسانی کا قصہ لے کر بیٹھ جاتا ہے جس میں
دماغ پر کسی قسم کا بار نہیں پڑتا۔ قدیم یونانیوں یا ہندوستانیوں کی طرح عہد
حاضر کے لوگ فطرت کی گود میں پلے ہوئے نہیں۔ ان کی مثال

ایسے شخص کی ہے جو دل پر جبر کر کے ایک دور کے رشتہ دار سے ملنے جا رہا ہو جسے وہ بہت کم جانتا ہو اس لئے یہ لوگ فطرت کی رنگا رنگی اور بوقلمونی سے وہ لطف اٹھا سکتے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد کا حصہ تھی اور نہ ان میں زندگی کا وہ شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے کہ فطرت ان کے ساتھ سوتیلی اولاد کا سا سلوک کرتی ہے۔

ہم ہمہ اوست کے اس پرانے نظریہ کو پھر سے اپنی زندگی کا جز نہیں بنا سکتے لیکن اس کے بغیر بھی شاید ہم فطرت کی پر اسرار عظمت کا احساس کر سکتے ہیں اس کے حسن اور زندگی کا نغمہ سن سکتے ہیں اور اس سے قوت حیات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ نغمہ صرف چند منتخب جگہوں ہی پر سنائی نہیں دیتا بلکہ اگر ہم اس سے آشنا ہیں تو اسے قریب قریب ہر جگہ سن سکتے ہیں پھر بھی بعض مقامات ایسے ہیں جہاں فطرت کا نغمہ ان لوگوں کو بھی مسحور کر دیتا ہے جو اس سے واقف نہیں اس لئے کہ اس کی آواز دور سے ارگن کے تیز سروں کی طرح آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح کی خوش نصیب جگہوں میں ایک کشمیر کی وادی ہے۔ جہاں حسن کی دیوی بستی ہے اور جہاں انسان کے احساسات پر ایک سحر سا چھا جاتا ہے۔ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے ایک بڑے فرانسیسی عالم ایم۔ فوشے نے لکھا ہے "کیا میں ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی بتاؤں کہ میرے نزدیک کشمیر کی اس مخصوص دلکشی کا، جسے ہر شخص محسوس کرتا ہے چاہے اس کا تجزیہ نہ کرے اصل سبب کیا ہے۔ کشمیر کا حسن محض اسکے شاندار جنگلوں میں

صاف شفاف جھیلوں، یا برف سے ڈھکی ہوئی پرعظمت پہاڑ کی چوٹیوں اور ٹھنڈی ہلکی ہوا میں اس کے بے شمار چشموں کی ترنم ریزی تک محدود نہیں اور نہ اس کی دلکشی کا راز صرف اس کی پرانی عمارتوں کے حسن اور عظمت میں پنہاں ہے اگرچہ مارتنڈ کے کھنڈر اپنے کریوا کے آگے نکلے ہوئے حصہ پر اتنے ہی شاندار معلوم ہوتے ہیں جتنا کمی را اس پر کوئی یونانی معبد اور پاپا کے چھوٹے سے مندر میں جو دس پتھروں کو تراش کر بنایا گیا ہے کسی کرائیسٹ کی یادگار کی طرح تناسب کا مکمل نمونہ ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ راز انسانی صنعت اور قدرتی مناظر کے یکجا ہونے میں مضمر ہے کیونکہ شاعرانہ ماحول میں خوشنما عمارتیں اور ملکوں میں بھی موجود ہیں۔ جو چیز صرف کشمیر میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں قسم کا حسن ایک ایسے ماحول میں جمع ہو گیا ہے جہاں فطرت کی رگوں میں اب تک ایک پراسرار زندگی کا خون دوڑ رہا ہے جہاں چپکے چپکے ہم سے قدرتی مناظر سرگوشی کرتے ہیں، ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں فطرت پرستی کے تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں اور ہمیں پھر شعوری یا غیر شعوری طور پر اس زمانے میں پہنچا دیتے ہیں جسے شاعر حسرت سے یاد کرتا ہے۔ جب دنیا جوان تھی جب

"زمین اور آسمان کا جوڑا
مل جل کر رہتا سہتا تھا"

لیکن میرا مقصد کشمیر کی قصیدہ خوانی نہیں ہے اگرچہ کشمیر کی محبت کبھی کبھی مجھے اصل موضوع سے ہٹا دیتی ہے اور نہ میں یہاں فطرت پرستی

کی حمایت کرنا چاہتا ہوں اگرچہ میرا عقیدہ ہے کہ تھوڑی سی فطرت پرستی جسم اور روح کے لئے اچھی ہے۔

مجھے جو بات کھلتی ہے وہ یہ ہے کہ زمین سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی مرجھا جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بالکل بے تعلقی تو شاید ہی کبھی ہوتی ہو اور فطرت کے کام ایک مدت میں آہستہ آہستہ انجام پاتے ہیں۔ لیکن بہرحال موجودہ تہذیب میں یہ کمزوری موجود ہے کہ وہ روز بروز حیات بخش عناصر سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں روپیہ کمانے کا خبط، باہمی مقابلہ کی کشمکش، دولت کا ہر چیز سے برتر سمجھا جانا، لوگوں کی مسلسل جدوجہد اور بے اطمینانی انھیں دماغی اور اعصابی امراض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ایک معقول اور متوازن معاشی نظام یقیناً ان حالات کو بہتر کر دے گا۔ مگر پھر بھی فطرت اور زمین سے زیادہ گہرا تعلق رکھنا ضروری ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ جا کر دیہات میں بس جائیں یا ابتدائی زندگی بسر کرنے لگیں۔ یہ علاج تو مرض سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ موجودہ صنعتوں کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ مردوں اور عورتوں کا زمین سے زیادہ سے زیادہ تعلق باقی رہے اور دیہی علاقوں کی تمدنی سطح بلند کر دی جائے۔ جہاں تک زندگی کی آسائشوں کا تعلق ہے دیہات اور شہر کو کم و بیش ایک ہی سطح پر ہونا چاہیئے تاکہ دونوں جگہ ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لئے پورا پورا موقع ملے اور مکمل زندگی بسر کی جا سکے میرے خیال میں یہ سب باتیں ہو سکتی ہیں بشرطیکہ لوگ کرنا چاہیں لیکن فی الحال تو

لوگوں میں عام طور پر اس قسم کی خواہش معلوم نہیں ہوتی اور ہماری قوتیں (ایک دوسرے کو قتل کرنے کے علاوہ) مصنوعی چیزیں بنانے اور مصنوعی تفریحات کے مہیا کرنے میں مصروف ہیں۔ مجھے ان میں سے اکثر چیزوں پر کوئی بنیادی اعتراض نہیں اور ان میں سے بعض تو میرے خیال میں یقیناً پسندیدہ ہیں لیکن یہ ہمارا سارا وقت لے لیتی ہیں جو بہتر کاموں میں لگا یا جا سکتا ہے اور ہمیں زندگی کا غلط نقشہ دکھائی ہیں۔ مصنوعی کھادوں کی آج کل بڑی مانگ ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بجائے خود مفید بھی ہیں۔ لیکن یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مصنوعی کھاد کے شوق میں لوگ فطری کھاد کو بھول جائیں اور اسے ضائع کر دیں۔ صرف چین نے بحیثیت قوم کے قدرتی کھادوں سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ مصنوعی کھادیں فوری نتائج کے لحاظ سے اچھی ہیں لیکن ان سے مٹی کے بعض ضروری اجزا فنا ہو جاتے ہیں اور زمین کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ بنجر ہو کر رہ جاتی ہے۔ خود اپنی زندگی کی طرح ہم زمین کو بھی عارضی فائدے کے لئے برباد کر رہے ہیں زمین سے اس کی دولت تو بڑی تیزی سے چھین رہے ہیں لیکن اس کے بدلے اسے کچھ نہیں دیتے ہمیں اس پر ناز ہے ہم کیمیاوی محکموں میں زیادہ سے زیادہ چیزیں بنانے کے قابل ہوتے جاتے ہیں۔ دخانی قوت کے دور کے بعد انسان نے ترقی کر کے بجلی کے دور میں قدم رکھا اور اب ہم حیاتی صنعت کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ سماجی علوم کا عہد سامنے نظر آ رہا ہے جس میں شاید ہمارے بہت سے پیچیدہ مسائل

حل ہو جائیں گے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اب میگنیشیم اور ایلومونیم کا زمانہ آرہا ہے اور چونکہ یہ دونوں دھاتیں بہت افراط سے ہر ملک میں موجود ہیں اس لیئے ان کی کمی پڑنے کا اندیشہ نہیں جدید علم کیمیا انسان کے لیئے ایک نئی زندگی تعمیر کر رہا ہے۔ ہماری طاقت کے مسائل میں زبردست اضافہ ہونے والا ہے اور مستقبل قریب میں عہد آفریں دریافتیں ہونے والی ہیں۔

یہ سب باتیں خوش آئند ہیں۔ لیکن میرے ذہن میں ایک بات کھٹکتی ہے۔ ہمارا دُکھ یہ نہیں کہ ہمارے پاس طاقت نہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنی طاقت کا بیجا استعمال کرتے ہیں اس سے مناسب کام نہیں لیتے۔ سائنس ہمارے ہاتھ میں طاقت دے دیتی ہے لیکن وہ خود لاشخصی ہے اور بے مقصد ہے اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ہم اس کے عطا کئے ہوئے علم سے کیا کام لیتے ہیں۔ سائنس کی کامیابیاں غالباً جاری رہیں گی لیکن اگر اس نے فطرت سے اور زیادہ غفلت برتی تو بہت ممکن ہے فطرت اس سے چپکے چپکے انتقام لے۔ ظاہری جسامت کے لحاظ سے زندگی ترقی کر رہی ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی ایسی چیز کی کمی کی وجہ سے جو سائنس ابھی دریافت نہیں کر سکی ہے زندگی کے اندرونی سوتے خشک ہو جائیں۔

۱۵- ایک پرانے مسئلے کا نیا حل۔

موجودہ دور کے بہترین ذہن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی اور افادی، اخلاقی اور معاشرتی اقتدار، ایثار، ہمدردی، اور

خدمت کے جذبے سے معمور ہوتا ہے۔ اس کے سماجی اصلاح و ترقی کے جوش نے ایک عملی تصوریت کی شکل اختیار کر لی ہے جو نصب العین اس کے اعمال کا محرک ہے اسی کو ہم روح عصر کہتے ہیں۔ اس نے عہد قدیم کے فلسفیانہ نقطۂ نظر اور حقیقت مطلق کی تلاش کو اور عہد وسطیٰ کے مسلک اور عقیدیت اور باطنیت کو ترک کر دیا ہے۔ انسانیت اس کا دیوتا ہے اور سماجی خدمت اس کا مذہب۔ ممکن ہے یہ تصور غیر مکمل ہو۔ ہر عہد کی قوت فکر ماحول کی پابند ہوتی ہے اور ہر زمانہ میں لوگ کسی جزوی حقیقت کو کلی حقیقت کی کنجی سمجھتے رہے ہیں۔ ہر عہد اور ہر قوم کو یہ غلط فہمی رہی ہے کہ صرف اس کا زاویۂ نظر بالکل صحیح یا قریب قریب صحیح ہے۔ ہر تہذیب کی بعض قدریں ہوتی ہیں جو اس کے مخصوص حالات پر مبنی ہوتی ہیں مگر اس تہذیب کے پیرو ان قدروں کو مطلق اور ابدی سمجھتے ہیں اسی طرح ہماری موجودہ تہذیب کی قدریں چاہے دائمی اور آخری نہ ہوں لیکن بہر حال ہمارے لئے وہ بنیادی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ وہ ہمارے دور کے فکر و تصور کی نمائندہ ہیں۔ ممکن ہے بعض روشن ضمیر مستقبل پر نظر ڈال کر انسانیت اور کائنات کا زیادہ مکمل تصور قائم کر لیں لیکن اکثر لوگ تو اپنے زمانے کی قدروں سے بھی ناآشنا ہیں چاہے ان کے بارے میں مروجہ فقروں کو دہراتے رہیں وہ اب تک ماضی کی قید میں گرفتار ہیں۔ غرض ہمیں اپنے دور کے بلند ترین نصب العین کی پیروی کرنی ہے البتہ ہم اس میں اپنی قومی روح کی مناسبت سے ترمیم کر سکتے ہیں۔ اس نصب العین کے دو اہم پہلو مسلک انسانیت اور عملی نقطہ نظر ان دونوں کے درمیان بظاہر

بہت کشمکش رہ چکی ہے لیکن آج کل انسانی فکر میں ایک ہیجان برپا ہے اور کل قدروں کی تنقیح کی جا رہی ہے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں بلکہ خود عالم خارجی اور عالم داخلی کے تصور میں جو فرق تھا وہ مٹتا جا رہا ہے۔ مسلک انسانیت اور علمی نقطۂ نظر میں رفتہ رفتہ امتزاج ہو رہا ہے اور ایک علمی انسانیت وجود میں آ رہا ہے خود سائنس امور واقعی سے سروکار رکھنے کے ساتھ ساتھ اب دوسرے میدانوں میں بھی قدم رکھ رہی کم یا کم سے کم یہ نہیں کرتی کہ حقارت کے ساتھ اُن کے وجود سے انکار کر دے ظاہر ہے کہ کائنات ہمارے حواس خمسہ اور ان کے مدرکات تک محدود نہیں مادی دنیا کی جو تصویر سائنس دانوں نے کھینچی ہے اس میں پچھلے ۲۵ سال میں بہت نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ اب سے پہلے سائنس کی نظر میں عالم فطرت عالم انسانی سے تقریبًا بالکل الگ تھا۔ لیکن اب جیسا کہ سر جیمس جینس نے کہا ہے "سائنس کا اصل اصول یہ ہے کہ اب انسان فطرت کو اپنے آپ سے جُدا نہیں سمجھتا۔" یہاں پھر وہ پرانا سوال جس نے اپنشد کے عہد کے مفکرین کو پریشان رکھا تھا پھر پیدا ہوتا ہے۔ خود ادراک کرنے والے کا ادراک کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ وہ آنکھیں جو خارجی مظاہر کو دیکھتی ہیں اپنے آپ کو کیسے دیکھ سکتی ہیں۔ اور اگر عالم خارجی محض عالم داخلی کا ایک حصہ ہے تو گویا ہم جو کچھ دیکھتے ہیں یا سوچتے ہیں وہ خود ہمارے ذہن کا پرتو ہے یعنی کائنات اور فطرت، روح اور نفس اور جسم، تا موت اور لاہوت حقیقت میں ایک ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہمارے محدود ذہن قدرت کے اس عظیم الشان کارخانے کو معروضی طور پر

کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ سائنس نے ان مسائل کو چھیڑنا شروع کر دیا ہے اور اگرچہ وہ ابھی تک ان پر قابو نہیں پا سکی ہے لیکن سچا سائنس دان قدیم فلسفی اور مذہبی مفکر کی طرح تلاش حق میں مصروف ہے۔ بقول پروفیسر آئن سٹائن "آج کی مادی دنیا میں صرف سائنس کے مخلص کارکن ہی گہرا مذہبی احساس رکھتے ہیں"[۱] حقیقی معنوں میں ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج کل کے لوگوں کو جہاں سائنس پر پورا اعتماد ہے وہاں یہ اندیشہ بھی ہے کہ محض امور واقعی سے تعلق رکھنے والی بے مقصد سائنس سے کام نہیں چلے گا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ زندگی کے لئے اتنا ساز و سامان فراہم کرنے میں سائنس نے زندگی کی اصل مقصد کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اب عالم واقعی اور عالم روحانی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی ہے کیونکہ یہ بات روز بروز واضح ہوتی جاتی تھی کہ اول الذکر پر حد سے زیادہ زور دینے سے انسان کی روح کچل کر رہ جائے گی وہی پرانا سوال جو پرانے زمانے کے فلسفیوں کو پریشان کر رہا تھا اب ایک نئی شکل میں پیدا ہو گیا ہے عالم طبیعی کے مظاہر کو فرد کی اندرونی روحانی زندگی سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ طبیوں پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہے کہ ایک فرد یا کل معاشرہ

---

[۱] آج سے ۵۰ سال قبل دو یکانندؔ نے عصر حاضر کی سائنس کو حقیقی مذہبی روح کا مظہر قرار دیا تھا کیونکہ سائنس خلوص کے ساتھ عرفان حقیقت کی کوشش کرتی ہے

کے محض جسم کا علاج کافی نہیں ہے۔ پچھلے چند سال میں ان ماہرین طب نے جو نفسی مرضیات کی جدید تحقیقات سے واقف ہیں۔ اعضا اور افعال اعضا کے امراض کی تفریق کو رد کر دیا گیا ہے اور نفسیاتی عنصر پر زیادہ زور دینے لگے ہیں۔ افلاطون نے لکھا ہے "بیماری کے علاج میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ جسم کے معالج الگ ہیں اور روح کے الگ حالانکہ جسم اور روح دونوں ایک ہیں اور ناقابل تقسیم"۔

سائنس دانوں میں آئن اسٹائن آج سب سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی رائے ہے کہ اب پہلے سے بھی زیادہ انسانی نسل کی آئندہ فلاح کا دارو مدار اخلاقی طاقت پر ہے راحت و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ انسان ترک لذات سے کام لے اور اپنے اوپر پابندیاں عائد کرے" وہ ہمیں دفعتہً اس خود پسند عہد سائنس سے قدیم فلسفیوں کے زمانے میں طلب قوت اور طمع زر کی دنیا سے زہد و ورع کی دنیا میں جس سے ہندوستان مانوس تھا پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن شاید اکثر سائنس دان پروفیسر آئن اسٹائن کے اس خیال سے متفق نہ ہوں گے۔ آئن اسٹائن نے ایک اور جگہ لکھا ہے "مجھے پورا پورا یقین ہے کہ دنیا بھر کی دولت بھی چاہے وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو دل و جان سے انسانوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرتے ہیں، انسانیت کو آگے بڑھنے میں مدد نہیں دے سکتی صرف عالی منش اور پاکباز لوگوں کی مثال ہی پاکیزہ خیالات اور نیک کاموں کی محرک ہوتی ہے۔ روپیہ صرف خود غرضی کے جذبہ کو ابھارتا ہے اور انسان کو ہمیشہ یہ ترغیب دیتا ہے کہ اس کا بیجا استعمال کرے"۔

اس سوال کو حل کرنے میں جو انسانی تہذیب کی ابتدا سے برابر چلا آ رہا ہے ہمارے عہد کی سائنس کو پرانے فلسفیوں کے مقابلے میں بہت سی سہولتیں حاصل ہیں اس کے پاس علم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے اور ایک ایسا طریق عمل جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت مفید ثابت ہو چکا ہے سائنس نے زندگی اور فطرت کے بہت سے گوشوں کا جن سے لوگ واقف نہ تھے جائزہ لے ڈالا ہے۔ اس کی بدولت انسان نے بہت سی چیزوں کا علم اور ان پر قدرت حاصل کر لی ہے جن کا پہلے مذہبی پیشوا ڈھونگ بنا کر لوگوں کو لوٹتے تھے۔ لیکن اس سے بعض نقصانات بھی پہنچے ہیں سائنس نے علم کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے کہ آدمی اس کے کسی ایک گوشہ میں کھو جاتا ہے اور اُسے یہ احساس باقی نہیں رہتا کہ یہ سب ایک ہی کل کے اجزا ہیں۔ لوگ ایک حصہ کا تجزیہ کرتے ہیں، اسی پر غور و خوض کرتے ہیں اور جزوی طور پر اسے سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن کل سے اس کا کوئی تعلق ان کے ذہن میں نہیں آتا۔ سائنس نے جو زبردست قوتیں پیدا کر دی ہیں ان کے آگے انسان بے بس ہو گیا ہے وہ اُن کے دھارے میں چار ناچار نامعلوم ساحل کی طرف بہتا چلا جا رہا ہے اور بحرانوں کا سلسلہ انسان کو سکونِ قلب کے ساتھ تلاش حق کا موقع زندگی کی موجودہ تیز رفتاری نہیں دیتا۔ خود عقل و حکمت عجلت اور کشمکش کی حالت میں وہ پرسکون اور بے لاگ طریق فکر اختیار نہیں کر سکتی جو کسی چیز کی حقیقت کو پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ تدحکمت کی راہ خاموشی سے طے ہوتی ہے اُس کے مزاج میں شورش اور اضطراب نہیں۔"

شاید ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم انسانی تاریخ کے ایک شاندار دور سے گذر رہے ہیں اور ہمیں اس کی قیمت دینی پڑتی ہے تاریخ کا ہر شاندار دور کشمکش، اور نا پائیداری کا زمانہ ہوتا ہے جب کہ پرانے نظام کو بدل کر نیا نظام قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے دنیا میں دائمی پائیداری اور سکون اور عدم تغیر کا تو وجود ہی نہیں۔ اس لئے کہ اگر تغیر نہ ہو تو زندگی ہی ختم ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اضافی پائیداری، محرک توازن پیدا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے جس میں انسان کو دوسرے انسانوں سے اور اپنے ماحول سے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی جنگ کرنی پڑتی ہے اور اس کشمکش سے نئی شکلیں اور نئے تصورات وجود میں آتے ہیں۔ تخریب اور تعمیر ساتھ ساتھ چلتی ہے اور انسان اور فطرت کے یہ دونوں پہلو ہر وقت کارفرما نظر آتے ہیں۔ زندگی نمو کا نام ہے یہ مسلسل تغیر اور حرکت کا عمل ہے جس میں سکون اور جمود کی گنجائش نہیں۔

آج دنیا میں لوگ سیاسی اور معاشی اقتدار کی طلب میں سرگرداں ہیں لیکن جب یہ اقتدار حاصل ہوتا ہے تو بہت سی اور قیمتی چیزیں ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں۔ اصول پرستی کی بجگہ سیاسی چالوں اور سازشوں کا اور بے لوث بہادری کی جگہ بزدلی اور خود غرضی کا زور ہو جاتا ہے۔ صورت کو معنی سے زیادہ اہمیت دی جانے لگتی ہے اور وہ اقتدار جو اتنے شوق سے حاصل کیا جاتا ہے اپنے مقصد میں ناکام رہتا ہے حکومت اور اقتدار کے اثر کی بھی ایک حد ہے اور طاقت کا بیجا استعمال خود اپنے حق میں مضر ہوتا ہے یہ دونوں چیزیں روح کو نہیں دبا سکتیں اگرچہ اسے

سخت اور کند بنا سکتی ہیں۔ کنفوشس کا قول ہے "ایک فوج سے اس کا سردار چھینا جا سکتا ہے لیکن معمولی سے معمولی آدمی سے اس کا عزم نہیں چھینا جا سکتا" جان اسٹوارٹ مِل نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے "اب مجھے بالکل یقین ہو گیا ہے کہ جب تک ذہن انسانی کے طریق فکر میں بنیادی تبدیلی نہ ہو جائے انسانیت کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔" لیکن خیالات میں تبدیلی خود ماحول کی تبدیلی کا اور اس تکلیف اور مصیبت کا نتیجہ ہے جو کشمکش حیات میں اٹھانی پڑتی ہے اس لئے ہم انسان کے طریق فکر کو بدلنے کی براہ راست کوشش بھی کر سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ ضروری اس ماحول کو بدلنا ہے جس میں اس طریق فکر نے پرورش پائی ہے دونوں ایک دوسرے کے پابند ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں ہر انسان کا ذہن مختلف ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک حقیقت کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اکثر دوسرے کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس اختلاف خیال سے باہمی آویزش پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ مختلف خیالات کے باہمی ردعمل سے حقیقت کا زیادہ مکمل اور مربوط تصور حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ حقیقت کے کئی رخ ہیں اور اس پر کسی جماعت یا قوم کا اجارہ نہیں ہے۔ اسی طرح کام کرنے کے ڈھنگ بھی مختلف افراد کے لئے مختلف حالات میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان، چین اور دوسری قوموں نے اپنے اپنے طریق زندگی کی تشکیل کی اور اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ ان میں یہ زعم تھا اور ان میں سے بہتوں کو اب تک ہے

کہ صرف ان ہی کا طریقہ صحیح ہے فرض کئے بیٹھے ہیں کہ ان کا طریق زندگی ہی بس ایک مناسب ہے۔ آج یورپ اور امریکہ نے ایک نیا طرز وضع کیا ہے جو دنیا پر چھا گیا ہے اور وہاں کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی طرز ہو ہی نہیں سکتا اس میں شک نہیں کہ ہندوستان اور چین کو اُن سے بہت کچھ سیکھنا ہے کیونکہ یہ دونوں ملک جمود میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں اور مغرب نہ صرف اس عہد کی روح کا مظہر ہے بلکہ اس میں زندگی اور حرکت اور نمو کی قوت ہے اگرچہ یہ کبھی کبھی تباہی اور خونریزی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

ہندوستان اور شاید دوسرے ملکوں میں بھی دو متضاد جذبات پائے جاتے ہیں — نقلی اور احساس غلطی یہ دونوں ناپسندیدہ اور ادنیٰ قسم کے جذبات ہیں۔ زندگی کو ہم جذبات پرستی کے نقطۂ نظر سے نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جرأت اور پامردی سے حقائق کا سامنا کریں ہم یہ نہیں کر سکتے کہ اپنے آپ کو بے مقصد روحانی تصورات میں جو زندگی کے مسائل سے بے تعلق ہوں کھو دیں اس لئے کہ انقلاب دہر کا چکر جاری ہے اور کسی کی فرصت کے انتظار میں ٹھہر نہیں سکتا اور یہ بھی نہیں کر سکتے کہ صرف ظاہری چیزوں سے سروکار رکھیں اور انسان کی داخلی زندگی کی اہمیت کو بھول جائیں۔ ان دونوں کے درمیان توازن اور ہم آہنگی ہونی چاہئے۔ سترہویں صدی میں اسپنوزا نے کتنی سچی بات کہی تھی "سب سے اہم علم یہ ہے کہ انسان اس اتحاد کے رشتہ کو پہچان لے جو اس کا ذہن کل کائنات کے ساتھ رکھتا ہے.... جتنا زیادہ ہمارے ذہن کو اس رشتہ کا احساس ہوگا اتنا ہی زیادہ

وہ اپنی قوتوں کو اور فطرت کے نظام کو سمجھ سکے گا۔ اپنی قوتوں کا اندازہ کرکے وہ اپنے لئے زیادہ آسانی سے راہ عمل معین کرسکے گا اور قواعد و ضوابط مرتب کرسکے گا اور نظام فطرت کو سمجھ کر وہ اپنے آپ کو دورانہ کار تصورات سے آزاد کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ بس یہی حکمت کا سارا طریق عمل ہے"۔

اپنی انفرادی زندگی میں بھی ہمیں جسم اور روح میں، انسان کی طبعی اور معاشرتی حیثیت میں توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ٹیگور نے ٹھیک کہا ہے "اپنے آپ کو مکمل بنانے کے لئے ہمیں قوت حیات کے لحاظ سے وحشی، اور ذہنی حیثیت سے مہذب ہونا چاہئے۔ اور اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہئے کہ فطرت کے ساتھ فطرت کا ایک جز بن جائیں اور انسانی سوسائٹی میں انسان بن کر رہیں" تکمیل ہماری دسترس سے باہر ہے کیونکہ یہ تو سفر کے خاتمے کی دلیل ہے اور ہم ایسے رہرو ہیں جن کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے اور جن کی منزل روز بروز دور ہوتی جاتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے اندر مختلف شخصیتیں ہوتی ہیں جن میں باہم تناقص اور تضاد پایا جاتا ہے اور جو ہم کو الگ الگ راستوں پر لے جانا چاہتی ہیں۔ ہمیں زندگی سے محبت بھی ہوتی ہے اور نفرت بھی، ایک طرف جی چاہتا ہے کہ اس کی ہر چیز کو قبول کرلیں دوسری طرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی چیزوں کو رد کردینا چاہئے۔

ان متضاد رجحانات کو ہم آہنگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور ان میں سے کبھی ایک غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا۔ لاؤتسے نے کہا ہے "کبھی آدمی اپنے کو جذبات سے بالکل الگ کرلیتا ہے تاکہ زندگی کا راز سمجھ سکے۔

اور کبھی زندگی کو جذبات کی آنکھوں سے دیکھتا ہے تاکہ اس کے مختلف نتائج سامنے آجائیں۔ باوجود اس کے کہ ہم عقل و فہم کی قوتیں رکھتے ہیں اور صدیوں سے علم اور تجربے کے ذخیرے اکٹھے کر رہے ہیں، ہم زندگی کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور اس پر اسرار کارخانے کے متعلق صرف قیاس آرائی سے کام لے سکتے ہیں۔ مگر ہم اُس کے حسن سے لطف اُٹھا سکتے ہیں اور آرٹ کے ذریعہ دیوتاؤں کی طرح تخلیق کا کمال دکھا سکتے ہیں۔ گو ہم کمزور گنہگار فانی مخلوق ہیں اور ہماری زندگی چند روزہ ہے لیکن ہم میں بہت سی صفات لافانی دیوتاؤں کی موجود ہیں اس لئے ہمیں بہ قول ارسطو کے "اُن لوگوں کی پیروی نہیں کرنی چاہیئے جو یہ کہتے ہیں چونکہ ہم فانی انسان ہیں لہذا ہمارے خیالات بھی فانی انسانوں کے سے ہونے چاہئیں۔ ہمارا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے لافانیوں کی شان سے زندگی بسر کریں اور جو قوتیں خدا نے ہمیں عطا کی ہیں ان کا بہترین استعمال کریں"۔

۱۶- خاتمۂ کلام

آج مجھے یہ کتاب لکھتے ہوئے پانچ مہینے ہو گئے ہیں۔ اور میرے دماغ میں خیالات کا جو ہجوم تھا اسے میں نے قلمی مسودے کے ایک ہزار صفحوں پر بکھیر دیا ہے۔ پانچ مہینے تک میں نے ماضی کی سیر کی ہے مستقبل کی اندھیری کوٹھری میں جھانکا ہے اور کبھی کبھی اُس نقطے پر ٹھہرنے کی کوشش کی ہے جہاں زمان ولازمان کی حدیں مل جاتی ہیں۔ ان چند مہینوں میں دنیا میں بہت کچھ ہوا ہے جہاں تک فوجی کارروائی کا

تعلق ہے لڑائی بخیر و خوبی ختم ہو رہی ہے۔ خود میرے اپنے ملک میں بہت سے واقعات پیش آئے ہیں جن کا میں محض دور سے تماشا دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی مجھ پر رنج و الم کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں ہر وقت سوچنے میں اور اپنے خیالات کو قلم بند کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ اور حال کے تیز نشتر کی خلش سے بچنے کے لئے ماضی اور مستقبل کے آغوش میں پناہ لیتا تھا۔

مگر اب یہ سفر ختم ہونا چاہیئے۔ کوئی اور وجہ نہ بھی ہوتی تو یہ کیا کم ہے کہ ایک عملی مشکل درپیش ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کاغذ کا جو ذخیرہ میں نے بڑی دقتوں سے حاصل کیا تھا تقریباً ختم ہو چکا ہے اور مزید کاغذ فراہم کرنا آسان نہیں۔ میں تلاش ہند میں مصروف تو رہا مگر کچھ پایا بھی یا نہیں؟ شاید یہ میری بیجا جسارت تھی کہ میں ہندوستان کے چہرے سے نقاب اٹھا کر دیکھنا چاہتا تھا کہ آج اس کی اصل شکل کیا ہے اور پہلے کیا تھی۔ آج ہندوستان ۴۰ کروڑ انسانوں کا وطن ہے جن میں سے ہر ایک احساس و خیال کی ایک جداگانہ دنیا میں الگ الگ زندگی بسر کر رہا ہے۔ جب اس وقت یہ کیفیت تو ظاہر ہے کہ انسانوں کی بے شمار نسلوں کا جو ہزارہا سال کے عرصے میں گذری ہیں جائزہ لینا کس قدر دشوار ہے لیکن ان سب میں کوئی ربط کا رشتہ ضرور تھا اور اب بھی ہے۔ ہندوستان جغرافی اور معاشی حیثیت سے ایک ہے اور تہذیبی حیثیت سے کثرت میں وحدت کا سماں دکھاتا ہے۔ وہ اضداد کا مجموعہ ہے جنہیں غیر مرئی کڑیوں کی ایک مضبوط زنجیر نے ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اسے اکثر میدان جنگ میں شکست

ہوئی لیکن اس کی روح کو کوئی فتح نہیں کر سکا اور آج بھی جب ہندوستان ایک مغرور فاتح کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے وہ غیر مفتوح اور غیر مغلوب ہے۔ پرانے زمانے کی کہانیوں کی طرح وہ ایک معمہ ہے جس کا حل ہاتھ نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذہن ایک طلسم میں گرفتار ہو کر رہ گیا ہے! ہندوستان ایک افسانہ ہے ایک تصور ہے، ایک خواب ہے ایک پیکر خیال ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایک ٹھوس حقیقت بھی ہے جو موجود اور محیط ہے۔ اس کے بعض خوفناک گوشے دنیا کے دور اولین کی تاریکی کو یاد دلاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس میں دن کی حرارت اور زندگی بھی پائی جاتی ہے وہ ایک حسینہ کی طرح جو کبھی رنگین زندگی بسر کر چکی ہے بعض اوقات شوخی اور بے باکی، ضد اور خود رائی سے کام لیتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو اس پر ایک اعصابی دورہ سا پڑ جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے بچوں کی پیاری ماں ہے اور وہ کہیں بھی ہوں کسی حال میں بھی ہوں اپنی مادر وطن کو نہیں بھول سکتے کیونکہ وہ ساری عظمت اور پستی کے ساتھ ان کی زندگی میں رچ گئی ہے اور اس کی گہری آنکھوں میں جو زندگی کے جوش و مسرت کے بہت سے منظر دیکھ چکی ہیں اور جنون و حکمت کے اسرار کی محرم ہیں، ان کا عکس نظر آتا ہے ان میں سے ہر ایک کا دل اس کی طرف کھنچتا ہے لیکن ہر ایک اس کشش کی وجہ الگ الگ بتاتا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو اس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتے اور ہر ایک کو اپنی مادرِ وطن کی متنوع شخصیت کا ایک جداگانہ پہلو نظر آتا ہے۔ مختلف زمانوں میں ہندوستان میں بڑے آدمی پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے ماضی کی روایات کو قائم رکھا مگر انھیں

بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور اسی شاندار سلسلے کی ایک کڑی تھے وہ عصر حاضر کی روح سے معمور تھے اور اس کے تقاضوں کو پوری طرح محسوس کرتے تھے پھر بھی ان کی جڑیں ماضی کی زمین میں پیوست تھیں اور انھوں نے اپنے آپ کو قدیم و جدید کے امتزاج کا نمونہ بنا کر پیش کیا تھا۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے "میں ہندوستان سے اس لئے محبت نہیں کرتا کہ میں جغرافیہ کا پرستار ہوں اور نہ اس لئے کہ اتفاق سے میں اس سرزمین میں پیدا ہوا تھا مجھے یہ ملک اس لئے عزیز ہے کہ اس نے اپنی طویل تاریخ کے پرشور طوفان میں ان جاں بخش کلمات کو محفوظ رکھا ہے جو اس کے بزرگوں کے ضمیر روشن پر منکشف ہوئے تھے" بہت سے اس رائے سے متفق ہوں گے مگر اور لوگ اس محبت کی جو وہ ہندوستان سے رکھتے ہیں کوئی اور توجیہہ کریں گے۔

یہ پرانا طلسم اب ٹوٹتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ہندوستان نے اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈالنا اور عہد جدید کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ تبدیلی تو ہوتی ہے اور ہو کر رہے گی مگر ماضی کا جادو اب بھی لوگوں کے دلوں کو موہتا رہے گا۔ ہندوستان کا ظاہری لباس بدل جائے مگر اس کی باطنی سیرت وہی رہے گی اور اپنے عقل و حکمت کی بدولت وہ اس بے رحم، کینہ پرور اور لالچی دنیا میں حق اور حسن اور نیکی کا دامن نہ چھوڑے گا۔

اس زمانے میں دنیا نے بڑے بڑے کارنامے دکھائے ہیں۔ لیکن انسانیت اور محبت کے بلند آہنگ دعوؤں کے باوجود اس کے عمل کی بنیاد انسانی فضائل کے بجائے نفرت اور تشدد پر قائم ہے جنگ انسانیت اور

حق پرستی کے منافی ہے۔ ممکن ہے بعض حالات میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہو، لیکن اس کے نتائج اتنے بھیانک ہوتے ہیں کہ ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جنگ کا سب سے خوفناک پہلو خونریزی نہیں اس لئے کہ مرنا تو انسانوں کو یوں بھی ہے بلکہ جان بوجھ کر نفرت اور جھوٹ کی مسلسل ترویج اور اس کا رفتہ رفتہ انسان کی عادت میں داخل ہو جانا۔ زندگی کے سفر میں نفرت اور بیزاری کو مشعل راہ بنانا خطرناک بھی ہے اور مضر بھی کیونکہ اس طرح انسان کی طاقت بیکار صرف ہوتی اس کا ذہن مسخ اور نظر تنگ ہوتی ہے اور وہ حق کا ادراک نہیں کر سکتا بدقسمتی سے آج ہندوستان میں نفرت اور بیزاری کا شدید جذبہ موجود ہے اس لئے کہ ماضی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا اور حال بھی اُس سے کچھ مختلف نہیں ہے ایک مغرور قوم کی عزت اور وقار کو جو صدمے بار بار پہنچائے گئے ہیں انھیں بھلا دینا آسان کام نہیں تاہم یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہندوستانی نفرت کے جذبہ کو بہت دنوں تک نہیں پالتے اور بہت جلد ان کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ جب آزادی ہندوستان کے لئے سعی و عمل کی نئی راہیں کھول دے گی اس وقت ہندوستان کا مزاج اعتدال پر آجائے گا اور ماضی قریب کے مقابلے میں جو ناکامی اور ذلت سے معمور تھا اسے مستقبل سے زیادہ دلچسپی ہوگی۔ اس وقت ہندوستان خود اعتمادی کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوگا مگر اسی کے ساتھ وہ بڑے شوق سے دوسرے ملکوں سے سبق لے گا اور ان کے ساتھ تعاون کرے گا آج وہ یا تو پرانے رسم و رواج کی بے چون و چرا پابندی کرتا ہے یا مغربی

طریقوں کی اندھا دھند نقل - ان دونوں میں سے کوئی صورت بھی تکمیل یا زندگی یا ترقی کی نہیں اُسے یقیناً پرانی زندگی کی چار دیواری سے باہر نکل کر نئے زمانہ کی زندگی اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑیگا اور یہ بھی یقینی ہے کہ محض تقلید پر حقیقی تہذیبی یا روحانی ترقی کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی - اس طرح کی نقالی صرف چند افراد کے لئے ممکن ہے جو اپنے آپ کو عوام سے اور قومی زندگی کے سرچشمہ سے الگ کرلیں یوں حقیقی تہذیب دنیا کے ہر گوشہ سے کسب فیض کرتی ہے لیکن دراصل وہ اپنے ملک کی پیداوار اور عوام الناس کی زندگی پر مبنی ہوتی ہے - آرٹ اور ادب اگر ہمیشہ بیرونی نمونوں کو سامنے رکھیں تو مردہ ہو جاتے ہیں - اب وہ دن گذر گئے جب تہذیب چند خوش مذاق افراد تک محدود ہوتی تھی - اب تہذیب کا ذکر کرتے وقت عام لوگوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے اور ان کی تہذیب کے لئے یہ لازمی ہے کہ ایک طرف ماضی کے عقائد اور روایات سے پیوستہ ہو اور دوسری طرف حال کے تقاضوں اور رجحانات کو ظاہر کرتی ہو - کوئی سو سال پہلے ایمرسن نے امریکہ میں اپنے ہم وطنوں کو متنبہ کیا تھا کہ انھیں یورپ کی نقل نہیں کرنا چاہیئے اور تہذیبی حیثیت سے اس کا پابند نہیں ہونا چاہیئے - ایمرسن کی خواہش تھی کہ امریکی قوم اپنے یورپی ماضی کی پابند ہوکر نہ رہ جائے بلکہ خود اپنے ملک کی زندگی سے کسب فیض کرے وہ دن جب ہم دوسروں کے پابند تھے اور ان کے آگے زانوئے شاگردی تہ کرتے تھے اب ختم ہو رہے ہیں - ہمارے اردگرد لینے والے لاکھوں آدمی؟ زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے رہے ہیں ان کے ذہنوں کی پرورش دوسرے ملکوں کی

ادنیٰ پیداوار سے نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے ملک میں نئے واقعات نئے کارنامے ظہور میں آ رہے ہیں جن کا تقاضا ہے کہ ان کے گیت بنا کر گائے جائیں۔ . . . ہماری قوم کے آداب، اعمال اور اقوال میں بہت سی چیزیں تخلیقی ہیں۔ کسی رسم و دستور کی پابند نہیں بلکہ خود ہمارے حسن اور نیکی کے احساس نے ان کی تشکیل کی ہے" اور اپنے مضمون میں جس کا عنوان "خود اعتمادی" ہے وہ لکھتا ہے "یہ تہذیب نفس کی کمی کا نتیجہ ہے کہ اٹلی، انگلستان اور مصر کا سفر ایک مذہبی فریضہ بن گیا ہے حالانکہ جن لوگوں نے اٹلی، انگلستان یا یونان کو ہمارے تخیل میں اس قدر قابل احترام بنایا وہ قطب کی طرح اپنے مرکز سے نہیں ٹلے ہمت و مردانگی کے موقعوں پر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا مقام وہ ہے جہاں ہمیں اپنا فرض انجام دینا ہے۔ روح کا کام یہ نہیں کہ ماری ماری پھرے۔ دانشمند آدمی اپنے وطن ہی میں رہتا ہے اور جب ضرورت یا فرض کے تقاضے سے اسے باہر جانا بھی پڑے تب بھی اس کا دل وطن ہی میں رہتا ہے اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عقل اور نیکی کا پیام بر ہے اور جس شہر میں جاتا ہے ایک بادشاہ کی شان سے جاتا ہے کسی قلندر یا چاکر کی طرح نہیں۔"

مجھے آرٹ یا علم یا رفاہ عام کی خاطر دنیا کا دورہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں بہ شرطے کہ پہلے آدمی اپنے وطن سے پوری طرح مانوس ہو چکا ہو اور دوسرے ملک کا سفر اس امید پر نہ کرے کہ اس کے علم میں کوئی غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ جو شخص محض تفریح کے لئے یا کوئی ایسا کمال حاصل کرنے کے لئے جو خود اس کے اندر موجود نہیں دنیا کا سفر کرتا ہے وہ گویا اپنے آپ سے

بھاگتا ہے اور آثار قدیمہ کے درمیان جوانی میں بوڑھا ہو جاتا ہے تھیس اور پالمیرا میں اس کا ذہن اور ارادہ اپنے ماحول کی طرح شکستہ ہو کر رہ جاتا ہے وہ کھنڈروں کو ساتھ لئے ہوئے کھنڈروں میں مارا مارا پھرتا ہے۔" یہی نہیں سفر کی لت ایک اور بنیادی خرابی کا پتہ دیتی ہے جو کل ذہنی اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہم دوسروں کی نقالی کرنے لگتے ہیں . . . . . ہمارے مکانات دوسروں کے مذاق کے مطابق بنائے جاتے ہیں ہم اپنی الماریوں کو دوسرے ملکوں کی چیزوں سے سجاتے ہیں۔ ہماری رائے۔ ہمارا ذوق، ہماری ذہنی قوتیں ماضی کا اور دور کی قدروں کا سہارا ڈھونڈتی ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی آرٹ نے ترقی پائی ہے وہ اسی ملک کی روح سے پیدا ہوا ہے۔ آرٹسٹ اپنا نمونہ خود اپنے ذہن میں ڈھونڈھتا ہے وہ خود سوچ کر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے کون سی چیز بنانی ہے اور اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا ہے . . . . . خود اپنے ذہن پر زور دو۔ دوسروں کی نقل مت کرو۔ اس جوہر کو جو قدرت نے تمہیں عطا کیا ہے استعمال کرتے وقت ہر لحظہ تمہاری پشت پر عمر بھر کی ریاضت کی مجموعی قوت ہوتی ہے لیکن اس ہنر پر جو تم نے دوسروں سے مستعار کیا ہے تمہارا قبضہ محض عارضی اور ادھورا ہوتا ہے" لیکن ہم ہندوستانیوں کو ماضی کی یادگاروں کی تلاش میں اپنے ملک سے باہر جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ خود ہمارے ہاں ان کی بہتات ہے۔ ہم اگر دوسرے ملکوں کا سفر کرتے ہیں تو ماضی کی تلاش میں نہیں بلکہ حال کی تلاش میں کرتے ہیں۔

اور یہ بہت ضروری ہے کیونکہ بیرونی دنیا سے کٹ جانا پس ماندگی اور انحطاط کی نشانی ہے ایمرسن کے زمانے کی دنیا اب بدل چکی ہے اور ملکوں کے درمیان جو دیواریں حائل تھیں وہ ٹوٹ رہی ہیں زندگی پر روز بروز بین الاقوامی رنگ چڑھ رہا ہے ہم کو آئندہ بین الاقوامی نظام میں اپنے شایانِ شان حصّہ لینا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم دنیا کا سفر کریں دوسروں سے ملیں، ان سے جو کچھ سیکھ سکتے ہیں سیکھیں، اور ان کو سمجھنے کی کوشش کریں لیکن حقیقی بین الاقوامیت کوئی ایسی چیز نہیں جو ہوا میں معلق ہو اور جس کی جڑیں زمین میں پیوست نہ ہوں۔ وہ انہیں قومی تہذیبوں سے پیدا ہوسکتی ہے مگر اس کی نشو و نما کے لئے آزادی اور مساوات اور حقیقی بین الاقوامی شعور کی فضا درکار ہے ایمرسن کی تنبیہ آج بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی پہلے تھی اور ہماری کوششیں اسی شرط پر کامیاب ہوسکتی ہیں جس کا اس نے ذکر کیا ہے کہ ہم کسی ملک میں نقندرکو کی طرح نہ جائیں بلکہ صرف اسی صورت میں اس کے اندر قدم رکھیں جب وہاں کے لوگ ہمیں اپنے برابر سمجھیں اور ہمارا خیر مقدم اس حیثیت سے کریں کہ ہم راہ جستجو میں ان کے رفیق ہیں۔ بعض ملکوں خصوصًا برطانوی نوآبادیات میں ہمارے ہم وطنوں کے ساتھ ذلت کا برتاؤ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہمیں ان ملکوں کا رخ بھی نہیں کرنا چاہئے آج ہمارے کاندھوں پر بیرونی حکومت کا جوا ہے اور ہم اس کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں لیکن ہماری آزادی کا دن دور نہیں ہم کسی معمولی ملک کے شہری نہیں۔ ہمیں اپنے وطن کی سرزمین، اپنے ہم وطنوں اپنی تہذیب اور اپنی روایات پر فخر ہے لیکن اس فخر و ناز کے یہ معنی

نہیں کہ ہم اپنے ماضی کی ایک خیالی تصویر سامنے رکھ کر اس کی پرستش
شروع کریں، اُسی کے ہو کر رہ جائیں، دوسرے ملکوں سے الگ تھلگ
رہیں اور ان کے طور طریقوں کی قدر نہ کریں یہ نہ ہو کہ ہم اس فخر کے نشے میں
اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو بھول جائیں اور ہمارے دل میں اُن
کی اصلاح کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے انسانی تہذیب و ترقی کے جلوس
میں اپنے شایان شان جگہ پانے کے لئے ہمیں ابھی بہت دور جانا ہے اور
بہت تیزی سے قدم اٹھانا ہے اس لئے کہ ہمارے پاس وقت بہت
کم ہے اور دنیا کی رفتار برابر تیز ہوتی جاتی ہے ماضی میں ہندوستان
نے ہمیشہ دوسری تہذیبوں کا خیر مقدم کیا ہے اور انھیں اپنے اندر
جذب کر لیا ہے آج یہ کام پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کیونکہ
دنیا عالم گیر وحدت کی طرف جا رہی ہے جہاں قومی تہذیبیں ایک
بین الاقوامی تہذیب میں گھل مل جائیں گی۔ اس لئے ہم علم و حکمت
رفاقت اور دوستی جہاں سے بھی مل سکے گی حاصل کریں گے اور مشترک
مقاصد کے لئے دوسروں کے ساتھ مل کر کام کریں گے لیکن ہم دوسروں
کے لطف و کرم کی بھیک نہیں مانگیں گے ہم سچے ہندوستانی اور ایشیائی
رہیں گے اور اُس کے ساتھ ساتھ آفاقی اور عالمگیر ریاست کے شہری
بننے کی کوشش کریں گے۔

ہمارا دور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں تکلیف
اور مصیبت کا دور تھا ممکن ہم کچھ دن اور کھنچ لئے جائیں مگر اب ہمارا
وقت ہو چکا اور ہمیں دوسروں کے لئے جگہ خالی کرنی ہے وہ اپنی
زندگی اپنے رنگ میں بسر کریں گے اور اپنے بار امانت کو اگلی منزل

پہنچائیں گے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس مختصر دور میں جو اب ختم ہو رہا ہے
ہم اپنے فرائض کس طرح انجام دئے اس کا فیصلہ آنے والی نسلیں
کریں گی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ہماری کامیابی یا ناکامی کا معیار کیا ہے
ہم یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ زندگی نے ہمارے ساتھ سختی کی کیونکہ ہم نے
یہ راستہ جان بوجھ کر اختیار کیا تھا اور سچ پوچھئے تو ہماری زندگی کچھ
ایسی بُری نہیں گذری اس لئے کہ زندگی کا لطف وہی اٹھاتے ہیں
جو اکثر اُس کے آخری سرے پر کھڑے رہتے ہیں جن کی زندگی موت
کے خوف سے متاثر نہیں ہوتی۔ ممکن ہے ہم نے بہت سی غلطیاں کی ہوں
لیکن ہم نے اپنے آپ کو نکمے پن اور ذلت سے محفوظ رکھا ہے۔ ہماری
اپنی ذات کے لئے یہ کارنامہ کچھ کم نہیں ہے۔" انسان کی سب سے
قیمتی دولت زندگی ہے اور چونکہ یہ دولت صرف ایک بار میسر آتی
ہے اس لئے انسان کو اپنی زندگی اس طرح گذارنی چاہئے کہ پچھلے
نکمے پن اور بزدلی کی یاد شرم اور ذلت کا احساس نہ دلاسکے،
برسوں تک بے مقصد جینے کی اذیت نہ اٹھانی پڑے، اور وہ مرتے
وقت کہہ سکے "میری ساری زندگی اور میری ساری قوت اس
مقصد کے لئے صرف ہوئی جو دنیا میں سب سے بڑھ کر ہے یعنی نوعِ
انسان کی آزادی"۔

لینن۔

خاتمہ

مارچ اور اپریل ۱۹۴۵ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر جو قلعہ احمد نگر کے قید خانے میں نظر بند تھے اپنے اپنے صوبوں کو بھیج دیئے گئے۔ کیمپ کا جیل توڑ دیا گیا اور شاید پھر سے اسے فوجی عہدے داروں کے حوالے کر دیا گیا۔ ہم تین آدمیوں یعنی گووند بلبھ پنت، نریندر دیو اور میں نے "قلعہ احمد نگر کو ۲۰ مارچ کو خیرباد کہا اور نینی سینٹرل جیل پہنچے۔ یہاں بہت سے پرانے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی جن میں رفیع احمد قدوائی بھی تھے۔ اگست ۱۹۴۲ء میں اپنی گرفتاری کے بعد پہلی مرتبہ ہم نے ۱۹۴۲ء کے حادثات کے عینی شاہدوں کے بیانات سنے کیونکہ نینی کے قیدیوں میں سے بہت سے ہمارے بعد گرفتار ہوئے تھے۔ نینی سے ہم تینوں بریلی کے قریب عزت نگر کے مرکزی قید خانے کو منتقل کر دیئے گئے۔ گووند بلبھ پنت کو خرابیٔ صحت کی بنا پر رہائی مل گئی۔ میں اور نریندر دیو دو مہینے تک اس جیل کی ایک بارک میں رہے۔ شروع جون میں ہم الموڑہ پہاڑ کے قید خانے کو منتقل کر دیئے گئے۔ دس سال پہلے میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ۱۵ جون کو ہم دونوں اگست ۱۹۴۲ء میں گرفتاری کے پورے ۱۰۴۱ دن بعد رہا کر دیئے گئے۔ اور اسی طرح میری نویں اور سب سے لمبی جیل یاترا ختم ہوئی۔

اس وقت سے ساڑھے چھ مہینے اور گذر چکے ہیں۔ جیل کی تنہائی کے بعد پھر جلسوں اور جلوسوں کی شدید مصروفیت اور مستقل سفر کا چکر شروع ہو گیا۔

ایک رات گھر پر گذار کر میں بھاگا بھاگ بمبئی پہنچا تاکہ ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شرکت کر سکوں۔ اس کے بعد شملہ کانفرنس میں جو وائسرائے نے بلائی تھی جانا پڑا۔ مجھے اپنے آپ کو نئے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھالنے میں تھوڑی سی دقت ہوئی۔ میں آسانی سے نئے ماحول میں نہ کھپ سکا۔ اگرچہ ہر چیز مانوس تھی اور پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے مل کر خوشی ہوتی تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں باہر کا آدمی ہوں۔ میرا دماغ پہاڑ اور برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اس لئے جوں ہی شملہ کا کام ختم ہوا میں نے کشمیر کا رخ کیا۔ میں نے وادی میں قیام نہیں کیا بلکہ پہنچتے ہی اونچے پہاڑوں اور دروں کے سفر کے لئے چل کھڑا ہوا۔ ایک مہینہ کشمیر میں رہ کر میں پھر روزمرہ کی زندگی کے ہنگاموں، مجمعوں اور اکتا دینے والی یکسانی میں آپھنسا۔

دھیرے دھیرے پچھلے تین سال کے واقعات کی ایک تصویر میرے ذہن میں بننے لگی۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ جو کچھ ہوا تھا وہ ہمارے وہم و گمان سے بہت زیادہ تھا۔ یہ تین سال ہماری قوم کے لیے بڑی مصیبت اور آزمائش کے سال تھے اور جو کوئی ملتا اس کے چہرے سے اس کی نشانی نظر آتی۔ ہندوستان بدل گیا تھا اور سطح کے ظاہری سکون کے نیچے شبہات، سوالات، مایوسی اور غصے کی دبی ہوئی آگ سلگ رہی تھی۔ ہماری رہائی اور واقعات کی تبدیلی سے اس منظر میں ایک تبدیلی ہوئی۔ ساکن سی سطح پر دوبارہ ایک تلاطم کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ سارے ملک میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تین سال تک جبر و تشدد کے بوجھ میں دبے رہنے کے بعد اب ملک آہستہ آہستہ سر اٹھا رہا تھا۔ میں نے پہلے نہ تو ایسے مجمعے

اور جوش و خروش کے یہ مظاہرے دیکھے تھے اور نہ اپنے عوام میں آزادی کے لئے ایسی تڑپ کا مجھے پہلے احساس ہوا تھا۔ نوجوان مرد ہوں یا عورتیں، لڑکے ہوں یا لڑکیاں، سبھی کے دل میں کچھ نہ کچھ کرنے کی لگن تھی، گو ان کے ذہن میں یہ واضح نہیں تھا کہ انھیں کیا کرنا چاہئے۔

لڑائی ختم ہوگئی اور ایٹم بم نئے زمانے کی نشانی بن گیا۔ اس بم کے استعمال اور طاقت و اقتدار کی پرپیچ کشمکش سے لوگوں میں اور بھی بدظنی اور بدگمانی پیدا ہوگئی۔ پرانی سامراجی طاقتیں اب بھی زندہ تھیں اور انڈونیشیا اور ہند چینی کے واقعات نے منظر کو اور بھی درد انگیز بنا دیا تھا۔ ان دونوں ممالک میں جو آزادی کے حصول کے لئے لڑ رہے تھے ہندوستانی فوجوں کا استعمال ہمارے لئے بڑے شرم کی بات تھی اور اس سے ہماری بیچارگی کا احساس اور بھی تیز ہوگیا اور غصے اور تلخی میں اس سے اور بھی اضافہ ہوگیا۔ ملک کے مزاج کا پارہ چڑھتا رہا۔ ہندوستانی قومی فوج کی خبر جو جنگ کے دوران میں برما اور ملایا میں بنی تھی سارے ملک میں اچانک پھیل گئی اور لوگوں نے غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعض عہدیداروں کے کورٹ مارشل نے سارے ملک میں ایک نئی ہلچل پیدا کردی اور یہ فوج ہندوستان کی جنگِ آزادی کی ایک نشانی بن گئی۔ وہ ہندوستان کے مختلف مذہبی فرقوں کے اتحاد کی بھی نشانی تھی کیونکہ اس فوج میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی بھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنے ہاں فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرلیا تھا۔ پھر ہم کیوں نہیں کرسکتے؟

ہندوستان میں عام انتخابات ہونے والے ہیں اور یہ توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ لیکن انتخابات جلد ہی ختم ہوجائیں گے اور پھر؟

آنے والا سال بڑا طوفان انگیز ہو گا جس میں کشمکش، جد و جہد اور ہنگامے ناگزیر دکھائی دیتے ہیں۔ جب تک اس کی بنیاد آزادی پر نہ رکھی گئی ہندوستان یا دنیا میں امن کا خواب منت کش تعبیر نہ ہو گا۔

*